البدر
سلیم منصور خالد

سلیم منصور خالد

ادارۂ مطبوعاتِ طلبہ، لاہور ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
البدر

مشرقی پاکستان

البدر

سلیم منصور خالد

ادارہ مطبوعاتِ طلبہ لاہور ۱۶

پرنٹر: ——— میٹرو پرنٹرز۔ لاہور
طبع اوّل اکتوبر ۱۹۸۵ء ——— ۵۰۰
طبع دوم فروری ۱۹۸۶ء ——— ۱۰۰۰
طبع سوم مارچ ۱۹۸۶ء ——— ۱۰۰۰
طبع چہارم اگست ۱۹۸۶ء ——— ۱۰۰۰
طبع پنجم اگست ۱۹۸۶ء ——— ۱۰۰۰
طبع ششم جنوری ۱۹۸۸ء ——— ۱۰۰۰
طبع ہفتم ستمبر ۱۹۸۹ء ——— ۱۰۰۰
طبع ہشتم اکتوبر ۱۹۸۹ء ——— ۲۰۰۰

قیمت روپے

ملنے کا پتہ : البدر پبلی کیشنز، راحت مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

اُس لہو کے نام

جو ــــــــــــــــ
پاکستان کے لیے بہا
اور ــــــــــــــــ
پاکستان میں اجنبی ٹھہرا

فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ
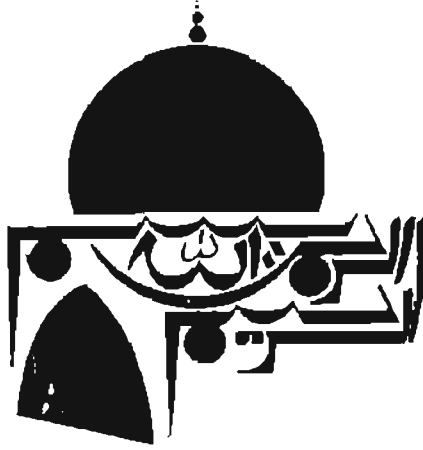
ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے . . . .

الاحزاب : ۲۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سقوطِ مشرقی پاکستان کے تقریباً آٹھ سال بعد جب میں اپنے ایک بنگالی دوست کے ہمراہ سائیکل رکشا پر ڈھاکہ یونیورسٹی اور ریس کورس گراؤنڈ کی درمیانی شاہراہ سے گزر رہا تھا تو اپنے رفیقِ سفر سے پوچھا:

"آپ سے "البدر" میں شامل (شہید) دوستوں کے بارے میں کچھ تفصیل سے جاننا چاہوں گا۔" اس سوال پر اُس کا ہشاش بشاش چہرہ اُداس ہوگیا، آنکھیں اشک آلود ہوگئیں، ریس کورس کی جانب اُس نے درد بھری نظر ڈالی اور دھیرے دھیرے کہنے لگا:

" If you wish to know about the martyres of ' AL-BADAR ' ..... I have no courage to tell you..... When I think of the tyranny to which they were subjected, courage fails me...... my heart bleeds and my soul shudders..... You had better ask the Race Course Ground and the walls of the Dhaka University Campus, with all their silence, they recount the tragic tale so clearly, that I cannot do justice to the subject ...... So, in this respect, brother! I cannot control my tears,..... every inch of this land is coloured with the blood of our dear fellows ..... The tragedy is that, we cannot even express our agony..... The nation does not recognize our sacdifice, The Muslim Ummah does not realise its significance..... We are strangers at home and foreingers in Pakistan....."

ترجمہ: "اگر تم البدر کے شہیدوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو یہ بتانے کی مجھ میں سکت نہیں۔۔ میں جب اس ظلم و استبداد کے بارے میں سوچتا ہوں، جس کا نشانہ وہ بنائے گئے تو میرا دل [illegible] ہو جاتا ہے اور روح لرز جاتی ہے۔ میں اس موضوع سے انصاف نہ کر سکوں گا اس لیے تم ریس کورس گراؤنڈ اور ڈھاکہ یونیورسٹی کی خاموش دیواروں سے پوچھو، ان کی بے زبانی اس داستانِ رنج و الم کو بہتر انداز میں بیان کر سکے گی۔۔۔ بھائی! میں (تصور کرتا ہوں تو) اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکتا کہ اس سرزمین کا چپہ چپہ ہماری محبوب ہستیوں کے خون سے لہو رنگ ہے مگر دکھ تو یہ ہے کہ ہم اس المیے کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ قوم ان قربانیوں کی معترف بھی نہیں اور مسلم امت نے اس کی قدر نہیں پہچانی۔ ہم گھر (بنگلہ دیش) میں اجنبی ہیں اور پاکستان میں غیر ملکی۔۔۔"

اس کی آواز میں لمحوں کے جبر، قربانیوں کی ناقدری اور سیکولر سیاست کی چنگیزیت کے خلاف مجبوروں کا احتجاج پنہاں تھا

یہ آشوب تاریخ ہے۔ کہ قوموں نے اپنے محسنوں کی ناقدری کی ہے۔ لیکن مسلمانوں میں ناقدری کی روایت بڑی پرانی اور دردناک ہے۔ جو قومیں اپنے محسنوں کو بھلا دیتی ہیں، وہ کسی وقت بھی اپنی آزادی کی زندگی سے محروم ہو سکتی ہیں۔

جنوبی ایشیا میں باب الاسلام کھولنے والے نوجوان محمد بن قاسم جو خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہی شہید ہوئے مدتوں مطلق العنان حکمرانوں نے اسے مسلم تاریخ میں جائز مقام نہ دیا، لیکن وقت نے جب ناانصافی کی گرد ہٹائی تو ابنِ قاسم کا روشن چہرہ روشن تر ہو گیا، اور تاریخ کے اوراق نے اسے سینے سے لگا لیا، اور غیرت مندوں نے اسے حمیت کی علامت بنا لیا۔ پھر اسی سرزمین پر سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے وادیٔ بالاکوٹ میں جہاد کیا، ان مجاہدین کی پشت میں کچھ غدار خائنین نے چھرا گھونپا اور سکھوں کا ساتھ دیا، انگریزوں کی مراد برلائی گئی اور دریائے کنہار کی شوریدہ سر لہروں میں اس تحریک کا مقدس لہو ل گیا۔ انگریزی استعمار نے مجاہدین کے لیے "وہابیت" کی گالی وضع کی اور اپنے زیرِ اثر علمائے سو کے ذریعے ہر خاص و عام میں پھیلا دیا گیا۔ اس سب کے باوجود تاریخ نے مجاہدین کو بلند مقام عطا کیا کہ وہ جنوبی ایشیا میں حقیقی جہادِ اسلامی کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی تحریک کے نقیب بن کر ابھرے۔ اس صدی کے چوتھے عشرے میں سرزمینِ فلسطین پر غاصبانہ قائم ہونے والی یہودی ریاست اسرائیل کا خنجر توڑنے کے لیے کسی بھی عرب ریاست سے پہلے اخوان المسلمون کے کارکن آگے بڑھے، انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی، اخوان کی تحریکِ جہاد کامیابی سے ہمکنار ہوا ہی چاہتی تھی کہ مصر داروں کے مسلم بادشاہوں نے اپنے مغربی سرپرستوں کے اشارے پر اخوان پر سنگدلانہ وار کیا۔ اخوان کے مرشدِ عام امام حسن البنّاؒ کو سرِ بازار گولی مار کر شہید کر دیا، پھر مشرق و مغرب کے زیرِ اثر عرب ریاستوں پر قابض آمروں اور کچھ قلم کاروں نے اخوانی مجاہدین کو گردن زدنی قرار دیا۔ ان کے لٹریچر پر پابندی عائد کر دی اور صفِ اوّل کے قائدین کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اسی قسم کے لوگ افغان مجاہدین کے عظیم ترین جہاد اور ان کی قربانیوں کا مقام و مرتبہ گھٹانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

——— اس تناظر میں اگر البدر کی شہادتوں پر دو قومی نظریے کی تعبیر پاکستان اور بنگلہ دیش میں گواہی دینے والی زبانیں گنگ، نطق و حرف مفلوج اور قلم ٹوٹ گئے ہیں تو کوئی حیرت نہ ہونی چاہیے، کہ نفاق کے اندھیرے میں ادنیٰ مفادات کی بیساکھیوں کے سہارے چلنے والے دانشوروں کی سوچ روشنیوں کے اس سفر کا تصور اور ادراک نہیں کر سکتی۔

بے شک شکست بڑا تلخ تجربہ ہوتا ہے لیکن زندہ قوموں کی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا کہ ایک شکست ان کے لیے بڑی فتح کا پیش خیمہ بن گئی اور وہ قومیں پہلے سے زیادہ معزز اور مضبوط بن کر ابھریں لیکن ہمارے ہاں شکست کی تلخی اس حد تک بڑھی کہ اہلِ وطن ان جاں نثاروں کو بھی بھول گئے جنہوں نے اپنی کڑیل اور بے داغ جوانیاں مکتی باہنی کے تخریب کاروں اور بھارتی فوجیوں کے مقابلے میں دفاعِ پاکستان کی خاطر قربان کر دیں۔ اور اب تو یہ عالم ہے کہ ۱۹۷۱ء کے ان شہیدوں اور غازیوں کا نام تک پاکستان میں لینا گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ لوگ بھی ہمارے ہی تھے جو مشرقی پاکستان کے سبزہ زاروں اور دریاؤں کے پانیوں کو اپنے لہو کی سوغات دے گئے۔ وہ نوجوان ہمارے جسد ملی ہی کا حصہ تو تھے جنہوں نے بنگالی ہوتے ہوئے بنگلہ قوم پرستی کے بت پر البدر کی صورت میں تیشہ چلایا اور قائد اعظمؒ کے متحدہ مشرقی و مغربی پاکستان کا سبز ہلالی پرچم اٹھایا، مگر ہمارے اندر احساس کی چنگاری اس طرح بجھ گئی کہ ہم ان غریب الوطن جوانوں، شہیدوں اور غازیوں کو یکسر بھول گئے (یا بھلا دیئے گئے)

طرفہ تماشہ یہ کہ جن موقع پرست سیاستدانوں اور بزدل بادہ مست جرنیلوں نے اس گھر کو آگ لگائی اور اس مملکت کو دولخت کر دیا، جو جنوبی ایشیا میں امت کی امیدوں کا واحد مرکز تھی۔ انکی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ حیف! اب وقت کے غدار بھی رستم ٹھہرے اور جن کے لہو سے دو قومی نظریہ منور ہو گیا انہیں کوئی یاد نہیں کرتا۔ اگر ایک کردار نے تاریخ کے صفحے آلودہ کر دیئے تو شہیدوں نے اسی تاریخ میں عزیمت کا روشن باب رقم کیا اور آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کے مینار بن گئے۔ مگر اس سے بڑھ کر ناانصافی اور اندھیر کیا ہو گا کہ ہمارا جغرافیہ تو بگڑ ہی چکا ہے اب ہماری شناخت اور تاریخ بھی مسخ کی جانے لگی ہے۔ اس مینارۂ نور کی بنیادیں کھوکھلی کی جا رہی ہیں۔ شاعر، محقق، صحافی اور ادیب (الا ماشاء اللہ) پہلے بھی ایسے کے مجرموں میں شامل تھے کہ وہ غاصب اور نااہل حکمرانوں کے ہر فعل کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے، ان کی ہر کج روی پر پردہ ڈالتے اور ہر حماقت کو تاریخ کا سنہری باب قرار دیتے رہے۔ یہ قلم بدست طائفہ آج بھی اپنی شناخت اور تاریخ کو مسخ کرنے کے اس کھیل میں برابر شریک ہے۔ ہمارے سادہ لوح عوام ماضی میں اس المیے کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہ تھے کہ انہوں نے تحریک پاکستان کے نعرے لا الہ الا اللہ کا کسی سے حساب نہ لیا، اور پاکستان کے نقشے کو چاک کرنے والے ہاتھوں کو نہ روکا اور نہ توڑا آج تاریخ کو مسخ کرنے کے لیے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ اس سے بھی بری الذمہ نہیں ہیں کہ ان کا کردار پہلے کی طرح بے تعلق اور خاموش تماشائی کا ہے۔

ان محسنوں کو یاد کرنا ہر پاکستانی پر واجب ہے جنہوں نے ظلمت کے طوفانوں میں حق و صداقت
کی قندیلیں روشن کی تھیں اور حق کی آواز بلند کرنے کے صلے میں طعنوں کے تیر سہے، اپنے مستقبل کو نثار کیا
اور قوم کے مستقبل اور آزادی کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے قید خانوں میں زندگی گزاری
اور سنگینوں اور پھانسی کے پھندوں پر جھول گئے۔ قوم کے یہ محسن آج ہم میں موجود نہیں، مگر ان کی پاک
روحیں آج بھی دیکھ رہی ہیں کہ ان کی یادوں اور قربانیوں سے کون فیضیاب ہو رہا ہے۔ اگر ہم فراموش کار
نہیں تو پھر ان شہیدوں کو نہیں بھولنا چاہیے۔ ہر چند کہ وہ جاں نثار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور کسی
بھی نوعیت کی مدح و ستائش سے بے نیاز ہیں۔ لیکن ان کا ملک و ملت پر نچھاور کیا ہوا لہو جانے والوں
کا قرض اور آنے والوں کی امانت ہے۔ اگر ہماری قوم ان کی جاں نثاری، جرأت اور عزیمت کو نظر انداز
کرتی ہے تو پھر بجا طور پر شک پیدا ہوتا ہے کہ یہ قوم زندہ بھی ہے یا نہیں؟

زیر نظر مجموعہ سعادت کی زندگی کا پیغام ہے۔ یہ یادوں کا گلدستہ، آنسوؤں کی مالا اور جاں نثاروں
کی روداد جاں سپاری ہے۔ یہ مجموعہ ایک تاریخ ہی نہیں، تاریخ کا احتجاج بھی ہے۔ فکری نظر بندوں کی
کم نگاہی اور مؤرخین کی بے مروتی کا ماتم، سیاسی مجبوریوں کا نوحہ اور پسماندگانِ تحریکِ پاکستان کا مرثیہ بھی ہے
یہ تذکرہ پاکستانی جذبوں کا امین ہے جسے موقع پرست صحافت، سیاست اور سندِ حب الوطنی کی کوئی طلب نہیں
اس مجموعے میں شامل تحریریں قوم کی ذہنی غلامی، سیاستدانوں کی بے وفائی اور جرنیلوں کی پسپائی کے
خلاف ایک Charge-Sheet ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۱ء میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے بیسویں (اور متحدہ پاکستان کے آخری) سالانہ
اجتماع منعقدہ ملتان میں مؤلف نے "البدر" پر جمع و ترتیب کا کام شروع کیا، مگر اس جذبے کو لہنہ اس
وقت لگی، جب ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو بنگلہ دیش نے البدر کے کمانڈروں کی
گرفتاری پر انعامات کا اعلان کیا اور سالمیتِ پاکستان کی جنگ میں حصہ لینے کی پاداش میں انہیں
بے نقط سنانا شروع کیں۔

اس تالیف میں شامل شہیدوں کے جگر لخت لخت اور ایثار و سرفروشی کے رزمیہ واقعات
جمع کرنے کے لیے گم گشتہ منزل (مشرقی پاکستان) کا سفر کیا۔ ڈھاکہ سے چٹاگانگ تک بادیہ پیمائی
کی، بنگال کے صحافیوں، قانون دانوں، یونیورسٹی کے پروفیسروں اور سیاست دانوں سے مفصل ملاقاتیں
کیں اور ان کے نتیجے میں البدر کا پیش منظر مزید نکھر کے سامنے آیا، مزید برآں البدر کے مجاہدوں سے نشستیں

ہوئیں، شہداء کے لواحقین اور احباب سے شہید بیتی، پاک بیتی اور آپ بیتی سنی کچھ افراد سے انگریزی میں اور کچھ سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں انٹرویو کیے، کچھ احوال بنگلہ میں لکھوائے اور بمشکل تمام انہیں پاکستان منتقل کیا۔ اسی طرح یہاں مسلح افواج پاکستان کے ارکان کی یادداشتیں اور مشرقی پاکستان سے ہجرت کرکے آنے والے سچے پاکستانی بنگالیوں کی گواہیاں بھی ریکارڈ کیں۔ نتیجتہً اس کتاب کی ضخامت کے تین مجموعوں کا لوازمہ جمع ہوگیا۔ سرِدست ایک مجموعہ حاضر ہے۔ جس میں کچھ واقعات کا انتخاب پیش کیا جارہا ہے۔

اس تذکرے کا پہلا حصہ مختصر تاریخ و تجزیے پر مبنی ہے، اور اس لیے ضروری ہے کہ آج کی درسگاہوں سے درسِ خود فراموشی حاصل کرنے والے جوانوں کو علم ہو کہ ہم کیا تھے، کیا ہوگئے اور کیوں کر ایسا ہوا؟ دوسرا حصہ البدر کی تشکیل، شجاعت اور شہادت کی کچھ تصویروں پر مشتمل ہے اور طویل تر ہے۔ بیشتر واقعات اور احوال کے بارے میں ایک سے زائد افراد سے روایات جمع کیں۔ اس احتیاط کے نتیجے میں کئی ایسی باتیں جو پہلے بالواسطہ ذرائع سے سامنے آچکی تھیں، ان کی درستی ہوگئی۔ کیونکہ ایک ایک لفظ کا استناد (Authentication) مطلوب تھا، صبر و جستجو کے ساتھ نقطہ نقطہ اور حرف حرف جوڑ کر اس قلمی تصویر کے خدوخال بنانے میں کئی برس لگ گئے۔

——— اور اسی توشہ کے ذریعے میں ربِّ ذوالجلال سے رحمت و بخشش کا طلب گار ہوں۔

ممکن ہے کہ قارئین کو اس کتاب میں کہیں کہیں جذباتیت کا عنصر نظر آئے، اس سلسلے میں ہمیں کسی معذرت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ زیرِ بحث موضوع پر جذبات سے بالاتر ہو کر کچھ لکھنا ممکن ہی نہیں، تاہم یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ جذباتیت صرف اسلوب اور بیان و تحریر کی حد تک ہے۔ حقائق و واقعات کی استنادی حیثیت پر اس کا کوئی اثر نہیں۔

محترم جمیل احمد رانا صاحب کا سپاس گزار اور ممنون ہوں کہ ان کی جانب سے تاریخ پاکستان کے باب میں بھرپور معاونت اور مسودے پر نظرِ ثانی کے دوران مؤثر مشاورت نے اس پیش کش کو بہتر عملی شکل عطا کی۔ اللہ انہیں جزا دے۔

اگلے ایڈیشن کو مزید بہتر بنانے کے لیے قارئین کی تجاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

سلیم منصور خالد

نقشِ ثانی

یہ مقامِ شکر ہے کہ اہلِ نظر نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ خدا کرے کہ یہ کاوش آخرت کی میزان میں بھی شرفِ قبول پائے۔

محترم خرم جاہ مُراد کی خصوصی شفقت سے ان کی ایک خوبصورت اور فکر انگیز تحریر اس ایڈیشن میں شامل کی گئی ہے، جسے ہم ابتدا میں لانا چاہتے تھے، مگر کتاب کی فنی ترتیب میں موزوں مقام وہی طے پایا، جہاں اسے قولِ فیصل کے طور پر دیا جارہا ہے۔

کتاب کا اصل موضوع "البدر" کے طریقِ کار سے واقفیت اور گمنام شہیدوں کا تذکار ہے۔ اس اہم موضوع کی تمام جہتوں اور ممکنہ حد تک تمام واقعات کو ایک جلد میں مدوّن کرنا ممکن نہ تھا۔ "البدر" کے ڈیڑھ ہزار سے زائد شہداء میں سے تقریباً دو سو کا ذکر یہاں موجود ہے، جبکہ بہت سا کام ابھی باقی ہے — اسی ضمن میں کہیں اختصار اور کہیں تفصیل ہے۔ یہ معاملہ درحقیقت معلومات کی فراہمی میں دقت، روایت کی پرکھ، مضمون کی نزاکت اور معیار کی صداقت کے سبب ہے۔

جبکہ تحریکِ اسلامی کے دوسرے رضاکار ونگ "الشمس" کے شہیدوں کا ذکر چند مقامات پر ہے۔ یہ موضوع تفصیلی جائزے کے لیے الگ کتاب کا متقاضی ہے۔

کتاب کے حُسنِ ترتیب میں تعارفی باب "البدر" کے بارے میں تعارفی اشارات پر مبنی ہے: "جنگی مہمات" میں دفاعی آپریشن کا ایک انتخاب ہے، "جادۂ وفا" کے ذیل میں کچھ منفرد واقعات درج ہیں، "اسیری" کے دامن میں میسر روداویں ہیں اور "ہجرت" چند مہم جُو نوجوانوں کی آپ بیتی ہے۔

اس ایڈیشن کو مزید مفید بنانے کے لیے چند عکس اور انڈیکس کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

مصنف

اول

دوم

سوم
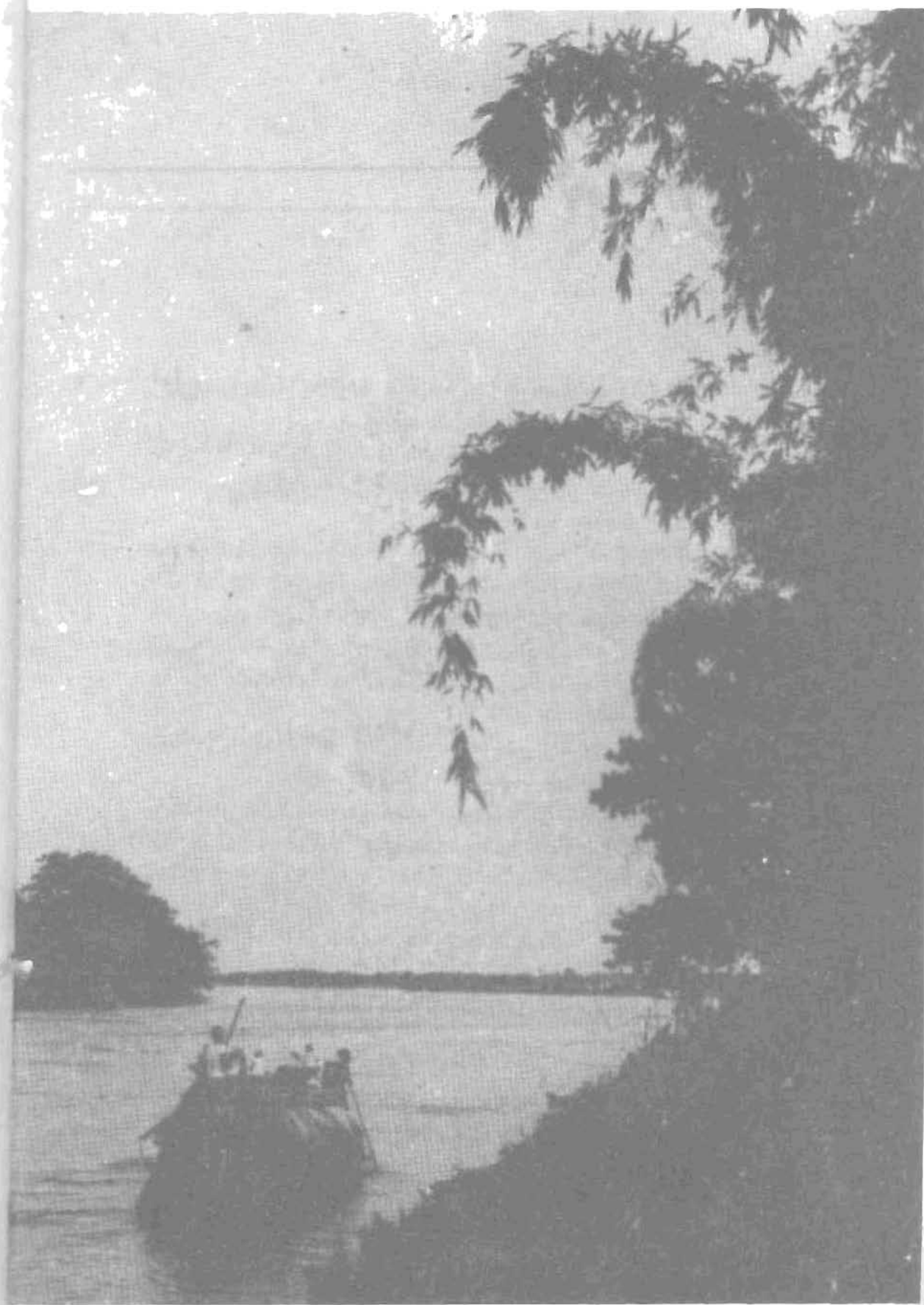
مسلم بنگال

برصغیر پاک و ہند (جنوبی ایشیا) میں بنگال کی تاریخ پر[1] ایک نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان بنگال میں آئے جب عرب بسلسلہ تجارت و تبلیغ یہاں پہنچے تھے۔ مسلمان عربوں نے ایک امیر کے تحت تبلیغی مرکز کے روحِ رواں سلطان محمود ماہیؒ (۱۰۴۷ء) شاہ محمد سلطان رومیؒ (۱۰۵۳ء) بابا آدم شہیدؒ (۱۱۱۹ء) اور شاہ نعمت اللہؒ بت شکن جیسے اکابرِ اہل اللہ تھے جنہوں نے سارے بنگال کو اپنی تبلیغی جدوجہد سے منور و تاباں بنایا۔"[2]

پھر ہندوستان میں مسلم خاندان غلاماں کے ایک جرنیل محمد بن بختیار خلجی نے بہار کے بعد بنگال کے وسیع و زرخیز علاقے کو ۱۲۰۳ء (۶۰۰ھ) میں فتح کیا۔ اس طرح یہ علاقہ پہلی مرتبہ مسلم اقتدار کے زیرِ نگیں آیا۔ اس وقت بنگال کا حاکم راجہ لکشمن سین عرف لکھمنیہ تھا جس کے مظالم سے تنگ عوام نے اسلام کی دعوت قبول کرنے میں کوئی تردد نہ کیا۔

تبلیغ اسلام

ان حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے انیسویں صدی کا ایک ہندو نواز انگریز سر ولیم ہنٹر اعتراف کرتا ہے:

"بنگال کی نچلی قوموں کے غریب مچھیروں، شکاریوں اور کسانوں کے لئے اسلام ایک آسمانی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے —— اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد چہارم، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء

[2] اعجاز الحق قدوسی "تذکرہ صوفیائے بنگال"، ۱۹۶۵ء، ص ۴۸-۴۷

رحمت بن کر نازل ہوا۔ وہ نہ صرف حکمران قوم کا مذہب تھا، بلکہ اس میں اتنی مساوات بھی تھی کہ وہ اس کی بدولت خود ان لوگوں سے بھی زیادہ بلند درجہ حاصل کر سکتے تھے جو برہمن کھشتری، انہیں (شودر) ذلیل خیال کرتے تھے۔ اس بنا پر اسلام ملک کے سب سے زیادہ خوش حال صوبہ (بنگال) پر قابض ہو گیا۔ اسلام کے تصورِ مساوات، اور دیگر خوبیوں نے اہلِ بنگال کی عقل کو اپیل کیا۔ ان کے سامنے انسانیت کا ایک بلند مفہوم پیش کیا۔ انسانی برادری کا ایک ایسا عجیب اصول قائم کیا جس سے وہ بالکل ناآشنا تھے اور ذات پات کی قیود بالکل توڑ دیں۔"[1]

"بنگال میں دعوتِ حق کی تبلیغ و ترویج کے داعی اول شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جنہوں نے یہ مقدس فرض انجام دیا اور وہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔ اسی طرح آسام میں اس نعمتِ عظمیٰ کو حضرت شیخ جلال الدین فارسیؒ اپنے ساتھ لے گئے جو سلہٹ میں مدفون ہیں۔" . . . . . . بلاشبہ مسلم فاتحین نے اپنی فتوحات سے اسلام کی اشاعت کے لئے ایک فضا پیدا کی۔ لیکن جن لوگوں نے یہاں کے عوام کے قلوب کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا اور جن کی بدولت اس خطے میں اسلام کی بہار آئی، وہ بنگال کے صوفیائے کرام تھے۔

بنگلہ زبان اور مسلمان

"مسلمانوں کی آمد نے بنگال کے معاشرے کے جس شعبے کو سب سے زیادہ ترقی دی اور متاثر کیا وہ بنگلہ زبان تھی۔ مسلمان فاتحین کے ہمراہ عالموں اور بزرگوں نے اس زبان کو رشد و ہدایت کا وسیلہ بنایا اور اس کے نشو و نما کی کوشش کی۔ اس زبان کو سنسکرت کی پیچیدگیوں سے پاک کیا۔ بنگالی زبان کا عروج اور بلند ادبی مقام مسلمانوں کا رہین منت ہے"[2] اسی طرح محققین اور انگریزوں کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اسلام (خصوصاً) جنوبی بنگال میں اس قدر راسخ ہو چکا ہے

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ "اسلام کا سرچشمۂ قوت" لاہور ۱۹۷۱ء ص ۲۸ [2]۔ ایضاً ص ۳۷

[2] عبداللہ ملک "بنگالی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی" لاہور ۱۹۶۷ء ص ۱۳۰

کر دہاں ایک خاص دینی ادب اور زبان پیدا ہو گئی ہے[1]۔ ..... اور یہی بنگالی زبان کے علمی و ادبی ارتقاء کی اہم ترین کڑی ہے جسے بعد میں سنسکرت زدہ کرنے کی سازش کی گئی۔

بنگال کے سیاسی واقعات

۱۳۴۰ء میں بنگال کے حاکم سلطان فخر الدین نے دہلوی اقتدار سے خود مختاری اور مکمل آزادی کا اعلان کر دیا اور یہ علیحدگی ۱۵۷۰ء تک برقرار رہی۔ تا آنکہ شہنشاہ جلال الدین اکبر نے بنگال پر چڑھائی کر کے خود مختار گورنر داؤد شاہ کو قتل کیا اور اسے اپنی بادشاہی میں شامل کر لیا۔ اسی دوران میں مغلیہ حکومت نے یورپ سے آنے والے جاسوسوں اور سفارت کے پردے میں آ کر سازشیں کرنے والے انگریزوں کو اپنی بے بصیرتی کے باعث دربار شاہی میں بلند مقام عطا کئے۔ ۱۶۰۰ء میں مغلوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سرکاری طور پر تجارت کرنے کی اجازت دے دی اور ان کی بڑی تجارتی کوٹھی ہُگلی بنگال میں تھی۔ حالانکہ یہ کمپنی بظاہر تجارتی مقاصد رکھتی تھی۔ مگر اس کے پس پردہ عزائم تفرقہ بازی اور پھر اقتدار پر قبضہ کرنا تھا۔

مغربی اقوام نے سترھویں صدی میں ہندوستان کی جانب رخ کر لیا تھا۔ ۱۶۶۴ء کے زمانے میں ولندیزیوں نے چنسورہ، فرانسیسیوں نے چندر نگر اور ڈنمارکیوں نے سری رام پور میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں۔ شائستہ خان صوبیدار بنگال (۸۹-۱۶۶۴ء) نے انگریزوں کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کے باعث ان کو ہگلی سے نکال دیا جس پر انگریزوں نے ۱۶۶۸ء میں چٹاگانگ پر بحری بیڑے کے ساتھ حملہ کیا[2]۔

ادھر ۱۷۲۵ء میں نواب شجاع الدین نے کمزور مغلیہ اقتدار سے علیحدگی کا اعلان کیا لیکن مسلم بنگال کی یہ علیحدگی بھی ۱۷۵۷ء میں ختم ہو گئی۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۲۰۴ء سے لے کر ۱۷۵۷ء (انگریزوں کی آمد) تک پانچ سو ترپن برس کے عرصے میں بنگال کے جو ۷۶ گورنر گزرے، ان میں صرف

---

[1] ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر "ہمارے ہندوستانی مسلمان" (مترجم صادق حسین) اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۴۴ء صفحہ ۲۲۸

[2] باری علیگ "کمپنی کی حکومت" لاہور ۱۹۶۹ء صفحہ ۹۶

دو ہندو تھے اور ان دونوں راجہ ٹوڈرمل ۸۲-۱۵۸۰ء اور راجہ مان سنگھ ۱۶۰۶-۱۵۸۹ء کو اکبر نے مقرر کیا جو کہ اکبر کی مخصوص سیکولر پالیسی کا ایک حصہ تھا۔

بنگال پر مسلمانوں کے تہذیبی اثرات

مسلمانوں کے تحت بنگال میں باقی ہندوستان کی نسبت بے نظیر امن وامان قائم رہا کیونکہ یہ علاقہ قدرتی طور پر محفوظ سرحدوں میں تھا اور اس قدر دور تھا کہ بیرونی حملہ آوروں کی تاخت وتاراج سے ہمیشہ بچا رہا۔ مختلف اوقات میں ہندوستان کے بعض حصوں سے مسلمان آکر یہاں بستے رہے اور زرخیز زمین کو زیر کاشت لاکر ترقی کی طرف گامزن ہوئے۔ بنگال کی پہلی فتح (۱۲۰۴ء) کے ساتھ ہی بے شمار مسلمان فوجیوں کے خاندان جو کہ افغانوں، مغلوں و ساداتِ پر مشتمل تھے، یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ اور علوم وفنون کی روشنی سے اس علاقے کو منور کیا، اسلام کی دعوت کو پھیلانے کا کام بدقسمتی سے کسی بھی حکمران نے نہ کیا۔ صرف دردِ دل رکھنے والے مشائخ وسادات نے یہاں کی مقامی آبادی تک اسلام کا پیغام پہنچایا۔ بنگال کی معاشی خوشحالی کا ایک بڑا سبب مسلمانوں کی جہاز رانی تھی، اس دور میں ہگلی کی بندرگاہ عرب وعجم کے درمیان تجارت کا بہت بڑا مرکز تھی[1]۔ ہندوؤں کے ہاں سمندر کا سفر خلاف مذہب تھا اس لئے عرب جہاز رانوں کی اس آمد ورفت سے یہاں کے مسلمانوں کی مالی حالت سدھرنے لگی تھی۔ بنگال کے مسلمانوں کی نسل عربی وعجمی خاندانوں کے اشتراک سے بڑھی تھی اس لئے ان کی ہئیتِ جسمانی، رنگ اور خدوخال میں مقامی ہندو بنگالیوں کی نسبت آج تک نمایاں فرق موجود ہے۔ بنگال میں باہر سے آنے والے مسلمانوں (سید، میر، خوندکر، شیخ، خان، مغل، ملک، مرزا، بیگ، خواجہ، قاضی وغیرہم) نے اس علاقے کو اپنا دیس بنا لیا، چنانچہ اس نسلی اختلاط اور ربطِ باہم سے بنگالی زبان کے لہجے میں تبدیلی ہوئی۔ لاتعداد عربی اور فارسی الفاظ فرہنگِ بنگلہ میں شامل ہوئے، فارسی اور عربی زبان کا جنگجویانہ لہجہ بنگلہ زبان وادب کے لوک ورثے اور ادب عالیہ میں سرایت کر گیا۔ یہ جنگجو اقوام

---

[1] خوندکر فضل ربی "حقیقتِ مسلمانانِ بنگالہ" (مطبوعہ ۱۸۹۱ء) کراچی۔ ۱۹۷۲ء طبع ثانی۔

اگرچہ خود میاں کی آب و ہوا اور ماحول میں تحلیل ہوگئیں، مگر ان کا آتشیں مزاج بنگالیوں کے رگ و پے میں سرایت کر گیا جس کا مشاہدہ تاریخ کے اوراق نے بارہا کیا ہے۔

انگریز سامراج کی آمد

اٹھارھویں صدی میں جب برطانیہ فرانسیسی حکمران نپولین کے نام سے فوجی اور تجارتی اعتبار سے خوف زدہ تھا تو اس نے اپنی توسیع پسندانہ حکمت عملی کو ایشیائی ممالک کے لئے مخصوص کر دیا۔ ان دنوں (۱۷۲۵ء) نواب شجاع الدین بنگال کی مسلم ریاست کا الگ وجود برقرار رکھنے کے لئے مرہٹوں کی یلغار کے سامنے چٹان بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب علی وردی خان کے کندھوں پر مسلم بنگال کے حکمرانی کی ذمہ داری (۱۷۴۰ء) آن پڑی تو اس نے بھی اگرچہ بڑی قابلیت کے ساتھ بنگال کو مرہٹوں کی شورش اور لوٹ مار سے محفوظ رکھا، لیکن دوسری جانب ایسٹ انڈیا کمپنی سے سفارتی تعلقات قائم کئے۔ وہ انگریزوں کو اہل کتاب سمجھتے ہوئے ان کے بارے میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ اس لئے اس کے نزدیک ان سے تعلقات استوار کرنے یا ان پر اعتماد و اعتبار نہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی، لیکن جوں ہی اس کے جانشین نواب سراج الدولہ نے عنان حکومت سنبھالی تو ہندو انگریز گٹھ جوڑ کی آکاس بیل مسلم بنگال کے تنے سے چمٹ چکی تھی جو اس شاداب و خودمختار ریاست کا لہو چوسنے لگی۔ سراج الدولہ کو ہندو ساہوکاروں، انگریز سفارت کاروں اور غدار مسلمان درباریوں (میر جعفر) کی سہ طرفی سازش کا شکار ہونا پڑا۔ جون ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں معرکہ ہوا تو ہندوؤں نے ہندوستان کے افق پر ابھرتے ہوئے انگریز سامراج کی معاونت کی۔ ننگ ملت میر جعفر کے بیٹے نے سراج الدولہ کو شہید کر دیا۔ اس طرح ساڑھے پانچ سو سال بعد بنگال پر ہندو نواز انگریزی اقتدار قائم ہوا۔

انگریزوں اور ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کا تہذیبی و اقتصادی استحصال

۴ انگریز سامراج نے جنگ پلاسی کی فتح کے بعد اپنی مخصوص سیاسی فوجی اور معاشی ضروریات

کے پیش نظر یہاں کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی میدان میں تبدیلیاں کیں۔ ان کی اس پالیسی کا بنیادی پتھر ہندو نوازی پر مبنی تھا جس میں معاشی استحکام اور سیاسی حکمت کے اعصابی مراکز پر ہندوؤں کی تعیناتی شامل تھی۔

انگریزوں نے اقتدار پر قبضہ کرتے ہی مسلمانوں کو دبانے کا منصوبہ بنایا کیونکہ انہیں خوف تھا کہ مسلمانانِ بنگال بالخصوص حصول اقتدار کے لئے جوابی اقدام نہ کریں۔ اس لئے اس خطے کے مسلمانوں کو کچلنے کی انتہا کر دی گئی۔ ان کو سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی لحاظ سے مفلوج کرنے کی مہم شروع کی گئی اور اس سلسلہ میں وارن ہیسٹنگز اور کارنوالیس ویل نے جو زمینداری سسٹم نافذ کیا۔ اس میں بڑی بددیانتی کے ساتھ مقامی اکثریتی مسلمانوں کی زمینیں چھین کر زبردستی ہندو اقلیت کے ہاتھوں میں دے دی گئیں۔ مسلمانوں نے اپنے طویل دور اقتدار میں ہندوؤں کے ساتھ جس فیاضی اور مذہبی رواداری کا سلوک کیا تھا اسے ہندو احسان فراموش نے پرائی طاقت کے بل بوتے پر بھلا دیا اور انگریزوں سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔

بنگال کے مسلمان شکست اور ظلم پر ظلم برداشت کر رہے تھے۔ وہ جاہ و جلال، تخت و حکومت آسودگی اور فارغ البالی سبھی سے محروم ہو گئے تھے اور اس کی سب سے بڑی وجہ ظالم ہندو گماشتہ تھا۔۔۔[1] برطانوی سامراج سے مل کر ہندو اہل کاروں نے مسلمانوں کا اقتدار، پھر دیوانی اختیارات چھینے اور پھر دوامی بندوبست اراضی کی آڑ میں زمینیں ہتھیالیں۔ دیہی پولیس اور دوسرے شعبوں میں مسلمان ملازمین کو ہٹا کر ہندو مسلط کر دیئے۔ مسلمانوں سے وابستہ پارچہ بافی کی صنعت کو تباہ کر کے ان کی معاشی زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ الغرض چند سالوں کے اندر اندر انگریزوں نے یہاں پر مسلمانوں کے صدیوں سے قائم سماجی ڈھانچے کو ہلا ڈالا جو مذہبی رواداری اور تعاون و اتحاد پر استوار تھا۔

فرائضی تحریک

بنگال میں مسلمانوں کی تہذیبی، دینی اور معاشی بربادی کے باوجود ان میں خود کو زندہ رکھنے کا عزم

---

[1] عبداللہ ملک ـــــ ایضاً۔ ص ۲۵

د جو عطا پیدا ہوا۔ سلطان ٹیپو شہید کی شہادت کے تین سال بعد اس جذبے نے فرائضی تحریک کا روپ دھارا اور یہ تحریک بڑی تیزی سے بنگالی مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ اس تحریک نے بنگال کے مسلمانوں کو جان اپنی بقا کے لئے قرآن حکیم کے بنائے ہوئے ضابطے پر سختی سے عمل پیرا ہونے کا شعور دیا۔ وہیں مسلمان مزارعین کو ہندو زمینداروں کے عائد کردہ ناجائز ٹیکس ادا کرنے سے انکار پر ابھارا۔

فرائضی تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہؒ (۱۷۸۱-۱۸۴۰) تھے۔ مداری پور میں پیدا ہوئے انہوں نے ابتدائی تعلیم عربی و فارسی میں حاصل کی اور سلسلہ قادریہ سے وابستہ ہو گئے۔ بعد ازاں جامعہ الازہر (قاہرہ) میں اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لئے گئے۔ واپسی پر حج بیت اللہ کیا۔

۱۸۲۰ء میں دوبارہ سفر حجاز کیا اسی دوران الشیخ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک توحید کے اس پہلو کو ملحوظ رکھا کہ "عوام کو صحیح اسلامی تعلیمات اور توحید الٰہی کے حقیقی شعور کی طرف راغب کر لیا جائے تو سیاسی انقلاب کی جدوجہد آسان ہو جاتی ہے" اس نقطۂ نظر سے وہ متاثر ہوئے اور واپسی پر فرائضی تحریک کا آغاز کیا جس کا بڑا مقصد دینی فرائض کی ادائی کا شعور بیدار کرنا اور مسلمانوں کو منظم کر کے اسلامی نشاۃ ثانیہ کا کام کرنا تھا انہوں نے انفرادی بیعت کے لئے مروجہ قدیم طریق کار کو ختم کر کے اجتماعی نظم کا تصور دیا۔ فرائضی تحریک نے دینی فرائض کی ادائی کے ساتھ ساتھ جابرانہ جاگیردارانہ اور زمیندارہ سسٹم کے خلاف انقلابی جدوجہد شروع کی، تاکہ غریب مسلمانوں پر ہونے والے اقتصادی و معاشرتی جبر کا خاتمہ ہو۔ اس تحریک کا مرکز "نواباڑی" تھا اور یہیں پر ان کا سب سے پہلے جاگیرداروں سے ٹکراؤ ہوا۔ ہندو جاگیرداروں نے اپنے علاقوں میں فرائضی تحریک کے کارکنوں اور بیدار ذہن مزارعوں کی داڑھیوں کو باندھ کر سرخ مرچ کا پاؤڈر ان کے نتھنوں میں ڈالا اور ان کے ننگے جسموں پر کیڑے چھوڑے۔ نتیجۃً سب سے بڑے ہندو جاگیردار گھوش خاندان کے خلاف فرائضیوں نے مسلح اقدام کیا اور جبر کے اس نشان کو توڑ کر رکھ دیا۔ حاجی شریعت اللہ کے انتقال پر ان کے صاحبزادے دودو میاں (میاں محسن الدین) تحریک کے سربراہ بنے۔ انہوں نے جدوجہد کو آگے بڑھایا[1] فرائضی تحریک کا دائرہ بنگال کی سرزمین تک ہی محدود

1— "Pakistan Times" 23, Sep. 1983 (Revivalism in Muslim Bengal)

رہا اور ایک عرصے تک یہ تحریک بنگال میں کام کرتی رہی۔ اس سے وہاں کے عام مسلمانوں میں اسلام کے احیاء اور شریعت کے نفاذ کے لئے جدوجہد کا جذبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ دُودُو میاں کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے انگریزوں کو متعدد بار سخت اقدام کرنے پڑے۔ یہ تحریک اس قدر مقبول ہوئی کہ جب اس نے انگریزی عدالتوں کی بائیکاٹ کی تحریک چلائی تو ایک وقت ایسا بھی آیا جب ان عدالتوں میں شاذونادر ہی مقدمات آتے تھے اور اس کے برخلاف متوازی عدالتیں مؤثر ثابت ہو رہی تھیں۔[1]

تحریک مجاہدین

بنگال میں مسلمانوں کی اسلام سے گہری وابستگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب سید احمد شہیدؒ نے تحریک مجاہدین کی بنیاد رکھی تو بنگال کے دیہی علاقوں سے مسلمان سپاہی جوق در جوق اس میں شرکت کے لئے آنے لگے۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کا مقصد ہندوستان میں اسلامی معاشرے کا قیام اور پہلے مرحلے میں مسلمانوں کو سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کے حملوں سے بچانا تھا۔ جب جہاد کے لئے اعلانِ عام ہوا تو بنگال کے مسلمان اس میں سب سے زیادہ سرگرمی سے آگے بڑھے اور یہ امر واقعہ ہے کہ بنگال کے مقابلہ میں پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کے لوگوں نے تحریک جہاد میں اتنی سرگرمی سے حصہ نہ لیا، بلکہ یک گونہ سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ بنگال، سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کے حملوں کی زد سے باہر تھا۔[2]

سید احمد شہیدؒ کی دینی تحریک، تجدید و احیائے دین کی ایک مستقل تحریک تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکری نمو کا پرتو تھی۔ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ (سرحد) کے مقام پر چند سرحدی خوانین کی غداری اور سکھ انگریز حملے کے نتیجہ میں بظاہر تحریک مجاہدین کو فوجی شکست ہوئی اور سید احمدؒ، شاہ اسماعیلؒ شہید ہوگئے۔ تحریک آزادی اور جہاد اسلامی کا حقیقی آفتاب بالاکوٹ کی پہاڑیوں اور دریائے کنہار کے کنارے غروب ہوگیا، لیکن یہ سفر جاری رہا۔ مجاہدین کی ایک بڑی تعداد بنگال واپس آگئی اور

---

[1] پروفیسر خورشید احمد "چراغ راہ نظریہ پاکستان نمبر" ادارہ عالم، کراچی ۱۹۶۰ء۔ ص ۱۶۱

[2] صفدر محمود "سقوط مشرقی پاکستان" لاہور ۱۹۷۳ء۔ ص ۲۸، ۲۹

یہاں پر اسلامی انقلاب و تحریک آزادی کے کام کو آگے بڑھایا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ چنگاریاں نئے سرے سے بھڑک اٹھیں تو انگریز نے "وہابی" کی گالی ایجاد کرکے اپنے پروردہ بعض جہاد دشمن علماء کو مجاہدین کی تکفیر کے دھندے پر لگا دیا۔

اس سلسلے میں ممتاز مورخ اور محقق مولانا مسعود عالم ندوی نے برطانوی ریکارڈ سے حقائق یکجا کیئے ہیں:

"بنگال کے دیہاتوں میں مجاہدین کی تنظیم خاص طور پر قابلِ رشک تھی۔ اس سلسلے میں سر ولیم ہنٹر کی شہادت "دی انڈین مسلمانز" صہ۔۷) ملاحظہ ہو۔ بے شمار باغیانہ لٹریچر پٹنہ کا مرکزی دارالاشاعت اور بنگال کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مبلغین کے علاوہ ، باغیانہ رجحان رکھنے والے عوام تک پہنچنے کے لئے ان لوگوں نے ایک چوتھی راہ بھی نکال رکھی تھی۔ ابتدا ہی میں خلفاء نے اس بات کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ جہاں کہیں بھی ان کے مرید ہاتھ بٹا ئیں مبلغین کو چاہیئے کہ وہاں اپنی مستقل نوآبادی قائم کرلیں۔ اس طرح بنگال کے دیہاتی علاقوں میں متعدد باغیانہ نوآبادیاں قائم ہوگیئں (برطانوی راج سے "بغاوت" کے یہ ضلعی مرکز پٹنہ کے مرکز سے باقاعدہ خط و کتابت رکھتے تھے" ــــ پھر حکومت برطانیہ نے مردم شماری رپورٹ ۱۹۱۱ء جلد پنجم میں اعتراف کیا کہ ــــ " ۱۸۳۱ء سے ۱۸۶۸ء میں (حکومتِ برطانیہ کے خلاف) پٹنہ سازش کا مرکز تھا (تحریک مجاہدین کے) وہابی مبلغین ہندوستان اور دوسرے قریب کے ملکوں میں اپنے مشن کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ان کے لیڈر ولایت علی نے بنگال کے اضلاع مالدہ ، بوگرہ ، راج شاہی ، پٹنہ ، ندیا ، اور فرید پور میں اپنی کوششیں صرف کیں۔ پھر ان کے خلیفہ زین العابدین نے چیرا اور سلہٹ (آسام) میں کام کیا۔ معمولی مبلغین کا کیا ذکر کہ ان کی تعداد بے شمار تھی۔ اس طرح ان کے مبلغ چپہ چپہ میں پھیل گئے۔"[1]

عیسائی پادریوں کا حملہ

انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند پر قبضہ کرنے کے بعد اس کی "روحانی تسخیر" کے لئے عیسائی

---

[1] مسعود عالم ندوی "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" (طبع پنجم) لاہور ۱۹۷۹ء۔ صہ ۱۰۶-۱۰۸

پادریوں کا لشکر جرار بھی در آمد کیا ... ان پادریوں کے حملے کا اصل نشانہ اسلام تھا کیونکہ یہ حکمران قوم کا دین تھا، دوسرے یہ کہ اسلام اپنے پیروؤں کو انگریز کی غلامی پر رضامند نہیں ہونے دیتا تھا مسلمان علماء نے اس طاغوتی فوج کا جس طرح مقابلہ کیا وہ علماء کی دستارِ فضیلت کا ایک طرۂ امتیاز ہے[1]۔

ہندوؤں کا فکری حملہ

ہندوؤں میں جس شخص نے ہندو ازم کے احیاء کی تحریک کا آغاز کیا، اس کا نام راجہ رام موہن رائے تھا۔ جو جنگ پلاسی سے تیرہ برس قبل پیدا ہوا۔ اس نے اپنی زندگی میں بنگال میں ہندومت کے لئے ذہنی و سیاسی انقلاب کے لئے ایک فکری ٹیم تیار کی جنہوں نے مختلف میدانوں میں تخصص حاصل کیا، مثلاً کرسٹو داس پال (احتجاجی سیاسیات)، ہریش چندر مکھرجی (صحافت و ادب)، کیشب چندر سین (روحانیات)، سوامی ویویکانند (اخلاقیات)، ایشور چندر ودیا (تمدن و تہذیب)، بنکم چندر چیٹرجی (ادب) وغیرہ ان لوگوں نے یورپ کے سیاسی مفکرین سے تصور قومیت لیا اور بنگلہ قومیت کا صور پھونکا۔ مغرب کے فکری حملے سے اپنے کو بچانے کا اہتمام بھی کیا اور ہندومت کے احیاء کے لئے خدمتِ خلق اور ایثار و قربانی کی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے علی گڑھ کی مانند مغرب کی محض نقالی نہیں کی[2]

کلکتہ یونیورسٹی کا قیام

جنوری ۱۸۵۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی (بنگال) کی بنیاد رکھی گئی۔ اس پر روزِ اول سے ہندوؤں کا قبضہ رہا۔ اسی دوران جب آشوتوش مکرجی یہاں کے وائس چانسلر ہوئے تو انہوں نے ہندوئیت کو بنگالیت کی بوتل میں بند کر کے بنگالی ہندوؤں کو ایک نئے سخن کی شراب پلائی۔

---

[1] علی احمد خان "بنگال کے سیاسی حالات" لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۹۰

[2] ایضاً صفحہ ۱۲-۱۰

اپنی وائس چانسلری کے دور میں انہوں نے بنگلہ زبان کو لازمی زبان کی حیثیت دے دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈگری حاصل کرنے والے ہر شخص کے لئے اس لٹریچر کا مطالعہ لازمی ہوگیا جو کہ ان ہندوؤں کے مشنری اسپرٹ کے تحت لکھا ہوا تھا جو ہندو مذہب اور کلچر کے دلدادہ تھے۔ ان لوگوں نے انقلاب فرانس کی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگلے مرحلہ میں انجمن سازی کا کام شروع کیا جو پورے ہندوستان میں ہندوؤں کی فکری و عملی پیش رفت میں ہراول دستہ ثابت ہوا۔

انگریزوں کا ہندو نواز رول

۱۸۶۹ء میں بنگال کے سرکاری محکموں میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا یہ عالم تھا:

	ہندو	مسلمان
اسسٹنٹ انجینیئر	۱۴	صفر
پبلک ورکس سب انجینیئر	۲۴	۱
اوورسیئر	۶۳	۲
اکاؤنٹس آفیسر	۵۰	صفر
ورکس ڈیپارٹمنٹ اکاؤنٹنٹ	۵۴	صفر
۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک وکلاء جن کو لائسنس ملا	۲۳۹	۱

انگریز خود اعتراف کرتے ہیں "مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے تحت سب سے زیادہ نقصان یہیں (بنگال) اٹھایا"[1]

مسلمانوں میں تعلیمی بیداری

ہندوؤں کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی دباؤ کو ختم کرنے کے لئے نواب عبداللطیف ——

[1] ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ ایضاً ۔ ص۔ ۲۳۲

(۱۸۹۳ء ۱۸۲۸ء) نے ۱۸۶۲ء میں محمڈن لٹریری سوسائٹی قائم کی اور سید امیر علی (۱۹۲۸-۱۸۴۹ء) نے ۱۸۷۷ء میں سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی تاکہ بنگال کے مسلمانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ انہوں نے ان کی اجتماعی امور میں رہنمائی کی اور ان کی سماجی و سیاسی نشاۃ ثانیہ کا کام شروع کیا۔ اسی دور میں محسن الملک، وقار الملک اور سلیم اللہ جیسے مدبرین پیدا ہوئے۔ نواب سلیم اللہ نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کی طرف توجہ کی۔ جب کہ دوسری جانب انگریز مطمئن اور ہندو مسرور تھے کہ انہوں نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں پیچھے دھکیل دیا ہے۔

تقسیم بنگال

بنگال پہلے روز ہی سے انگریزوں کے لئے مسلسل مشکلات کا باعث تھا اس لئے ۱۹۱۱ء تک کلکتہ کو انگریزوں نے برطانوی ہند کا دار الحکومت رکھا، حالانکہ یہ علاقہ ہندوستان کے وسط میں نہ تھا۔ اصل سبب یہ تھا کہ یہاں کے لوگوں کی سیاسی بیداری، دینی ذوق، خداداد ذہنی قابلیت اور تنظیمی شعور نے انگریزوں کو مسلسل پریشان رکھا۔[1] . . . . . ہندو مسلم محاذ آرائی نے بھی مسلمانوں کو سیاسی بخشی عطا کی۔ ویسے بھی بنگال مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ تھا۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق پورے ہندوستان میں چار کروڑ دس لاکھ مسلمان تھے۔ جب کہ ان میں سے ایک کروڑ اٹھتر لاکھ ترسٹھ ہزار مسلمان صرف بنگال کے رہنے والے تھے۔ گویا کہ بنگال مدتوں سے مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔

انگریز وائسرائے لارڈ کرزن نے فی الحقیقت اپنی انتظامی و سیاسی مصلحت سے ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بلاشبہ اس تقسیم سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کا امکان پیدا ہوا تھا، لیکن ہندوؤں نے ہنگامہ آرائی شروع کردی۔ ۷ راگست ۱۹۰۵ء کو مہاراجہ منندر چندر نندی نے ایک احتجاجی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا "نئے صوبے (مشرقی بنگال) میں مسلمانوں کی آبادی عظیم تر ہے اور بنگالی ہندوؤں کی تعداد محدود تر ہے، اس طرح ہم اپنی سرزمین پر اجنبی بن جائیں گے اور

1– Hummera Momen "Muslim Politics in Bengal of 1937" (Dhaka, 1972) ص ۹،۸

خدشہ ہے کہ ختم ہو جائیں گے۔[1] ..... جب کہ تقسیم کی اسکیم شائع ہوئے اور اس قانون کے نفاذ کی تاریخ ۱۶ ارا کتوبر ۱۹۰۵ء کو نواب سلیم اللہ بہادر نے ڈھاکہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا اس تقسیم نے ہماری بے عملی رفع کردی ہے اور ہم کو جدوجہد کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔[2]

انہی دنوں سید امیر علی نے مسلمانوں کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ان کی قیادت میں شملہ کے مقام پر وائسرائے لارڈ منٹو سے ایک وفد نے ملاقات کی اور پہلی مرتبہ قانون ساز کونسلوں میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ بیّن طور پر دو قوموں کی حقیقت کے احساس پر مبنی تھا۔[3]

" ادھر کلکتہ میں ہندوؤں نے تقسیم کے اس فیصلے پر سخت شورش کی۔ کانگریس نے اپنے طریقے پر ہندوستان گیر ایجی ٹیشن کیا۔ بنگالی ہندوؤں نے بڑے پیمانے پر تشدد کا راستہ اپنایا، انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا، بم اور پستول سے حملے کئے۔ ملکی مال کی ترویج کی، وہ جوش میں دیوانے ہو گئے تھے، مگر سب کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ اس تقسیم سے مسلمانوں کو نفع پہنچنے کا امکان پیدا ہوا تھا۔ کانگریس کی یہ شورش سوائے فرقہ وارانہ عداوت، تعصب، حرص کے اور کچھ نہ تھی اس تحریک (تنسیخِ تقسیم بنگال) کے پس منظر میں ہندوانہ مذہبی جوش و جنون کا سخت ہنگامہ تھا... (اس زمانہ میں) ہندوؤں میں جوش تھا کہ ویدوں کے مطابق ہندو مذہب کی تجدید کی جائے شیواجی مرہٹہ کو قومی ہیرو بنا کر پیش کیا اور ہندوؤں نے اپنی تمام مذہبی تحریکوں کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیر دیا ......

تقسیم بنگال کے خلاف کانگریس کا ایجی ٹیشن اور حکومت برطانیہ کا مجموعی طور پر ہندو نواز رویہ دیکھ کر محسن الملک نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ محسن الملک نے رفقاء کے مشورے سے مسلمانوں کے سیاسی اغراض و مقاصد کی ترقی، نگرانی

1– Ibid (All about Partition – Calcutta, 1905). صہ ۸۸

۲۔ سید حسن ریاض "پاکستان ناگزیر تھا" کراچی یونیورسٹی ۱۹۷۰ء صہ ۴۹

۳۔ سید نور احمد۔ "مارشل لاء سے مارشل لاء تک" لاہور ۱۹۶۷ء صہ ۱۵

حفاظت اور تقویت کے لئے ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ کے اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس (جسے دسمبر ۱۸۸۶ء میں سر سید احمد خانؒ نے اس غرض سے قائم کیا تھا کہ عام مسلمانوں کو تعلیمی مسائل میں بصیرت حاصل ہو۔) میں مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کیا۔ اس تاسیسی اجلاس میں نواب سلیم اللہؒ (ڈھاکہ) سید نواب علی چودھریؒ (بوگرہ بنگال) جسٹس شاہ دینؒ (لاہور) مولانا ظفر علی خانؒ (لاہور) اور مولانا محمد علیؒ جوہر شریک تھے[1]

تقسیم کے خلاف ہندوؤں کی تحریک چلتی رہی بالآخر مسلمانوں کے ساتھ کئے گئے تمام وعدوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خود شاہ انگلستان نے دسمبر ۱۹۱۱ء کو تنسیخ تقسیم بنگال کا اعلان کر دیا اور اب ہندو فاتحانہ شان کے ساتھ بنگال کے ہر شعبہ زندگی پر مسلط ہو گیا۔

مسلمانوں کی تعلیم اور ہندو

ہندو مسلمانوں کی کسی بھی ایسی کوشش یا امکان کو پسند نہ کرتے تھے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ اور اجتماعی امور میں ترقی ہو سکے۔ اسی لئے جب ۱۹۲۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو ہندوؤں نے اس اعلان کی سخت مخالفت کی، لیکن جب یہ یونیورسٹی بن گئی تو تمام اہم شعبہ جات پر ہندو پروفیسر قابض ہو گئے اور اس مقصد کے لئے انگریزوں نے ان سے بھرپور تعاون کیا۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بعد ہندوؤں نے اپنے "مشن" کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے بڑی تیزی کے ساتھ ضلعی صدر مقامات سے لے کر تحصیل ہیڈ کوارٹرز تک اپنے کالج کھولے، جن کی تعلیمی پالیسی پر کلکتہ یونیورسٹی کا ہندو رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ہندو دانشوروں نے طے کر لیا تھا کہ وہ مستقبل میں اپنے عزائم کی تکمیل مسلمانوں کو فکری اعتبار سے "شدھ" کر کے حاصل کریں گے، چنانچہ ان درس گاہوں میں ہندو نظریات اور ہندو کلچر کی بڑے غیر محسوس طریقے سے تبلیغ ہوتی۔ چونکہ تدریس و انتظام کے شعبہ پر ان ہی کا سکہ چلتا تھا اس لئے اس صورت حال پر حساس مسلمان طلبہ سوائے کڑھنے کے کچھ نہ کر

[1] سید حسن ریاض — ایضاً — ص ۴۸ ، ۵۵

سکے۔ اس طرح پڑھے لکھے طبقے کو اپنی ذہنی غلامی میں جکڑنے کا اقدام شروع ہوا۔

تحریک پاکستان کا آغاز

ردعمل کے طور پر مسلمانوں نے سیاسی میدان میں تو ہوشمندی سے کام شروع کیا، مگر اس ملک کو ہندو تعلیم کا پانی تحلیل کئے جا رہا تھا۔ ۱۹۳۶ء کے انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ اور مولوی فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اگرچہ الیکشن کے بعد دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا اور فضل الحق مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ پھر انہوں نے ہی ۲۳، مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد لاہور پیش کی۔

"تحریک پاکستان[1] دیکھتے ہی دیکھتے زور پکڑ گئی۔ عوام نے بھی جوش و ولولے سے کام کیا اور قیادت نے بھی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ یہ تحریک بنیادی طور پر اسلام کے نام پر اٹھائی گئی تھی، لیکن بدقسمتی سے اس تحریک کے اکثر قائدین اسلامی تعلیمات سے نہ صرف یہ کہ ناواقف تھے بلکہ مثبت طور پر مغربی تہذیب کے فکری اور ظاہری عناصر ترکیبی کے دلدادہ بھی تھے یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نہ تو اسلامی تعلیمات کو حکیمانہ انداز میں پیش کر سکے اور نہ اپنے کارکنوں اور قیادت کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہندو ذہن نے جب سیاسی سطح پر اسلامی تعلیمات کے چرچے کے پس منظر میں اپنے کو خطرے میں پایا تو جلد ہی ہندو کی دانش مندی اور فضل الحق کی طبیعت کے لہری پن میں رشتہ جڑ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فضل الحق نے مسلم لیگ کو طاق نسیاں پر رکھ کر ہندو مہاسبھا سے رشتہ جوڑ لیا اور شیام پرشاد مکرجی کے ساتھ مل کر نئی وزارت قائم کر لی۔"[2]

اشتراکی تحریک کی برصغیر میں آمد

چونکہ زیر نظر قضیے میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم فکر اور حکمت عملی کو بڑا گہرا دخل حاصل ہے اس

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "پاکستان ناگزیر تھا" حسن ریاض، ظہور پاکستان، چودھری محمد علی اور ماہنامہ "چراغ راہ" "نظریۂ پاکستان نمبر" پروفیسر خورشید احمد: "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" حصہ اول، دوم، ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔

[2] چودھری علی احمد خان "بنگال کے سیاسی حالات۔ منظر و پس منظر"۔ لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۲۵، ۲۸

لئے یہاں پر اس پارٹی کے پس منظر اور ارتقاء کے بارے میں مسٹر فلپ اسپراٹ (کمیونزم اینڈ انڈیا) کے مطالعے کو پیش کیا جارہا ہے:" ۱۹۲۰ء میں ایم۔ این رائے کو بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹی کی مجلس منتظمہ کا رکن نامزد کیا گیا تھا جنہوں نے متعدد کتابچے لکھے، ہفتہ وار اور ماہانہ جرائد نکالے۔ ان کی شب و روز کوشش سے پانچ سال بعد کمیونسٹ پارٹی قائم ہوگئی۔ جس کے دو سال بعد مزدور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۳۰ء تک اشتراکی تعلیمات سے متاثر کچھ متمول اور ذلین اہل دانشور بھی میسر آگئے جن کی مدد سے اسے دانشوروں کے طبقے میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ برصغیر پاک و ہند کی جدوجہد آزادی میں یہاں کی کمیونسٹ پارٹی نے کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا، بلکہ بعض اقدامات کی بنا پر وہ قومی تحریک آزادی سے الگ رہی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ مذہبی فرقہ واریت کی علمبردار اور مقامی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے اٹھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹی کے خیالات سے متاثر افراد تحریک خلافت سے الگ رہے اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے تحریک ترکِ موالات سے کوئی دلچسپی نہ لی، سول نافرمانی تحریک کی مخالفت کی، ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس میں حصہ لینے والے پولیس افسران کی مخبری کی، سبھاش چندر بوس اور جے پرکاش نارائن کو پھانسی دینے کا مطالبہ کیا اور ایسے نازک وقتوں میں کسانوں کو اشتعال دلا کر خون خرابہ کیا۔[1]

بنگال مسلم لیگ پر اشتراکی اثرات

بدقسمتی سے بنگال کی مسلم لیگ کئی گروپوں میں بٹی ہوئی تھی۔ حسن اصفہانی، حسین سہروردی اور خواجہ ناظم الدین کے درمیان شکوک و شبہات تھے، دوسری جانب اشتراکی عناصر نے آہستہ آہستہ مسلم لیگ پر قبضہ جمانا شروع کر دیا تھا۔ اشتراکی ذہن کے حامل ابوالہاشم جو پہلے بنگال مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔ ۱۹۴۳ء میں بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوگئے۔ انہوں

---

[1] ۔ پروفیسر خورشید احمد "چراغ راہ سوشلزم نمبر" (یعقوب طاہر) کراچی ۱۹۶۷ء، صد ۲۱۷

نے مسلم لیگ کو طبقاتی کش مکش کی راہ پر ڈال دیا اور ہفت روزہ "ملت" کے ذریعے اپنے خیالات کی اشاعت کرنے لگے۔ ان کے اشتراکی رفیقوں نے کلکتہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ انہی دنوں اس صورتحال سے دل برداشتہ ہو کر مولانا محمد اکرم خان (۱۹۶۸ - ۱۸۶۸ء) نے صوبائی مسلم لیگ کی صدارت سے احتجاجاً استعفیٰ بھی دے دیا۔ فروری ۱۹۴۷ء میں ابوالہاشم نے ایک ہندو چندر بوس کے ساتھ مل کر عظیم بنگال کی سکیم تیار کی اس سکیم کی اشاعت پر ۱۰ جون ۱۹۴۷ء کو روزنامہ "ڈان" نے "تھیلے میں سانپ" کے زیر عنوان اداریہ لکھا اور واضح کیا کمیونسٹ، مسلم لیگ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں"۔ آگے چل کر یہ صاحب مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے۔ مگر اپنے جراثیم اور اشتراکی افکار مسلم لیگ کی جڑوں میں پھیلا گئے"۔ "نتیجۃً" پارٹی کے اندر نظریاتی کش مکش آنے والے حالات میں بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئی[1] . . . . واضح رہے بنگال میں کمیونسٹ پارٹی کا کام پورے ہندوستان کی نسبت زیادہ پھیلا ہوا تھا جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مارچ ۱۹۴۴ء میں بھارتی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد ۲۵ ہزار تھی جن میں سے صرف بنگال کے ارکان کی تعداد ۷ ہزار تھی۔[2]

خود جناب سہروردی نے تقسیم (ہندوستان) کی منظوری سے پہلے اس بات کی بہت کوشش کی تھی کہ متحدہ بنگال، پاکستان اور ہندوستان سے الگ ایک تیسری ڈومی نین (خود مختار ریاست) بن سکے (ان کی) اس کوشش میں مسٹر سرت چندر بوس ان کے ساتھ تھے، لیکن یہ تجویز مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے مسترد کر دی تھی۔[3]

مشرقی پاکستان کا قیام

قائداعظمؒ کی زیر قیادت حصول پاکستان کی جدوجہد میں، بنگالی مسلمانوں نے دوسرے صوبوں

---

[1] الطاف حسن قریشی ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" لاہور اگست ۱۹۷۱ء ص ۲۸

2– Bangwan Josh "Communist Movement in Punjab 1927–47" ص ۱۸۸

[3] سید نور احمد ––– ایضاً ––– ص ۳۲۶

سے مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ جوش اور سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ انگریز اور ہندو کے جبر و استبداد نے بنگال کے مسلمانوں میں یہ احساس شدت سے پیدا کر دیا کہ سیاسی و معاشی استحصال سے بچنے اور اپنے تہذیب و تمدن کو بچانے کے لئے ایک الگ اور آزادانہ خطۂ زمین بیحد ضروری ہے چنانچہ اس احساس کی بدولت ۱۹۴۶ء کے انتخابات [1] میں جو کہ پاکستان پر ریفرنڈم کی حیثیت رکھتے تھے۔ ۹۶ فی صدی بنگالی مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے۔ مسلم لیگ کو ان انتخابات میں جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ بنگال کے مسلمان عوام کے صحیح جذبات کا مظہر تھی۔ مسلم لیگ نے آسام کی چونتیس نشستوں میں سے اکتیس جیت لیں اور بنگال کی ایک سو اکیس میں سے ایک سو انیس پر شاندار کامیابی حاصل کی۔ یاد رہے کہ مسلم لیگ کو یہ شاندار کامیابی ہندوؤں کی شدید مخالفت اور مقامی مسلم قیادت کی ذہنی و فکری کشمکش کے باوجود حاصل ہوئی۔ بنگالی مسلمانوں کی پاکستان سے یہ والہانہ محبت کسی جذباتی یا وقتی وابستگی کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مسلم بنگال کے عوام نے انگریز اور ہندو کے ظلم و ستم کا دوسرے تمام صوبوں کی نسبت زیادہ مقابلہ کیا تھا اور جب منزل متعین ہوگئی اور رہنمائی میسر آئی تو پھر وہ دیوانہ وار منزل کی جانب چل پڑے اور راستے کی مشکلات ان کا راستہ نہ روک سکیں۔ اور پاکستان بن گیا۔ مشرقی بنگال اور سلہٹ باہم ملا دیئے گئے۔ مگر یہاں بھی پنجاب کی غیر منصفانہ تقسیم کی مانند انگریزوں نے ڈنڈی ماری اور کلکتہ کو مغربی بنگال میں شامل کر دیا۔

تقسیم ہند کے اس مرحلہ میں ہندوؤں اور سکھوں نے نہ صرف پنجاب میں بلکہ بہار و بنگال میں بھی مسلمانوں کے قتل عام کی دہشت ناک کارروائیاں کیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پوری تحریک پاکستان میں مسلمانوں

---

[1] ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں پورے پاک و ہند میں ۲،۰۴۰،۱۹۱،۶۲ مسلمانوں نے ووٹ کا حق استعمال کیا۔ جن میں سے ۴،۶۲۰،۹۷۰،۶۹ ووٹ مسلم لیگ نے حاصل کئے جب کہ باقی ووٹ کانگریس سمیت ۱۹ پارٹیوں یا آزادانہ امیدواروں میں تقسیم ہوئے۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ نے پورے ہندوستان سے ۵۲۱ امیدوار کھڑے کئے جن میں سے ۵۰۳ امیدوار کامیاب ہوئے۔ (مرتب)

کو تشدد کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ پورے برصغیر میں مسلمانوں کی کوئی انجمن نہیں تھی جیسی ہندوؤں کی راشٹریہ سیوک سنگھ جیسے سکھوں کی اکالی دل۔ مسلمانوں نے اپنے جذبات میں اس گندگی کو کبھی داخل ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ہندوؤں یا سکھوں کو قتل کریں، اگر مسلمان ایسے متعصب اور ظالم ہوتے تو ہندوؤں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے وہ سات صدیاں ان کے لئے بہت کافی تھیں۔ جن میں وہ ہندوستان کے مطلق العنان حاکم رہے۔ ـلہ

ـلہ سید حسن ریاض "پاکستان ناگزیر تھا" کراچی یونیورسٹی ۱۹۷۰ء ص ۵۳۹ - ۵۴۰

۱۸

مشرقی پاکستان؟

لاؤ تو قتل نامہ مرا مَیں بھی دیکھ لُوں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہُوئی
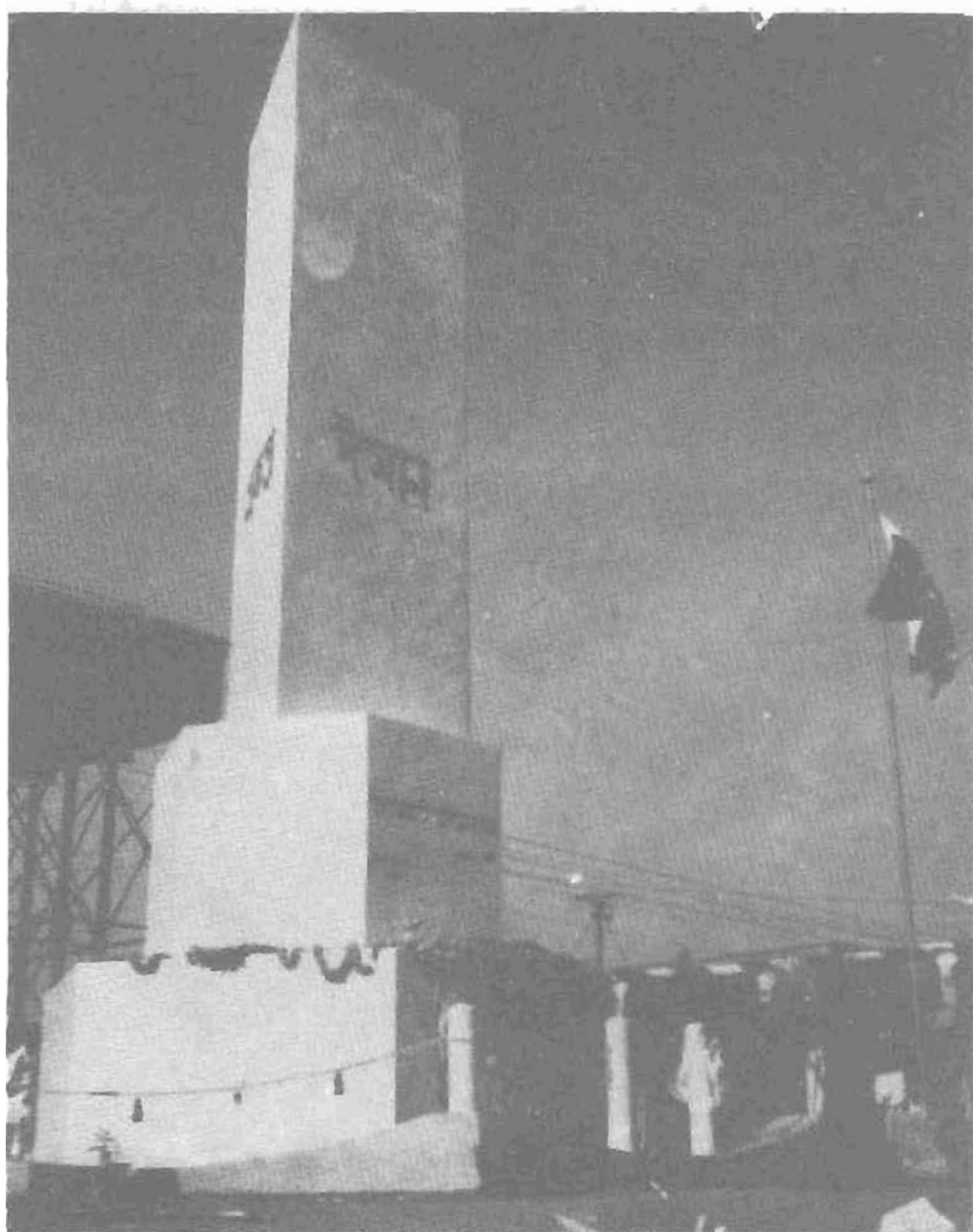
یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کسی مقبول عوامی تحریک آزادی کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مشرقی پاکستان کے عام لوگ علیحدگی چاہتے تھے۔ اسی طرح اس سانحے کو محض صدر جنرل یحییٰ خان کی حماقتوں، شیخ مجیب اور مسٹر بھٹو کی سازشوں یا صرف بھارت، روس اور امریکہ کے "منصوبوں" سے وابستہ کر دینا بھی یک رُخے مطالعے کے مترادف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس المیہ کے ڈراپ سین کے وقت اسٹیج پر یہی کردار موجود تھے، لیکن اس کہانی کی ڈرامائی تشکیل اور اس کے اسٹیج کی تیاری میں ہمارے حکمرانوں اور طالع آزما سیاستدانوں نے بقدر توفیق حصہ لیا۔

گویا "بنگلہ دیش" کا قیام کوئی اتفاقی یا حادثاتی واقعہ نہیں تھا، بلکہ ایک طویل منفی اور اجتماعی عمل تھا جو حماقتوں اور نااہلیوں سے لکھی ہوئی داستان کا المناک منطقی انجام تھا۔ دراصل سیاسی، خارجہ، تعلیمی اور معاشی منصوبے، سیاسی عمل کے عناصر ترکیبی ہوتے ہیں۔ انہی عناصر ترکیبی میں عدم توازن دیکھتے ہوئے بعض اہل نظر نے پیش گوئی کی تھی کہ "اگر پاکستان میں سیاسی عمل یونہی بے ڈھب جاری رہا تو پاکستان کا یہ (مشرقی) حصہ علیحدہ ہو کر رہے گا۔" اس خدشے کی بنیاد دراصل ٹھوس، بے لاگ اور غیر جذباتی تجزیہ تھا۔ مگر عوام کو یہ واقعہ اچانک اور غیر متوقع اس لئے لگا کہ ان کے سامنے حالات کی صحیح تصویر نہیں تھی۔ بات تلخ سہی، مگر امر واقعہ یہ ہے کہ ہماری سیاسی قیادت، اصحاب علم اور اہل قلم، اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں مجرمانہ غفلت کا شکار رہے۔ اور اگر کسی دیدہ ور نے آنے والے طوفان سے آگاہ کیا بھی تو اس کی بات سنی ان سنی کر دی گئی[1]

---

[1] پروفیسر طاہر امین "قومی سالمیت کے تقاضے" (۱۹۸۰ء) ص ۷-۸

ہمارے نزدیک اس عظیم المیہ کے اسباب کو تین عنوانات[1] کے تحت مرتب کیا جا سکتا ہے :-

— اوّلاً، وہ اسباب جن کا تعلق پاکستان کی نظریاتی تشکیل میں ناکامی سے ہے۔

تحریک پاکستان کے قائدین کے پاس نئی ریاست کی تعمیر کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور آئی وہ اس نظریہ سے ہی منحرف ہو گئے جس کی بنیاد پر پاکستان کی عمارت استوار ہوئی تھی اور بعد میں آنے والوں پر فقط ہوس جاہ اور حصول اقتدار کا جذبہ غالب رہا۔ عوام کو بنیادی حقوق اور شرکت اقتدار سے محروم کیا گیا، نتیجتاً بیوروکریسی نے اقتدار پر شب خون مارا اور ۱۹۵۸ء میں فوج نے اقتدار کو فتح کر ڈالا۔ اس پورے عرصہ میں (۱۹۴۹ء تا ۱۹۷۱ء تک) جاگیردارانہ سیاست اور وڈیرہ شاہی کی سرپرستی کی گئی۔ چنانچہ بتدریج مراعات یافتہ طبقوں (Privileged Classes) اور عام لوگوں کے درمیان سیاسی اور معاشی تفریق بڑھتی گئی۔ اس پورے عرصے میں ملک کی نظریاتی تشکیل اور نشوونما کے لئے کچھ نہ کیا گیا، بلکہ دیدہ و دانستہ ابہام پیدا کیا گیا۔ ظاہر ہے نظریاتی انتشار، معاشی ناانصافی اور سیاسی جبر و تشدد کا نتیجہ عمل معکوس کی صورت میں ہی نکل سکتا تھا، سو وہ نکلا۔

— ثانیاً، وہ اسباب جن کا تعلق ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک جنرل یحییٰ کی فوجی حکومت اور ان کے لعل سیاسی حلیفوں اور مشیروں سے ہے۔

اس دوران پاکستان اخلاقی اور سیاسی ہی نہیں بلکہ عسکری اور خارجی طور پر بھی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا گیا۔ غلط سیاسی فیصلے اور غلط سیاسی عناصر کی حوصلہ افزائی نے پاکستان کو نہایت تیزی کے ساتھ اس دہانے پر پہنچایا۔ یوں لگتا تھا کہ مشرقی پاکستان کو دھکے دے دے کر ہندوستان کی گود میں ڈالا جا رہا ہے۔

— ثالثاً، وہ اسباب جن کا تعلق بیرونی طاقتوں کے کردار سے ہے۔

---

[1] پروفیسر خورشید احمد، پاکستان، بنگلہ دیش اور جنوبی ایشیا کا مستقبل، ص ۵۲-۵۷۔

اپنے اپنے مقاصد کے لئے ہندوستان، روس اور امریکہ علیحدگی کے اس عمل میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ ہندوستان نے اپنے "عمل" کا آغاز تقسیم برصغیر کا اعلان (۳جون ۱۹۴۷ء) ہوتے ہی کر دیا تھا۔ جب کہ دونوں سپر طاقتوں نے اپنا رول اپنی حکمت عملی اور منصوبہ بندی کے تحت مقررکردہ اوقات میں ادا کرنا شروع کیا۔ لیکن اس سازش کا فوری فائدہ ہندوستان نے اور طویل المیعاد فائدہ روس نے اٹھایا۔

آئندہ صفحات میں ہم انہی مذکورہ بالا عنوانات پر گفتگو کریں گے۔

تقسیم ہند کے وقت پاکستان

پاکستان متحدہ ہندوستان کے ان علاقوں میں قائم ہوا جہاں کے مسلمان اکثریت میں ہونے کے باوجود تعلیم، تمدن، صنعت، تجارت، سرکاری ملازمتوں اور سیاسی شعور کے اعتبار سے بہت پیچھے تھے۔ برعظیم ہند کے جو علاقے مسلمانوں کی تہذیب کے اصل مرکز تھے اور جہاں کے مسلمانوں نے ہر لحاظ سے کافی ترقی کر لی تھی وہ سب بھارت میں چلے گئے۔

مشرقی پاکستان میں زندگی کے ہر میدان میں ہندو چھائے ہوئے تھے۔ تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ کارخانوں اور صنعتوں کے وہ مالک تھے اور مسلمان ان کے ماتحت صرف مزدور اور کاریگر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ حکومت کی بڑی اور قابل ذکر ملازمتوں پر زیادہ تر بلکہ تمام تر ہندوؤں ہی کا قبضہ تھا اور زمینداری بھی انہی کی تھی۔ مسلمانوں کو ان کے مزارعین یا کمین سے بڑھ کر کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔

مغربی پاکستان کے مسلمان بھی کچھ بہتر حالت میں نہ تھے۔ وہاں کا سب سے بڑا صوبہ پنجاب تھا۔ اس پر انگریزوں سے پہلے سکھوں کا تسلط تھا۔ سکھوں نے اپنے دور میں مسلمانوں کو جس طرح مٹانے، ذلیل اور رسوا کرنے کی کوشش کی، اس کا حال تاریخوں میں پڑھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ اس "بازوئے شمشیر زن" نے سکھوں کے ہاتھوں یہ ذلت اور رسوائی کس طرح اٹھائی۔ سکھوں کے بعد انگریزوں کا تسلط ہوا۔ انہوں نے جن سکھوں سے لڑ کر

پنجاب کی حکومت حاصل کی تھی، وہ بہت جلد ان کے محبوب بن گئے اور انہیں انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھایا۔ لیکن مسلمانوں کو انہوں نے ہر میدان میں پسماندہ رکھنے اور پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ پنجاب کی ساری تجارت اور صنعت پر ہندوؤں اور سکھوں کا قبضہ تھا۔

پنجاب کے اگر کسی علاقے کے مسلمان تعلیم اور ترقی یافتہ تھے تو زیادہ تر وہ مشرقی پنجاب کا علاقہ تھا جو تقسیم کے وقت بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ مغربی پنجاب میں چند اضلاع کو مستثنیٰ کر کے باقی پورے علاقے کو انگریزوں نے ایک منصوبہ کے تحت تعلیم و تمدن، سیاسی بیداری اور مادی ترقی کے میدان میں پیچھے رکھا تاکہ انہیں اپنی فوج کے لئے سستے سپاہی ملتے رہیں۔

سندھ اور بلوچستان کی حالت پنجاب سے بھی بدتر تھی۔ سندھ ، جس پر مسلمانوں نے اپنے آخری دور تک حکومت کی، اس میں تقسیم کے وقت مسلمانوں کی حالت دیکھ کر کوئی بھی یہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ اس قوم نے کبھی اس علاقے میں حکومت کی ہوگی۔ وہاں کی زندگی کے ہر شعبے پر ہندوؤں کا تسلط تھا اور بلوچستان کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ رہا صوبہ سرحد تو وہاں کے مسلمان بھی تعلیم، صنعت و تجارت ہر چیز میں اتنے ہی پسماندہ تھے جتنے کہ دوسرے علاقوں کے لوگ۔[1]

مہاجرین کی خدمات اور غلطیاں

جب پاکستان بنا تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے مسلمان ہرگز اس قابل نہ تھے کہ وہ اپنے بل بوتے پر اس عظیم مملکت کا نظام چلا سکتے۔ اس وقت مملکت کو سنبھالنے کے لئے درحقیقت ایسے افراد کی ضرورت تھی جو حکومت کے نظم ونسق، ملک کی تجارت، صنعت و حرفت، تعلیم اور دوسرے اجتماعی اداروں کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتے ہوں اور ایسے افراد بیشتر ان علاقوں

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ "مشرقی پاکستان ، حالات و مسائل کا جائزہ اور اصلاح کی تدابیر" (۱۹۵۶ء) ص ۶ ، ۷

بھی تھے جو بھارت میں رہ گئے تھے۔ یہ دراصل ہندوؤں کی "عنایت" تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کو زبردستی نکال کر پاکستان بھیجا۔ اگرچہ یہ لوگ بڑے ہولناک مظالم سے دو چار ہوئے اور سخت مصائب سے گزر کر یہاں پہنچے، لیکن یہی چیز آخر کار پاکستان کے لئے رحمت ثابت ہوئی۔ اگر دہلی، یوپی، بمبئی، کلکتہ، حیدر آباد، مدراس اور دوسرے مقامات کے مسلمان پاکستان پہنچ کر ملک کی صنعت، تجارت اور ملکی نظم ونسق کو نہ سنبھالتے تو اس نئی سلطنت کا خیریت کے ساتھ چلانا غیر ممکن تھا۔ حقیقی صورت حال اگر سامنے ہو تو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہے گا کہ جس طرح پاکستان کا بننا اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کی قربانیوں کا نتیجہ تھا اسی طرح اس کا چلانا بھی انہی کی کوششوں کا رہین منت ہے، لیکن سخت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہجرت کرکے آنے والے مسلمانوں کی خدمات اگر ایک طرف قدر کی مستحق ہیں تو دوسری طرف ان کی غلطیاں بھی کچھ کم نہ تھیں[1] اور بڑی حد تک اس "تلخی" کا موجب ہوئیں جو خصوصیت کے ساتھ مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئی۔

جو لوگ مشرقی پاکستان سرکاری افسروں کی حیثیت سے گئے ان کی ایک اچھی خاصی تعداد نے وہاں کچھ اچھا رویہ اختیار نہ کیا۔ انہوں نے انگریز کی چھوڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اپنے آپ کو انگریز سمجھ لیا۔ انہوں نے انگریز کے اس طرز عمل کی نقل اتاری جو وہ غیر قوم پر دست کرنے کے لئے اختیار کرتا تھا۔

یہ وہ سب سے بڑا سبب ہے جس نے چند سال کے اندر مشرقی پاکستان کے عام باشندوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ ان کو ایک نوآبادی (Colony) بنا کر رکھا گیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ لوگ چونکہ اردو بولنے والے تھے اور مشرقی پاکستان کے عام باشندے اردو کو مغربی پاکستان کی زبان سمجھتے تھے اس لئے وہاں کے عوام نے سمجھا کہ اصل پاکستان مغربی پاکستان ہے اور ہم اس کی ایک کالونی بنا دیئے گئے ہیں۔

آگ پر تیل کا کام ہمارے بعض مغرب زدہ افسروں کی فرنگی تہذیب نے کیا۔ مشرقی پاکستان

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ ایضاً — ص ۸ - ۱۰

میں جو لوگ انگریزی حکومت میں خاصے بڑے عہدوں پر بھی پہنچے۔ انہوں نے مذہبیت نہ چھوڑی تھی۔ ان لوگوں کی آنکھیں ایسے مسلمانوں کو دیکھنے کی عادی نہ تھیں جو بالکل انگریزیت میں غرق ہوں، مگر ہمارے "صاحب لوگوں" نے یہاں آکر اسلامی تہذیب و شائستگی کے سارے بند توڑ دیئے اور ان ساری قدروں کو سر بازار رُسوا کرنا شروع کر دیا جو مسلمانوں کو عزیز تھیں۔ یہ چیزیں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں میں مایوسی پیدا کرنے کی موجب بھی ہوئیں۔ اور نفرت پیدا کرنے کی بھی۔ ان کا عام احساس یہ تھا کہ یہ گورے انگریزوں کی جگہ کالے انگریزوں کی حکومت ہے جو ان پر اچانک مسلط ہو گئی ہے۔

عام مہاجرین نے بھی مشرقی پاکستان میں جو روش اختیار کی وہ صحیح نہ تھی[1] یہ لوگ جانتے تھے کہ یہاں وہ آگئے ہیں اب یہی ان کا وطن ہے، ان کی واپسی کی کشتیاں جل چکی ہیں، ان کے لئے کوئی اور ٹھکانہ باقی نہیں ہے۔ ان کو چاہیئے تھا کہ یہاں کے عام مسلمانوں میں گھل مل کر جلد ہی ان کے ساتھ یک جان ہو جاتے۔ ان کی زبان سیکھتے، اپنے اور ان کے درمیان اجنبیت اور بیگانگی کا کوئی نشان باقی نہ رہنے دیتے۔ مگر افسوس کہ انہوں نے ایسا نہ کیا۔ انہوں نے اپنا الگ وجود باقی رکھنے کی کوشش کی، اپنی الگ تنظیم کی، اپنے ساتھ مہاجرین کا نام اور احساس چسپاں کر لیا۔ اپنے حقوق کے لئے چیخ و پکار کی اور بعض لوگوں نے اپنے تہذیبی تفوق (Superiority) کا فخر جتانے میں بھی تأمل نہ کیا۔ ان باتوں کا فطری نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ جواب میں ایک دوسرا تعصب تیزی سے اُبھر آتا۔

ہجرت کر کے جو تاجر اور کارخانہ دار آئے ان کا یہ فرض تھا کہ اس ملک کو اپنا ملک اور اس قوم کو اپنی قوم سمجھتے ہوئے اپنے پسماندہ بھائیوں کو سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرتے ان کو صنعت اور تجارت میں آگے بڑھنے کے قابل بناتے۔ لیکن افسوس کہ ان میں سے اکثر لوگوں نے اپنے اس فرض کو نہ پہچانا۔ انہوں نے اپنی قوم کو لوٹنا شروع کر دیا۔ بلیک مارکیٹنگ اور ذخیرہ اندوزی میں نام پیدا کیا۔ کم سے کم محنت اور سرمائے سے زیادہ سے زیادہ دولت

---

[1] ایضاً ـــــ ص ۱۰

سیٹنے کی کوشش میں تو یہ ہندوؤں سے بھی بازی لے گئے۔ مگر اس فیاضی میں ہندو کی نقل نہ اتاری جو وہ قومی ادارے قائم کرنے اور چلانے میں دکھاتے تھے۔ یہ لوگ اس بات کو بھول گئے کہ ان کی خوش حالی تنہا ان کی قابلیت اور محنت و سرمائے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں ساری قوم اور اس کے سرمائے کا بھی حصہ ہے اس لئے ان کے نفع میں سے قوم کو بھی حصہ ملنا چاہیئے اسی وجہ سے عام لوگوں میں ان طبقات (Classes) کے خلاف طرح طرح کی شکایات پیدا ہوئیں جن سے شر پسند لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھا کر بنگالی اور غیر بنگالی کا تعصب پیدا کر دیا[1]

اربابِ حکومت کی بے تدبیری

مشرقی پاکستان کی حکومت جن "عقلمند" لوگوں کے ہاتھوں میں رہی۔ انہوں نے وہاں پیدا ہونے والے ہر فتنے کا علاج یہ سوچا کہ موسیقی، رقص و سرود، ریس اور کھیل کود کا قوم کو رسیا بنا دیا جائے۔ ان کے دل اور کان فتنہ پردازوں کی باتیں سننے کے لئے فارغ ہوں گے اور نہ نت نئے مطالبات سامنے آئیں گے۔ یہ بات محض کسی قیاس اور بدگمانی کی بنا پر نہیں کہی جا رہی، بلکہ امر واقعہ یہ ہے اور معتبر ذرائع نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ فتنے کے علاج کا یہ "حکیمانہ نسخہ" ہمارے "افلاطونوں" اور "جالینوسوں" نے خوب سوچ سمجھ کر مرتب کیا تھا۔ ان میں سے کسی نے ان اسباب کو سمجھنے اور دفاع کرنے کی فکر نہ کی جو مشرقی پاکستان میں بے چینی کے حقیقی موجب تھے۔ کسی نے یہ نہ دیکھا کہ ہم اپنے کالجوں میں نوجوانوں کو کیا تعلیم دے رہے ہیں اور کس قسم کے لوگوں کے ذریعہ سے دے رہے ہیں اور اس کے فطری نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ کسی نے اس لٹریچر پر نگاہ نہ ڈالی جو ملک کے اندر ہی سے نہیں بلکہ باہر مغربی بنگال سے آ کر یہاں پھیلتا رہا۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت نہ اٹھائی کہ اردو سے یہاں کے لوگوں کی ناواقفیت اور بنگلہ زبان میں اسلامی لٹریچر کے

---

[1] ۔۔۔۔۔ ایضاً ۔۔۔۔۔ ص ۱۱

نقصان اور سندھ و کلچر اور اشتراکیت اور بنگالی نیشنلزم کی ترجمانی کرنے والے لٹریچر کی کثرتِ اشاعت کا آخر کار کیا نتیجہ ہوگا۔ یہ ساری فکریں تو دماغ کو تکلیف دینے والی تھیں۔ آسان تدابیر اس کے سوا کون سی تھیں کہ بُلبل اکیڈمیوں کی طرز پر کچھ ادارے قائم کر دیئے جائیں جس سے عوام کا دل بھی "بہلے" اور اپنا دل بھی۔[1]

زبان کا مسئلہ

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والے بھی اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہندوؤں نے من حیث القوم پاکستان کے قیام کو ایک روز کے لئے بھی دل سے قبول نہیں کیا اور یہ کہ وہ پہلے دن ہی سے پاکستان کی سلامتی کو زک پہنچانے کے لئے سازشوں کا تانا بانا بُننے لگے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے زبان کے مسئلہ کو کھڑا کیا۔ یہ مسئلہ پہلے پہل دستور ساز اسمبلی کے ایک ہندو ممبر دھریندر ناتھ دَت نے فروری ۱۹۴۸ء میں اٹھایا۔ اس نے دستور ساز اسمبلی کے قوانین میں ترمیم کی تحریک پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اس وقت وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اجلاس میں اس ترمیم کی مخالفت کی اور اسے پاکستانی عوام کے درمیان کشیدگی پیدا کرنے کا باعث قرار دیا۔[2] ہندوؤں نے بڑی ذہانت کے ساتھ بھُس میں چنگاری پھینک دی تھی جسے اپنے اپنے مقاصد کو ہوا دینے کے لئے ادارے موجود تھے۔ چنانچہ بہت جلد قومی سطح پر ایک خطرناک تنازعہ کا آغاز ہو گیا۔

برصغیر کے طلبہ نے تحریکِ پاکستان میں بھرپور کردار ادا کیا تھا۔[3] آزادی کے بعد

---

[1] ـــــــ ایضاً ـــــــ ص ۲۲-۲۳

2 - Rushbrook William, "The East Pakistan Tragedy "P.15

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے میگزین "محور" پنجاب یونیورسٹی کا صد سالہ نمبر جب وہ ناظم اعلیٰ تھے" حصہ اول پر سرفراز مرزا کی کتاب "All India Muslim Students Federation"

مشرقی پاکستان میں ان پرجوش طلبہ کے جذبات کو سب سے پہلے بھارت نواز ہندوؤں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ اُن میں بالخصوص اس تاثر کو گہرا کیا گیا کہ مرکزی حکومت جس میں پنجابیوں اور مہاجروں کا غلبہ ہے اکثریتی آبادی کے صوبے کو اس کی مادری زبان سے محروم کرنے کی سازش کر رہی ہے اور انہوں نے زبان کے مسئلہ پر اگر ذرا بھی نرمی دکھائی تو اردو بولنے والے غیر بنگالی ان کے حقوق غصب کرلیں گے اور تمام کلیدی آسامیوں پر ان کا ہی قبضہ اور تصرف ہوگا۔ طلبہ کے جذبات اس حد تک برانگیختہ کر دیئے گئے کہ وہ قائدِ اعظمؒ کی بات تک سننے کے روادار نہ رہے ....

۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو جب پہلے گورنر جنرل، قائدِ اعظمؒ ڈھاکہ تشریف لائے اور انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اعلان کیا: صرف اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔" ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں اساتذہ اور طلبہ کے خصوصی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے جب قائدِ اعظمؒ نے پھر دہرایا "پاکستان کی واحد سرکاری زبان اردو ہوگی" تو اس کے ساتھ ہی ہال میں آواز گونجی "نہیں، نہیں، نہیں[1]"

طلبہ کے اس گروہ کی قیادت طالب علم رہنما شیخ مجیب الرحمٰن کر رہا تھا جسے مسٹر حسین شہروردی کی حمایت حاصل تھی۔

رفتہ رفتہ ڈھاکہ یونیورسٹی کیمپس بنگلہ زبان کی حمایت میں منعقد ہونے والے احتجاجی اجتماعات کا مرکزی مقام بن گیا۔

فروری ۱۹۵۲ء میں (بنگالی) وزیرِ اعظم خواجہ ناظم الدینؒ نے ڈھاکہ میں ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے جب کہا "پاکستان کی واحد سرکاری زبان اردو ہی ہے"۔ تو ان کا یہ کہنا گویا شعلے کو ہوا دینے کے مترادف ٹھہرا۔ چنانچہ مذکورہ اعلان کے فوراً بعد اس مسئلہ پر کمیٹی آف ایکشن آن نیشنل لنگویج نے جو سٹوڈنٹس یونین اور یوتھ لیگ کے نمائندوں کے ذریعے کمیونسٹوں کے زیرِ کمان تھی، ۴۔ فروری ۱۹۵۲ء کو صوبہ گیر ہڑتال کروانے کی کوشش کی

---

[1] تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند۔ پنجاب یونیورسٹی، جلد ۱۲ اور چودھری علی احمد خانؒ "مشرقی پاکستان، سیاسی حالات کا تجزیہ" (۱۹۵۵ء) ص ۳۶۔

اگرچہ یہ ہڑتال کامیاب نہ ہو سکی، لیکن فضا میں کشیدگی ضرور پیدا ہو گئی جس کے نتیجہ میں ۲۱ر فروری ۱۹۵۲ء کو ڈھاکہ میں پولیس فائرنگ کا المناک واقعہ رونما ہوا۔ پولیس فائرنگ سے ۳ طالب علم مارے گئے۔ یہ واقعہ جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔ ان عناصر کو یہی مطلوب و مقصود تھا اب نہ صرف اردو کے خلاف بلکہ اردو بولنے والوں کے خلاف بھی جذبات نشو و نما پانے لگے۔

ہلاک ہونے والے ان ۳ طلباء کی یاد میں "شہید مینار" تعمیر کروایا گیا اور پھر یہ مینار بنگالی قوم پرستوں کی ریلیوں اور جد و جہد کی علامت بن گیا۔

آخر کار ۱۹۵۶ء کے دستور میں بنگلہ کو اردو کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں اور کمیونسٹوں نے اس کامیاب لسانی تحریک سے جو نتائج اخذ کئے وہ یہ تھے۔

۱۔ عوام کو لسانی اور علاقائی مسائل کے ذریعے آسانی سے ایکسپلائٹ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ کسی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے تشدد ضروری ہے۔

۳۔ اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے پاکستان میں طلبہ سب سے زیادہ مؤثر گروہ ہیں

۴۔ کسی بھی ایسی تحریک کو قوت کے ذریعے دبایا نہیں جا سکتا جو طلبہ کی سرگرم حمایت حاصل کر لیتی ہے۔

ہندو اور کمیونسٹ جس زبان کے لئے لڑ رہے تھے وہ "مسلم بنگلہ" نہیں تھی، بلکہ یہ وہ زبان تھی جس کی تخلیق کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں ہندو برہمنوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کی ترقی و ترویج کے لئے "بنگالی اکادمی" قائم کی گئی۔ بنگالی اکادمی وغیرہ کی مساعی کے نتیجہ میں جب مشرقی پاکستان کی "مسلم بنگلہ" مغربی بنگال کی سنسکرت زدہ زبان سے قریب تر ہو گئی، تو مغربی بنگال (بھارت) میں لکھی اور چھپی ہوئی کتابوں کا مشرقی پاکستان کی مارکیٹوں میں سیلاب لے آیا گیا۔[1] اس لٹریچر نے مشرقی پاکستان میں فکری انتشار کو بڑی

---

1. Maswani, A.M.K" Subversion in East Pakistan" p 108.

تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا۔[1]

مشرقی پاکستان میں زبان کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک صاحب بصیرت مفکر نے فرمایا تھا:

"امر واقعہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں اردو کے خلاف کوئی تعصب نہ تھا بلکہ اس کی ضرورت اور اہمیت کا یہاں کے ذی فہم لوگوں کو خود احساس تھا یہاں کے عام لوگ اردو بولنے والوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور قیام پاکستان کے بعد بھی یہاں عربی زبان کے بعد اردو کو ایک طرح کا مذہبی تقدس حاصل رہا، لیکن اسے واحد قومی و سرکاری زبان قرار دینے کے معاملے میں یہاں کے لوگوں کو عملاً یہ مشکل درپیش تھی کہ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ تک اس زبان سے بالکل ناواقف تھے انہیں اندیشہ تھا کہ اگر یہ زبان واحد قومی و سرکاری زبان قرار دے دی گئی تو وہ نہ صرف عملی مشکلات سے دوچار ہوں گے، بلکہ ہر میدان میں ان لوگوں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ جن کی مادری زبان اُردو ہے یا جن کے ہاں ایک مدت دراز سے اردو پڑھنے لکھنے اور بولنے کا رواج ہے۔ اس بنا پر انہوں نے مطالبہ کیا کہ اردو کے ساتھ بنگلہ کو بھی سرکاری زبان ہونا چاہیئے۔ عقل مندی تو یہ تھی کہ معاملے کی صحیح نوعیت کو سمجھ کر اول روز ہی اس مطالبے کو مان لیا جاتا لیکن ایک طرف اسے گولیوں سے دبانے کی کوشش کی گئی اور دوسری طرف مغربی پاکستان سے پے در پے اس کی مخالفت ہوتی رہی۔ اس چیز نے بنگلہ کے مطالبے کو ایک عملی مسئلے سے بڑھا کر ایک عقیدے اور جذبے کی شکل دے دی۔ فطری بات ہے کہ ایک مطالبے کا جواب "نہیں دیں گے" کی صورت میں دیا جائے تو مقابلے میں "لے کر رہیں گے" کی صدا یقیناً بلند ہوگی۔ یہی کچھ اس معاملے میں ہوا اور اس کی بدولت نہ صرف یہ کہ اردو کے خلاف ایک طرح کا تعصب پیدا ہو گیا جو پہلے نہ تھا، بلکہ

---

[1] یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ لفظ "بنگلہ دیش" کو سب سے پہلے ایک ہندو رائٹر بمل مترا (Bimal Mitra) نے اپنے ناولوں میں استعمال کیا تھا۔ جو پچاس کے عشرے میں شائع ہوتے تھے۔ یہی بمل مترا مشرقی پاکستان کے نوجوانوں میں مقبول ترین ناول نگاروں میں سے ایک تھا۔ (Ibid, p.110)

مغربی پاکستان کے خلاف یہ شکایت بھی پیدا ہوگئی کہ وہ مشرقی بازو پر زبردستی اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا ہے۔[1]

پاکستانی سیاست میں جاگیرداری کا زہر

مغربی پاکستان خصوصاً پنجاب و سندھ کے جاگیرداروں کی بڑی اکثریت برطانوی سامراج کی تخلیق و تشکیل کا شاہکار ہیں۔ ان میں سے شاید ہی کوئی مغلیہ عہد کی جاگیروں کا وارث ہو۔ ان جاگیرداروں نے برطانوی استعمار سے وفاداری اور قوم سے غداری کے عوض یہ جاگیریں ہتھیائی تھیں۔ اسی حوالے سے ان جاگیرداروں کا خمیر ملک و ملت سے بے وفائی سے اٹھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ لوگ سیاسی طور پر ناقابل اعتماد، ہرجائی اور قومی شعور و جذبات سے عاری ہوتے ہیں، بلکہ بعض کی وفاداری ریاست سے بھی مشکوک رہتی ہے۔[2] ان لوگوں نے جب دیکھا کہ اب پاکستان کا بننا ناگزیر ہے تو آخری برسوں میں ان کی اکثریت مسلم لیگ کی کشتی میں سوار ہوگئی۔ یہی وہ طبقہ ہے کہ جس نے اپنی تاریکی موقع پرستی اور جاگیردارانہ سوچ کے سبب پاکستان میں صحت مند سیاست کو پنپنے نہیں دیا۔ ان جاگیرداروں کا نہ صرف زمینوں پر تصرف ہے بلکہ لوگوں کے سر اور ووٹ بھی ان کے قبضہ قدرت میں رہے ہیں نتیجتاً اسمبلیوں میں نمائندگی ہمیشہ انہی کا اجارہ ٹھہرا۔[3]

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ ———— ایضاً ———— ص ۹ - ۱۰

[2] – Khalid B. Sayeed, "Politics in Pakistan" P. 36.

[3] یہاں پر یہ مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا کہ دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے جاگیرداری کے اس استحصالی اور سیاست کش نظام سے چھٹکارا پانے کے لئے سب سے پہلے جماعت اسلامی نے صوبائی انتخابات (۱۹۵۱ء) کے موقع پر اپنے منشور میں قوم کو یہ عادلانہ پروگرام دیا کہ: ایسی تمام جاگیریں واپس لے لی جائیں (۱) جو کسی سابق حکومت نے کسی ناجائز (یعنی اسلامی یا قومی مفاد کے خلاف) خدمات کے صلے میں عطا کی تھیں۔ (۲) جو جائز وارثوں کی زمینوں کو غصب کر کے ایک طبقے کے سپرد کی گئیں اور اصل

پاکستان کی قومی اسمبلی میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی نمائندگی کا تناسب کچھ اس طرح رہا[1]

مغربی پاکستان سے قومی اسمبلی کے منتخب ممبران :

	۱۹۵۵ء	۱۹۶۲ء	۱۹۶۵ء	۱۹۷۰ء
جاگیردار	۷۰٪	۵۶٪	۴۵٪	۴۴٪
صنعتی سرمایہ دار	۱۰٪	۶٪	۱۴٪	۷٪

اس کے برعکس مشرقی پاکستان کی سیاست میں جاگیردارانہ سیاست راہ نہ پا سکی کیونکہ آزادی سے قبل مشرقی بنگال کی ۷۵ فی صد زرعی اراضی ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ تقسیم ہند کے بعد وہاں کے بڑے زمینداروں کی اکثریت ہندوستان چلی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان میں زرعی اراضی اصلاحات نافذ کی گئیں کہ کوئی فرد ۳۳ ایکڑ زمین سے زائد نہیں رکھ سکتا[2] اس لئے وہاں کی سیاست میں جاگیرداری کا زہر سرایت نہ کر سکا۔

علماء

مشرقی پاکستان کے مسلمان، نماز اور مسجد سے والہانہ تعلق رکھتے تھے۔ جنوبی ایشیا

مالکوں کو مزارع بنا دیا گیا۔ (۳) جو کسی مخصوص خدمت کے لئے عطا کی گئیں مگر وہ خدمت انجام نہ دی گئی۔ (۴) جو جائز خدمات کے صلہ میں جتنی ضرورت سے زیادہ مقدار میں دی گئیں۔ (۵) جو اگرچہ جائز سرکاری عطیہ تھیں مگر گذشتہ تین سال سے بے کار و غیر آباد پڑی ہیں۔ (۶) جن پر شرعی نقطۂ نظر سے زمیندار کا حقِ ملکیت ثابت نہ ہو۔ ان کو جاگیرداروں سے واپس لے کر زمینوں کے حقداروں یا نئی اکمال مزارعوں میں تقسیم کر دی جائیں (انتخابی منشور جماعت اسلامی ۱۹۵۱ء ص ۲۱-۲۳)

لیکن برسر اقتدار مسلم لیگی حکومتوں کے نمائندوں پنجاب سے ممتاز دولتانہ، سرحد سے خان قیوم خان اور سندھ سے نے اس کاوش پر پانی پھیر دیا اور جاگیرداروں نے لے پاکستان کی قومی سیاست کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔

1 -Stanley A. Kochanek, "Business and Politics in Pakistan P. 62

2 Rounaq Jehan, "Pakistan : Failure in National Integration". p. 19.

ہیں ڈھاکہ مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہاں کے علمائے کرام عوام کی اجتماعی و سیاسی زندگی پر بحیثیت مجموعی اثرانداز نہ ہو سکے پھر ان کے دین اور سیاست کی علیحدگی کے تصور نے عوام کو طالع آزما سیاسی کھلنڈروں کے سپرد کر دیا جو چند لوگ دین کا صحیح تصور اور حالات کا مقابلہ کرنے کا شعور رکھتے تھے۔ ان کے خلاف انہی علماء کے فتوؤں کی مہم نے دشمن اور رہنماؤں کے راستے آسان بنا دیئے۔

دراصل علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد ملک کے حالات سے بے تعلق ہو کر اپنے درس و افتاء اور مخصوص مذہبی و فقہی مباحث و مشاغل میں لگی رہی اور ایک قلیل تعداد جو ملکی مسائل میں دلچسپی لینے والی تھی اس کے درمیان بھی اختلاف رائے تھا۔ ایک گروہ نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ اور عوام کی اس ناراضی کو اپنی طرف پھیر لیا، جس کا رخ مسلم لیگ کی جانب تھا۔ دوسرے گروہ نے متحدہ محاذ (جگتو فرنٹ) کا ساتھ دیا، لیکن وہ اتنا مؤثر نہیں تھا کہ جس محاذ کا وہ ساتھی ہے اس کے ہتھکنڈوں کا توڑ کر سکے۔ باوجودیکہ سب بزرگ پورے اخلاص کے ساتھ یہ محسوس کر رہے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے دین و ملت اور پاکستان کی سالمیت کے لئے سخت نقصان دہ ہے، مگر عملاً وہ ان فتنوں کا تدارک نہ کر سکے تھے چنانچہ رفتہ رفتہ یہ فتنے اس قدر زور پکڑتے گئے کہ ان کا استیصال کر دینا علماء کے بس میں ہی نہ رہا۔[1]

علمائے کرام سے ایک بھول یہ ہوئی کہ مختلف اوقات میں ان کی جانب سے پیش کئے جانے والے چار نکاتی مطالبہ نظام اسلامی، علماء کے بائیس نکات، آٹھ نکاتی مطالبہ وغیرہ میں علاقائی انصاف کا نکتہ شامل نہ کیا گیا۔ اگرچہ یہ نکات دستوری خلاء کو پُر کرنے کی سیاسی جدوجہد کے اچھے سمبل (علامت) تھے، لیکن اگر علاقائی انصاف کا نکتہ بھی ان نکات میں بالصراحت شامل کر لیا گیا ہوتا تو یہ نکات مشرقی پاکستان کے عوام میں محرومیوں کے ازالہ کی کوشش سمجھے جاتے۔[2]

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ ——— ایضاً ——— ص ۲۳ - ۲۴

[2] پروفیسر فروغ احمد "مجلہ نظریہ پاکستان" مرتبین ڈاکٹر معین الدین عقیل، پروفیسر مسلم سجاد۔ محبوب علی شیخ ص ۵۷ - ۵۸

دراصل مشرقی پاکستان کی دنعاتی (POINTS) سیاست کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی جو وہاں کے سیاسی شعور کی واضح علامت تھی۔ مسائل کے بارے میں اکثر روائتی علماء کا رویہ غیر اعتدال پسندی اور کم نگاہی پر مبنی رہا۔ وہ جزو کو کل پر اور "فروعات" کو "اسباسیات" پر فوقیت دیتے رہے اور اس حوالے سے کفر کے فتوؤں کی بارش ان کا وطیرہ رہا ہے[1] اس رویہ نے نئی نسل کو مذہب سے برگشتہ کرنے اور لادین عناصر کی راہ کے روڑے دور کرنے میں خاصا مؤثر حصہ لیا۔ حد یہ ہے کہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۱ء تک کے پرآشوب دور میں بھی علمائے کرام انہی فروعات میں الجھے رہے اور ایک دوسرے کے خلاف فتوؤں کے تیر برسا کے اسلام دشمن طاقتوں کا راستہ صاف کرنے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ گویا کہ مغربی پاکستان میں رنگ تصوف، پیری مریدی اور فرقہ وارانہ جنگ وجدل کے اکاس بیل نے ہمارے مذہبی ذہن کو مفلوج، بے عملی کو مقبول اور بے بصر مقلدانہ ذہنیت کو رواج دیا اور مشرقی پاکستان میں دینی ذہن کو پوری طرح سیکولر سیاست کا نوالہ تر بنا دیا۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیے

علم وادب کے میدان میں

یہ ایک دردبھری حقیقت ہے کہ نہ قیام پاکستان سے پہلے اور نہ بعد میں ٹھوس فکری منزل کا تعین کیا گیا۔ نعروں کی حد تک تو ضرور کہا گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ (اگرچہ اسے بھی پاکستان کا خالق ہونے کے کچھ دعوے دار آج بچوں کا نعرہ قرار دیتے ہیں) لیکن ایسا نعروں کی بنیاد پر کر لینے کے باوجود کسی شعبہ حیات میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ یہاں تک کہ اس سمت میں کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، بلکہ اس ضرورت کا احساس دلانے والوں کو ملک کا غدار اور پھانسی کا حق دار قرار دیئے جانے کی رسم کی بنیاد ڈالی گئی۔ چنانچہ سیاست، معیشت، معاشرت کی طرح ادب وصحافت کے پہلو کو بھی یکسر

---

[1] ڈاکٹر حفیظ الرحمان صدیقی: قرارداد مقاصد سے اسلامی قانون تک، ص ۲۶۳-۲۶۸۔

نظر انداز کیا گیا، ہندوؤں، اشتراکیوں، ملحدوں اور نام نہاد ترقی پسندوں کو کھلی چھوٹ حاصل رہی کہ وہ ادب و دانش کے نام پر جو چاہیں، لکھیں، چھاپیں اور پھیلائیں وہ سرزمین جو مشرقی پاکستان کے نام سے ہمارے ملک کا دایاں بازو تھی، جسم کا حصہ تھی۔ وہاں کے ادب پر تو پہلے ہی رابندر ناتھ ٹیگور اور دوسرے ہندو قلم کاروں کی فکری چھاپ بہت گہری تھی۔

بنگلہ زبان میں اقبالؒ کا لٹریچر تھا، نہ ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا۔ دارالمصنفین کی کتابیں تھیں نہ ادارہ تعلیمات اسلام، اور نہ ندوۃ المصنفین اور مدرسۃ الاصلاح کی۔ بنگلہ زبان میں کسی مستند تفسیر قرآن کا مکمل ترجمہ تک مہیا نہیں تھا اور نہ سیرت صحابہؓ پر کتب اور نہ اسلام کے انقلابی داعیوں کے سوانح حیات۔ مشرقی پاکستان میں اُس وقت جو مطبوعہ سرمایۂ ادب تھا۔ وہ تمام تر بنکم چندر مکرجی، رابندر ناتھ ٹیگور یا ان کے زیر اثر ادیبوں ہی کا پیدا کردہ تھا۔ ایک صاحب قاضی نذرالاسلام مسلمان نظر آتے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ انہوں نے عمر بھر ہندو دیوی دیوتاؤں کی حمد و ثنا میں ایسے ایسے بلند پایہ بھجن اور کیرتن کہے تھے کہ کوئی زبردست مشرک شاعر بھی اپنے گلدستہ عقیدت میں اس معیار کے پھول پرو کر اپنے دیوتاؤں کے سامنے پیش کرنے سے قاصر تھا۔ ایسی صورت میں نوجوان نسل بنگلہ کلچر اور قومیت کی طرف اگر جاتی ہے تو اس سے گلہ اور شکوہ کس بات کا۔ وہ اشتراکیت کے جنگل میں آ ئے یا زبان کے تعصب کا شکار ہو جائے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اشتراکی ادیبوں صحافیوں نے فکر و فن کی تمام تر جولانیاں پاکستان کی دشمنی میں صرف کیں اور بنگلہ قومیت کو ابھارا۔ ان کے ہاں اب طبقاتی جنگ کا میدان مغربی پاکستانیوں اور بنگالیوں کے درمیان ٹھہرا۔ خود اشتراکی اہل قلم کے بارے میں یہ قول کتنا مبنی بر صداقت ہے کہ "کوئی کمیونسٹ اسلام اور پاکستان کا وفادار نہیں ہو سکتا" جس کی حقانیت کو ترقی پسند اہل قلم نے قدم قدم پر سچ کر دکھایا۔[ل] اگر بنگالی نوجوانوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی ذرا بھی کوشش کی جاتی تو واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے لئے یہ مٹی بڑی زرخیز ثابت ہوتی۔ اس کام کو جماعت اسلامی نے سرانجام دینا چاہا، مگر قائداعظمؒ کی آنکھیں بند ہوتے ہی اسے ملک دشمن اور غدار قرار

ل ماہر القادریؒ ماہنامہ "فاران" کراچی اکتوبر ۱۹۷۳ء

دے کر قابلِ گردن زدنی کہا گیا اور سیفٹی ایکٹ کی اندھی تلوار پر لٹکا دی گئی [1]

بنگلہ ادب میں ہندو ادیبوں کی ہندو دھرم سے تعصب کی حد تک وابستگی سے کوئی بڑے سے بڑا سیکولر ادیب بھی انکار نہ کر سکے گا۔ ان کے ادب میں خواہ وہ شاعری ہو یا افسانہ نگاری، ڈراما نویسی ہو یا ناول نگاری ہندو دھرم، پریم بھگتی کا مذہبی عنصر اور بنگلہ قوم پرستی کا رنگ اس میں کسی نہ کسی درجہ ضرور ملایا جاتا ہے چنانچہ اس ادب کے سائے میں پلنے اور جوان ہونے والی نسل پر بنگلہ قوم پرستی کا اثر لازمی تھا۔ چنانچہ ایسی فضا میں اسلام اور پاکستان دشمن لابی کا راستہ آسان ہوا اور اس نے نہایت آسانی کے ساتھ اس نئی نسل کو اپنا شکار بنا لیا اور کلکتہ سے آنے والے ادبی و ثقافتی لٹریچر کی کاٹ اپنا رنگ دکھلانے لگی۔ وکٹر ھیوگو نے خوب کہا تھا!

"An invasion of armies can be resisted, but an invasion of ideas can not be resisted.".

(فوجوں کی یلغار کو تو روکا جا سکتا ہے مگر خیالات کی یلغار روکی نہیں جا سکتی۔)

چنانچہ خیالات و عقائد کی یہ یلغار جو کتابوں اور پمفلٹوں کے ذریعے کی گئی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں بھارت کی فوجی یلغار کا ہراول دستہ ثابت ہوئی۔

قادیانیوں کا کردار

قادیانیت کا مسئلہ مشرقی پاکستان میں کبھی موجود نہ تھا۔ انگریز نے یہ پودا پنجاب کی سرزمین میں لگایا تھا اور یہیں برگ و بار لایا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختمِ نبوت کو مشرقی پاکستان کے عوام میں مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ وہ اس مسئلہ اور اس کے علیہ ما علیہ سے قطعی بے خبر تھے۔ اس پس منظر میں لادین عناصر نے وہاں یہ پراپیگنڈا کیا کہ "اچھے بھلے مسلمانوں" پر کفر کے فتوے عائد کرنا مولویوں کی پرانی عادت ہے" اور پھر جب ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے ہنگاموں پر

---

[1] چودھری علی احمد خانؒ ——— ایضاً ——— ص ۵۳، ۵۴

حکومت کے قائم کردہ کمیشن کی رپورٹ (جو منیر انکوائری رپورٹ" کے نام سے معروف ہے) شائع ہوئی تو اس کی جس قدر پذیرائی مشرقی پاکستان میں ہوئی مرکزی حکومت کی کسی دوسری شائع شدہ سرکاری دستاویز کو کبھی نصیب نہیں ہو سکی تھی۔ سیکولر پارٹیوں نے اس رپورٹ کو وسیع پیمانے پر پھیلایا، اس لئے کہ رپورٹ "مخلوط آو میہنٹ" کی ایک ایسی انجیل تھی جسے علیحدگی پسند اور لادین عناصر کے ساتھ دلوہ اور عدالت کی تائید حاصل تھی[1] اس رپورٹ میں ملکی سیاست میں مذہب کے دخل کو زہر ہلاہل قرار دیا گیا تھا اور یہ وہی بات تھی جسے سیاست سے باہر نکال پھینکنے پر ہندو کمونسٹ اور لادین عناصر اور بعض مسلم لیگی ادھار کھائے بیٹھے تھے

۱۹۶۸ء میں جب ایوب خان کے وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سیاست میں آئے تو انہوں نے سوشلزم کا نعرہ لگایا۔ یہ نعرہ ایسے طبقات کو مسحور کر گیا جو مذہب کے نفوذ اور مذہب کے غلبہ سے خائف یا واقعۃً جاگیرداری و سرمایہ داری کے براہ راست استحصال کا شکار تھے۔ قادیانی تو پہلے ہی اس بات کے قائل تھے کہ اسلامی حکومت ان کے لئے سخت نقصان دہ ہے اور ایک سیکولر یا غیر اسلامی نظام حکومت ان کے مقاصد کے لئے موزوں ترین ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنا پورا وزن مسٹر بھٹو کے پلڑے میں ڈال دیا اور بعد میں مرزا ناصر نے کھلے بندوں بڑے فخر کے ساتھ اس کا اعلان اور اعتراف بھی کیا۔

"قادیانی حضرات کی عرصہ سے یہ خواہش تھی کہ مشرقی پاکستان (جہاں مذہب کی گرفت نسبتاً مضبوط نہ ہے) کسی طرح الگ ہو جائے تاکہ مغربی پاکستان کو بالآخر ایک قادیانی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جائیں[2] اس خواہش کو بروئے کار لانے کے لئے جنرل ایوب حکومت کے پلاننگ کمیشن کے قادیانی چیئرمین ایم ایم احمد برسوں سے کام کر رہے تھے۔ مشرقی پاکستان کے ایک سیاستدان نے اس حقیقت کی نشاندہی بھی کی تھی کہ مقاصد مشترک ہونے کے باوصف پاکستان میں قادیانی بنگلہ دیش بنوانے کے لئے امریکی آلۂ کار کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ یہی وجہ

---

[1] پروفیسر فروغ احمد ——— ایضاً ——— ص ۵۸

[2] ابو الاعلیٰ مودودیؒ ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور، مرتبہ: پروفیسر عبد الحمید صدیقیؒ) جون ۱۹۷۱ء

ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے سانحے پر جس آنکھ سے آنسو نہ ٹپکا وہ سوشلسٹ یا قادیانی تھا۔

نوکرشاہی: اقتدار کیوں اور کیسے

پاکستان کے ایک معروف سابق بیوروکریٹ پاکستانی نوکر شاہی کے مزاج، کردار،
پس منظر اور پیش منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

• وہ مخصوص انتظامی ڈھانچہ جسے ہم نے انگریزوں سے ورثے میں پایا تھا، آزادی کے بعد رنگ لانے لگا۔ مسلم لیگ کے اکابرین اور سیاسی حکمران انتظامی ذمہ داریوں اور ملک چلانے کے کاروبار سے ناآشنا تھے۔ سول سروس (بیوروکریسی، نوکر شاہی) کے کارندوں میں خصوصاً جو پرانے لوگ تھے۔ ان کے مزاج میں انگریزیت رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ نئے پاکستانی افسروں کو بھی برابر کا درجہ دینے کو تیار نہ تھے۔ عوام بے چارے تو کسی شمار میں نہ تھے۔ مشرقی پاکستان کے دیہاتی لوگ پاکستان کے نئے مسلمان افسروں کو دیکھنے آتے مگر انہیں وہاں "صاحب لوگ" اجلاس فرماتے نظر آتے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے پرانے بیوروکریٹس اور نئے سول سرونٹس کی تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا جس قسم کا چیف سیکرٹری ہوتا، مشرقی پاکستان میں اسی قسم کا نظام چلنے لگتا۔ ۱۹۵۵ء تک مشرقی پاکستان میں جو نظام کارفرما تھا وہ ہوبہو انگریزی استعماری اور نوآبادیاتی نظام کا چربہ تھا۔ اس میں نہ کوئی اسلامی رنگ تھا اور نہ کوئی پاکستانی خصوصیت تھی وہی سیکولر نظام تعلیم، وہی حاکمی اور محکومی کا سالہا سال پرانا سلسلہ، وہی یورپی لباس، انگریزی زبان کا رعب داب، کالے گورے کی تخصیص، نوکریوں کے لئے تگ و دو، پولیس کی دہشت اور مجسٹریٹوں کی حکومت، جب یہ سب کچھ وہی تھا، تو لوگ کیسے سمجھ لیتے کہ یہ افسر جو ایک ہزار میل دور مغربی پاکستان سے ان کے صوبے مشرقی پاکستان میں آئے ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے ہم وطن لوگ ہیں۔ مرکزی حکومت میں اس موضوع پر نہ کوئی سوچ بچار ہو رہا تھا اور نہ اس بڑھتی ہوئی خلیج کا کوئی احساس تھا۔ سوچا تو یہ کہ کوٹہ سسٹم ڈھونڈ نکالا۔ وہی حربہ جو انگریز حکمران اقلیتوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مرکزی حکومت اس جاہلانہ خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ ان بیوروکریٹوں کے جبر کے نتیجہ میں لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ حل ہو گیا ہے اور مشرقی پاکستان کے بڑے رائے کے فضل الحق خان،

فضل القادر، ڈھاکہ کے نواب، کھلنا کے عبدالصبور، فرید پور کے وحید الزماں اور بوگرہ کے محمد علی وغیرہ) ساتھ ہیں تو باقی لوگوں کی حیثیت ہی کیا ہے۔[1]

اگرچہ کسی بھی قوم کی مضبوطی اور علاقائی، لسانی اور سیاسی استحصال سے پاک معاشرے کے قیام میں دیانت دار بیوروکریسی ہی ایک مرکزی کردار ادا کیا کرتی ہے اور یہی ریاست کا بنیادی انتظامی ڈھانچہ (Infra Structure) ہوتی ہے، مگر افسوس کہ پاکستان میں یہی ڈھانچہ اپنی مختلف نفسیاتی و طبقاتی اغراض کے حوالے سے ملک میں نفرت بڑھانے اور ملک کو توڑنے کا ایک بڑا سبب بنا۔

قیام پاکستان کے وقت پاکستان کے حصے میں آنے والے ۸۳ انڈین سول سروس کے افسروں میں سے صرف ایک بنگالی تھا اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ عموماً مغربی پاکستان کے بیوروکریٹوں کا رویہ مشرقی پاکستان کے عوام کے ساتھ اجنبیوں کا سا ہوتا۔ یہ عوامل احساس محرومی پیدا کرنے اور نفرت کی خلیج وسیع تر کرنے کا باعث بنے چنانچہ وہاں بیوروکریسی میں آبادی کے تناسب سے حصہ لینے کا مطالبہ اٹھا۔ دلیل یہ تھی کہ صرف وہ منصوبہ ساز ہی مشرقی پاکستانیوں کے حقوق اور مسائل کے بارے میں بہتر انداز سے معاملہ کر سکتے ہیں جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہو۔[2] یہ مطالبہ ایسا نہیں تھا کہ جسے آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکتا۔ چنانچہ مرکزی حکومتوں کو اس مطالبے پر توجہ دینا پڑی جس کے نتیجے میں سول سروس میں مشرقی پاکستان کا حصہ مسلسل بڑھا۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان سے گیارہ اعشاریہ ایک فی صد سول سرونٹس بنائے گئے۔ جب کہ ۱۹۵۸ء میں یہ تعداد اکتالیس اعشاریہ سات تک پہنچی۔ دوسری جانب مغربی پاکستان سے سول ملازمین کا تناسب اٹھاسی اعشاریہ نو سے کم ہو کر اٹھاون فی صد پہ آن پہنچا۔[3]

اب ہوا یہ کہ مشرقی پاکستان سے ابھرنے والی اس نئی بیوروکریسی کا معاملہ دوسری

---

[1] الطاف گوہر "میں نے مشرقی پاکستان کو دم توڑتے دیکھا" اردو ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۷۵ء

1 Dr. Safdar Mahmood, "Pakistan Divided" P. 30–31.

2 Rouneq Jehan, "Opcit" P. 26

انتہا کی جانب چل پڑا۔ فطری طور پر اس کی ہمدردیاں اُس گروہ کے ساتھ تھیں جس نے انہیں یہ حق دلایا۔ یہ نئے بیورو کریٹ نوجوان تھے جو ادنیٰ متوسط طبقے یا دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں سے بیشتر کا تعلق اور ربط سرگرم سیاسی تحریکوں، سرگرمیوں اور سیاسی دانشوروں سے تھا۔ اس لئے ان کا وہاں کی مقبول سیاسی تحریکوں اور لیڈروں کا احسان مند ہونا اور انہیں بہتر مواقع فراہم کرنا فطری امر تھا۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان کے نئے بیوروکریٹس زیادہ تر اعلیٰ یا اعلیٰ متوسط طبقے اور شہری آبادی سے تعلق رکھنے والے تھے اور فوجی افسروں یا برسر اقتدار نوکر شاہی کے چشم و چراغ تھے۔ اسی تناظر میں پاکستانی نوکر شاہی میں رفتہ رفتہ "بنگالی اور پنجابی" کی تفریق و تعصب پیدا ہونا شروع ہوا۔ پھر جنرل محمد ایوب خان کے عہد میں (۱۹۵۸ء - ۱۹۶۸ء) میں ایک بڑا ہی غلط فیصلہ یہ کیا گیا کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسر مغربی پاکستان میں اور مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسر مشرقی پاکستان میں ہی محدود رہیں گے، اس طرح سول سروس دو خطوں میں تقسیم ہوگئی۔ درحقیقت اس فیصلے سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک کو بڑی تقویت ملی[1]

جب ۱۹۶۸ء-۱۹۶۷ء کے دوران مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے شوشے نے سر اٹھایا تو مشرقی پاکستان میں سول انتظامیہ کا بڑا حصہ عوامی لیگ کی حمایت و تائید میں پوری طرح سرگرم ہوگیا۔ کیونکہ وہ اس تحریک کی کامیابی کی صورت میں اپنے لئے ترقی کے بے پایاں امکانات دیکھ رہے تھے۔ سول انتظامیہ ہر طرح سے عوامی لیگ کو طاقت اور اثر و نفوذ فراہم کر رہی تھی۔ تمام سرکاری فیصلے اور اہم راز عوامی لیگ کی قیادت کو مسلسل پہنچائے جا رہے تھے اور ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کے دوران تو سرکاری دستاویزات تک شیخ مجیب الرحمان کو فراہم کی جاتی رہیں جو اس کی چمک دمک اور گرما گرمی پیدا کرنے کے کام آئیں۔ بالفاظ دیگر ایسٹ پاکستان سول سیکرٹریٹ بھی مغربی پاکستان کو "شکست" دینے کے منصوبہ پر عمل پیرا تھا[2]

---

[1] راؤ فرمان علی - یاد داشتیں۔ اردو ڈائجسٹ۔ مئی ۱۹۷۸ء و الطاف گوہر "مشرقی پاکستان" اردو ڈائجسٹ، ستمبر ۱۹۷۵ء لاہور۔ [2] ——— ایضاً ———

فوجی اقتدار کا پس منظر

یہ بات سچ ہے کہ "فوج ہماری آنکھوں کا نور ہے ہمیں وہ جان سے بھی زیادہ عزیز ہے کہ اس کے جوان دکھ جھیل کر روکھی سوکھی پر گزارہ کر کے دن رات ہماری سرحدوں کی حفاظت کرتے اور اپنی جانوں کو نچھاور کرتے ہیں، خاندانوں سے دور رہ کر ایثار کرتے ہیں۔ پھر ہماری فوج شخصی نہیں بلکہ قومی فوج ہے۔ جس طرح عدلیہ ہمارے لئے بلا تخصیص قابل احترام ہے اسی طرح فوج بھی تنقید سے بالا تر ہے، لیکن جس طرح عدلیہ میں عدالتی وقار مجروح کرنے والے جج پر تنقید ہو سکتی ہے، کڑا احتساب کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اپنا فرض منصبی ادا نہ کرنے والے کسی فوجی جرنیل کو بھی تنقید و احتساب سے بالا نہیں سمجھا جا سکتا"[1]

قیام پاکستان کے بعد جب سول بیوروکریسی نے سیاستدانوں کی کاروبار مملکت چلانے اور انتظامی ذمہ داریوں سے ناواقفیت کو بہانہ بنا کر حکومت کے دروبست پر قبضہ جما لیا تو رفتہ رفتہ فوج کے کچھ جرنیلوں میں بھی یہ جذبہ انگڑائی لینے لگا کہ "ہم وطن کے پاسبان آخر حکومت کرنے کے حقدار کیوں نہیں ہو سکتے"۔ اس سوچ کا دبا دبا اظہار اس وقت ہوا۔ جب ایوب خان بری فوج کے کمانڈر انچیف بنائے گئے اور پھر وہ اس منصب کے ساتھ کابینہ میں بھی لے لئے گئے۔

اگرچہ ایوب خان نے محلاتی سازشوں کے نتیجہ میں براہ راست جنرل کے طور پر پاک فوج کی سربراہی سنبھالتے وقت فوجی جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"فوج میں ہوتے ہوئے آپ نہ عملی سیاست میں حصہ لیں اور نہ اپنے خیالات کا کھلم کھلا اظہار کریں۔ ہماری اصل حیثیت ملازمین پاکستان کی ہے اور اس حیثیت سے ہر اس پارٹی کی اطاعت ہمارا فرض ہے جس کے سپرد باشندگانِ ملک اقتدار کریں"[2]۔ مگر بعد میں

---

[1] لاہور ہائی کورٹ بار سے خطاب، نوائے وقت، تجارت" ۹ نومبر ۱۹۸۳ء (پروفیسر غفور احمد)

[2] The Pakistan Times "(Lahore) 25 January 1951

خود ایوب خان نے اپنے عمل کے ذریعے وہ سب کچھ کیا، جسے نہ کرنے کی تلقین انہوں نے اپنے جوانوں کو کی تھی۔ ایوب خان نے اس کردار کی کہانی خود اپنی زبانی "Friends Not Masters" میں بیان کی ہے۔

پاکستان کی سیاست میں فوج کی باقاعدہ مداخلت کا آغاز ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف پنجاب سے اٹھنے والی تحریک کے دوران ہوا۔ جب لاہور میں مارشل لاء لگا۔[1] اس زمانہ (۱۹۵۳-۵۸ء) میں ملکی سیاست میں جتنے جھگڑے چلے، ان سب کی پشت پر جنرل ایوب خان کی فوجی طاقت اور اقتدار کی ہوس کارفرما تھی۔ اس مقصد کے لئے سول بیوروکریسی کے نمائندے گورنر جنرل غلام محمد اور ڈیفنس سیکرٹری سکندر مرزا نے خصوصی حالات پیدا کرنے میں جنرل ایوب خان کی معاونت کی۔[2] اس طرح غلام محمد کے زمانے میں عوام کی بجائے فوج قوت کا اصل سرچشمہ قرار پائی اور حکمران اس کے سہارے اپنے سیاسی فیصلے اور اقدامات کرنے لگے جس کے نتیجہ میں بالآخر فوجی آمریت کا دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ایک ایسی رات بھی آئی جب گورنر جنرل غلام محمد نے جس کے دائیں اور بائیں دونوں طرف فوجی جرنیل موجود تھے، اپنے حلقہ بگوش وزیر اعظم کی آڑ لے کر دستور ساز اسمبلی توڑ ڈالی۔ نئی کابینہ میں میجر جنرل سکندر مرزا وزیر داخلہ اور جنرل محمد ایوب خان وزیر دفاع بنا دیئے گئے۔ ایوب خان نے وزیر دفاع ہونے کے ساتھ ساتھ مسلح افواج کا کمانڈر انچیف رہنے پر بھی اصرار کیا اور انہیں ایسا کرنے دیا گیا۔ نوکر شاہی اور فوج اس وقت اپنے داخلی تضادات کے باوجود یک جان تھیں۔

سکندر مرزا نے جو اب ملک کے صدر تھے۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک بھر میں مارشل لاء نافذ کرنے کا اعلان کر دیا۔ چند ہی روز بعد (۲۷ اکتوبر ۵۸ء) جنرل محمد ایوب خان نے

---

[1] اسی مارشل لاء کے تحت مسلم لیگ کے دور حکومت میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو سزائے موت (مئی ۱۹۵۳ء) سنائی گئی جو بعد ازاں ملکی رائے عامہ کے دباؤ کے تحت عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔

[2] ابوالاعلیٰ مودودیؒ، کراچی بار سے خطاب ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۴ء

سکندر مرزا کو چلتا کیا اور ملکی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ جمہوریت کی بساط لپیٹ دیئے جانے کے بعد مشرقی پاکستان میں یہ احساس جاگزیں ہونے لگا کہ "مغربی پاکستان کا ڈکٹیٹر (Dictator) بلا شرکت غیرے ہم پر حکمرانی کر رہا ہے اور اس حکومت میں ہمارا کوئی حصہ اور دخل نہیں"۔ جمہوریت کی عدم موجودگی میں رفتہ رفتہ علیحدگی کے احساسات توانا ہوتے گئے اور مرکز گریز عناصر کو تقویت ملتی گئی۔

مولانا مودودیؒ نے اس دوران فوجی حکومت پر گرفت کرتے ہوئے کہا تھا "یہ کہنا کہ ملکی اقتدار کی آخری ذمہ داری فوج پر ہے، ایک غلط پالیسی ہے۔ فوج کی ذمہ داری ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کی ہے نہ کہ ملک چلانے کی۔ ملک فوج کا نہیں بلکہ اپنے باشندوں کا ہے اور یہ باشندوں کا اپنا ہی کام ہے کہ وہ اپنے گھر کے معاملات کو چلائیں بھی اور بگڑ رہا ہو تو اسے درست بھی کریں۔ ملازمین خواہ فوج کے ہوں یا سول (Civil) کے، ان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ملک کا نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں[1] ان کا کہنا تھا کہ مارشل لاء سرے سے کسی قانون کا نام ہی نہیں ہے، بلکہ مارشل لاء نام ہے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی منشاء و مرضی کا[2]

حقیقت یہ ہے کہ مارشل لاء کہیں بھی اور کبھی بھی سیاسی و اجتماعی مسائل کا کوئی حتمی اور مؤثر حل نہیں ہوتا اور نہ سیاسی استحکام کا ضامن بن سکتا ہے۔ اسے محض ایسے ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جو ملک کی سلامتی کے لئے خطرہ بن رہا ہو، ایک وقتی علاج کے طور پر تو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا مسلسل طول پانا کسی طور بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ الجھنیں حل ہونے کی بجائے اس کے جاری رہنے سے نت نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ نتیجۃً چھوٹے صوبوں میں عدم شرکت کا احساس ابھرتا ہے، قوم اور فوج[3] میں دوری اور بے اعتمادی بڑھتی ہے۔ سیاسی عمل کے فقدان سے انتشار پسند

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ تحریک جمہوریت اسباب اور مقاصد ص ۹

[2] ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ خطاب ۱۲ جنوری ۱۹۷۲ء و تبصرہ بسلسلہ فیصلہ تحقیقاتی عدالت (ص ۶۲) ۱۹۵۳ء

[3] حالانکہ پاکستان میں فوج بحیثیت ادارہ کبھی اقتدار پر قابض نہیں ہوئی، بلکہ یہ کام چند جرنیلوں ہی نے کیا، مگر ان کی پالیسیوں کے نتیجہ میں لغزشیں بلا وجہ فوج کے کھاتے میں گئیں۔

گروہ ملک میں تخریب کاری اور تشدد کی سیاست کو جنم دیتے ہیں۔ نیز عالمی برادری میں بھی قومی ساکھ کو نقصان پہنچتا ہے۔[1] مرنے سے قبل خاصب جرنیل نے کہا:

"فوج کا کام حکومت کرنا نہیں ہے۔ فوج کے ذمے دو کام ہیں۔ اولاً بیرونی جارحیت کے موقع پر وطن کا دفاع، ثانیاً اندرون ملک امن و امان برقرار رکھنا۔ اس کے علاوہ فوج کا کوئی تیسرا کام نہیں ہے۔ نہ وہ اس کے لئے Trained کی جاتی ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو الجھنیں پیدا ہوں گی۔ اس لئے یہ امر واقعہ ہے کہ فوج کا ملک پر حکومت کے لئے آنا ملک کی بدقسمتی ہوتا ہے"۔[2]

دفاع کا مسئلہ

"فوج کے لئے فوجی نسل کے لوگ ہی موزوں ہیں"۔ قیام پاکستان کے بعد بھی انگریزی دور کے اس فرسودہ نظریہ پر عمل جاری رکھا گیا اور یہ اسی فلسفے کا نتیجہ تھا کہ فوجی خدمات پر بعض مخصوص علاقوں کا اجارہ رہا۔ فوجی بجٹ کے مالی فوائد علاوہ فوجی تربیت کے دوسرے اہم تر فوائد کا بھی کوئی قابل لحاظ حصہ (۱۹۶۵ء تک) مشرقی پاکستان کے لوگوں کو نہیں پہنچا تھا۔ معلوم نہیں ہمارے ارباب اقتدار کے نزدیک سیلون، برما، انڈونیشیا، فلپائن وغیرہ ممالک کے باشندے فوجی نسل سے تھے یا نہیں۔ اگر نہیں تو پھر ان ممالک کو یا تو دفاع کی قوت سے محروم ہونا چاہیئے تھا یا پھر کہیں سے فوجی نسل کے لوگوں کو بلا کر اپنی فوج تیار کرنی چاہیئے تھی اور اگر یہ سب ملک اپنا دفاع خود کرنے کے لائق ہیں تو آخر مشرقی پاکستان کے ہی لوگ فوجی خدمات کے لائق کیوں نہیں تھے۔ ہماری نصف سے زائد یہ آبادی ایک ایسے مختصر سے خطے میں آباد تھی جو تین طرف سے ہندوستان کے چنگل میں تھا اور تقریباً چودہ سو میل کی سرحد کا اس کو دفاع کرنا تھا۔ اگر یہ آبادی خود اپنا دفاع کرنے کے قابل نہ ہو اور اسے ہر

---

[1] میاں طفیل محمد، "جماعت اسلامی اور قومی سیاست"۔ ص ۲۴-۲۵

[2] سابق صدر جنرل یحییٰ خان "انٹرویو"۔ آتش فشاں، لاہور دسمبر ۱۹۷۸ء

لحاظ سے اس کے لئے تیار نہ کر دیا جاتے تو اس کو محض یہ تسلی کہ جنگ کے وقت مشرقی پاکستان کا دفاع مغرب کی طرف سے ہوگا کوئی تسکین نہیں پہنچا سکتی تھی۔ یہ ایک غلط نقطۂ نظر تھا جس سے بڑھ کر شاید ہی کسی دوسری چیز نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بددل کیا ہو[1]

اگرچہ کشمیر کا مسئلہ پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ لیکن مشرقی پاکستان میں بالعموم اسے مغربی پاکستان کا مسئلہ سمجھا گیا۔ اس لئے بھی کہ اصل فورس اور مسلح افواج کے ہیڈ کوارٹرز مغربی پاکستان میں تھے جن میں مجموعی طور پر ۹۰ فی صد افراد کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا[2] ایسے عالم میں ۱۹۶۵ء کی جنگ ستمبر کے موقع پر مشرقی پاکستان کیا کردار ادا کر سکتا تھا۔ جب کہ وہاں پر معقول تعداد میں تینوں افواج (بری، فضائی اور بحری) نہیں تھیں۔ چنانچہ اس جنگ کے دوران پورے سترہ روز مشرقی پاکستان، اسلام آباد سے کٹا رہا۔ اس کیفیت نے مشرقی پاکستان کے عوام میں شدید عدم تحفظ اور تنہائی کا احساس پیدا کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم بھارت کے رحم و کرم پر ہیں۔ چنانچہ اسی جنگ نے مشرقی پاکستان میں خود مختاری کے نعروں کو تحرک (Momentum) عطا کیا[3] اور غالباً پہلی بار کھلے لفظوں میں شیخ مجیب الرحمان نے اس موقع پر گورنر مشرقی پاکستان مسٹر عبدالمنعم خان سے کہا تھا کہ وہ اسی جنگ کے دوران ہی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا اعلان کر دیں[4]

۱۷ روزہ جنگ ختم ہونے کے بعد جب پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر بھٹو نے قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان کے دفاع کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں یہ بتایا کہ "اس جنگ کے دوران مشرقی پاکستان ہندوستان کی دست برد سے محض چین کے باعث محفوظ رہا" تو گویا اس بیان نے مشرقی پاکستان کے عوام کے اندیشوں کی تائید سرکاری سطح پر کر دی اور انہیں یقین ہو

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، "مشرقی پاکستان، حالات و مسائل کا جائزہ اور اصلاح کی تدابیر"۔ ص ۱۶-۱۷

2. Maniruzzaman, "Radical Politics and Emergence of Bangladesh P. 36.

3. Safdar Mahmood, 'Opcit' P. 65.

4. Zulfiqar Ali Bhutto, "The Great Tragedy "P. 59.

گیا کہ" ان کی آزادی کا تحفظ مغربی پاکستان کے حکمران طبقے کا مسئلہ نہیں ہے[1] اور جب ہم واقعی دوسروں کے رحم و کرم پر ہیں تو پھر پاکستان کے اندر رہنے کا کیا فائدہ ؟ مسٹر بھٹو کے اس ایک بیان نے علیحدگی کے رجحان کو ایک ہی جست میں کئی قدم اور آگے بڑھا دیا۔[2]

دفاع مشرقی پاکستان کے مسئلہ پر گہری نظر رکھنے والوں نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ مشرقی پاکستان کو فوجی اعتبار سے جلد از جلد خود کفیل بنایا جائے، کیونکہ اس کے بغیر اس خطہ میں رہنے والے پاکستانیوں کو اپنی آزادی اور بقا کا یقین نہیں ہو سکتا۔[3] اہل دانش نے کھلے الفاظ میں یہ مطالبہ بھی کیا کہ "مشرقی پاکستان کے دفاع کو اس قدر مضبوط بنایا جائے کہ حالت جنگ میں وہ مغربی پاکستان کی مدد سے بالکل بے نیاز ہو سکے اور اس مقصد کے لئے مشرقی پاکستان میں ایک با اختیار کمانڈ قائم کی جائے۔[4] مگر ان تنبیہات اور مطالبات پر کسی نے کان نہ دھرا اور ۱۹۷۱ء میں جب جنگ کا بگل بجا تو مشرقی پاکستان میں دفاعی صورت حال مبالغہ آمیز حد تک قابل رحم تھی۔

چھ نکات

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد روس نے ہر دو ممالک کے درمیان اپنی سرزمین پر ایک سمجھوتہ کرایا جسے "معاہدہ تاشقند" (جنوری ۱۹۶۶ء) کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے کے خلاف پاکستانی عوام نے شدید ردِعمل ظاہر کیا جس پر تمام اپوزیشن پارٹیوں نے لاہور میں پابندیوں کے برعکس چودھری محمد علی کی کوٹھی میں کل جماعتی کانفرنس (فروری ۱۹۶۶ء) منعقد کی۔ تاکہ ملک کی تمام اسلام دوست، جمہوریت نواز پارٹیاں اور آزاد سیاسی عناصر کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے پاکستان کو میدان میں جیتی ہوئی جنگ کو مذاکرات کی میز پہ ہار دینے والی

1 Hasan Askari, "The Military and Politics in Pakistan P. 192.

2 — Safdar Mahmood, 'op cit' "P. 44

3 ابوالاعلیٰ مودودی" "ایضاً" ص ۳۲

4 پروفیسر غلام اعظم "مشرقی پاکستان کے لئے راہ نجات" (۱۹۶۶ء ڈھاکہ) ص ۱۲

ڈکٹیٹر شپ کے پنجہ سے نکالنے کے لئے کوئی متفقہ اور مؤثر پروگرام بنائیں۔ لیکن کانفرنس کے دوران ۶، فروری ۱۹۶۶ء کو شیخ مجیب الرحمان نے موضوع سے ہٹ کر اچانک اپنے چھ نکات جو بادی النظر میں سراسر علیحدگی کا منصوبہ تھا[1] پیش کر دیئے سبھی سیاسی جماعتوں کے قائدین نے ان نکات کی سخت مخالفت کی اور دلائل کے ساتھ انہیں سمجھانا چاہا۔ مگر شیخ مجیب ٹس سے مس نہ ہوئے اور اس بات پر بضد رہے کہ مجھے یہ نکات کانفرنس کے پلیٹ فارم پر پیش کرنے کی اجازت دی جائے جس کی انہیں اجازت نہیں دی گئی، لیکن حزب اختلاف سے دشمنی میں پیش پیش پریس ٹرسٹ کے سرکاری اخبارات نے ان نکات کو مسلسل کئی مہینوں تک خوب اچھالا۔ پاکستان ریڈیو بھی اس موقع پر چپ نہ رہا۔ غرض یہ کہ غنی شدومد سے ذرائع ابلاغ نے ان نکات کے حوالے سے خواہ مخواہ اپوزیشن کی مذمت کی، دوسری جانب ردعمل کے طور پر مشرقی پاکستان میں یہ نکات پھیلتے چلے گئے اور انہیں یقین ہوتا چلا گیا کہ واقعتاً یہ نکات ان کے تمام مصائب کا حل ہیں جبھی تو مغربی پاکستان کا حکمران ٹولہ ان نکات کی اتنی شدت کے ساتھ مخالفت کر رہا ہے۔ اس دوران ایوب خان حکومت کے وزیر خارجہ مسٹر بھٹو نے چیلنج کیا کہ وہ چھ نکات پر مجیب سے "عوامی مناظرہ" کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اُدھر شیخ مجیب ان کو للکارتے رہے: "آؤ مناظرہ کر دیکھیں" یہ چھ نکات کا ملک بھر میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں شہرہ ہوتا چلا گیا۔

---

[1] اس مرحلے پر چھ نکات کے بارے میں ان تمام پارٹیوں نے اپنا ردعمل ظاہر کیا جو کسی نہ کسی شکل میں ملک کے دونوں حصوں میں تھیں کونسل مسلم لیگ کا مؤقف تھا "چھ نکات کنفیڈریشن کا نظریہ پیش کرتے ہیں فیڈریشن کا نہیں"۔ جماعت اسلامی نے اسے "سراسر علیحدگی کا منصوبہ کہا"۔ نظام اسلام پارٹی نے اسے "ایوب خان آمریت کی نئی چال کہا"۔ نیشنل عوامی پارٹی (پیکنگ نواز) نے اسے غیر واضح پروگرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ امید افزا حد تک مشرقی پاکستان کی آزادی کا پروگرام نہیں ہے جبکہ نیشنل عوامی پارٹی (ماسکو نواز) نے چھ نکات کی مکمل تائید کا اعلان کیا۔
(Rounaq Jehan, 'op. Cit " 140, 170).

ابھی تک یہ بات راز ہے کہ ان چھ نکات کا مصنف کون تھا؟ کئی حلقے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایوب خان حکومت کے خلاف حزب اختلاف کی تحریک کو سبوتاژ کرنے کے لئے یہ بیوروکریسی کی سازش تھی اور اس سازش کی خالق ایوب حکومت' بعض کا کہنا ہے ....

کہ ڈھاکہ یونیورسٹی شعبہ سیاسیات کے ریڈر پروفیسر منظور احمد چودھری نے انہیں ترتیب دیا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ مشرقی پاکستان کے ماہر معاشیات رحمان سبحان نے ان نکات کو ترتیب دیا[1] بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو یہ بات طے شدہ ہے کہ ایوب خان کی حکومت نے اپنی عاقبت نااندیشی کے سبب شیخ مجیب کے سیاسی قد کو بڑھایا جس کا خود شیخ مجیب نے یہ کہہ کر اعتراف کیا" ایوب خان نے مجھے مقبولیت کی ایسی معراج پر پہنچا دیا ہے کہ اب کوئی شخص میری مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا۔ کوئی شخص مجھے "نہ" نہیں کہہ سکتا۔[2]

چھ نکات کو تمہید و تعارف کے ساتھ مشرقی پاکستان میں" ہمارا زندہ رہنے کا حق" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔ بیس صفحات پر مشتمل یہ پمفلٹ اپنے اختصار اور استدلال کے لحاظ سے ایک گمراہ کن مگر پُر اثر چیز تھی۔ چھ نکات یہ تھے:۔

۔ طرز حکومت وفاقی و پارلیمانی ہوگا۔"(۱) وفاقی حکومت کے ذمہ صرف دو امور ہوں گے دفاع اور وزارت خارجہ۔ بقیہ تمام امور صوبوں کے سپرد ہوں گے۔(۲) دونوں صوبوں میں ملکی کرنسی الگ الگ ہوگی مگر ان کے تبادلے کا انتظام ہوگا۔ وفاق پاکستان میں شامل رہنے والی ریاست کو ہی ہر قسم کے ٹیکس لگانے کا اختیار ہوگا۔(۳) وفاقی حکومت کسی قسم کا محصول لگانے کی مجاز نہ ہوگی۔(۴) ہر ریاست اپنی بیرونی تجارت کا الگ حساب رکھے گی اور بیرونِ ملک تجارتی معاہدے کرنے میں آزاد ہوگی۔(۵) نیز جو زرمبادلہ آئے گا وہ ریاستوں کے قبضہ میں ہوگا (۶) وہ اپنے ہاں الگ نیم عسکری تنظیم قائم کریں گی[3]

۱۹۶۹ء میں چھ نکات میں کچھ مزید مطالبات سمو دیئے گئے ۔ وقت گزرنے کے

---

1 — Herbert Feldman, "From Crisis to Crisis" P. 183.

۲۔ بریگیڈیئر صدیق سالک "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" ص ۳۱

۳۔ ــــــ ایضاً ــــــ ص ۲۲۱ - ۲۲۳

ساتھ ان نکات کے متن میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔[1] اور یہ نکات اپنی ساخت اور دعوؤں میں بُعد المشرقین رکھنے کے باوجود پراپیگنڈہ کے زور پر پھلتے پھولتے رہے۔ حالانکہ مشرقی پاکستان کے عوام تو درکنار اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ چھ نکات کیا ہیں جن کی وہ تائید کر رہے ہیں؟ صرف پروپیگنڈہ کا ایک طلسم تھا جس نے ان کو مبتلائے فریب کر رکھا تھا۔

بعد ازاں چھ نکات کو ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کے دوران مختصر الفاظ میں "مکمل صوبائی خود مختاری" سے موسوم کیا گیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد ہی صوبائی خود مختاری کے مطالبہ کو مشرقی پاکستان کے درمیانے بورژوا طبقے نے اٹھایا تھا جو اپنے مفادات کے حوالے سے سرمایہ کو مغربی پاکستان جانے سے روکنا چاہتا تھا۔[2] طویل عرصے تک اس مطالبے کی عوام میں کوئی جڑ نہ تھی۔ مگر ۶۹ - ۱۹۶۸ء میں اس مطالبے کا کردار اچانک بدل گیا اور مطالبہ "تحریک" بن گیا۔[3] پھر ہسٹیریائی پروپیگنڈہ کے زور پر نچلے طبقے کے افراد خصوصاً طلبہ، وکلاء، اساتذہ بھی اس کی لپیٹ میں آنا شروع ہوگئے اور یہ لہر مشرقی پاکستان کے عوام کو ایوب خان کی عسکری آمریت کے خلاف بہالے جانے میں ہی کامیاب نہیں ہوئی، بلکہ اس لہر نے خود مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان اعتماد کی فضا کو ہلا کے رکھ دیا۔

اگر تلہ سازش

اس سازش کا انکشاف اس وقت ہوا جب دسمبر ۱۹۶۷ء میں صدر جنرل محمد ایوب خان

---

[1] جسٹس حمود الرحمان: مقدمہ، قرار داد مقاصد سے اسلامی قانون تک - ص ۵

2 - Maniruzzaman, 'Op cit' 'P. , 37.

[3] پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے اتحاد پاکستان تحریک جمہوریت نے (جس میں عوامی لیگ کا ایک دھڑا بھی شامل تھا) صوبائی خود مختاری کے نعرے کا جائزہ لینے کے بعد مشرقی پاکستان کو ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے آئین سے زیادہ اور چھ نکات کے مضر اثرات سے پاک صوبائی خود مختاری دینے کا پروگرام دیا۔ مگر وہ حکومت اور عوامی لیگ کے منفی پروپیگنڈہ کی فضا میں جڑ نہ پکڑ سکا تب چھ نکات ہی مشرقی پاکستان میں آسودگی کا سمبل بنتے چلے گئے۔
(Rounaq Jehan, Op cit 170 – 171.

مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے ۔ وہ ڈھاکہ سے چٹاگانگ کے لئے طیارے میں سوار ہوئے تو اس میں ٹائم بم رکھ دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ صدر کا طیارہ دوران پرواز تباہ کر دیا جائے اور مشرقی پاکستان میں اقتدار پر قبضہ کر کے علیحدگی کا اعلان کر دیا جائے۔ لیکن بروقت پتہ چل جانے سے منصوبہ ناکام ہوگیا۔ سازش میں شریک بائیس افراد کا تعلق پاک بحریہ، پاک آرمی، سول سروس اور پاکستان ایئر فورس سے تھا۔ جب کہ پی آئی اے، عوامی لیگ اور بھارتی قونصل خانے سے متعلق افراد بھی اس سازش میں شریک تھے۔ ڈکٹیٹر شپ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کا اعتماد حکومت سے اٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ سازش میں صداقت ہونے کے باوجود عوام نے اسے تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا اور چھ نکاتی پروپیگنڈے کے پس منظر میں شیخ مجیب کے اس سازش میں ملوث کئے جانے کو انتقامی کارروائی اور سٹنٹ قرار دیا گیا[1]۔ اسی باعث جولائی ۱۹۶۸ء میں جب ڈھاکہ میں اس سازش کے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو دو مختلف ردعمل سامنے آئے۔ حکومت مجیب کو بجا طور پر غدار ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی مگر بعض اخبارات اسے بنگال کا "ہیرو" بنا کر پیش کر رہے تھے۔ اگرچہ ابتدا میں شیخ مجیب کو اس سازش کے حوالے سے مشرقی پاکستان میں نفرت کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر جلد ہی وہ اس مقدمے کے طفیل مقبولیت کے آسمان پر جا پہنچا[2]

سیلابوں کی قہر سامانیاں

مشرقی پاکستان دریاؤں کی سرزمین ہے اور موسم برسات میں دریا موت کے پروانے بن کر ہر سو پھیل جاتے ہیں۔ حکومت پاکستان اور افواج پاکستان ایسے ہر موقع پر اپنے مقدور بھر وسائل کے ساتھ میدان میں اترتیں اور اس کے منفی اثرات کو ہر اعتبار سے زائل کرنے کے لئے کوششیں جاری رکھتیں۔ لیکن علیحدگی پسند عناصر ان آفات آسمانی کو بھی اپنے مقاصد کے

1 – S. M. Zafar " Through The Crisis" p.32.

۲ صدیق سالک ـــــ ایضاً ـــــ ص ۲۱۹

لئے استعمال کرنے سے نہ چوکتے۔ وہ حکومتی اقدامات کو ناکافی اور واموات کی شرح کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرتے۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء کے موقع پر شیخ مجیب الرحمان نے اس مسئلہ کو یہ کہہ کر ایکسپلائٹ کیا کہ "مغربی پاکستان میں تربیلا اور منگلا ڈیم بن سکتے ہیں تو مشرقی پاکستان میں کیوں نہیں بن سکتے مسلسل ۲۳ سال سے ہمارے عوام پانی کی بے رحم موجوں کے ہاتھوں موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں، لیکن مغربی پاکستان ٹس سے مس نہیں ہوتا۔" جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ ایسے بڑے منصوبوں کو روبہ عمل لانے کے لئے پاکستان مکمل طور پر مجبور تھا کہ وہ امریکہ یا اس کے حلیف سرمایہ دار ممالک سے ان کی شرائط پر قرض لے۔ قرض دینے والے ان ممالک یا ان اداروں نے ہمیشہ یہ شرط عائد کی کہ یہ سرمایہ مغربی پاکستان ہی میں خرچ کیا جاسکے گا۔ اس طرح ان ممالک نے اپنی دور رس پالیسی کے تحت علیحدگی پسند عناصر کے ہاتھوں میں ایک ایسا زبردست کوڑا تھما رکھا تھا کہ جسے وہ جب چاہیں مغربی پاکستانیوں کی پیٹھ پر برسا سکتے تھے۔ دوسری جانب یہی ممالک اندرون خانہ مجیب الرحمان کو یہ یقین دہانی بھی کراتے رہتے تھے کہ سیلابوں کی روک تھام کے لئے اس کی آنے والی حکومت کو ہی قرض دیں گے۔[1]

تعلیم کا المیہ

قیام پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان کے ۱۲۹۰ ہائی سکولوں اور ۴۷ کالجوں میں سے پچاسی فیصد ادارے ہندوؤں کے پرائیویٹ انتظام میں تھے۔[2] جب کہ سرکاری مدارس میں بھی ہندو اساتذہ کا تناسب کہیں زیادہ تھا۔ یہ اساتذہ بڑی کاوش سے مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے معصوم ذہنوں میں تشکیک کا زہر گھولتے رہے۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی ثقافت کے بارے میں مسلم طلبا کے ذہنوں میں الجھاؤ اور انتشار پیدا کیا اور اس انتشار نے بالآخر انہیں صراط مستقیم سے بھٹکا دیا۔[3] یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ مشرقی پاکستان میں سرکاری سطح پر پرائمری

1 – Safdar Mahmood, 'Op cit' 'P 85, 86.

2 S. M. Ikram, "Modern Muslim India and Birth of Pakistan," P. 327.

۳۔ صفدر محمود "سقوط مشرقی پاکستان" ص ۳۲

اسکول نہ تھے بلکہ پرائیویٹ طور پر قائم تھے، البتہ حکومت انہیں مالی امداد دیا کرتی تھی، اور تعلیمی بجٹ کا ایک بڑا حصہ ان اسکولوں پر صرف ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان اسکولوں کے انتظام میں حکومت کو کوئی دخل حاصل نہ تھا۔ چنانچہ ان مدارس کی ہندو انتظامیہ اپنا سٹاف خود بھرتی کرتی تھی۔ جو زیادہ تر ہندو اساتذہ پر ہی مشتمل تھا اور یہ حقیقت بھی غور و فکر کی مستحق ہے کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد ہندو اساتذہ اور پروفیسروں کی اکثریت جو اسکولوں کالجوں اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں موجود تھی۔ مشرقی پاکستان ہی میں رہی[1] لیکن انہوں نے اپنے خاندان اور گھرانے مغربی بنگال (بھارت) منتقل کر دیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ محض اتفاقی امر نہیں تھا، بلکہ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسروں نے (جہاں ۹۰ فی صد تدریسی اسٹاف ہندو تھا) نہایت ہوشیاری سے طلبہ کو یہ ذہن نشین کرایا۔

۱۔ پاکستان کا معاشی طور پر مستحکم اور قائم رہنا ناممکن ہے۔

۲۔ غیر بنگالیوں کا مقصد مشرقی پاکستان کو اپنی نوآبادی بنانا ہے۔

اساتذہ کی جانب سے ان نظریات کی مسلسل تشہیر نے آخر اپنا اثر دکھایا اور بے اطمینانی نے طلبہ ذہنوں میں اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا۔[2]

ایک اور شرمناک حقیقت تعلیم کے السلے میں یہ بھی تھی کہ بیشتر درسی کتابوں کے مضامین تک کلکتہ سے لکھوائے جاتے رہے اور یہ کتابیں ۱۹۷۰ء تک مشرقی پاکستان میں پڑھائی جاتی رہیں۔[3] گویا پاکستان کی نئی نسل پاکستان کے دشمنوں کی تصنیف کردہ نصابی کتابیں پڑھتی رہی۔ نائی کلاس کی گرائمر اور کمپوزیشن کی ایک مقبول نصابی کتاب میں قواعد کی وضاحت کے لئے جو جملے درج تھے ان میں زیادہ تر نام ہندو تھے۔ مثلاً "کوشلیا" یہ کام کر رہی ہے۔" رام" وہ

---

1 Jyotisen Gupta, "Eclipse of East Pakistan, "(Calcutta) P. 105.

2 - Maswani A. K. 'Op cit' P. 105

[3] مسعود مفتی "حدیث غم دل" اردو ڈائجسٹ، لاہور دسمبر ۱۹۷۳ء

کام کر رہا ہے۔ تاریخ کی تمام کتابوں میں ۱۹۴۰ء کی قرار داد کا ذکر تو تھا، لیکن ۱۹۴۶ء کی قرار داد کا ذکر یا تو نظر انداز کر دیا گیا تھا یا بہت سرسری انداز میں کیا گیا تھا۔ تاریخ کی ایک اور درسی کتاب میں جو تصاویر دی گئی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی تصویر شیواجی مرہٹہ کی تھی یا ہندو نواز مغل بادشاہ اکبر اعظم کی، جس کی پالیسیوں کو بہت سراہا گیا تھا۔ ان کے مقابلہ میں مسلمان شخصیتوں کی تصاویر کم اور غیر نمایاں دی گئی تھیں۔ مسلمان سلاطین اور مغل بادشاہوں (ماسوا اکبر اعظم) کا ذکر حریفانہ انداز میں کیا گیا تھا۔ وہ درسی کتب جو بنگلہ زبان میں تھیں ان میں شعوری طور پر ہندی اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کئے جاتے تھے [1]

۱۹۶۷ء کے دوران ایوب حکومت نے تعلیمی اداروں میں ایک کتاب "دلیو کرسٹی" یا دلیو کرستی ادھرتی اور لوگ، ثانوی درجے کے نصاب میں شامل کی تاکہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان تہذیبی و نظریاتی رشتوں کو اجاگر کیا جاسکے۔ عوامی لیگ کے ایماء پر اشتراکی اور قوم پرست طلبہ اس کتاب کو نصاب سے خارج کرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حتیٰ کہ اس تحریک میں صوبے کے سیاستدان، شاعر، ادیب، صحافی اور دانشور بھی شامل ہوگئے۔ نتیجتہً صوبائی حکومت نے اس کتاب کو نصاب سے خارج کر دیا۔ اس اقدام سے نہ صرف حکومت کی کمزوری عیاں ہوگئی، بلکہ ایک ناجائز مطالبے کی منظوری نے علیحدگی پسند سیاستدانوں کو بھی حوصلہ بخشا۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں حالت یہ تھی۔ بقول کرنل بشارت سلطان ۱۹۷۰ء میں جب وہ ڈھاکہ یونیورسٹی گئے تو ان کو وائس چانسلر نے بتایا کہ تاریخ پاکستان کے یونیورسٹی معیار کے امتحان کے لئے ہم نے تاریخ کا جامع کورس وضع کیا تو طالب علموں نے اسکو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ہم نے کورس کم کر کے محض ایک کتاب کے چار ابواب رکھ دیئے، مگر طالب علم اس پر بھی تیار نہ ہوئے۔ ناچار پہلے اس کتاب سے دو اور پھر ایک باب کو کورس قرار دیا گیا مگر وہ اب بھی اسے قبول کرنے کو تیار نہ

[1] مسعود مفتی "حدیثِ غمِ دل" اردو ڈائجسٹ، لاہور دسمبر ۱۹۷۴ء

تھے۔ لہٰذا ان سے کہا گیا کہ وہ محض چار کلاس لیکچر تیار کر لیں اور اس سے امتحان دے دیں مگر ان کا جواب اب بھی انکار میں تھا۔ چنانچہ کورس کو محض ایک کلاس لیکچر پر محیط کر دیا گیا کہ امتحان دے دیں تو ان کو کامیاب قرار دے دیا جائے گا مگر طالب علموں کا ایجی ٹیشن جاری رہا اور یہ کہا کہ ہم تاریخ پاکستان پر کچھ بھی نہیں پڑھنا چاہتے [11] بہت تلخ سہی مگر یہ امر واقعہ ہے کہ حکومت پاکستان نے اپنے قیام کے روز اول سے لے کر ایک بار بھی تعلیم کے مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ حد یہ ہے کہ ملک کے دونوں حصوں کو ایک دوسرے کی زبان اور کلچر سے روشناس کرانے کی کوشش تک نہیں کی گئی۔ مغربی پاکستان کی سب سے بڑی درس گاہ پنجاب یونیورسٹی میں فارسی، عربی، انگلش کے علاوہ روسی، ترکی، فرانسیسی جرمن اور جاپانی جیسی زبانیں پڑھانے کا انتظام تو موجود تھا، لیکن ملک کی چھپن فی صد آبادی کی مادری زبان بنگلہ کو متعارف کرانے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا [12] تحریک پاکستان کے عواقب و عوامل، اس کے پس منظر اور جدوجہد پر ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی جو ابتدائی کلاسوں میں بچوں کے ذہنوں کو پاکستانی بنا سکتی۔ پھر ہماری نئی نسل کو پاکستان کی بنیادی باتیں سرے سے معلوم ہی نہیں تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی (اور افسوس ہے کہ آج بھی نہیں جانتی) کہ پاکستان کی بنیادوں میں کتنے شہیدوں کا لہو شامل ہے۔ کیا ہمارے ماہرین تعلیم کی اس اہم ذمہ داری سے غفلت کا یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ وہ بھی سقوطِ مشرقی پاکستان کی اس سازش میں برابر کے شریک تھے ؟ [13] ہرچند کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد جس بات کی سب سے پہلے ضرورت تھی وہ یہی تھی کہ نظام تعلیم کو تبدیل کیا جائے۔ لیکن محب وطن عناصر کی جانب سے بار بار توجہ دلانے کے باوجود نظام تعلیم میں کوئی تغیر نہ کیا گیا۔ چنانچہ جو تعلیم یہاں دی جا رہی تھی وہ لادینیت کی تعلیم تھی۔ اس کے اندر سب کچھ تھا، مگر خدا نہ تھا۔ خدا کا

---

[11] محمد ایوب: "مشرقی پاکستان ۱۹۷۰ء کے انتخابات" (غیر مطبوعہ مقالہ) ص ۳۵-۳۶

[12] مہدی حسن: "مشرقی پاکستان کی علیحدگی: ذرائع ابلاغ کا کردار" ص ۸۰

[13] پنجاب یونیورسٹی: "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد ۱۲، ص ۳۷-۲۳۶

رسولؐ اور خدا کی کتاب نہ تھی۔ لازمی طور پر اس ماحول میں مشرقی پاکستان سے جو نسلیں اٹھیں ان کے اندر بنگالیت کا احساس پیدا ہوا اور بنگالیت کے ساتھ ہندومت کے اثرات پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ یہاں تک کہ ذہنی طور پر بنگالی مسلمان نوجوان اور ہندو نوجوان کے درمیان کوئی وجہ امتیاز باقی نہ رہی، نہ صرف مردوں میں بلکہ جو عورتیں بھی نئی تعلیم پانے والی تھیں ان میں اور نئی تہذیب اختیار کرنے والی ہندو بنگالی عورت میں بظاہر کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔[1]

ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ ایک پاکستانی طالب علم ہونے کی حیثیت سے اپنی شناخت کی ضرورت تھی اور شناخت فقط اپنے نصاب تعلیم کے ذریعے ہی ممکن تھی، لیکن افسوس کہ ہمارے نصاب تعلیم ہی نے ہمیں اپنی شناخت سے محروم کر دیا۔ یہ نصاب تعلیم ہمارے ملک میں ذہنی اور فکری انتشار کے سوا اور کچھ پیدا نہیں کر سکا۔ حالانکہ تعلیم کا پودا جب تک روایت کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر پروان نہیں چڑھتا اور اس نظریئے کا رس اس کے رگ و پے میں نچوڑا نہیں جاتا، تب تک ایک شخص بھی سرحد پر خوشی سے مرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

مسٹر نور الامینؒ مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ (۱۹۴۸ - ۵۴ء) رہے۔ انھوں نے سقوط ڈھاکہ کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی تھی اور مشرقی پاکستان کے ہندو اساتذہ نے طلباء کو گمراہ کرنے اور ان میں علاقائی تعصبات پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔[2]

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے آنے والے خطرے سے خبردار کرتے ہوئے بہت پہلے جولائی ۱۹۵۶ء میں ڈھاکہ میں فرمایا تھا: "یہاں اسلام کے خلاف وسیع پیمانے پر زیر زمین پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے جو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان بنیادی رشتہ اور پاکستان کے وجود

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ، "خطاب بہ مرکزی مجلس شوریٰ"، ۱۲ر جنوری ۱۹۷۲ء، ص ۷ - ۸

[2] صفدر محمود "سقوط مشرقی پاکستان"۔ ص ۴۷

کی واحد اساس ہے۔ اس پروپیگنڈے کی پشت پر ہندو اور کمیونسٹ دماغ ہیں اور اس کے آسان شکار وہ طلبہ ہیں جنہیں اسلامی تعلیم نہیں دی جاتی اور جن کے ذہن کی "تربیت" غیر مسلم اور دشمن اسلام پریس، تعلیم، ادبیات اور اساتذہ کے ذریعے ہوتی ہے[1]
کاش اس آواز پر کان دھرے جاتے !

ڈھاکہ یونیورسٹی کا معاملہ

جب انگریزوں نے ۱۹۱۱ء میں ہندوؤں کی جانب سے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا مطالبہ تسلیم کر لیا تو انہوں نے آزردہ خاطر مسلمانوں کی اشک شوئی کی ایک کوشش کے طور پر ڈھاکہ میں ایک یونیورسٹی قائم کر دی جس کا مطالبہ ایک عرصے سے مسلمان کر رہے تھے۔ مسلم لیڈروں کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ کی طرح ڈھاکہ یونیورسٹی سے بھی ایسے افراد تعلیم پا کر نکلیں جو ذہن و فکر کے اس سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں جو مسلم قومیت کے تصور کا حامل ہو۔ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس یونیورسٹی میں تعینات اساتذہ کی اکثریت ہندو تھی اور یہ صورتِ حال اس وقت سے لے کر . . . سقوطِ ڈھاکہ تک برقرار رہی، یہ اساتذہ مسلمان لیڈروں کے مذکورہ عزائم یا خواہش سے ناواقف نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی کہ مسلم قومیت کے تصور کی بجائے بنگلہ قومیت کے تصور کو نوجوانوں کے ذہن میں اتار دیا جائے اور وہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب رہے۔ مسلمان نوجوانوں میں ہندو کلچر، ہندو تہذیب اور ہندو اقدار، بنگالی کلچر، بنگالی تہذیب اور بنگالی اقدار کے نام سے سرایت کر گئیں۔

افسوسناک صورتِ حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی نے ۴۹-۱۹۴۸ء میں جادو ناتھ سرکار کی تاریخ بنگال (مسلم دور) جلد دوم خود شائع کی۔ یہ کتاب متعصبانہ خیالات اور توڑ مروڑ کر بیان کئے گئے واقعات کا مجموعہ تھی۔ اس کتاب کی اشاعت سے اس اثر و رسوخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو تدریسی عملہ کے ہندو ممبران نے ڈھاکہ یونیورسٹی کی

---

[1] حفیظ الرحمن احسن "جماعت اسلامی اور مشرقی پاکستان"۔ ص ۲۷-۳۵

تعلیمی اور دوسری پالیسیوں پر قائم کر رکھا تھا[1]

ہندو اساتذہ کے طلبہ پر کنٹرول کا اندازہ لگانے کے لئے اس ایک واقعہ کا نقل کر دینا کافی ہوگا کہ "۱۹۵۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں آل پاکستان ہسٹاریکل کانگریس منعقد ہوئی جس کے ایک اجلاس کی صدارت برصغیر کے عظیم مسلمان مورخ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کی۔ شرکاء کی اکثریت ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ پر مشتمل تھی جنہوں نے نہ صرف جلسے کو درہم برہم کیا، بلکہ معزز مہمان پر حملہ آور بھی ہوئے۔ محض اس لئے کہ انہوں نے بنگال میں ہندو تعصب اور مسلم دشمنی کی تاریخ اور مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی نشاندہی کی تھی۔ یہ ایک مظاہرہ ارباب حکومت کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہونا چاہیئے تھا جس سے بہ طور ظاہر ہوگیا تھا کہ مشرقی پاکستان کی تعلیمی دنیا میں ہوا کس رخ پر چل رہی ہے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں روزنامہ "آزاد" ڈھاکہ نے لکھا تھا "ڈھاکہ یونیورسٹی شعبہ بنگلہ زبان وادب کے سربراہ نے ایک ایسے فرد کو بنگلہ زبان پڑھانے کے لئے مقرر کیا ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ تقسیم کے باوجود بنگالی قوم تقسیم نہیں ہوتی اور بنگال کے دونوں حصوں کا نظریہ حیات، تعلیم، تمدن، ادب اور زبان ایک ہیں اور اسے ایک رکھنے کی تحریک جاری رہنی چاہیئے"[2]

غرض یہ کہ ۱۹۵۳ء تک ہندو پروفیسروں نے وہ کام کر لیا تھا جس کی خاطر وہ تقسیم کے وقت یہیں رہ گئے تھے۔ ان کے تیار کردہ نوجوانوں کی ایک کھیپ تعلیمی اداروں سے عملی میدان میں پہنچ چکی تھی جو ڈگریوں اور سرٹیفکیٹوں سے ہی لیس نہیں تھے، بلکہ ان کے دل غیر بنگالیوں اور مغربی پاکستان کے شہریوں کے لئے شدید نفرتوں سے لبریز تھے۔ اب مشرقی پاکستان میں مسلم قومیت کے تصور کے حامل بنگالی ان کی نفرتوں کا ہدف تھے اور مغربی بنگال میں بولی جانے والی عربی وفارسی الفاظ سے پاک" سنسکرت زدہ بنگلہ پڑھی لکھی نئی نسل کی محبوب زبان تھی

---

1 Maswani A.K., "opcit" p.111

[2] چودھری علی احمد خان ـــ ایضاً ـــ ص ۳۲، ۹۰

طلبہ تنظیموں کا کردار

مشرقی پاکستان کی سیاست میں طلبہ تنظیموں[1] نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان طلبہ تنظیموں میں سے کچھ اتنی مضبوط تھیں کہ انھوں نے ایک مؤثر پریشر گروپ سے بڑھ کر مضبوط سیاسی جماعت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یہ تنظیمیں اپنی اپنی ممدوح سیاسی جماعتوں سے پالیسیاں حاصل کرتیں اور ان کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فعال کردار ادا کرتیں۔ ان کا مختصر جائزہ نیچے دیا جا رہا ہے

ایسٹ پاکستان مسلم اسٹوڈنٹس لیگ (EPMSL) آزادی سے پہلے اس تنظیم کا نام "آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس لیگ" تھا تحریک پاکستان میں اس نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اس کو یہ نیا نام دیا گیا۔ یہ تنظیم مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ تھی۔ ۱۹۵۴ء تک یہ تنظیم عملاً غیر مؤثر ہو گئی تھی۔

ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس فیڈریشن (EPSF) ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ تنظیم "انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن" کے نام سے برسرعمل تھی۔ اس کی ہمدردیاں کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ تھیں۔ ۱۹۵۱ء سے یہ تنظیم یوتھ لیگ میں ضم ہو گئی۔

ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس کانگریس (EPSC) ۱۹۴۷ء سے پہلے "بنگال سٹوڈنٹس کانگریس" کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ اس کا نظریاتی الحاق کانگریس کے ساتھ تھا۔ ۱۹۶۲ء کے بعد یہ تنظیم عملاً ختم ہو گئی اور اسٹوڈنٹس یونین سے مل گئی

ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ (ESPL) ۱۹۵۳ء میں ایسٹ پاکستان "مسلم سٹوڈنٹس لیگ" تین حصوں میں تقسیم

---

[1] ترقی پذیر ممالک میں طلبہ تنظیموں کے کلیدی کردار کے حوالے سے مشرقی پاکستان کی طلبا تنظیمیں ایک مستقل تحقیقاتی و تجزیاتی مطالعہ کی متقاضی ہیں ہم سر دست حوالے کے لئے ہم ان مآخذ کی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں: جب وہ ناظم اعلیٰ تھے "حصہ اول، دوم، مرتبہ، تاریخ جمعیت کمیٹی" مشرقی پاکستان میں طلبہ تحریک" مطیع الرحمان نظامی، مجلہ "ہم قدم" مارچ ۱۹۶۴ء Maniruzzaman "Radical Politics and Emergence of Bangladesh" "محور" صد سالہ نمبر پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۲ء

ہوگئی تھی۔ ایک گروپ ۳ ۱۹۵ء میں ہی ختم ہوگیا۔ دوسرے دو گروپوں نے "ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس فورس" اور "ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ" کی شکل اختیار کرلی۔ موخر الذکر تنظیم کی سرپرستی مسٹر حسین سہروردی نے کی[1] بعدازاں یہ تنظیم علیحدگی کی تحریک میں ہیرو بن کر ابھری بنگلہ زبان میں اس کا نام "پوربو پاکستان چھاترو لیگ" تھا۔

ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس یونین (EPSU) اپریل ۱۹۵۲ء میں کمیونسٹ طلبہ نے اسے منظم کیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں اسٹوڈنٹس لیگ اور یوتھ لیگ کے انتہاپسند بھی اسی میں شامل ہوگئے۔ یہ نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) کی تعلیمی اداروں میں ایک مضبوط تنظیم تھی جو کہ "پوربو پاکستان چھاترو یونین" کے نام سے معروف تھی۔ پھر اس کے دو گروپ ہوگئے۔ ایک ماسکو نواز، دوسرا پیکنگ نواز، ثانی الذکر گروپ کو حقیقی معنوں میں اکثریت حاصل تھی۔

ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس فورس (EPSF) "مسلم سٹوڈنٹس لیگ" کا ایک دھڑا ۱۹۵۳ء میں اس نام سے معرض وجود میں لایا گیا۔ اس کی ہمدردیاں "خلافت ربانی" پارٹی کے ساتھ تھیں۔ ۱۹۶۲ء کے بعد یہ تنظیم غیر مؤثر ہوگئی۔

اسلامی چھاترو شنگھو (اسلامی جمعیت طلبہ) (ICS) ۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں قائم ہوئی اور اس نے ۱۹۵۰ء سے مشرقی پاکستان میں کام کا آغاز کیا۔ اسٹوڈنٹس لیگ اور اسٹوڈنٹس یونین کے مقابلہ میں اسی تنظیم نے اسلامی انقلاب اور متحدہ پاکستان کے لئے آخر وقت تک جدوجہد کی۔ "البدر" اسی تنظیم کے کارکنوں پر مشتمل تھی۔ اس کی نظریاتی وابستگی مولانا مودودیؒ کے ساتھ تھی۔

نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) ۱۹۵۸ء کی مارشل لاء حکومت نے اپنے حامی بنگالی طلبہ کو گورنر مشرقی

---

1 Jyotisen Gupta "opcit" p.10.

پاکستان عبدالمنعم خان کی زیر سرپرستی "نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن" کے نام سے منظم کیا۔ عبدالمنعم خان کا بیٹا اس کا چیئرمین تھا۔[1]

جمعیت طلبہ عربیہ (JTA) یہ تنظیم دینی مدرسوں کے طلبہ پر مشتمل تھی۔ ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں اس نے عوامی لیگ کی حمایت کی تھی لیکن اس کا یہ کردار اس وقت تبدیل ہو گیا جب ۱۹۶۲ء میں اس کا کنٹرول اسلامی جمعیت طلبہ نے سنبھالا۔ بعدازاں یہ تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کی برادر تنظیم کے طور پر کام کرتی رہی۔[2]

یوتھ لیگ اگرچہ یہ طلبہ تنظیم نہیں تھی لیکن اس کا بہت گہرا تعلق نوجوانوں اور طلبہ سے رہا ہے اس لئے ہم اس کا تعارف طلبہ تنظیموں کے ذیل میں ہی کر رہے ہیں۔ یوں تو ۱۹۴۸ء سے ہی مشرقی پاکستانی طلبہ میں مغربی پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کے لئے ہندو اشتراکی قوم پرست اتحاد نے کام شروع کر دیا تھا لیکن ۱۹۵۱ء میں کمیونسٹ پارٹی نے نوجوانوں کی ایک باقاعدہ تنظیم "یوتھ لیگ" (Youth League) کے نام سے قائم کی۔ ۱۹۵۲ء کی بنگلہ زبان تحریک میں جو ایکشن کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ اس کے بارہ ممبران میں سے چار کا تعلق یوتھ لیگ سے تھا۔ کلکتہ کے اخبار (Swadhinta) کی طرف سے دعویٰ کیا گیا تھا کہ مارچ ۱۹۵۲ء میں زبان کی تحریک "پہلے کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے ہی منظم کی گئی تھی۔ اس تحریک میں تین طلبہ کے مارے جانے کے بعد یوتھ لیگ کے تقریباً تین چوتھائی ممبران گرفتار کر لئے گئے تو باقی ماندہ ممبران "ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین" میں گھس گئے جو بائیں بازو کی مؤثر ترین نرسری تھی۔[3]

اسلامی جمعیت طلبہ اور جمعیت طلبہ عربیہ کے علاوہ دوسری تمام طلبہ تنظیموں میں ہندوؤں کو اہم مقام حاصل تھا اور طالبات کی ممبرشپ اور قیادت بھی انہی تنظیموں کے

---

1. ہفت روزہ "الفتح" کراچی ۱۴ر نومبر ۱۹۷۱ء اور Rounaq Jehan "opcit" p.64
2. Jyotisen Gupta "opcit" p..10,11.
3. Maniruzzaman "opcit" p.6,7.

ہاتھ میں تھی۔

جمعیت نے ۱۹۵۰ء میں

اسلامی جمعیت طلبہ، فکر و کردار، طائرانہ جائزہ مشرقی پاکستان میں کام

شروع کیا لیکن ابتدا میں یہاں کے جذباتی قوم پرستانہ ماحول نے اس واحد مثبت تنظیم کو زیادہ پھیلنے پھولنے کا موقع نہ دیا کیونکہ اس کی پالیسیاں قوم پرست اور سیکولر طلبہ تنظیموں سے مختلف اور متحدہ پاکستان کے نظریے پر مشتمل تھیں۔ ابتداءً اس کی غیر بنگالی قیادت بھی جمعیت کی مقبولیت کے آڑے آئی۔ ۱۹۵۶ء میں جب سید محمد علی اس تنظیم کے پہلے بنگالی ناظم منتخب ہوئے تو اس تنظیم نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔ اسی سال جداگانہ انتخابات کی تحریک شروع ہوئی تو اسلامی چھاترو شنگھو (اسلامی جمعیت طلبہ) واحد طلبہ تنظیم تھی جس نے اس کی حمایت کی۔

۱۹۶۲ء میں اسلامی جمعیت طلبہ نے اسٹوڈنٹس لیگ اور سٹوڈنٹس یونین سے تعاون کیا اس طرح نام نہاد قومی تعلیمی رپورٹ کے خلاف تحریک شروع کی اور حکومت کو رپورٹ واپس لینے پر مجبور کر دیا[1]

۱۹۶۶ء میں جب شیخ مجیب الرحمان "چھ نکات" کو لے کر علیحدگی کے راستے پر مزید آگے بڑھے تو اسلامی جمعیت طلبہ ہی وہ تنظیم تھی جس نے ان نکات کی اس بنا پر کھل کر مخالفت کی، کہ ان نکات کا راستہ مشرقی پاکستان کی مکمل علیحدگی کی منزل تک جاتا ہے۔

۱۹۶۸ء کے آخر میں جب ڈھاکہ یونیورسٹی کے نائب صدر طفیل کی نگرانی میں "اسٹوڈنٹس لیگ" اور "سٹوڈنٹس یونین" کے لیڈروں نے ایوب حکومت کے خلاف تحریک شروع کرنے کے لئے سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی منظم کی، تو اسلامی جمعیت طلبہ نے بھی ان تنظیموں کی دعوت پر ایکشن کمیٹی کے تشکیلی اجلاس میں شرکت کی۔ جمعیت نے ایکشن کمیٹی میں شمولیت کے لئے یہ شرط عائد کی کہ "طلبہ کے اس اتحاد کو اپنے پروگرام میں چھ نکات شامل نہیں کرنے چاہئیں"، مگر اس

---

[1] مطیع الرحمان نظامی "مشرقی پاکستان میں طلبہ تحریک" مجلہ "ہم قدم" مارچ ۱۹۷۴ء

مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا نتیجتاً اسلامی جمعیت طلبہ نے ایک علیحدہ ایکشن کمیٹی بنائی۔ ۸ نکاتی پروگرام تشکیل دیا اور ایوب خان آمریت کے خلاف جدو جہد کی۔

۱۹۷۰ء میں جب پاکستان دشمن تحریکوں نے کھلم کھلا طلبہ کو تخریب پاکستان اور تخریب فکر کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا تو نا اہل حکومتی مشینری اس صورتِ حال کا مقابلہ نہ کر سکی اور نہ کر سکتی تھی، ویسے بھی پاکستان کی مرکزی و صوبائی حکومتوں کو صورتِ حال بہتر بنانے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اہل صحافت اور اہل سیاست کا پہیہ بھی اُلٹا چل رہا تھا چنانچہ تخریبی عناصر سے نمٹنے کے لئے اسلامی جمعیت طلبہ مردانہ وار میدان میں اتری۔ اور اگست ۱۹۶۹ء میں اپنے بہترین قائد محمد عبدالمالک کی قربانی پیش کر کے پاکستان میں کرسی، قلم اور عوام کو جھنجھوڑا، مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس بے اعتنائی اور سرد مہری کے باوجود ۱۹۷۱ء میں سالمیت پاکستان کی جنگ میں جمعیت کے نوجوان بے خطر کود پڑے اور البدرؔ و الشمسؔ کی صورت میں ہزاروں نوجوانوں نے اسلام اور وطن پر اپنی جان نثار کر دی[1]۔

دوسری طلبہ تنظیمیں، فکر و کردار، ایک طائرانہ جائزہ

۱۹۶۸-۶۹ء کی ایوب مخالف عوامی تحریک میں بائیں بازو کے طلبہ نے مرکزی کردار ادا کیا۔ سٹوڈنٹس یونین کے دونوں گروپوں (ماسکو نواز۔ بیکنگ نواز) اور سٹوڈنٹس لیگ نے سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کے نام سے مشرقی پاکستان میں تحریک شروع کی جس کا گیارہ نکاتی پروگرام بائیں بازو کی انتہائی انقلابیت اور بنگالی قوم پرستی و صوبائی خود مختاری کا آئینہ دار تھا۔

ایوب حکومت کی سرپرستی میں جو نام نہاد طلبہ تنظیمؔ این۔ ایس۔ ایفؔ منظم کی گئی تھی وہ لاکھی، اخلاقی طور پر بے راہ رو اور پیشہ ور طلبہ پر مشتمل تھی اور پولیس و انٹیلی جنس ان کے شرمناک جرائم اور دہشت گردی کی وارداتوں میں معاون بنتے تھے۔ اس تنظیم کے آتشیں اسلحہ سے مسلح غنڈے یونیورسٹی کیمپس میں جاتے، اپنے مخالف طلبہ کو بڑی بے دردی سے پیٹتے اور

---

[1] اس ضمن میں تفصیل باب صفحہ ۱۵۹ سے ملاحظہ فرمائیں۔

جان سے مار دینے میں بھی کوئی خوف محسوس نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ ایک مرتبہ انھوں نے اقبال ہوسٹل کی چوتھی منزل سے ایک طالب علم کو نیچے پھینک دیا جو موقع پر ہی جاں بحق ہوگیا۔ ۱۹۶۴ء کے الیکشن میں ان غنڈوں نے ایوب خان کی بہت مدد کی اور ۱۹۶۶ء میں معاہدہ تاشقند کو بھی انھوں نے خوش آمدید کہا۔[1]

جب کہ اسٹوڈنٹس لیگ نے شیخ مجیب کے چھ نکاتی فارمولے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے اور شہرت دلانے کے لئے وسیع پیمانے پر مہم شروع کی اور عین انہی ایام میں دیگر تعلیمی اداروں کی طرح "ڈھاکہ یونیورسٹی" میں بھی ماؤزے تنگ کے افکار و اقوال پر مشتمل کتابوں اور کتابچوں کی بارش ہونے لگی، جسے یونیورسٹی انتظامیہ شکریے کے ساتھ شرف قبولیت بخشتی رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ کتب کسی آئینی انقلاب کا نہیں بلکہ پرتشدد انقلاب کا درس دیتی تھیں۔[2]

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں عوامی لیگ کے نامزد کردہ تیس سال سے کم عمر کے ۱۸ امیدواروں میں سے تین کا تعلق سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی سے تھا۔ جب کہ سٹوڈنٹس لیگ اور سٹوڈنٹس یونین اپنی اپنی ممدوح پارٹیوں میں عملاً ضم ہوچکی تھیں۔ بس ظاہری طور پر ناموں کی علیحدگی کا تکلف تھا۔ بڑے بڑے تعلیمی اداروں نے عوامی لیگ کی انتخابی مہم کے مراکز کی حیثیت اختیار کرلی تھی اساتذہ کی استادی نے خوب رنگ جمایا اور بنگلہ قومیت کا ناگ پھن پھیلاتا چلا گیا چنانچہ تحریک سول نافرمانی (مارچ ۱۹۷۱ء) کے دوران ڈھاکہ یونیورسٹی کا گراؤنڈ، اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال عملاً ایک باغی چھاؤنی اور اسلحہ خانے میں تبدیل ہوگئے۔ اب اندھے جذبات سے مغلوب نوجوانوں کے ہاتھ میں آتش و آہن کی خطرناک طاقت تھی۔ اسی مہینے سٹوڈنٹس لیگ اور سٹوڈنٹس یونین نے ڈھاکہ میں ایک ریلی کے دوران شیخ مجیب الرحمان کی موجودگی میں بنگلہ دیش کا جھنڈا فضا میں لہرایا۔ ۶ مارچ کو سنٹرل جیل کے گیٹ توڑ دیئے گئے اور تمام اخلاقی مجرموں کو رہا کرایا گیا۔ رہا ہونے والے قیدی اس باغیانہ تحریک میں شامل ہوگئے اور پاکستان کی

---

[1] ہفت روزہ "الفتح" کراچی ۴ر نومبر ۱۹۷۱ء

[2] ابوالاعلیٰ مودودی "تصریحات" طبع سوم ص ۴۴۱

حمایت میں بلند ہونے والے نعروں کو دبانے کے لئے ڈھاکہ کی گلیوں میں دندناناشروع کر دیا۔چنانچہ ۲۳ مارچ کو خوفزدہ لوگوں نے اپنے گھروں پر پاکستانی پرچم کی بجائے بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا جو لاکھوں کی تعداد میں پہلے سے تیار کر کے پورے صوبے میں پھیلایا گیا تھا۔

برہمن ذہن، ماؤ کے فکر اور عوامی لیگ کی قیادت سے متاثر مکتی باہنی کے یہ لاکھوں دہشت گرد کارندے اور گوریلے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی نرسری ہی میں پروان چڑھے تھے۔ یہی وہ ادارے ہیں جنہیں روز اوّل ہی سے پاکستان کی قیادت نے نظر انداز کیا اور اسلامی و پاکستانی سوچ پیدا کرنے کا کبھی نہ سوچا۔ نتیجتاً وہ اسلام اور پاکستان سے دشمنی کی منظم و مؤثر تربیت گاہیں بن گئیں۔

مخلوط انتخابات

قیام پاکستان کی جدوجہد میں آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اختلافات کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ کانگریس مخلوط انتخابات (Joint Electorate) کی اور مسلم لیگ جداگانہ انتخابات (Separate Electorate) کی حامی تھی۔ مخلوط انتخابات کا مطلب یہ ہے کہ ایک ملک میں لبنے والے تمام باشندے بلا اختلافِ مذہب و عقیدہ ایک قوم ہیں۔ کانگریس اسی تعریف کے تابع متحدہ ہندوستانی قومیت کا نعرہ لے کر اٹھی تھی۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا تصور یہ تھا کہ قومیت وطن کی بنیاد پر نہیں، بلکہ مذہب اور عقیدے کی بنیاد پر استوار تھی۔ اس لئے مسلمان بلحاظ عقیدہ الگ قوم ہیں اور اسی اعتبار سے انہیں تمام انتخابات میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے الگ اور جداگانہ نمائندگی ملنی چاہیئے۔ اس تصور کی وضاحت میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا[1]

> "In every way we (the Muslims and Hindus) are different, we can not get together, even only in the Ballot-box".

اسی حکمتِ عملی کے تحت تخلیق پاکستان کے فیصلے کی بنیاد جداگانہ انتخابات تھے نہ کہ مخلوط

1. Quaid-e-Azam "Some Recent Speeches and Writings"

انتخابات۔

پاکستان بننے کے کئی سال بعد تک اس ملک کے کسی گوشے میں مسلمانوں کے کسی بھی سیاسی حلقے کی جانب سے کوئی آواز مخلوط انتخابات کے حق میں نہ اٹھی تھی۔ حتیٰ کہ مشرقی پاکستان میں ۱۹۵۴ء کے انتخابات کے موقع پر بھی کسی سیاسی پارٹی نے مخلوط انتخابات کے سوال کو اپنی انتخابی مہم کا مسئلہ نہیں بنایا تھا، مگر اس دوران جب مشرقی پاکستان مسلم لیگ شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی اور وہاں کی بکھری ہوئی صد مسلم آبادی کی سیاسی قوت چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر عملاً غیر مؤثر ہوگئی تو ہندو جو مشرقی پاکستان کی ۲۵ فیصد آبادی ہونے کے باوجود ایک منظم سیاسی اقتصادی قوت بن چکی تھی۔ مسلمانوں کے سیاسی گروہوں اور طالع آزما سیاستدانوں کو اب اس ہندو اقلیت کی تائید مطلوب تھی۔

ادھر ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ ہندوستان نے جموں و کشمیر، ریاست حیدرآباد (دکن) اور جونا گڑھ و مناودر پر غاصبانہ قبضہ کر کے مسلمانوں کے لہو سے ہولی کھیلی۔ لیکن ادھر مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کو جیتی مخلوق بنا کر رکھا گیا تھا، ان کی ناز برداریاں ہوتیں، وہ صنعت و حرفت اور تمام بڑی جائیدادوں کے مالک تھے، پاکستان کی سول انتظامیہ اور صوبائی سیاسی قوت ان کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ اب مشرقی پاکستان میں ہندو اقلیت کو اس سیاسی اقتدار کی ضرورت تھی جس سے وہ اپنی حلیف سیاسی قوتوں کے ذریعے اسلام، اسلامی ریاست اور پاکستان کی جڑیں کاٹنے کی جرأت اور جسارت کر سکتی۔ اس سیاسی و نظریاتی غداری کے لئے مشرقی پاکستان سے مسلمانوں کے سیکولر اور اشتراکی عناصر نے آگے بڑھ کر ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مخلوط انتخابات کے نعرے میں ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا[1] دوسری جانب مسلم لیگ اور جماعت اسلامی پاکستان جداگانہ طریق انتخابات کی حامی تھیں۔ ان کے نزدیک اقلیتوں کی بہتری، پاکستان کے سیاسی افق پر اقلیتی دباؤ سے بچنے اور منتخب مسلم نمائندوں کی اسلامی نظریۂ حیات سے کمٹمنٹ کے لئے یہ طریقہ

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ مخلوط انتخابات کیوں اور کیسے؟ ص ۳-۲۲

انتخاب مؤثر اور عادلانہ نظام تھا۔ جب کہ مغربی پاکستان سے فوجی اقتدار پسند جرنیلوں اور بیوروکریسی کے گماشتوں کا ووٹ مخلوط انتخابات ہی کے حق میں تھا۔

مشرقی پاکستان کی مؤثر ہندو اقلیت کی خوشنودی اور سیاسی مفاد کے حصول کی خاطر تشکیل پاکستان کے صرف سات سال بعد اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا گیا جس پر اس ملک کی عمارت اٹھائی گئی تھی۔ سیکولر مزاج پارٹیوں نے اب مخلوط انتخابات کی حمایت اور جداگانہ انتخابات کی مخالفت شروع کر دی۔ مخلوط انتخابات اپنے اندر بڑے خطرناک عملی مضمرات رکھتے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ مشرقی پاکستان کی حد تک تمام امور وہاں کی ایک چوتھائی ہندو آبادی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیئے جاتے۔

۱۹۵۶ء میں عوامی مسلم لیگ نے مشرقی پاکستان میں صوبائی وزارت بنائی تو ہندو ارکانِ اسمبلی نے اپنی حمایت کے لئے دو شرطیں پیش کیں۔ اول یہ کہ "عوامی لیگ" سے لفظ "مسلم" نکال دیا جائے، دوم یہ کہ "صوبے کی وزارت خزانہ ہندوؤں کے ہاتھ میں دے دی جائے" چنانچہ یہ دونوں شرائط منظور کر لی گئیں (تب عوامی مسلم لیگ صرف عوامی لیگ رہ گئی۔) ہندوؤں نے ان شرائط کی منظوری کے بعد اپنی ساری جدوجہد کا رُخ مخلوط انتخابات کے نفاذ کا آئینی بل منظور کرانے کی جانب پھیر دیا۔

۱۹۵۶ء میں جب طریقِ انتخابات کی بحث عروج پر تھی تو مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ جداگانہ طریقِ انتخاب کی حمایت اور وضاحت کے لئے مشرقی پاکستانی عوام کے درمیان پہنچے پلٹن میدان ڈھاکہ میں جلسہ عام سے خطاب کرنے گئے، لیکن عوامی لیگی صوبائی وزیر شیخ مجیب الرحمان کی زیر قیادت غنڈوں نے جماعت اسلامی کا جلسہ عام الٹ دیا۔ جماعت کے کئی کارکن زخمی ہو گئے اور مولانا مودودیؒ خطاب نہ کر سکے، بعد ازاں مولانا نے پریس کانفرنسوں اور شہروں کے متعدد اجتماعات میں اپنا مؤقف بیان کیا۔ چودھری محمد علی (سابق وزیر اعظم) بھی جداگانہ انتخابات کی حمایت اور مخلوط انتخابات کی مخالفت کی وجوہ بیان کرنے گئے، لیکن ہندو نواز سیاسی غنڈہ گردی ان کی راہ میں بھی رکاوٹ بنی۔

۱۹۵۶ء میں جب ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا تو ہندوؤں اور سیکولر طبقوں

نے خوف و ہراس کی فضا قائم کر دی۔ اسی دوران پارلیمنٹ میں ایک ہندو ممبر نے اچانک مخلوط انتخابات کا بل پیش کر دیا۔ جو دو گھنٹے کے اندر اندر منظور ہو گیا۔ اس طرح طے کیا گیا کہ "مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی مخلوط طریق انتخابات کے ذریعے اور مغربی پاکستان اسمبلی جداگانہ انتخابات کے ذریعے منتخب ہوگی۔"

اس کامیابی نے ہندوؤں کے حوصلے بڑھا دیئے اور مشرقی پاکستان کی سیاسی اور اقتصادی شہ رگ ان کی گرفت میں آ گئی۔ حتیٰ کہ کروڑوں روپے کا پٹ سن، چاول اور دیگر خام اجناس کھلم کھلا بھارت سمگل ہونے لگیں اور صوبے میں قحط کے آثار نمایاں ہو گئے۔ ناچار وہاں کی حکومت نے سمگلنگ روکنے کے لئے ۱۹۵۷ء میں پاک فوج کی مدد طلب کر لی۔ لیکن ہندوؤں نے صوبائی حکومت پر الٹا دباؤ ڈالا تو اس نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ فوج واپس بلائی گئی اور سمگلروں کے خلاف قائم کردہ مقدمات واپس لے لیے گئے اور سمگلنگ کے خلاف مہم ختم کر دی۔ جس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ رہا کہ اب مٹھی بھر ہندو طبقے کے ہاتھ مرکزی حکومت (وزیر اعظم فیروز خان نون) کو بھی کنٹرول میں لے چکے تھے۔[1]

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات مخلوط بنیادوں پر ہوئے اور ہندو اقلیت نے اپنا سیاسی اور اقتصادی تعاون عوامی لیگ کے پلڑے میں ڈال دیا جو عوامی لیگ کی تحریک کو تقویت بڑھانے میں فیصلہ کن ثابت ہوا۔

معاشی استحصال، ایک جائزہ

بنگلہ زبان میں ایک لفظ ہے "پوش چیما" (Poshchima) جسے اردو میں پچھما (یعنی مغرب سے آنے والا) کہتے ہیں بنگلہ میں یہ لفظ مغرب کی جانب سے آنے والی ان خون خوار سمندری طوفانی ہواؤں کے لئے جو بنگالیوں کا سب کچھ جان، مال اور تمام اسباب بہا کر لے جائیں۔ ۔۔۔ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پھر یہی لفظ علامت کے طور پر برطانیہ (مغرب) سے آکر

---

[1] سید نور احمد "مارشل لاء سے مارشل لاء تک"۔ ص ۴۹۳

برصغیر پر مسلط ہو جانے والے سامراجی حکمرانوں کے لئے استعمال ہونے لگا جو یہاں سے سب کچھ سمیٹ کر برطانیہ لے گئے۔ اس طرح یہ لفظ ظلم، نوآبادیاتی نظام حکومت، استحصال اور ہر نوع کی زیادتی کی علامت (Symbol) بن گیا۔ پاکستان بننے کے بعد سوشلسٹ اور ہندو نیشنلسٹ عناصر نے اسے مغربی پاکستان والوں پر چسپاں کر دیا اور دھیرے دھیرے یہ لفظ شر انگیزی کی حد تک نئے Context میں استعمال ہوتا گیا۔[1]

صحیح صورت حال کیا تھی؟ اسے جاننے کے لئے ہمیں قدرے پیچھے جانا ہوگا۔[2]

برصغیر جنوبی ایشیا کا سب سے پہلا علاقہ جو انگریزوں کے قبضے (۱۷۵۷ء) میں آیا وہ بنگال تھا۔ انگریزوں نے وہاں مسلمانوں کو ہر طریقے سے تباہ و برباد کرنے اور کچلنے کی مسلسل کوششیں شروع کر دیں۔ اس کام میں ہندو ان کے دست راست اور مددگار بنے۔ ایک صدی کے اندر اندر اس علاقہ میں مسلمانوں کی جو حالت ہو گئی اسے ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب (۱۸۷۱) "Our Indian Muslmans" میں اس طرح بیان کیا ہے:

"زندگی کے ہر شعبے اور ہر معزز پیشے کے دروازے مسلمانوں کے لئے بند کر دیئے گئے۔ تعلیم کا ایسا نظام رائج کیا گیا کہ مسلمان اگر اسے قبول کریں تو "نا مسلمان" بنیں اور اگر قبول نہ کریں تو بھوکے مریں۔ بڑے بڑے خاندان جو مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں امراء اور روسا اور اشراف تھے ان کے لئے سر چھپانے تک کی جگہ باقی نہ رہی اور ان کی اولاد کے لئے چپراسی اور خدام کے سوا اور کوئی منصب باقی نہ تھا۔ جن زمینوں کے مسلمان مالک تھے، ان پر پہلے ہندوؤں کو مالگزاری وصول کرنے والے افسروں کی حیثیت سے مقرر کر دیا گیا۔ اور پھر انہی کو زمیندار بنا دیا گیا۔ یوں اپنی ہی زمینوں کے سابق مسلمان مالک ہندوؤں کے کاشت کار (مزارع) بن کر رہ گئے۔"

---

[1] الطاف گوہر "میں نے مشرقی پاکستان کو ڈوبتے دیکھا" اردو ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۷۵ء

[2] ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ ماہنامہ "ترجمان القرآن"۔ جون ۱۹۷۱ء

اسی طرح ایک ہندو مورخ رام گوپال "Indian Muslims: A Political History" میں بیان کرتا ہے "۱۸۷۸ء میں جن لوگوں نے گریجوئیٹس اور پوسٹ گریجوئیٹس ڈگریاں حاصل کیں۔ ان میں ۳۱۵۵ ہندو تھے اور ۵۷ مسلمان" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان کو تعلیم میں کتنا پیچھے پھینکا گیا تھا۔

اوپر کی تصویر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تقسیم (۱۹۴۷ء) سے ۸۰ سال پہلے ہی انگریزوں نے مسلمانوں کا کچومر نکال دیا تھا اور ہندو ان پر مسلط کر دیئے تھے۔ گویا مسلمان دو آقاؤں کے نیچے پس رہا تھا۔ جب کہ بنگال میں آبادی کی اکثریت مسلمانوں کی تھی اور اسی اکثریت کی وجہ سے بنگال آخر کار پاکستان میں شامل ہوا۔ قیام پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان کی معیشت تعلیم اور ملازمتوں کے میدان میں کیا حالت تھی۔ ذیل کے بیان سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

تقسیم کے وقت سرکاری ملازمین کی بہت بھاری اکثریت ہندو تھی۔ انگریزی حکومت میں اوپر کے درجے کی ملازمتوں کو انڈین سول سروس (ICS) کہا جاتا تھا۔ اس سروس میں تقسیم کے وقت صرف ایک بنگالی مسلمان تھا۔ دوسری سرکاری ملازمتوں میں بھی بنگالی مسلمانوں کا حصہ برائے نام تھا۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کے جن مسلمان سرکاری ملازمین نے پاکستان کی ملازمت کو ترجیح دی۔ انہوں نے آکر اس خلا کو بھرا اور ان کی بدولت مشرقی پاکستان کا نظم و نسق بحال ہوا۔ مگر چونکہ وہ اردو بولنے والے تھے اس لئے ان سب کو مغربی پاکستانی سمجھ لیا گیا۔ بعد میں رفتہ رفتہ ملازمتوں کے اندر مشرقی پاکستانیوں کو ترقی دی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء میں وہاں کا پورا نظم و نسق مشرقی پاکستانیوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ مرکزی حکومت میں بھی کثرت سے بنگالی آ گئے۔ حالانکہ تقسیم کے وقت یہ تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا کہ بنگالی مسلمان کبھی نئی دہلی میں ان عہدوں پر آ سکیں گے۔

تجارت اور بنکنگ میں بھی تقریباً ہندوؤں کا اجارہ تھا۔ ان میں بہت بڑی تعداد تقسیم ملک کے وقت اپنا سرمایہ لے کر ہندوستان منتقل ہو گئی جس سے مشرقی پاکستان کی معیشت یک لخت معطل ہو گئی۔ ہندوستان سے جو مسلمان مہاجر مشرقی پاکستان منتقل ہوئے ان میں

چونکہ صنعت پیشہ اور تجارت پیشہ لوگ تھے اس لئے انہوں نے مشرقی پاکستان کی معیشت کو سنبھالا دیا۔[1]

مشرقی پاکستان کی ساری تجارت کلکتہ کے راستے سے ہوتی تھی۔ مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی پیداوار پٹ سن تھی۔ تقسیم ملک کے وقت یہ پٹ سن کلکتے جاتی تھی۔ اس کے تمام کارخانے کلکتے اور مغربی بنگال میں قائم تھے۔ مشرقی پاکستان میں صرف گانٹھیں باندھنے کے چھ کارخانے تھے۔ دوسرے الفاظ میں مشرقی پاکستان میں پٹ سن کی انڈسٹری ناپید تھی۔

تقسیم ہند کے بعد ڈھاکے کو مشرقی پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا۔ تقسیم سے پہلے ہندوؤں اور انگریزوں کی ساری توجہ کلکتہ پر تھی۔ اس لئے ڈھاکہ کی کوئی حیثیت نہ تھی اور یہ محض ایک قصبہ تھا۔[2]

اب ایک دوسرے پہلو سے مسئلہ زیر بحث کا جائزہ لیا جائے۔ یعنی یہ کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان تقسیم کے وقت کس حالت میں تھے۔ تقسیم کے وقت مشرقی پاکستان میں عمدہ قسم کی سڑکوں کی کل لمبائی ۲۴۰ میل تھی۔ درآنحالیکہ مغربی پاکستان میں ان کی لمبائی ۵۵۰۳ میل تھی۔ ریلوے لائن مشرقی پاکستان میں ۱۹۳۴ میل تھی اور مغربی پاکستان میں ۵۳۱۶ میل۔[3]

چٹاگانگ کی بندرگاہ تقسیم کے وقت اس حالت میں تھی کہ ۵ لاکھ ٹن سالانہ سے

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی " ترجمان القرآن " جون ۱۹۷۱ء

[2] ایضاً

[3] چونکہ مغربی پاکستان کے علاقے کی سرحدیں روس سے ملحق تھیں۔ اس لئے انگریز کو فوجوں کی نقل وحرکت کے لئے یہاں بہتر مواصلات کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مغربی پاکستان کو جو ریل کی پٹڑی اور سڑکیں ورثہ میں ملیں وہ انگریز نے تاج برطانیہ کے دفاعی مقاصد کے لئے بنائی تھیں بعد میں مواصلات کا یہ نظام ملک کے اس حصے کی ترقی کے لئے سودمند ثابت ہوا (مفصل تقسیم پاکستان کا المیہ ۱۹۷۱ء۔ ص ۱۰)

زیادہ مال وہاں اتارا اور چڑھایا نہ جاتا تھا کیونکہ جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے مشرقی پاکستان کی تجارت ساری کی ساری کلکتے کے راستے سے ہوتی تھی۔ درآنحالیکہ مغربی پاکستان میں کراچی کی بندرگاہ اس وقت ۲۸ لاکھ ٹن سے زیادہ مال اتارتی اور چڑھاتی تھی۔

مشرقی پاکستان میں تقسیم کے وقت مجموعی طور پر جتنی انڈسٹری تھی۔اس سے ملک کی دولت میں صرف ۵ کروڑ سالانہ کا اضافہ ہوتا تھا۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان میں اس وقت جو انڈسٹری تھی وہ ملک کی مجموعی دولت میں ۲۰ کروڑ سالانہ کا اضافہ کرتی تھی۔

۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان میں صرف ۷۶۶۳ کیلو واٹ بجلی پیدا ہوتی تھی۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان میں تقسیم کے وقت ۷۸۸۰۰ کیلو واٹ بجلی پیدا ہوتی تھی۔

ان تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں علاقوں میں معاشی عدم مساوات دراصل انگریز کا ورثہ تھا۔ جو وہ یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ مغربی پاکستانیوں کا اس عدم مساوات میں مجموعی طور پر کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ خود انگریزوں نے دونوں بازوؤں کو دو مختلف حالتوں میں چھوڑا تھا۔ ہندوؤں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ بنگالیوں کے اس غصے کو جو دراصل ان کے خلاف بھڑکنا چاہیئے تھا۔ غیر بنگالی مسلمانوں کی طرف پھیر دیا اور ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ مغربی پاکستانی اور غیر بنگالی مسلمان تم کو لوٹ کر کھا رہے ہیں اور تم ان کے محکوم بن کر رہ گئے ہو۔ اس وجہ سے قوم پرست بنگالی مسلمانوں کا مجموعی غصہ غیر بنگالی مسلمانوں پر پلٹ پڑا۔ نتیجۃً غیر بنگالی مسلمان جو سرمایہ ہندوستان سے لائے تھے اور جس سرمائے سے انہوں نے تجارت وصنعت و حرفت کو مشرقی پاکستان میں ترقی دی تھی اس کے متعلق ان کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ مشرقی پاکستان میں ان کا یہ سرمایہ محفوظ نہیں ہے۔ یہ ایک اور بہت بڑا سبب ہے جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کی ترقی میں نجی سرمایہ کاری اتنے بڑے پیمانے پر نہیں ہو سکی۔ جس پیمانے پر مغربی پاکستان میں ہوتی رہی ہے۔ کیونکہ مغربی پاکستان میں ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کے خلاف ایسا کوئی تعصب نہیں تھا۔ نیز اسی وجہ سے جب کبھی مشرقی پاکستان میں بدامنی کا خطرہ پیدا ہوتا تھا اور دکانوں اور کارخانوں کو لوٹنے یا زبردستی لوگوں سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی تو وہاں سے صنعت کار اپنا

سرمایہ مغربی پاکستان منتقل کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

تقسیم ملک کے وقت مشرقی پاکستان کی جو حالت تھی اس کے بارے میں جو حقائق بیان کئے ہیں ان کو دیکھ کر ان شکایات پر غور کیجیے کہ مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو لوٹ کھایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے پاس کون سی اضافی دولت تھی جسے کوئی لوٹ کھاتا؟[1] اس کے برعکس ذیل کے اعداد و شمار ملاحظہ کر لئے جائیں۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ ۱۹۷۰ء تک مرکز کی آمدنی میں مشرقی پاکستان کا کتنا حصہ رہا اور مغربی پاکستان کا کتنا۔ اور پھر دونوں بازوؤں کے اندر مرکز کی آمدنی کو کس تناسب کے ساتھ تقسیم کیا جاتا رہا ہے۔ اگر مغربی پاکستان ایثار نہیں کر رہا تھا تو مشرقی پاکستان کے پاس یہ روپیہ کہاں سے آرہا تھا۔ درحقیقت[2] مشرقی پاکستان کی بیشتر ترقی مغربی پاکستان کی بدولت ہوئی تھی۔

---

[1] امر واقعہ یہ ہے کہ سمگلنگ کے ذریعے مشرقی پاکستان کی کثیر دولت بھارت بھیجی جاتی رہی اور یہ سلسلہ حد سے بڑھ گیا تو ۱۹۵۲ء میں کہیں جا کر سمگلنگ روکنے کے لئے پاک فوج کی خدمات حاصل کی گئیں اور اس نے "آپریشن جیوٹ" کے نام سے کارروائی کی۔ ۱۹۵۶ء میں "آپریشن سرد س ٹ" اور ۱۹۵۷ء میں "آپریشن کلوز ڈور" کے تحت کارروائی کی گئی۔ پہلی کارروائی سے فوج پٹ سن کی ۳ لاکھ گانٹھوں کی بھارت کو سمگلنگ روکنے میں کامیاب ہو گئی۔ دوسری کارروائی کے دوران صوبے میں خوراک کی صورت حال مستحکم ہو گئی اور تو سے ہزار من چاول (علاوہ چاندی سونا کے) روکنے میں کامیاب رہی۔ آخری کارروائی کے دوران مشرقی پاکستان کی سرحد سے بھارت کو دس کروڑ روپے کا سونا سمگل کیا جا رہا تھا کہ پاک فوج نے پکڑ لیا۔ لیکن یہ تمام انسدادی کارروائیاں عارضی تھیں۔ کیونکہ ہندو کا ووٹ حاصل کرنے والی سیاسی پارٹیاں اس راستے میں رکاوٹ بنی رہیں۔ ماہرین کے مطابق ہر سال مشرقی پاکستان سے ۷۰ سے ۸۰ کروڑ روپے کا زرمبادلہ ہندو سرمایہ کار بھارت لے جاتے رہے جس نے دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کی معیشت کو تباہ کر کے رکھا (فضل مقیم - ایضاً - ص ۱۵ - ۱۶)

[2] تعمیراتی و صنعتی ترقیات اور مسلسل مادی و رفاہی امداد کے باوجود اہل مشرقی پاکستان کی ...

تقسیم کے وقت پاکستان کا پہلا بجٹ جو بنا اس میں مرکز کی آمدنی میں مشرقی پاکستان کا حصہ ۱۹٫۷۱ فیصد تھا۔ اور ۲۳ سال بعد ۱۹۷۰ء میں مرکز کی آمدنی میں مشرقی پاکستان کا حصہ صرف ۲۵۔۲۶ فیصد تھا۔ لیکن اعداد و شمار ذیل سے یہ پوزیشن واضح ہوتی ہے کہ مرکز میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان سے وصول کتنا ہوتا تھا اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں مرکزی آمدنی کا حصہ تقسیم کس طرح ہوتا تھا۔

۶۱-۱۹۶۰ء سے ۶۹-۱۹۶۸ء تک مرکز کو کل آمدنی ۳۰۲۲ کروڑ ۹ لاکھ روپیہ ہوئی۔ جس میں مشرقی پاکستان سے ۷۹۰ کروڑ ۲۱ لاکھ روپے وصول ہوئے اور مغربی پاکستان سے ۲۲۱۲ کروڑ ۸۸ لاکھ روپے وصول ہوئے (یعنی بحیثیت مجموعی مشرقی پاکستان نے مرکز کو ۲۶.۴ فی صد دیئے اور مغربی پاکستان نے ۷۳.۶ فیصد دیئے) لیکن مرکز سے صوبوں کو اس آمدنی سے جو حصہ دیا گیا وہ یہ تھا۔

مشرقی پاکستان کو ۳۶۷ کروڑ ۸ لاکھ روپے
مغربی پاکستان ۳۹۰ کروڑ ۳ لاکھ روپے

یعنی مشرقی پاکستان کو ۴۸٫۷ فی صد اور مغربی پاکستان کو ۵۱٫۳ فی صد دیا گیا۔ ان حقائق کے باوجود صورت حال کا منفی پہلو موجود تھا جس کے سبب استحصال کا نعرہ بلند کرنے کے جواز پر مباحثہ شروع ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں مشرقی پاکستان سے ماہرین معاشیات نے ڈھاکہ

تالیف قلب نہ ہوسکی۔ اگر ایک متوازن (Balanced) متناسب (Proportional) وفاقی دستور کام کر رہا ہوتا تو سرزمین مشرقی پاکستان پر آفات سماوی و ارضی یعنی سیلاب، طوفان قحط، استحصال یا افلاس سے پیدا شدہ مختلف النوع مسائل حل کرنے اور دونوں بازوؤں کے درمیان معیار زندگی کے تفاوت (Disparity) کو دور کرنے کی ذمہ داری طرفین پر ہوتی لیکن مغربی پاکستان کے سول و آرمڈ بیوروکریسی نے اقتدار کی کنجی اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اور یوں استحصال و زیادتی روکنے کے سخن بدقسمتی سے مغربی پاکستان کے بے قصور اور پسے ہوئے عوام کی جانب رہا (پروفیسر فروغ احمد۔ مجلہ نظریۂ پاکستان" ص ۶۳)

کانفرنس میں ذو معاشی حکمت عملی (Two Economy Thesis) کا نظریہ پیش کیا۔ بنگالی بیوروکریسی کی اس نظریئے کو سرپرستی حاصل تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح مضبوط مرکز سے چھٹکارا پانے میں آسانی رہے گی۔ جب کہ ترقی پسند دانشوروں نے الگ الگ معاشی پالیسیوں کے فلسفے کو تدریجاً سوشلسٹ معاشی نظام کا پیش خیمہ تصور کیا۔[1] دراصل ایوب خان کی معاشی پالیسیوں نے ملک کے دونوں حصوں کے درمیان معاشی ناہمواری کے تناسب کو گہرا کیا اور اس عہد میں چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز (Concentration) نے معاشی بگاڑ پیدا کیا۔ ملکی دولت کے بیشتر اثاثے پر قبضہ جمانے والے بائیس خاندانوں میں سے کوئی بھی مشرقی پاکستانی نہ تھا۔[2] اگرچہ سرمایہ دار کی نہ کوئی قومیت ہوتی ہے اور نہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کا کوئی مذہب ہوتا ہے، لیکن بہرحال شکایت کی تان مغربی پاکستان پر ہی آکر ٹوٹتی۔ اس عہد میں نجی سرمایہ کاری بھی کچھ اس طرح رہی۔ ۶۴-۱۹۶۳ء میں مشرقی پاکستان میں نجی سرمایہ کاری صرف ۲۱ فی صد ہوئی جب کہ مغربی پاکستان میں ۷۹ فی صد ہوئی اور اس عہد حکومت کے دور عروج پر یعنی ۶۸-۱۹۶۷ء میں مشرقی پاکستان نجی سرمایہ کاری میں صرف ۲۲ فیصد کا مستحق ٹھہرا اور مغربی پاکستان میں ۷۸ فی صد کی سرمایہ کاری ہوئی۔[3] (کم نجی سرمایہ کاری کا سبب اوپر بیان ہو چکا ہے)۔

تاہم اس کے باوجود یہ مطالعہ دلچسپ رہے گا کہ دونوں حصوں میں پاکستانی عوام کی فی کس

---

1 Rounaq Jehan, 'Op cit' P. 85, 89

2 جنرل ایوب حکومت کے دسویں سال ۱۹۶۸ء میں قومی صنعت کا ۶۶ فی صد بنکوں کے اثاثہ جات کا ۸۰ فی صد اور انشورنس کمپنیوں کے حصص کا ۹۷ فی صد ۲۲ سرمایہ دار گھرانوں کی مٹھی میں تھا۔ یہ دولت یا تو سرمایہ داروں کی تجوریوں میں تھی یا غیر ملکی بنکوں میں گردش کر رہی تھی۔ سرمایہ پرستی کی اس سوچ سے نہ صرف مشرقی پاکستان بلکہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کے لوگوں کا بھی دم گھونٹا جا رہا تھا۔ (Khalid B. Syeed, 'Op cit' P 81)

3 Rounaq Jehan, 'Op cit P 62, 75 89

آمدنی کی اٹھان ایوبی عہد میں کیا رہی ۔ ملاحظہ ہو:[1]

مشرقی پاکستان	۶۰-۱۹۵۹ء	۲۵۹ روپے	۶۴-۱۹۶۳ء	۳۰۵ روپے
مغربی پاکستان	"	۳۳۵ روپے	"	۳۵۳ روپے

مگر مشرقی پاکستان میں منفی پراپیگنڈے کے ذریعہ عوام کو باور کرایا گیا مغربی پاکستان کے عوام روپے میں کھیل رہے ہیں۔ پراپیگنڈا کے اسی ماحول میں شیخ مجیب سیاسی افق پر ابھرے۔

پراپیگنڈا کی کرشمہ سازیاں

یہاں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ پاکستان کو قائم ہوئے ابھی کچھ مدت نہ گزری تھی کہ مشرقی پاکستان میں منفی پراپیگنڈ کو ہوا دی جانے لگی - اس سلسلے میں نہایت "ہوشیار" لوگوں نے جھوٹے سچے اعداد وشمار مرتب کرکے بڑے پیمانے پر پھیلائے جو کالجوں کے طلبہ اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں اور سرکاری ملازموں کی نوکِ زبان پر چڑھ گئے۔ حکومت پاکستان کو محب وطن عناصر کی جانب سے بار بار توجہ دلائی جاتی رہی کہ وہ ان اعداد و شمار کی تحقیق کرے، ان میں اگر کوئی صداقت ہو تو فوراً تلافی کی جائے اور اگر یہ جھوٹے اعداد وشمار ہیں تو ان کی تردید کرکے صحیح اعداد وشمار شائع کر دے، لیکن حکومت کی غیر ذمہ داری کا یہ عالم ملاحظہ ہو کہ ایک بار بھی اس پروپیگنڈے کے مقابلے میں مستند چیز شائع نہیں کی گئی۔[2]

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کی تمام شکایات بے بنیاد اور بے وزن تھیں اور ان کی ناراضی محض مخالفانہ پراپیگنڈہ کی مرہون منت تھی۔ غلط پراپیگنڈا نے جو کردار ادا کیا اس سے بلاشبہ انکار ممکن نہیں، لیکن دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ جدید نظام جنگ میں اعداد و شمار کا پراپیگنڈا ایک مؤثر ترین نفسیاتی حملہ ہے اور اس اسلحہ کی طاقتور فیکٹریاں ذرائع ابلاغ (اخبارات، ریڈیو، ٹی وی) ہیں۔ چنانچہ انہی حوالوں سے

1 Ibid-P 80.

۲ ابوالاعلیٰ مودودی روزنامہ "جسارت" کراچی ۹ ستمبر ۱۹۷۲ء

رائی سے پہاڑ بنتے چلے گئے ۔ جن کے نیچے آدھا پاکستان کچلا گیا۔

اب ہم مشرقی پاکستان کی سیاسی صورت حال میں سیاسی پارٹیوں تحریکوں اور پریشر گروپوں میں سے قابل لحاظ عناصر پر اختصار کے ساتھ بحث کریں گے ۔

مسلم لیگ

قیام پاکستان کے بعد مولانا محمد اکرم خان مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے آرگنائزر مقرر ہوئے اس جماعت میں عبدالحمید بھاشانی اور عطاء الرحمٰن صوبائی آرگنائزر کے مخالف اور "ترقی پسند" لیڈر سمجھے جاتے تھے ۔ ان حضرات نے اپریل ۱۹۴۸ء میں مسلم لیگ میں اپنے ہم خیال ارکان کا ایک اجلاس تنگائل میں منعقد کیا اور مسلم لیگی صوبائی حکومت کے خلاف قرار داد عدم اعتماد منظور کی اور کچھ ہی دنوں بعد ۱۹۴۹ء میں انہی حضرات نے عوامی مسلم لیگ کے نام سے ایک نئی جماعت کی بنیاد رکھی ۔ یہ واقعہ ہے کہ اس نئی جماعت نے برسر اقتدار مسلم لیگی قیادت کی بے عملی ، تن آسانی ، عوامی مسائل سے چشم پوشی اور بے ضابطگیوں کی کوکھ سے ہی جنم لیا تھا ۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۸ء میں زبان کے مسئلہ پر ایجی ٹیشن اور مظاہرے بھی اسے خواب غفلت سے بیدار نہ کر سکے ۔

مشرقی پاکستان میں تخلیق پاکستان کے ساتھ ان تین مطالبات یعنی بنگلہ بطور قومی زبان صوبائی خودمختاری اور زمینداره نظام کا خاتمہ کو مقبولیت حاصل ہوگئی تھی ۔ مسلم لیگ کی اعلیٰ سطحی قیادت نے ان مطالبات پر کان نہ دھرا ۔ نتیجۃً زبان کا مسئلہ "مقدس تحریک" اور صوبائی خودمختاری کا مطالبہ ہمہ گیر تحریک بن گیا ۔ بے تدبیر حکومتوں کے مانند مسلم لیگ کے پاس ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کا ایک ہی علاج تھا اور وہ تھا سیفٹی ایکٹ کے تحت عام گرفتاریاں بعد از خرابی بسیار ۱۹۵۱ء میں زرعی اصلاحات نافذ کر دی گئیں جن سے زمینداره سسٹم یکسر ختم ہوگیا ۔ لیکن اس وقت تک عوام کی ہمدردیاں جیتنے کی چیمپئن پوزیشن بن چکی تھی ۔ مسلم لیگی قیادت اس کار خیر سے خود کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکی ۔ باشعور نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی مقبولیت کا سورج غروب ہو رہا ہے ۔[1]

---

[1] ڈاکٹر صفدر محمود "مسلم لیگ کا دور حکومت" ص ۲۲۸ - ۲۳۷

مسلم لیگی حکومت نے ان مطالبات کے حق میں آواز اٹھانے والوں کی ایک کھیپ کی کھیپ
ان سلاخوں کے پیچھے بند کر رکھی تھی۔ جیل پہلے سے سکہ بند کیمونسٹ موجود تھے۔ دوسرے لفظوں
میں کیمونسٹوں کو حکومت سے ناراض عناصر کو اپنے دام میں لینے کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ ان
جیلوں نے اچھے بھلے مسلمان اور سچے پاکستانیوں کو پکا مارکسی بنگالی قوم پرست بنا کر باہر
نکالا۔[1] الغرض اس صوبائی حکومت کے اعمال نے عوام کو اس سے اور اس کی رہنمائی کرنے
والے مرکز سے اتنا متنفر کر دیا کہ بالآخر وہ ہر اس شخص کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو گئے جو انہیں
کسی طرح بھی اس کے اقتدار سے نجات دلا دے۔

مسلم لیگ اگرچہ پاکستان کو معرض وجود میں لانے کے حوالے سے ایک قابل فخر سیاسی
وجود ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کو نقصان
پہنچانے میں بھی مسلم لیگ ہی نے سب سے زیادہ افسوسناک کردار ادا کیا۔ قائد اعظمؒ کی رحلت
کے بعد مسلم لیگ (الا ماشاءاللہ) ان رہنماؤں کے تصرف میں آ گئی جنہوں نے اس جماعت
کو اپنی اغراض کا قمار خانہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ چند برسوں کے اندر اندر اس کا وقار ختم ہو گیا اور
یہ نام پاکستان کی سیاسی زندگی پر محض ایک دھبہ بن کر رہ گیا۔ بلاشبہ چھوٹے درجے کے
کارکنوں کے جذبہ اخلاص کو آج بھی الزام نہیں دیا جا سکتا، لیکن لیگ کے سیاسی سماجی اور
مادی اعتبار سے توانا لوگوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کو رسوا کرنے میں پورا پورا حصہ
لیا ہے۔

عوامی لیگ

مشرقی پاکستان کی سب سے اہم پارٹی عوامی لیگ کے بیشتر لیڈر وہی لوگ تھے جو تشکیل
پاکستان سے پہلے یا ایک عرصہ بعد تک مسلم لیگ میں رہے۔ ان لوگوں نے جون ۱۹۴۹ء
میں عوامی مسلم لیگ کے نام سے ایک سیاسی پارٹی تشکیل دی۔ عبدالحمید خان بھاشانی جو

---

[1] چودھری علی احمد خان: "مشرقی پاکستان" سیاسی حالات کا تجزیہ۔ ص ۹۰-۹۱۔

مطالبہ پاکستان کی جد و جہد میں پیش پیش تھے، اس نئی پارٹی کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ عوامی مسلم لیگ برسراقتدار مسلم لیگ کی نکتہ چیں اور ناقد تھی جس نے رفتہ رفتہ ایک مضبوط اپوزیشن کی صورت اختیار کر لی، لیکن یہ ایک بااصول سیاسی پارٹی کبھی نہیں رہی۔ چنانچہ اس نے تشکیل پاتے ہی حکمران جماعت کی مخالفت میں وہ ہتھیار بھی استعمال کر ڈالے جو خود مملکت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینے والے تھے۔ اس کی سیاسی لغت میں تعمیری تنقید، کیریکٹر کی تشکیل، بہتر منصوبہ بندی اور صبرآزما جد و جہد کے الفاظ نہیں تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے اور جس طرح بھی ہو سکے بام حکومت پر پہنچا جائے۔ لہٰذا اس پارٹی نے حصول مقصد کے لئے اوّل روز سے عوام کے منفی جذبات کو بھڑکانا شروع کیا اور لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنے کے لئے جائز و ناجائز محرومیوں کا طوفان اٹھا دیا اس صورت میں ان کی پالیسی کا تعمیری عنصر سے خالی اور تخریب سے پُر ہونا ایک لازمی امر تھا۔ قبل از تقسیم محرومیوں کا ذمہ دار ہندوؤں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ اب ہدف غیر بنگالی مسلمان تھا۔ نتیجتاً عوام کے دلوں سے ہندو دشمنی کے جذبات نکلتے گئے اور غیر بنگالی کی مخالفت اور دشمنی کے جراثیم بڑھتے گئے۔ بنگال کے ہندو کی اس سے زیادہ اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی پر جھاڑ کر فضائے سیاست میں کھلم کھلا پرواز شروع کر دی اور پھر ایک وقت آیا کہ مشرقی پاکستان کے لکھے پڑھے مسلمان طبقہ کی ہمدردیاں، پہلی دستوریہ کے ہندو ارکان کے مطالبہ مخلوط انتخاب کے حق میں تھیں۔ الیکشن ۱۹۵۴ء سے کچھ عرصہ پہلے تک اس جماعت کا اپنا کوئی روزانہ اخبار نہ تھا۔ بس صرف ایک ہفت روزہ جریدہ تھا، لیکن اب اس کمی کو کلکتہ کے ہندو اخبارات پورا کرنے لگے تھے۔ اسی طرح اس پارٹی کا اپنا کوئی لٹریچر بھی نہ تھا۔ اس کمی کو بھی کلکتہ سے چھپ کر آنے والا قوم پرستانہ اشتراکی لٹریچر پورا کرنے لگا۔ خود عبدالحمید بھاشانی کے بیانات جس زبان اور انداز و مطالب کا جامہ پہنے ہوئے اخبارات میں آتے تھے ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے روس کے پولٹ بیورو سے مرتبہ ہو کر آئے ہیں۔ جیسا کہ ہم ابتدا میں کہہ چکے ہیں کہ عوامی لیگ کبھی کوئی اصولی (Ideological) پارٹی نہیں رہی۔ اس جماعت میں ہر وہ شخص شامل ہو سکتا تھا جس کو

برسرِاقتدار لوگوں سے ذاتی، گروہی یا اصولی اختلاف ہو۔ اس جماعت میں ملحدانہ خیالات کے حامل اور مذہبی افراد بھی سما سکتے تھے، اشتراکی نظریات اور مغربی طرز کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے علمبردار اور ہندو بھی، لیکن اس معجون مرکب میں فعال اور غالب عنصر ہمیشہ اشتراکی خیالات اور ہندو رفاقت رکھنے والے کارکنوں کا ہی رہا ہے[1]

عوامی لیگ اگرچہ جمہوری حقوق کی داعی بن کر میدان سیاست میں آئی تھی، لیکن خود جمہوریت کے بارے میں اس کا رویہ عجیب و غریب رہا۔ جب اس لیگ کے صدر مسٹر حسین سہروردی نے گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل میں وزارت کا قلم دان سنبھالا تو انہوں نے گورنر جنرل غلام محمد سے اپیل کی کہ وہ وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیں اور (سراسر غیر آئینی قدم اٹھا کر) اس دستور ساز اسمبلی کو بھی برخاست کر دیں۔ جب انہی سہروردی صاحب کو پاکستان کی وزارت عظمیٰ کا لالچ دیا گیا تو ان کا ارشاد تھا کہ نیا دستور تو بذریعہ آرڈی ننس بھی نافذ کیا جا سکتا ہے۔ بطور وزیر قانون انہی صاحب نے دفعہ ۲۲۳ (الف) جو دستور میں جمہوریت کی جان تھی، کو بھی ان قوانین کی فہرست سے ساقط کر دیا جو دستور کو دوبارہ پاس کرتے تھے اور یہ وزارت عظمیٰ ہی کا شوق تھا کہ انہوں نے مرکز میں دونوں بازوؤں کے درمیان برابر کی نمائندگی (Parity) اور مغربی پاکستان کے لئے ون یونٹ کی اسکیم کو پاپولر بنانے کے لئے سب سے زیادہ کام کیا، لیکن جب دستور یہ کراچی کے اجلاس میں سہروردی صاحب نے دیکھا کہ وزارتِ عظمیٰ تو پسِ پردہ چھلاوہ ہی نکلی تو انہوں نے وہی باتیں کہنا شروع کر دیں جن کی چند روز پہلے تک خود تردید کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی ون یونٹ بل کی مخالفت شروع کر دی جس کو بحیثیت وزیر قانون خود مرتب کیا تھا اور وہ خود ہی دستور یہ میں پیش کرنے والے تھے۔ اسی طرح اوّلاً عوامی لیگ نے ۱۹۵۶ء کے آئین پر دستخط کرنے سے انکار کیا، لیکن جونہی سہروردی صاحب کو وزارتِ عظمیٰ کی پیشکش ہوئی تو مان

[1] جب چینی اور روسی کمیونزم کے سوال پر مشرقی پاکستانی کمیونسٹوں میں تصادم ہوا تو روسی کمیونسٹوں نے بڑی حد تک عوامی لیگ میں پناہ لی۔ (Maniruzzaman, 'Op cit'' P 43)

گئے اور جب مسٹر سہروردی وزیراعظم بنا دیئے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ مشرقی پاکستان کو ۵۶ء کے آئین میں ۹۸ فی صد خود مختاری مل گئی ہے[1] اور یہ کہ مشرقی پاکستان کی معاشی برابری کا مطالبہ پورا ہو گیا۔ غرض یہ کہ اس جماعت کی پوری تاریخ اس قسم کی مفاد پرستی، موقع شناسی سیاسی قلابازیوں اور ملکی مفاد کے منافی کارگزاریوں سے عبارت ہے۔

ہندو

انگریزوں کے بنگال پر تسلط کے بعد مسلمان معتوب اور ہندو ان کے منظور نظر اور مددگار رہے۔ مسلمان کو کچل کر انگریز نے ہندو کو اوپر اٹھایا۔ چنانچہ تقسیم ہند کے وقت زمیندار تھے تو یہ سرکاری عہدیدار تھے تو یہ صنعت تجارت تھی تو ان کے ہاتھ میں دو سو برس کے اس مسلسل عمل نے مسلمانوں کو کاشتکاری، مزدوری اور ادنیٰ ملازمتوں کے سوا ہر میدان سے بے دخل کر دیا تھا۔ اب جو پاکستان بننے کے بعد مسلمان مہاجرین نے آکر سرکاری عہدے سنبھالے اور صنعت و تجارت کے میدان میں آگے بڑھنا شروع کیا تو ہندوؤں کو اپنا غلبہ ختم ہوتا نظر آیا۔ معاشی مفادات کی اجارہ داری پر ضرب پڑتے دیکھ کر ہندو بلبلا اٹھا۔ چنانچہ انہوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان جائز و ناجائز شکایات کو ہوا دینی شروع کی جو مشرقی پاکستان کے لوگوں میں مرکزی حکومت اور بیرونی مسلمانوں کے خلاف پیدا ہو رہی تھیں۔ انہیں اپنے منصوبے میں اولین کامیابی کتنی جلد ہوئی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سن ۱۹۵۴ء کے فسادات میں جتنا کشت و خون ہوا، مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہوا اور جتنے ہنگامے ہوئے ان کارخانوں میں ہوئے جو مسلمانوں کے تھے کسی ہندو سرمایہ دار یا کارخانہ دار پر آنچ تک نہ آئی۔[2]

ہندو ذہنیت کے پس منظر میں دوسری چیز یہ کارفرما تھی کہ اس نے تقسیم ہند کو ہی

---

1 Rounaq Jehan, Op cit P 49

[2] ابوالاعلیٰ مودودی ——— ایضاً ——— ص ۱۹-۲۰

قبول نہیں کیا تھا: بھارت ماتا" کی تقسیم ان کے نزدیک "گئو ماتا" جیو ہتیا سے بڑھ کر تھی چنانچہ وہ اول روز سے ذاتی طور پر" اکھنڈ بھارت" کے لئے کوشاں تھے۔ زندگی کے تمام دائروں میں ان کی سرگرمیوں کا محور یہی ایک سوچ تھی۔ چنانچہ ان کا ہر قدم اپنے اس مقصد کو پانے کے لئے اٹھا۔ بد قسمتی سے انہیں جلد ہی مسلمانوں میں سے ایسے عناصر مل گئے جو ان کے قدم بہ قدم چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے یہاں کے مسلمان کے ذہن سے دو قومی نظریہ کے پودے اکھیڑ کر بنگالی قومیت کی تخم ریزی کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوؤں نے ۱۹۵۶ء میں جداگانہ انتخابات کی سخت مخالفت کی۔ ہندو کو اس بات کا احساس تھا کہ مخلوط انتخابات میں تو وہ اپنی برتر معاشی حیثیت کی وجہ سے اپنی مرضی و منشا کے مسلمان قانون ساز اسمبلی میں بھجوا سکتا ہے، لیکن جداگانہ انتخابات میں یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔

اپنے مقصد کے لئے جس دوسرے محاذ پر ہندو نے اپنی مساعی مرکوز کئے رکھیں۔ وہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان واحد رشتہ اتحاد اسلام کو منقطع کرنا تھی اور یہ مقصد اس نے دونوں حصوں کے عوام کے درمیان بداعتمادی، بدگمانی اور شکوک و شبہات کی فضا پیدا کرنے سے حاصل کیا۔ (اگرچہ ان کے کام کو آسان کرنے میں پاکستان کی مرکزی حکومت کی حماقتوں کو بھی اچھا خاصا دخل تھا) چنانچہ رفتہ رفتہ مسلم اخوت کا تصور سرد پڑتا گیا اور بنگلہ قومیت کے جذبات گرم ہونے چلے گئے کمیونسٹوں نے بھی اپنی اغراض کے لئے اس پالیسی کا پوری طرح ساتھ دیا۔ اس جد و جہد کے نتیجے میں جلد ہی یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ سیاسیات سے مذہب کی علیحدگی کا نعرہ عوامی لیگ کے چند گنے چنے نمایاں نعروں میں شمار ہونے لگا۔ مسلمانوں کی صف میں ایسے حضرات بھی پیدا ہو گئے جو "فخریہ" طور پر دعویٰ کرنے لگے کہ راجہ رام موہن رائے ان کے قومی ہیرو ہیں اور رابندر ناتھ ٹیگور، جو ہندو کلچر کے احیاء کا علمبردار تھا قومی شاعر کے مقام پر جا پہنچا۔ پھر ایسے "مسلمان" بھی نکل آئے جو خالصتاً ہندو تہواروں کو "قومی" تہوار کی حیثیت سے بڑی عقیدت کے ساتھ منانے لگے۔

ہندوؤں کو اس کام میں کمک کلکتہ کے اخبارات و جرائد سے ملتی رہی۔ بھارت کا

تخریب پاکستان کے لئے "پروگرام" اور پالیسیاں مشرقی پاکستان کے ہندوؤں اور کمیونسٹوں کے الفاظ کا جامہ پہن کر آٹھ دس روزناموں اور بے شمار ہفت روزہ، ماہوار جرائد اور تصانیف کی صورت میں مشرقی پاکستان کے کالجوں، یونیورسٹیوں اور دانشوروں تک پہنچتی رہیں۔ ان کے صفحات میں پہلے پہل ملفوف اور بعد میں کھلم کھلا زہریلے مضامین و مقالات لکھے جانے لگے جن میں بنگلہ قومیت اور مغربی پاکستان کے مشرقی پاکستان پر نام نہاد "غلبہ و تسلط" کے افسانوں کو سمویا ہوتا تھا۔

بالآخر اس زہر نے اپنا کام کر دکھایا۔

کمیونسٹ

اگرچہ مشرقی پاکستان میں کمیونسٹوں کی عددی طاقت مغربی پاکستان سے کچھ زیادہ نہ تھی اور شکایات کی زمین بھی یہاں کی نسبت کچھ زیادہ زرخیز نہ تھی لیکن ابتداءً دو چیزوں نے ان کو وہاں پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ ایک یہ کہ ان کے نظریات کا مقابلہ کرنے کے لئے بنگلہ زبان میں نہ تو کوئی طاقتور اسلامی لٹریچر موجود تھا اور نہ کوئی منظم اسلامی تحریک ہی پائی جاتی تھی۔ دوسری چیز جو ان کے لئے سازگار ہوئی وہ یہ تھی کہ حکومت نے کمیونسٹ عناصر کے ساتھ ساتھ خود مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے غیر مطمئن نوجوانوں کو بھی پکڑ پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس دیا۔ چنانچہ جیل کی یہ کوٹھڑیاں کمیونزم کی درس گاہوں میں تبدیل ہو گئیں، اور بیشتر نوجوان جو سیدھے سادے مسلمان کی حیثیت سے گئے تھے۔ کمیونسٹ بن کر یا کمیونزم سے متاثر ہو کر نکلے۔ کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دیا جانا بھی ان کے لئے ثمر آور ثابت ہوا۔ ظاہر ہے پارٹی پر پابندی لگنے سے کمیونسٹ کہیں معدوم نہیں ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے مختلف سیاسی پارٹیوں میں گھس کر بنگالی نیشنلزم کا لبادہ اوڑھ لیا اور پھر بتدریج ان پارٹیوں کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے لگے اور لوگوں کی شکایات اور جائز و ناجائز محرومیوں کو اچھال کر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ جلد ہی انہیں اس کوشش میں بھارت کی آشیرباد اور بعض سوشلسٹ ممالک کی سرپرستی بھی میسر آگئی۔[ل]

[ل] ابوالاعلیٰ مودودی "مشرقی پاکستان، حالات و مسائل کا جائزہ"۔ ص ۱۸-۱۹۔

۱۹۴۷ء میں کمیونسٹوں کے پاس ایک ہی متفقہ پلیٹ فارم کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی شکل میں موجود تھا۔ مشرقی پاکستان کے کمیونسٹ اپریل ۱۹۴۸ء تک کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سیکرٹریٹ ہی سے براہِ راست منسلک رہے اور رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ دوسری کلکتہ کانفرنس (فروری مارچ ۱۹۴۸ء) کے موقع پر پہلی بار پاکستان کمیونسٹ پارٹی کو الگ کر کے سجاد ظہیر کو اس کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا جو اس سے قبل کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری جنرل تھے۔ پاکستان کمیونسٹ پارٹی نے جنوبی ایشیا کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک فکری رہنما مسٹر رندیو (Randave) کے پرتشدد نظریہ اشتراکی انقلاب "Hit and Hit" کو اپنا ماٹو بنایا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ادبی محاذ پر سجاد ظہیر نے فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے ذریعے مغربی پاکستان کے "ترقی پسند" شاعروں ادیبوں اور صحافیوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ہندوستان کمیونسٹ پارٹی نے تو مسٹر رندیو کے نظریہ انقلاب کو مسترد کر دیا مگر پاکستانی کمیونسٹوں نے پاکستان کیلئے قابل عمل سمجھتے ہوئے اسے برقرار رکھا۔ اسی سال یعنی مارچ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی پر ملک میں بغاوت کرانے اور فوج کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرنے کی سازش (جو پنڈی سازش کیس کے نام سے مشہور ہوئی) کا الزام عائد کیا گیا، اور متعدد افراد کو جن میں اعلیٰ فوجی افسر بھی تھے زیرِ حراست لے لیا گیا اور پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی۔

اس کے بعد راجشاہی جیل (مشرقی پاکستان) میں مقید کمیونسٹوں نے ایک پلان مرتب کیا جس کی نظری اساس یہ تھی کہ "اگر نیم بورژوا افراد اور نیم انقلابی تنظیموں کے ذریعے اشتراکی فکر و عمل کا کام کیا گیا تو اس سے مارکسی لیننی (Marxist Leninist) گرفت کمزور ہو جائے گی، اس لئے پارٹی کو بہر صورت براہِ راست کام کرنا چاہیے، لیکن اس کو قابل عمل نہ پاکر بالآخر لائحہ عمل یہ طے ہوا کہ اب وہ جاگیردارانہ نوآبادیات" کے خلاف عوامی مسلم لیگ سے بالخصوص اور دیگر مقبول عوام گروپوں سے بالعموم کام لیں گے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں یوتھ لیگ کے نام سے ایک گروپ تشکیل دیا گیا۔ جس کا منشور یہ تھا کہ کم سے کم نکات پر تمام طبقوں کے زیادہ سے

1 Y.V Gankovsky, "A History of Pakistan" P 143–145.

زیادہ افراد کو منظم اور فعال بنا کر استعماریت اور جاگیرداری کے خلاف، "عالمی امن" اور "جمہوریت" کے قیام اور "روزگار کی فراہمی" کے لئے جد و جہد کی جائے گی۔ یوتھ لیگ کے تمام سرکردہ افراد کالعدم کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر تھے۔ لیگ نے آغاز کے طور پر ان مقاصد کے حصول کے لئے خصوصاً مشرقی پاکستان کے کسانوں میں اپنے کام کو منظم کیا۔ نیز صوبائی سطح پر مسلم تہذیبی و ثقافتی پروگراموں کے متبادل رابندر ناتھ ٹیگور کے یوم پیدائش، مشہور بنگالی کیمونسٹ آنجہانی سوکنتا کی برسی اور نیا بنگلہ سال (New Bangla year) کو منانے اور رواج دینے کی شعوری کوششیں شروع کر دیں[1] اس کے علاوہ دوسری تنظیموں میں نفوذ کر کے ان کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی عملی راہ اختیار کی۔

مذکورہ حکمت عمل کے تحت، عوامی لیگ میں شامل کمیونسٹوں نے پہلی بار اس وقت مسٹر حسین سہروردی کی وزارت عظمیٰ (۱۹۵۶ء) پر عدم اطمینان کا اظہار کیا جب سہروردی نے عوامی لیگ کی کونسل میں ۶۰ کے مقابلہ میں ۸۰۰ ووٹوں کی واضح اکثریت کے بل پر مغرب نواز خارجہ پالیسی اختیار کی۔ اس مرحلہ پر عبدالحمید بھاشانی نے مجلس عاملہ کے نو اشتراکی ممبران کے ہمراہ عوامی لیگ سے استعفیٰ دے دیا اور "استعمار دشمن جمہوری قوتوں" کا ایک کنونشن ستمبر ۱۹۵۷ء کو ڈھاکہ میں طلب کیا جس میں پنجاب سے معروف سرمایہ دار کمیونسٹ میاں افتخار الدین، صوبہ سرحد سے وہاں کے بڑے زمیندار خان عبدالغفار خان، صوبہ سندھ سے معروف قوم پرست دانشور جی ایم سید اور بلوچستان سے قلات کے نواب خاندان کے فرد شہزادہ عبدالکریم خان نے شرکت کی۔ ان کے ہمراہ مغربی پاکستان میں اشتراکی تحریک سے تعلق رکھنے والے دوسرے تمام سرکردہ رہنما بھی شامل تھے۔ اس کنونشن میں نیشنل عوامی پارٹی (National Awami Party — NAP). کی بنیاد رکھی گئی جس کا سربراہ عبدالحمید بھاشانی کو منتخب کیا گیا۔ جلد ہی زیر زمین اور دوسری جماعتوں میں گھسے ہوئے اہم افراد نہ صرف "نیپ" میں شامل ہو گئے، بلکہ اس کے اہم مناصب پر فائز ہو گئے۔

1. Maniruzzaman 'op cit' p. 4-7.

انہی لوگوں نے طے شدہ حکمت عملی کے مطابق بھاشانی صاحب ہی کی قیادت میں مشرقی پاکستان مزدور تنظیم (East Pakistan Peasant Association - EPPA) قائم کی جس کا تاسیسی اجلاس ۱۹۵۷ء میں ہوا اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن عبدالحق کو تنظیم کا سیکرٹری جنرل چنا گیا۔ فروری ۱۹۵۸ء میں (East Pakistan Mazdoor Federation-EPMF) کے نام سے ایک اور مزدور تنظیم معرض وجود میں آئی جس کی قیادت پرلوتھ لیگ کے نوجوان کمیونسٹ لیڈر محمد طہٰ کو فائز کیا گیا۔ مؤخرالذکر تنظیم نے بالخصوص مشرقی پاکستان کی ٹریڈ یونینوں پر قبضہ کرنے اور بڑی صنعتوں میں طبقاتی کش مکش تیز کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جب مارشل لا کا نفاذ ہوا تو یہ کمیونسٹ عناصر زیر زمین چلے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں سیاسی پارٹیوں سے پابندی ہٹا لئے جانے کے بعد ۱۹۵۱ء میں غیر قانونی قرار پانے والی "مشرقی پاکستان کمیونسٹ پارٹی" کے ممبران (جو دوسری پارٹیوں میں موجود تھے) کی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس ہوا اس اجلاس میں روسی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس کے نکات پر ان کے درمیان اختلاف رائے واقع ہو گیا اور یہ دو واضح گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروپ "روس نواز" اور دوسرا "چین نواز" کہلایا۔

چین نواز کمیونسٹ تحریک

۱۹۶۲ء میں نیفا کے محاذ پر چین بھارت سرحدی جنگ ہوئی، تو چین دشمنی میں امریکا اور روس دونوں نے ہی اسلحہ سے بھارت کو لاد دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھارت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دونوں سپر طاقتیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ امریکہ کے اس رویّہ سے پاکستان کو مایوسی ہوئی۔ چنانچہ اس کی خارجہ پالیسی کا جھکاؤ چین کی طرف ہو گیا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ "چین نواز" کمیونسٹوں کے لئے پاکستان میں کام کرنا آسان ہو گیا اور ایک اعتبار سے انہیں سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ ستمبر ۱۹۶۳ء میں ایوب حکومت نے سرکاری خرچ پر عبدالحمید بھاشانی کو خیرسگالی مشن پر

سوشلسٹ عوامی جمہوریہ چین کے دورہ پر بھی بھیجا اور یہی وہ دن تھے جب پاکستان (بالخصوص مشرقی پاکستان) میں اشتراکی لٹریچر کی بھرمار ہوگئی اور چین سے دھڑا دھڑ بار در کُک لٹریچر پاکستان پہنچنے لگا۔[1]

۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے موقع پر متحدہ حزب اختلاف (Combined Opposition Parties COP). نے مس فاطمہ جناح کو ایوب کے مقابلہ میں صدارتی امیدوار نامزد کیا تو عین انتخابی مہم کے عروج کے موقع پر بھاشانی صاحب نے سیاسی علالت کی چادر اوڑھ لی اور انتخابی مہم موقوف کردی اور اپنے حامیوں کو ایوب خان کے لئے سرگرم عمل ہونے کی ہدایت کردی. حالانکہ ان کی جماعت نیشنل عوامی پارٹی COP کی رکن تھی اور مس فاطمہ جناح کی صدارتی امیدوار کے طور پر نامزدگی میں شریک تھی۔

۱۹۶۷ء میں ملک کی سیاسی پارٹیوں نے ایوب آمریت سے نجات اور پارلیمانی جمہوریت کی بحالی کے لئے تحریک جمہوریت پاکستان (Pakistan Democratic Movement – PDM) کے نام سے نئی تحریک کا آغاز کیا تو بھاشانی اس سے بھی الگ رہے۔

اور جب پاکستان کو سیاسی بحران سے نکالنے کے لئے پارلیمانی جمہوریت کی بحالی اور نئے مارشل لا کے نفاذ سے بچنے کے لئے (فروری ۱۹۶۹ء) میں گول میز کانفرنس اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔ کامیابی تک پہنچی ہوئی اس کانفرنس کو بھاشانی نے مسٹر بھٹو سے مل کر ناکام بنا دیا۔[2]

چین نواز اشتراکی مشرقی پاکستان میں مختلف گروپوں کی شکل میں سرگرم عمل تھے۔ ایک گروپ "مشرقی پاکستان کمیونسٹ پارٹی مارکسی لینینی" (East Pakistan Communist Party Marxist Leninist-EPCPML) تھا جس کا کہنا تھا کہ پاکستان کا وجود ایک نیم استعماری ریاست سے عبارت ہے۔" دوسرا گروپ "مشرقی بنگال کمیونسٹ پارٹی" (East Bengal Communist Party-EBCP) تھا۔ اس کے نزدیک پاکستان کا قیام بورژوائی انقلاب کی

---

1 – Maniruzzaman, 'Op cit' P. 15

[2] نوابزادہ نصراللہ قومی ڈائجسٹ مارچ ۱۹۸۱ء

علامت تھا۔ تیسرا گروپ "انقلابی کمیونسٹوں کی رابطہ کمیٹی" (Coordination Committee of Communist Revolutionaries-CCCR) تھا۔ اس کے نزدیک پاکستان نیم نوآبادیاتی نیم سرمایہ دارانہ، نیم جاگیردارانہ ملک ہے اور یہ کہ مشرقی پاکستان کے لئے مغربی پاکستان سے علیحدگی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔" چوتھا گروپ "مشرقی بنگال کارکن تحریک" (East Bengal Workers Movement-EBWM) تھا جس کے زیر انتظام چیئرمین ماؤ ریسرچ سنٹر ڈھاکہ بھی کام کر رہا تھا۔ ان کے نزدیک "خودمختار عوامی جمہوریہ بنگال ہی تمام دکھوں کا مداوا تھا۔ پانچواں "فکری گروپ" (The Myth Group) تھا جو "قومی جدوجہد آزادی" کے لئے تمام ممکنہ جائز و ناجائز ذرائع کو روبہ عمل لانے کا علمبردار تھا۔ چھٹا گروپ "مشرقی پاکستان طلبہ یونین" (East Pakistan Students Union-EPSU) تھی۔ جو گیارہ نکاتی فارمولا کو لے کر برملا "آزاد اشتراکی بنگلہ دیش" کے لئے نعرہ زن تھی۔

۱۹۷۰ء میں عام انتخابات کے موقع پر یہ تمام گروپ اس بات پر متفق تھے کہ نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) کو ان انتخابات میں ہرگز حصہ نہیں لینا چاہیئے، بلکہ مسلح بغاوت کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ انہی دنوں EPCPML نے مندرجہ ذیل چار نکاتی پروگرام برائے انقلاب مرتب کیا۔

۱۔ ایک خفیہ مسلح انقلابی پارٹی منظم کرنا، جو مارکسی، لینینی اور ماؤزے تنگ افکار کی علمبردار ہو۔

۲۔ جاگیرداری، نوآبادیاتی اور سرمایہ داری کے خلاف اشتراکی انقلابی کارکنوں اور مذکورہ بالا تنظیموں کو ایک فعال تنظیم میں منظم کرنا۔

۳۔ دیہاتوں میں مسلح انقلابیوں کے یونٹ قائم کرنا۔

۴۔ آخرکار پورے مشرقی پاکستان میں مسلح بغاوت کر کے ایک "خودمختار عوامی سوشلسٹ جمہوریہ بنگال" کا قیام عمل میں لانا۔[1]

اس پروگرام کو دوسرے چین نواز اشتراکی گروپوں CCCR اور EBCP نے بھی خفیہ

1 Maniruzzaman, 'Op cit' P, 23-26

سرکلر کے ذریعے خوب پھیلایا۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں CCCR اور EPCPML نے مسلح گوریلوں کی تنظیم بڑی تیزی سے شروع کر دی انہیں مغربی بنگال (ہندوستان) میں موجود ہم خیال نکسل باڑی (مسلح کمیونسٹ تحریک جو چین کی حمایت سے متحدہ بنگال کے لئے کوشاں تھی) کی بھی معاونت حاصل تھی۔ EBCP بھی اس مہم میں مذکورہ دونوں گروپوں کے دوش بدوش تھی۔

چنانچہ طے شدہ حکمت عملی کے مطابق بھاشانی صاحب (نیشنل عوامی پارٹی) نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا اور "ووٹ سے پہلے روٹی" کا نعرہ لگایا۔ اس طرح بالواسطہ طور پر بھاشانی نے شیخ مجیب کو تقویت پہنچائی کیونکہ بھاشانی کے حامیان کے تمام ووٹ عوامی لیگ کو ملے۔ نتیجتہً ووٹ اور دھونس کے ذریعے عوامی لیگ ایک غیر معمولی قوت کے ساتھ سامنے آئی۔

پاکستان کے کمیونسٹوں کی وفاداریاں درحقیقت کبھی بھی ریاست پاکستان سے وابستہ نہیں رہیں۔ وہ اپنے قول و فعل سے اسے روس کی کالونی یا ہندوستان کا دست نگر یا چھوٹی چھوٹی نام نہاد "آزاد" ریاستوں کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں (اور ہندوستان کو متحد و مضبوط)۔ کمیونسٹوں کی یہ ادا ہر فہم سے بالاتر ہے کہ ان کی پسند کے "ظالم" اور پسند کے "مظلوم" ہیں۔ ان کے نزدیک "انسان" صرف وہ ہے جو کمیونسٹ ہے یا کمیونسٹوں (سوشلسٹوں) کی قیادت میں "محبوب" کردہ ہے جو پاکستان کو توڑنے یا اسلام پر پھبتی کسنے کے لئے نعرے بلند کرتا ہے، ان کے علاوہ باقی تمام لوگ انسان کہلانے کے حق سے محروم ٹھہرتے ہیں۔ اگر ایسے لوگ لاکھوں کی تعداد میں بھی مر جائیں تو اشتراکیوں کی "انسان دوستی" کو صدمہ نہیں پہنچتا اس کے برعکس اگر ان کا کوئی "پسندیدہ مظلوم" سیب کاٹتے ہوئے زخمی ہو جائے یا غلط سے غلط کام کرتے ہوئے مر جائے تو یہ پوری دنیا میں کہرام برپا کر دیتے ہیں۔ اپنے ناقابل فہم رویے کے باعث پاکستانی کمیونسٹ پورس کے ہاتھی ہیں[1]۔ چنانچہ انہوں نے "مظلوموں" کے نعرے مسلسل بلند کر کے پاکستانی عوام میں علاقائی

---

[1] عطاء الحق قاسمی "روزن دیوار سے" روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۲۶ مارچ ۱۹۸۴ء

عصبیتوں کے نفوذ اور پاکستان کو توڑنے کے لئے دو طرفہ (بھارت روس) تعلقات کا سہارا لیا
ان کی طاقت کا سرچشمہ پاکستانی پریس پر قبضہ اور روس کی تھپکی ہے۔

جماعتِ اسلامی پاکستان

مشرقی پاکستان کی تمام سیکولر (لادینی) پارٹیوں نے مسلم لیگ کے بطن سے جنم لیا تھا۔ ان کے مدمقابل قابلِ ذکر نظریاتی پارٹی صرف جماعت اسلامی تھی جسے تن تنہا ان سب کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن یہ مقابلہ افہام و تفہیم کی صورت میں تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے حریفوں کو سرکشی اور بغاوت کی روش سے روکنے، دستوری جدوجہد کی راہ پر گامزن رکھنے اور مشترکہ قومی مفاد کی خاطر انہیں ساتھ لے کر چلنے کی پالیسی اختیار کی۔ اگر جماعت نے یہ رویہ نہ اپنایا ہوتا تو ۱۹۶۲ء کے دستور کے خلاف چلنے والی تحریک ۱۹۶۲ء ہی میں بغاوت بن جاتی اور جنگ ۱۹۶۵ء میں علیحدگی کا عمل مکمل ہو جاتا[1]

جماعت اسلامی نے مشرقی پاکستان کی سیاسی صورتِ حال کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہاں مغربی پاکستان سے اپنے ایک انتھک، ذہین اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے رہنما چودھری علی احمد خان کو مشرقی پاکستان بھیجا (۱۹۵۲ء) جنہوں نے وہاں فکری کام کو منظم کیا۔ کچھ عرصہ بعد ان کی معاونت کے لئے شیر علی خان اور سید اسعد گیلانی وہاں گئے۔ اسی دوران بنگلہ زبان تحریک کے سابق رہنما غلام اعظم (پروفیسر) جیسی مؤثر اور انتھک شخصیت تحریک اسلامی کو میسر آئی جنہوں نے آگے چل کر صوبائی سطح پر مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کو ایک فعال، مدبر اور مثالی قیادت فراہم کی۔ جب کہ تحریک اسلامی کو تربیتی و تنظیمی غذا خرم جاہ مراد (سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ) نے فراہم کی۔

جنوری ۱۹۵۶ء میں مولانا مودودیؒ نے مشرقی پاکستان کا چالیس روزہ دورہ کیا اور وہاں کے مسائل کو براہ راست قریب سے دیکھا، اور پھر ان کا حل بارہ[2] نکات کی صورت میں

---

[1] پروفیسر فروغ احمد "مجلہ نظریۂ پاکستان"۔ ص ۵۹-۶۰

[2] ابوالاعلیٰ مودودیؒ "مشرقی پاکستان: حالات و مسائل جائزہ اور اصلاح کی تدابیر"۔ ص ۲۹-۳۲

پیش کیا۔

چند سال بعد اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ایک بار پھر مولانا مودودیؒ مشرقی پاکستان کے حالات و کوائف کا جائزہ لینے کے لئے اکیس روزہ دورے پر نکلے۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد وہاں جو بے چینی پیدا ہوگئی تھی، اس کے اظہار کو آئین و قانون کی حدود میں رکھنے کے لئے مشرقی پاکستان کے سیاسی زعماء سے ملاقاتیں کیں۔ اگلے ہی سال نومبر ۱۹۶۳ء میں مولاناؒ پھر مشرقی پاکستان گئے۔ فروری ۱۹۶۶ء میں مولانا مشرقی پاکستان آئے۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد وزیر خارجہ مسٹر بھٹو نے یہ کہہ کر کہ مشرقی پاکستان پر اگر بھارت حملہ کرنے سے باز رہا ہے تو یہ محض چین کا خوف تھا۔ ...... مشرقی پاکستانی عوام میں احساس محرومی کو اور گہرا کر دیا۔ بھٹو صاحب کے غیر محتاط (یا خوب سوچے سمجھے) جملے نے علیحدگی پسندی کی سوچ کو توانائی بخشی اور ملک کا یہ حصہ امر واقعہ ہے کہ اسی روز علیحدگی کی راہ پر قدرے تیزی کے ساتھ گامزن ہوا۔ سید مودودیؒ اس جملے سے پیدا ہونے والی منفی صورت حال کا اندازہ کر کے ایک بار پھر مشرقی پاکستان پہنچے تاکہ اصلاح احوال کی تدابیر اختیار کی جا سکیں۔ چنانچہ ۱۵ اپریل ۱۹۶۶ء کو مشرقی پاکستان کے سیاسی، معاشی، فکری، دفاعی تعلیمی مسائل اور ان کے حل کی تجاویز و عملی اقدامات کی سفارشات پر مشتمل جماعت اسلامی نے ایک طویل قرار داد منظور کی۔[1]

اگر حکمران اور ملک کی دیگر سیاسی جماعتیں ان سفارشات پر سنجیدگی سے توجہ دیتیں تو شاید سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ رونما نہ ہوتا۔

۱۹۷۰ء میں جماعت اسلامی نے جو انتخابی منشور پیش کیا اس میں بھی مشرقی پاکستان کے مسائل کو قرار واقعی اہمیت دی گئی۔ یہ منشور پاکستان کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے تمام سیاسی پارٹیوں سے زیادہ مؤثر اور ہمہ گیر پروگرام تھا۔[2]

لیکن جماعت اسلامی پاکستان کے ملک کے مشرقی حصہ سے اس والہانہ لگاؤ کے باوجود

---

[1] پروفیسر غلام اعظم، "مشرقی پاکستان کے لئے راہِ نجات" (قرار داد کا متن) ڈھاکہ ۱۹۶۶ء
[2] "منشور" ۱۹۷۰ء جماعت اسلامی پاکستان، ص ۱۳ - ۱۴، ۱۵

حکمرانوں کی کوتاہ اندیشی، غیر ملکی طاقتوں کی آلہ کار سیاسی جماعتوں اور سپر پاورز کی مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں کھلم کھلا دلچسپی نے ملک کو دولخت کر کے چھوڑا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے ملک کے حکمران لیاقت علی خان سے ایوب خان و یحییٰ تک بنگالی نیشنلزم، سوشلزم اور دوسرے فتنے کو برداشت کرنے میں ہمیشہ روا دار رہے، لیکن جماعت اسلامی کو ایک روز کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکے اس بات کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ وہاں بنگلہ اور انگریزی زبان کے متعدد روزناموں اور ہفت روزہ رسائل کو کمیونزم اور بنگالی نیشنلزم کا زہر کو پھیلانے کی کھلی چھوٹ تھی، لیکن جماعت اسلامی کو ۱۹۵۶ء تک حکومت نے ایک اخبار کا ڈیکلریشن تک نہیں دیا[1] الٹا اس کا لٹریچر ضبط اور کارکنوں کو پابند سلاسل کیا جاتا رہا۔ بار بار جماعت کو خلاف قانون قرار دیا گیا حتیٰ کہ اس کے قائد سید مودودیؒ کو پھانسی کے تختے تک لے جانے میں بھی انہیں باک نہ ہوا۔ حالانکہ یہ واحد ملک گیر تنظیم تھی جس کے بالخصوص درس گاہوں میں پیدا ہونے والے طوفان الحاد و تخریب پسندی کے مقابلہ میں مستحکم اثرات موجود تھے، جسے نیک اور بے لوث محب وطن نظریاتی کارکنوں کی ٹیم میسر تھی، لیکن حکومت ہی نہیں، جاگیردارانہ سیاست اور صحافت پر قابض ٹولے نے اس کی مخالفت کو اپنا فرض منصبی جانا۔ باطل نظریات کے مقابلہ میں پاکیزہ فکر کی حامل پاکیزہ سیاست کی اس آواز کو دبانے کے لئے مسلم لیگ اور مسلم لیگ کے بطن سے جنم لینے والی سیکولر جماعتوں نے ہمیشہ اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگائے رکھا۔ ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم میں خصوصاً ملک کے دونوں حصوں میں ان عناصر کا سب سے بڑا ہدف مولانا مودودیؒ رہے۔ جس کا منطقی نتیجہ جماعت کی انتخابی شکست کی صورت میں نکلا۔

خارجہ پالیسی

دنیا کے تمام بڑے ملکوں کی خارجہ پالیسی کے امور کو کل جماعتی بنیادوں پر طے

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ: مشرقی پاکستان۔ حالات و مسائل کا جائزہ اور اصلاح کی تدابیر، ص ۲۵

کیا جاتا ہے۔ محض عام حالات ہی میں نہیں بلکہ غیر معمولی حالات میں تو اس کا اہتمام اور زیادہ سختی سے کیا جاتا ہے۔ مگر پاکستان میں معمولی حالات تو ایک طرف رہے غیر معمولی حالات میں بھی کوئی ایسی کوشش نہ ہوئی۔ چنانچہ ہماری پوری خارجہ پالیسی عارضی (Ad-Hoc) انداز میں بنائی اور چلائی گئی۔ جن امور کا فیصلہ عمیق مطالعے، گہرے تجزیئے ٹھنڈے سوچ بچار اور صبر آزما تبادلہ خیال کے ذریعے ہونا چاہیے تھا۔ انہیں جذباتی نعروں اور فیصلوں کے ذریعے طے کرانے کی روش قائم کی گئی۔[1] اس معاملہ میں حکومت اور حزب اختلاف دونوں کا رویہ قابل اصلاح تھا اور ہنوز یہی صورت حال ہے۔ اسی طرح پاکستان کے شعبہ امور تعلقات خارجہ اور حکمرانوں نے شروع دن ہی سے اپنی خارجہ پالیسی کے تعین میں اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ جغرافیائی پوزیشن بھی کسی ملک کی خارجہ پالیسی کے نقوش متعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

ہندوستان

پاکستان کے بارے میں ہندوستان اور کانگریسی قیادت کی پالیسی بہت مستقیم (Consistent) اور سوچی سمجھی رہی ہے۔ کانگریس نے پاکستان کے قیام کی جان توڑ مخالفت کی، مگر اس کی مخالفت کے علی الرغم جب پاکستان بن گیا تب بھی اس نے کھلے دل سے اس کے وجود کو قبول نہیں کیا۔

قیام پاکستان کے اعلان سے صرف ۸ روز قبل ۱۵ مئی ۱۹۴۷ء کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ایک بیان میں کہا تھا کہ "جو لوگ پاکستان کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ جنت الحمقاء میں بس رہے ہیں۔"

پاکستان کے نظریاتی وجود کا مضحکہ اڑاتے ہوئے پہلے وزیر اعظم ہند جواہر لال نہرو نے علی گڑھ یونیورسٹی میں کہا: "پاکستان غیر فطری طور پر وجود میں آیا ہے . . . . . . پاکستان

---

[1] پروفیسر خورشید احمد "پاکستان، بنگلہ دیش اور جنوبی ایشیا کی سیاست"۔ ص ۸

ایک ناممکن العمل ملائی (Theocratic) ریاست ہے [1] جو پانچ دس سال میں پھر ہندوستان میں ضم (Merge) ہو جائے گی۔[2]

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ۳ دسمبر کو اندرا گاندھی نے کلکتہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ "بھارت نے کبھی پاکستان کی تخلیق کو تسلیم نہیں کیا۔ اس دور میں کسی ملک کی بنیاد مذہب پر نہیں رکھی جاسکتی۔ پاکستان ایسے ہی ایک بے تکے تصور پر مبنی تھا۔ بھارتی قیادت پہلے بھی یہ سمجھتی رہی ہے اور آج بھی سمجھتی ہے کہ پاکستان ایک ایسی ریاست ہے جو وجود میں آنے کی قطعی مستحق نہ تھی اور نہ اسے وجود میں آنا چاہیئے تھا۔"[3]

بھارت اور بھارت نواز حلقوں کے نزدیک پاکستان "مذہبی جنون" تنگ نظری اور "دقیانوسیت" (Orthodoxy) کی پیداوار ہے۔ چنانچہ پاکستان کے نظریاتی تصور کو بھارت کی ہندو قیادت نے ہمیشہ اپنے سیاسی، مذہبی اور بین الاقوامی تصورات کی ضد سمجھا ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے "مخالف کو مارنے سے پہلے اسے بدنام کرو" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے یہودی اور اشتراکی لابی کے تعاون سے پاکستان کو بدنام کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ پاکستان کے خلاف اندرون ملک اور بیرون ملک مسلسل ایک پراپیگنڈہ مہم شروع کئے رکھی، جو آج بھی جاری ہے اور پاکستان کو اپنا دشمن نمبر ایک قرار دیتے ہوئے اس کا عالمی وقار مجروح کرنا بنیادی ہدف ٹھہرا رکھا ہے۔ نیز پاکستان کو رسوا کرنے یا اس کی سالمیت ختم کرنے کی ہر تحریک پر ہمیشہ "دست شفقت" رکھا۔[4] بھارت کی اس پالیسی کے متعین مقاصد یہ رہے ہیں:

---

1 Josef Korbel, "Danger in Kashmir" P. 127–130.

۲ پروفیسر خورشید احمد ——— ایضاً ——— ص ۴۳، ۴۴

۳ بحوالہ ایضاً Daily 'Telegraph,' (London) 4 Dec. 1971.

4 Ashoka Rina, "Inside Raw" (The Story of Inidan Secret Service)

اوّلاً : پاکستان قائم نہ رہ سکے۔

ثانیاً : اگر قائم رہے تو کبھی مضبوط نہ ہو سکے۔

ثالثاً : اگر مضبوط بھی ہو جائے تو ہندوستان غالب قوت ہو تاکہ وہ جب چاہے پاکستان کو مغلوب کر سکے"[1]

مذکورہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے دو طریقے اختیار کئے گئے ۔

اول یہ کہ مغربی پاکستان میں موجود بھارتی لابی کے قوم پرستوں اور روسی لابی کے کیمونسٹوں کے ذریعے پختونستان کا سٹنٹ کھڑا کیا گیا۔ جسے بھارت اور روس کی آشیرباد سے افغانستان حکومت کی براہِ راست پشت پناہی حاصل رہی اور اس کے ذریعے پاکستان کے شمالی محاذ اور اندرونی استحکام کو ضعف پہنچایا۔

دوم یہ کہ مشرقی پاکستان کو کمزور کرنے اور اسے پاکستان سے الگ کرنے کے پروگرام پر طویل المیعاد (Long Term) منصوبہ شروع کیا۔ چنانچہ پہلے لسانی مسئلہ اٹھایا۔ پھر گذشتہ ڈیڑھ صدی سے ہندو ساہوکاروں، سرمایہ کاروں اور مارواڑیوں کی جانب سے بنگالی مسلمانوں کے استحصال کو، پراپیگنڈے کے زور پر مغربی پاکستان کے کھاتے میں ڈال دیا۔ مشرقی پاکستان کی معاشی بدحالی کو دفاعی اخراجات سے منسلک کر کے پاکستان کے دفاعی بجٹ کو کم کرنے کی "ضرورت" کا پروپیگنڈا کیا۔ پاکستان کی سیاسی و معاشی شہ رگ کاٹنے کے لئے بعض عرب حکومتوں کو آلۂ کار بنایا۔ بین الاقوامی رائے عامہ کی نظر میں پاکستان کو "امریکہ کا پٹھو" ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا۔ غرضیکہ بھارت کی پاکستان کے خلاف یہ اور ایسی ہی دوسری پالیسیاں ایک ایسے کثیر جہتی منصوبہ کے اجزا تھیں اور ہیں، جس میں گرم اور سرد دونوں پہلوؤں کو ایک منضبط (Well-knitted) حکمت عملی میں سمو دیا گیا جس میں تصادم مداخلت، مکر و فریب، مذاکرات اور عیارانہ گریز اور تجاہل اس طرح باہم دگر ملے ہوئے ہیں جس طرح . . . . ، لومڑی کے ساتھ مکاری، طوطے کے ساتھ طوطا چشمی

---

[1] پروفیسر خورشید احمد —— ایضاً —— ص ۹ ۳ - ۲۰ ، ۶۱ - ۶۲

اور بنگلے کے ساتھ مسکینی لازم و ملزوم ہیں۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے چند قریبی عملی شواہد ہیں۔

اگرتلہ سازش (۶۷-۱۹۶۸ء) ناکام ہو جانے کے بعد بھارت کسی دوسرے موقع کی تلاش میں رہا۔ ۱۹۷۰ء میں پاکستان میں انتخابات کی آمد آمد نے اسے بہ انداز دگر ایک موقع فراہم کیا۔ چنانچہ اس نے طے شدہ سٹریٹجی کے تحت مغربی پاکستان کے خلاف نفرت اور بنگالی قومیت کے جذبہ کو ابھارنے کے لئے منظم پروپیگنڈہ کا آغاز کر دیا۔ کلکتہ ریڈیو اس مہم میں پیش پیش رہا۔ شومئی قسمت سے انتخابات سے صرف ایک ماہ قبل ماہ نومبر میں مشرقی پاکستان میں قیامت خیز سمندری طوفان آیا اور اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت اور بھارت نواز حلقوں نے مغربی پاکستان کے خلاف الزامات کا ایک طوفان اٹھا دیا۔ ہندوستان پاکستان کی سیاسی صورتِ حال کو اس لئے بھی بد سے بدتر بنانے پر تلا ہوا تھا کہ ان دنوں مغربی بنگال کے سیاسی حالات اس کے لئے سخت پریشان کن تھے۔ مغربی بنگال میں ایک عرصہ سے کانگریس کو شکست ہوتی چلی آ رہی تھی۔ بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی مشرقی پاکستان میں سیاسی حالات کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی مشرقی سرحدوں پر خطرے کے بہانے اپنی فوج کو مغربی بنگال کے قریب مشرقی پاکستان کی سرحدوں پہ ڈال دینا چاہتی تھی تاکہ مغربی بنگال کے عوام کو حالات کی سنگینی کا تاثر دے کر انتخابات کے دوران "امن و امان" برقرار رکھنے کی ناگزیر ضرورت کے تحت کامیابی کے زینے طے کر سکے۔ دوسری جانب پاکستان پر بھی نفسیاتی دباؤ بڑھایا جا سکے۔ گویا بھارتی قیادت ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی تھی جس میں کامیاب رہی چنانچہ بھارت نے مشرقی پاکستان کی سرحد پر ایک لاکھ بیس ہزار فوج لا ڈالی۔

۱۹۷۰ء کے ان انتخابات کے دوران بھارت کی یہ خواہش رہی کہ بہر صورت عوامی لیگ کو منتخب کرایا جائے تاکہ اس کے ذریعہ اپنے ان مفادات کو حاصل کر سکے جو اگرتلہ سازش کے ناکام ہو جانے کے باعث وہ حاصل نہیں کر پایا تھا۔ چنانچہ اس نے مجیب کی شخصیت بنگالیوں کے نجات دہندہ کے طور پر ابھارنی شروع کی اور مشرقی پاکستان کا ایک ایک ہندو ووٹ

عوامی لیگ کو دلوایا۔عوامی لیگ کی کامیابی کے فوراً بعد ہندوستانی وزیراعظم نے بھارتی بنگال میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا تاکہ وہاں اندرا کانگریس برسراقتدار آکر مشرقی پاکستان میں متوقع بغاوت کی مدد کر سکے۔

چنانچہ جب مشرقی پاکستان میں بغاوت کی سی صورت پیدا ہوئی اور پاک فوج نے وہاں آپریشن شروع کیا تو دو روز بعد ہی ۲۷ مارچ کو بھارتی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے اندرا گاندھی نے کہا: مشرقی بنگال میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم خوش آئند تصور کرتے ہیں۔ ہم اس صورت سے پوری طرح متعلق ہیں۔ میں ارکان پارلیمنٹ کی اس خواہش کہ فیصلے بروقت کئے جائیں۔ کے جواب میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ میرے نزدیک "بروقت" سے زیادہ اہم چیز "عملی" اقدام ہے۔اس لئے ہم زبانی جمع خرچ کے بجائے عملی اقدام کریں گے[1] اور ۳۱ مارچ کو بھارتی پارلیمنٹ نے بنگالیوں کی "جدوجہد" کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس کی "مکمل تائید" کا اعلان کر دیا۔حکمران کانگریس کی پارلیمانی کمیٹی نے پاکستان میں فوری مسلح مداخلت کی قرارداد منظور کی۔کل ہند کانگریس کمیٹی کے اجلاس ۱تا۲ اپریل ۱۹۷۱ء میں کھلم کھلا اعتراف کیا گیا کہ "شیخ مجیب درحقیقت بھارت کی جنگ لڑ رہا ہے"[2]

انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان میں بے چینی کا آغاز ہونے پر پہلے مرحلے میں بھارت نے اپنے مسلح دستوں کو سفید کپڑوں میں پاکستان کی سرحدوں کے اندر بھیجا۔ پاکستان نے آرمی ایکشن شروع کیا تو ہندوؤں، عوامی لیگیوں اور نیپ کے کارکنوں کی ایک کثیر تعداد ہندوستان کی حدود میں بلا روک ٹوک داخل ہو گئی۔اپریل تک ہندوستانی حکومت کے مطابق ڈھائی لاکھ بنگالی "مہاجرین" ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اس طرح بلا روک ٹوک انہیں بھارت کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت دینے کا مقصد اس کے سوا اور کیا تھا کہ بھارت انہیں اپنی سرزمین پر گوریلا جنگ کی تربیت دینا چاہتا تھا تاکہ یہ تربیت یافتہ لوگ واپس جا کر تباہی

---

1 Indira Ghandhi, "India and Bangladesh" P 9–14.

2 Safdar Mehmood, "Pakistan Devided" P. 139

اور مجیب باہنی کے روپ میں تخریب کاری وقتل وغارت کا سلسلہ شروع کردیں اور حملہ کے وقت بھارتی فوجوں کی راہنمائی اور اس سے تعاون کرسکیں۔

پاکستانی فوج نے جب صورت حال پر قابو پالیا اور حالات قدرے پرسکون ہوگئے تو حکومت پاکستان نے عام معافی کا اعلان کیا اور بھارت چلے جانے والوں کو بلا خوف وخطر واپس آنے کی دعوت دی تو ہندوستان آڑے آیا۔ چنانچہ اس بات کو اقوام متحدہ کی کمیٹی برائے مہاجرین نے بھی تسلیم کیا کہ "بھارتی حکومت بنگالی مہاجرین کی اپنے وطن واپسی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔" [1]

اس لئے کہ ان "بے گھر" مہاجرین کے ذریعے اسے "گوریلے" مل رہے تھے اور اس پر فائدہ کروڑوں ڈالر کی وہ امداد تھی جو ان مہاجرین کے نام سے اسے دنیا سے مل رہی تھی۔ چنانچہ یہ مہاجرین نہ صرف یہ کہ اس کی معیشت پر بوجھ نہ تھے، بلکہ خود حکومت ہند کو مالی مفاد حاصل ہو رہا تھا۔ دوسری جانب یہودی لابی کے زیر اثر دنیا بھر کے اخبارات بھارت کے "مقدمے" کو حیثیت وکیل کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ آرمی ایکشن اور اس سے متعلقہ حقیقتوں اور افسانوں کو بھرپور پذیرائی حاصل ہو رہی تھی۔ جنرل ٹکا خان نے ۲۶ مارچ کو عالمی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرکے اور ملک سے باہر نکال [2] کے مسلم دشمن عالمی پریس کو اور مشتعل کردیا تھا۔ نتیجۃً وہ جھوٹے افسانے اور بھارتی وزارت اطلاعات کے فراہم کردہ معلوماتی کچرے کو دنیا بھر میں صحافت کا "معدقہ" شاہکار بنا کر پیش کرتے رہے۔ [3]

عوامی جمہوریہ چین

پاکستان اور عوامی جمہوریہ چین کے مابین سفارتی تعلقات ۱۹۵۰ء میں اس وقت

---

1 — "Pakistan Times, 7 July 1971.

۲؎ صدیق سالک ــــــــ ایضاً ــــ ، ص ۹۹

3 — Safdar Mehmood 'Op Cit' P. 143.

قائم ہوئے تھے۔ جب جنرل اے ایم رضا کو سفیر بنا کر پیکنگ بھیجا گیا۔ اس وقت اگرچہ کمیونسٹ اصطلاح کے مطابق پاکستان "سامراجی کیمپ" میں تھا۔ لیکن چین کی اقوام متحدہ میں شمولیت کا مسئلہ دسمبر ۱۹۵۰ء میں درپیش ہوا، تو پاکستان نے اس کے حق میں رائے دی۔

۱۹۵۵ء میں بنڈونگ کانفرنس کے موقع پر پاکستانی وزیر اعظم محمد علی بوگرا اور چینی وزیر اعظم چو این لائی کے مابین مذاکرات ہوئے اس کے بعد چین نے کبھی پاکستان مخالف رویہ اختیار نہیں کیا۔ البتہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کے عرصہ میں امریکی دباؤ کے تحت چین کے بارے میں پاکستان کی پالیسی سردمہر رہی اور یہی وہ عرصہ ہے جس کے دوران بھارت سے چین کے تعلقات گہرے ہوئے اور ان کے درمیان بعض معاہدات ہوئے۔

۱۹۶۲ء میں بھارت چین جنگ کے دوران امریکہ نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ بھارت کا ساتھ دے۔ مگر اس وقت کے صدر جنرل محمد ایوب خان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا[1] جس پر امریکہ نے برہمی کا اظہار کیا۔ اس موقع پر پاک چین تعلقات کے نئے اور گرم جوش سفر کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں چینی وزیر اعظم مسٹر چو این لائی اور صدر ایوب خان کی ملاقات ہوئی۔

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں چین نے بھارت کو نہ صرف جارح قرار دیا۔ بلکہ بھارت کو دھمکی (Ultimatum) بھی دی۔ کہا جاتا ہے کہ بھارت کو مشرقی پاکستان پر حملے کی جرأت اسی الٹی میٹم کے باعث نہ ہوئی چین کے اس دوٹوک رویہ سے اقوام متحدہ اور بڑی طاقتیں حیرت زدہ ہوگئیں۔

لیکن پاک چین تعلقات کو ایک بار پھر اس وقت جھٹکا لگا جب پاکستان نے روس کی سرزمین پر بھارت سے جنگ بندی کا معاہدہ کیا جسے معاہدہ تاشقند (جنوری ۱۹۶۶ء) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جنرل محمد یحییٰ خان کے دور صدارت میں پاکستان اور چین میں اعتماد کے رشتے

---

1 — Altaf Gauhar "Ayubkhan's : Abdication" Third World (Qr) Jan. 1985.

بحال ہوئے اور تعلقات میں پھر گرم جوشی پیدا ہوئی، جب پاکستان نے امریکہ اور چین کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے ڈاکٹر ہنری کسنجر کے خفیہ دورۂ چین (جولائی ۱۹۷۱ء) کا اہتمام کیا۔

لیکن ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کے دوران چین کا رویہ سرد مہری کا شکار رہا پاکستانی عوام کو توقع تھی کہ چین ۱۹۶۵ء کی طرح پاکستان کی بھرپور مدد کرے گا اور ضرورت ہوئی تو چین مداخلت سے بھی گریز نہ کرے گا اور یہ صرف پاکستانی عوام کا ہی خیال نہیں تھا بلکہ امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے بھی بھارت کے دورہ (۱۹۷۱ء) کے دوران کہا تھا "اگر پاکستان سے جنگ ہوئی تو چین بھارت کے خلاف میدان جنگ میں آ جائے گا اور ہم بھارت کی مدد نہیں کر سکیں گے، کیونکہ اب اس نے روس سے دفاعی معاہدہ کر لیا ہے۔"

دراصل یہ توقعات، حالات کے سطحی مطالعہ یا جذباتی کیفیت کی بنا پر قائم کی گئی تھیں۔ اس جنگ سے ڈیڑھ ماہ پہلے (اکتوبر ۱۹۷۱ء) چین میں بھارت کی ٹیبل ٹینس ٹیم کا جس گرم جوشی سے استقبال کیا گیا تھا اور اندرا گاندھی کے خیر سگالی پیغام کو جو موافقانہ اہمیت دی گئی تھی اس سے اہل نظر جان گئے تھے کہ چین اب بھارت کے خلاف پہلا سا رویہ برقرار رکھنا نہیں چاہتا ـــــــ اولاً اس کی وجہ یہ تھی کہ بھارت اور روس کے درمیان اجتماعی سلامتی کا دفاعی معاہدہ موجود تھا۔ چین اگر پاکستان کی مدد کو آتا، اپنے دستے بھیجتا یا بھارت کی سرحدوں پر کوئی مسئلہ کھڑا کرتا تو روس چین کی سرحدوں پر ایسے ہی مسائل کھڑے کر سکتا تھا۔ چین یہ بات خوب سمجھتا تھا اور وہ یہ خطرہ مول لینے کے لئے ہرگز آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ ثانیاً مشرقی پاکستان کی چین نواز "نکسل باڑی تحریک" پاکستان کے خلاف گوریلا جنگ لڑ رہی تھی۔ چنانچہ چین کا رویہ اپنے نظریاتی مفادات کے تابع رہا اور پاکستان کی حمایت میں اس کے اعلانات میں غیر معمولی احتیاط کا عنصر غالب رہا اور تعلقات میں وابستگی' الفاظ کی گرم جوشی سے آگے نہ بڑھی۔[1] علاوہ ازیں بھاشانی صاحب نے چینی

---

[1] الطاف حسن قریشی۔ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، لاہور جنوری ۱۹۷۲ء

کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین ماؤزے تنگ اور وزیر اعظم چواین لائی کو اس مضمون کے خطوط بھی لکھے کہ "وہ ان کی جدوجہد آزادی میں مدد کریں"۔ [1]

اس پس منظر میں جب یحییٰ حکومت کی جانب سے پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو جنرل گل حسن اور ائیر مارشل رحیم خان کے ہمراہ فوجی وفد لے کر چین گئے (نومبر ۱۹۷۱ء) تو وہاں ان کا استقبال سرد مہری سے کیا گیا۔ بات چیت کے دوران چینی حکام نے پاکستانی وفد کو ساٹھ ایسے چین نواز کمیونسٹ بنگالی کارکنوں کی فہرست پیش کی جنہیں ان کے بقول "پاکستانی فوج نے مشرقی پاکستان کے آرمی ایکشن میں ہلاک کر دیا تھا"[2] چنانچہ پاکستانی وفد کو محض یہ مشورہ دے کر واپس کر دیا گیا کہ "بھارت سے جنگ میں الجھنے سے بچا جائے اور مسئلے کا سیاسی حل تلاش کیا جائے"۔

۳ جنوری ۱۹۷۲ء کو چینی وزیر اعظم چواین لائی نے ان الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ "۱۹۷۱ء میں پاکستان کے لئے چینی مدد بہت محدود تھی لیکن ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے"۔

دراصل ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک مشرقی پاکستان میں بھارتی روسی اور امریکی پالیسیوں کے باعث چین نے غیر محسوس انداز سے دوہری پالیسی اختیار کئے رکھی۔ ایک طرف تو پاکستان کے ساتھ گہرے تعلقات استوار کئے گئے۔ تاکہ ہندوستان، امریکہ اور روس کی مشترکہ "چین گھیراؤ پالیسی" سے بچا جا سکے۔ دوسری جانب نظریاتی مفادات کے تحت مشرقی پاکستان میں پیکنگ نواز کمیونسٹوں کو مقامی علاقائی مسائل میں بھرپور کردار ادا کرنے کی گائیڈ لائن دی۔ کیونکہ چین کو یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ پاکستان اپنی کمزور داخلہ پالیسیوں کے باعث زیادہ مدت تک مشرقی پاکستان کو ساتھ لے کر نہیں چل سکے گا۔ چنانچہ اس نے چین نواز حلقوں کو "عظیم تر بنگال" کا نعرہ دیا۔ جو مشرقی بنگال (پاکستان) اور مغربی بنگال (ہندوستان) کے ادغام سے ایک آزاد اشتراکی ریاست کے طور پر ابھرتا۔ مشرقی پاکستان

1 — Sukrangan Das Gupta "Midnight Massacre in Dacca" P. 8.

2. G.W. Chaudhry "Last Days of United Pakistan" P. 119.

کمیونسٹ پارٹی (چین نواز) اور نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) اور مغربی بنگال میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسسٹ اور نکسل باڑی تحریک نے اس کو آگے بڑھانے کے لیے کام کیا اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سبھی اشتراکی گروہوں نے ہندوستان، یورپ، اور امریکہ میں بنگلہ دیش کے لئے بھرپور کام کیا۔[1]

اسرائیل

یہودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور ہی سے مسلمانوں کی دشمنی میں مشہور رہے ہیں دشمنی کا یہ طویل سفر آج بھی پاکستان کے خلاف محاذ آرائی اور بھارت کے ساتھ دوستانہ حکمت عملی میں پوری طرح جاری ہے۔ یہودی ریاست اسرائیل کی تخلیق کے فوراً بعد جس ملک نے سب سے پہلے اسے تسلیم کیا وہ روس تھا۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۵۰ء کو بھارت نے بھی اسرائیل کی نوسامراجی ریاست کو تسلیم کر لیا۔ اگرچہ دونوں ملکوں کے درمیان یہ تعلقات دبیز پردوں میں پوشیدہ رہے، لیکن کبھی کبھی اندرونی سرسراہٹ سے آزاد دنیا کو آگاہی ہوتی رہتی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں بھارت اور اسرائیل نے جوہری (ایٹمی) تعاون کے مشترکہ معاہدے پر دستخط کئے۔ جون ۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل نے مسجد اقصیٰ اور قبلہ اول بیت المقدس سمیت عرب علاقوں پر قبضہ کر لیا تو بھارتی پریس نے اسرائیل کو اس کارنامہ پر داد دی۔[2] یہودی سوچ کو ایک اسرائیلی جریدے . . . . یروشلم پوسٹ نے اپنی ۹ اگست ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں پاکستان اور بھارت کے بارے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:

• بین الاقوامی یہودی تحریک کو کسی طرح بھی پاکستان کے متعلق غلط فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہیئے۔ پاکستان دراصل ہمارا اصلی اور حقیقی نظریاتی جواب ہے۔ پاکستان کا ذہنی و فکری سرمایہ اور عسکری قوت آگے چل کر ہمارے لئے کسی وقت بھی مصیبت کا باعث بن سکتی ہے۔ ہمیں

---

[1] پروفیسر خورشید احمد ایضاً ص ۹۵

[2] میجر محمد حامد "اسرائیل بھارت خفیہ تعلقات"۔ ۱۹۸۰ء لاہور ص ۵۸

اس کا حل سوچنا چاہیئے۔ ہندوستان سے دوستی ہمارے لئے ضروری ہی نہیں۔ بلکہ ہمیں اس تاریخی دشمنی سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیئے جو کہ ہندو پاکستان اور اس میں بسنے والے مسلمانوں کے خلاف رکھتا ہے۔ یہ تاریخی عناد ہم یہودیوں کا سرمایہ ہے"۔[1]

جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں عربوں کی شکست کے بعد یہ راز بھی کھلا کہ بھارتی فضائیہ کے وہ پائلٹ جو مصری فضائیہ کو ایک فوجی معاہدہ کے تحت تربیت دینے پر مامور تھے انہوں نے مصر کے بعض اہم فوجی راز اسرائیل کو منتقل کر دیئے جس کے نتیجے میں یہ ممکن ہو سکا تھا کہ ۵ جون کی صبح مصری فضائیہ کے تمام بمبار اور لڑاکا طیارے فضا میں بلند ہونے سے پہلے ہی ہوائی اڈوں پر تباہ و برباد کر دیئے گئے۔[2] اس تعاون کے بعد اسرائیل بھارت تعلقات کا بنیادی نکتہ پاکستان کی شکست قرار پایا۔ چنانچہ یہ بات اب کوئی راز نہیں کہ اسی عرب اسرائیل جنگ کے بعد بھارتی فوجی کمان نے یہودی نژاد میجر جنرل جیکب کو اس منصوبے پر تعینات کیا کہ وہ "طوفانی طرز جنگ" کی حکمت عملی مرتب کرے جسے پاکستان کے خلاف استعمال کیا جا سکے[3] اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اسرائیل مشرقی پاکستان کے علیٰحدگی پسندوں کو بڑے پیمانے پر اسلحہ اور گولہ بارود فراہم کرتا رہا۔ اس امداد کا سنٹر کلکتہ میں قائم تھا۔[4] ان اطلاعات کی تصدیق مغربی اخبارات کے نمائندوں نے بھی کی۔ بھارت اور اسرائیل کے سرکاری ایجنٹوں کا ایک خفیہ وفد اپریل ۱۹۷۱ء میں شمالی امریکہ پہنچا۔ جہاں اس نے بھارت کے لئے امریکی اسلحے کی امداد کے سلسلے میں کامیاب بات چیت کی۔[5] پھر انہی دنوں اسرائیل کا ایک فوجی وفد نئی دہلی پہنچا جس میں تینوں مسلح افواج کے نمائندے شامل تھے

---

[1] اختر احسن "سازش یہود" ص ۶

[2] میجر محمد حامد ——— ایضاً ——— ص ۲۱-۲۲

[3] "Dawn" Karachi) 22 Dec. 1971.

[4] Daily "Times (London) 19, July – Vide–Pakistan Times, 13, Nov. 1971.

[5] میجر محمد حامد ——— ایضاً ——— ص ۲۳ "Daily Dawn"

اس وفد نے بھارت کے ساتھ ایک خفیہ فوجی معاہدے پر دستخط کئے [1] جس کے نتیجے میں اسرائیل کی جانب سے امریکی ساخت کا جدید اسلحہ بھارت کو پہنچنا شروع ہوا [2] اور یہ حقیقت تو محتاج ثبوت نہیں رہی کہ یہودی ذرائع ابلاغ نے مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے مبینہ "مظالم" کی خوب بڑھا چڑھا کر مسلسل تشہیر کی اور عالمی رائے عامہ کو پاکستان کے خلاف تیار کرکے بھارتی مقاصد کے لئے راہ ہموار کی [3]

امریکہ

پاکستان نے پہلے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کے عہد میں امریکہ کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اور جب پاکستان نے ستمبر ۱۹۵۴ء میں SEATO اور جولائی ۱۹۵۵ء میں سینٹو CENTO کے امریکی دفاعی معاہدوں میں شمولیت اختیار کی تو روس جو اپنے ہمسایہ میں اسلام کے نام پر قائم ہونے والی مملکت کے حوالہ سے پہلے ہی کھنچا ہوا تھا اس پر سخت برہم ہوا۔ اس کی برہمی کا کھلم کھلا اظہار اس وقت ہوا جب اس نے کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان کے موقف کو ویٹو (Veto) کر دیا۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں صدر ایوب خان اور امریکی صدر جان کینیڈی کے مابین مذاکرات کے نتیجہ میں پاک امریکہ تعلقات میں گرمجوشی پیدا ہوئی۔ انہی دنوں صدر ایوب نے امریکی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "پاکستان امریکہ کے لئے ایک ایسا قابل اعتماد علاقہ ہے جہاں وہ جب چاہے اپنی فوجیں اتار کر "آزاد دنیا" کی حفاظت کر سکتا ہے" [4] یہی وہ دن تھے، جب روس نے پشاور کے بڈھ بیر سے اڑنے والے امریکی جاسوسی طیارے یو۔ ٹو (U-2) کو گرا لیا

---

1 Daily Pakistan Times " 13, Nov. 1971.

2 - Safdar Mehmood, 'Op Cit. P. 156.

3 میجر محمد حامد ایضاً ص ۲۵-۲۶

4 Hasan Gardezi (ed) "Pakistan: The Unstable State" P. 104 – 105.

اور اس سے پائلٹ کو زندہ گرفتار کر لیا۔ روس نے دھمکی دی کہ پشاور پر سرخ نشان لگا لیا گیا ہے۔ روس کی اس دھمکی کے بعد پاکستان نے امریکہ پر زور دیا کہ وہ پشاور سے اپنا فوجی اڈا ہٹا لے۔ پاکستان کا یہ مطالبہ پاک امریکہ تعلقات میں سرد مہری کا باعث بن گیا۔

۱۹۶۲ء میں جب بھارت اور چین کے درمیان تصادم ہوا تو امریکہ کی خواہش تھی کہ پاکستان کمیونسٹ عوامی جمہوریہ چین کے مقابلہ میں ہندوستان کا ساتھ دے، لیکن پاکستان نے اس میں فریق بننے سے انکار کر دیا۔ اس پر تعلقات کی یہ سرد مہری ناراضی میں بدل گئی۔ چنانچہ جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ ہوئی تو امریکہ نے پاکستان کی فوجی امداد بند کر دی اور یہی وہ زمانہ ہے جب امریکہ میں ایک لابی پاکستان Cut-to-size پراپیگنڈے کو پروان چڑھانے لگی۔

چین کے وزیر اعظم چواین لائی نے ۲۷ جنوری ۱۹۶۴ء کو صدر ایوب کے سامنے دوستی کے معاہدے کی تجویز پیش کی۔ لیکن یہ تجویز پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کی مخالفت کے باعث پروان نہ چڑھ سکی۔ تاہم اس پیشکش کے بعد طرفین کے تعلقات میں گرم جوشی ضرور پیدا ہوئی جس سے بیک وقت امریکہ، روس اور بھارت کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ چنانچہ ان تینوں طاقتوں نے پاکستان کو سزا دینے کے لئے اپنے اپنے مفادات کے تحت مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے منصوبوں کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ پہلے امریکہ نے "عظیم تر بنگال" کا نقشہ پیش کیا (جس میں مشرقی و مغربی بنگال سمیت سکم، بھوٹان، اور ناگالینڈ شامل تھے) اور بنگالی طلبہ کے ذریعے اس تحریک کو مقبول بنانا چاہا۔ سابق گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے ایک انٹرویو میں یہ انکشاف کیا تھا کہ اس منصوبے (عظیم تر بنگال) کی حمایت اور سرگرمی سے کام کرنے کے لئے امریکی سفیر نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی تھی[1]۔ ۱۹۶۷ء کے آس پاس امریکہ نے مغربی پاکستان میں موجود اپنی لابی کے ذریعے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان پر اقتصادی بوجھ باور کرانے کا فریضہ سونپا۔ چنانچہ یہاں کے اخبارات بالخصوص کمیونسٹ رجحانات کے حامل

---

[1] "اردو ڈائجسٹ" لاہور نومبر ۱۹۷۱ء

اخبارات میں نام نہاد دانشوروں کے ایسے مقالات اور مضامین چھپنے لگے ، یہ وہ دور تھا جب مشرقی پاکستان میں ایوب آمریت کے خلاف مزاحمت بڑھ رہی تھی۔ ایوب حکومت کا سنگھاسن ڈول رہا تھا اور یہ بات زبان زد عام تھی کہ مشرقی پاکستان کو امریکہ سے امداد کے نام پر جو خوراک فراہم کی گئی ہے اس میں عوامی لیگ کے لئے اسلحہ اور گولہ بارود بھی شامل ہے چنانچہ ایوب خان نے اپنی آخری نشری تقریر میں امریکہ کی جانب کھلا اشارہ کیا تھا کہ "مشرقی پاکستان کو ہمارے ایک "دوست" نے اسلحہ خانہ میں تبدیل کر دیا ہے" [1]

مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی میں امریکی دلچسپی کا ایک باعث ۱۹۶۹ء میں امریکہ پر یہ واضح ہونا تھا کہ اسے اب ویت نام سے نکلنا پڑے گا اور پھر جنوب مشرقی ایشیا اور بحر ہند میں اس کے لئے کہیں ٹھکانہ ہوگا۔ چنانچہ اس کی نظر مشرقی پاکستان پر پڑی جو جنگی حکمت عملی کے اعتبار سے جنوب مشرقی ایشیا میں نہایت مناسب مقام پر واقع تھا۔ امریکہ کی اس حکمت عملی کے تناظر میں شیخ مجیب الرحمن کے چھ نکات اور ذوالفقار علی بھٹو کے امریکی مملکت کے ڈھانچے کی طرز پر دو قومی اسمبلیوں کی تجویز کو دیکھا جانا چاہیئے [2]

پاکستان نے نومبر ۱۹۷۱ء میں امریکہ سے بھارتی حملے کا دفاع کرنے کے لئے امداد چاہی تو امریکی حکومت نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "امداد صرف کیمونسٹ حملے کے خطرے کی صورت میں کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ دونوں ملکوں کے مابین معاہدات کی اصل اساس یہی ہے"۔ حتیٰ کہ سعودی عرب اور اردن نے پاکستان کو ہتھیار دینا چاہے تو امریکہ نے ان دونوں ملکوں کو بھی منع کر دیا [3] تاہم صدر نکسن نے اتنی دلچسپی ضرور لی کہ مغربی پاکستان بھارت کی دست برد سے بچ جائے، تاکہ وہ آزاد دنیا اور روس کے درمیان ایک بفر اسٹیٹ کے طور پر قائم رہ سکے۔

---

[1] "امریکی حکمت عملی" سیارہ ڈائجسٹ۔ لاہور اگست ۱۹۸۲ء

2 — (Safdar Mehmood Op Cit. P. 172.

3 — Ibid P. 156

امریکی خارجہ پالیسی کی سالانہ کانگریس رپورٹ (۹ فروری ۱۹۷۲ء) کے مطابق امریکہ نے ہی پاکستانی صدر یحییٰ خان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ مجیب الرحمٰن پر مقدمہ نہیں چلائیں گے[1]

مشرقی پاکستان میں عام معافی کا اعلان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ کلکتہ میں موجود عوامی لیگ کے لیڈروں اور یحییٰ خان کے مابین خفیہ مذاکرات کا اہتمام بھی امریکہ نے کیا تھا اور یحییٰ خان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دسمبر میں مشرقی پاکستان میں سول حکومت قائم کر دے گا اور اقتدار منتخب نمائندوں کو لوٹا دے گا۔ اندرا گاندھی اس صورت حال سے پوری طرح باخبر تھی، چنانچہ اس نے کھلم کھلا بھارتی پارلیمنٹ میں یہ اعلان کر دیا کہ ہم کوئی سیاسی سمجھوتہ تسلیم نہیں کریں گے۔ کیونکہ اس کا مقصد بنگلہ دیش کی "موت" ہوگا اور بھارت ایسا نہیں کرنے دے گا"[2]

۹ دسمبر کو امریکی حکومت کو سی آئی اے کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ بھارتی کابینہ میں ایک منصوبے پر غور ہو رہا ہے کہ مغربی پاکستان پر بھرپور حملہ کر کے کشمیر کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ اس موقع پر امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر اور صدر نکسن نے مغربی پاکستان کے محل وقوع اور جنگی پوزیشن کی بنا پر امریکی مفاد میں یہ فیصلہ کیا کہ بھارت کو مغربی پاکستان پر حملے سے باز رکھا جائے گا۔ چنانچہ ساتویں امریکی بحری بیڑے کی آمد کا مقصد محض بھارت کی توجہ کو بانٹنا اور مغربی پاکستان پر اس کے متوقع حملے کو روکنا تھا۔ امریکہ کا بحری بیڑہ ڈھاکہ میں پاکستان کے ہتھیار ڈالنے سے ایک روز قبل خلیج بنگال میں مشرقی پاکستان کی سرحد سے صرف ایک ہزار بحری میل دور کھڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس بیڑے کا مقصد جنگ میں الجھے بغیر محض بھارت پر دباؤ ڈالنا تھا اور اس سلسلے میں یحییٰ خان نے جنرل نیازی سے او دکلدیپ نیر کے بقول مسٹر بھٹو نے جنرل یحییٰ خان سے غلط بیانی کی تھی کہ امریکی بحری بیڑہ نیازی

---

1. Lawrence Ziring, "Pakistan : The Enigma of Political Development" P. 231.

2. Safdar Mehmood, 'Op Cit'. P. 169

کی مدد کو پہنچ رہا ہے۔[1]

امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے بعد میں یہ اعتراف کیا کہ ہم بھی دراصل بنگلہ دیش کی آزادی کے لئے کام کر رہے تھے۔ یعنی اس وقت کے مشرقی بنگال (پاکستان) اور آج کے بنگلہ دیش کے لئے "حق خود ارادی" (؟) کا حصول۔[2] ایک دوسرے موقع پر زیادہ واضح الفاظ میں سرکاری طور پر اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ امریکہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو دو ٹکڑے کر کے مشرقی پاکستان کو ایک خود مختار مملکت بنانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں بھارت اور امریکہ کے درمیان مکمل اتفاق تھا البتہ طریق کار میں اختلاف تھا۔ مقاصد میں ہم بھارت کے طرف دار تھے اور ہم بھی اس کے لئے کوشاں تھے جو کہ بنگلہ دیش کی صورت میں رونما ہوا۔[3]

سوویٹ روس

پاکستان کے قیام کے وقت روس کا مخالفانہ نقطۂ نظر ۱۲ مئی اور ۱۶ مئی ۱۹۴۷ء کے

---

[1] اس موضوع پر ایک بھارتی صحافی امریکہ اور روس کے رویے کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: "جونہی امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے نے حرکت کی تو روس نے خلیج بنگال میں اپنی ایٹمی آبدوزیں کو بیڑے کے تعاقب میں لگا دیا۔ اس طرح روس نے بھارت سے اپنے معاہدے کی ۹ دیں شق پر عمل کیا اور معاہدے کو نبھایا۔ مگر امریکہ نے پاکستان کو اس لمحے بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔"

(Kuldip Nayar, "A Report on Afghanistan" P. 57-58.)

2 Henery Kissinger, "White House Years "P. [illegible]-918 and "

American Foreign Policy" P. 234./

[3] سقوط مشرقی پاکستان کے بعد امریکہ کو احساس ہوا ہوگا کہ اس نے بنگلہ دیش بنانے کی سازش میں بنیادی کردار ادا کر کے کتنے گھاٹے کا سودا کیا ہے، کیونکہ بنگلہ دیش امریکہ کے سایہ عاطفت میں پیدا ہونے والی ریاست نہیں، بلکہ ہندوستان اور روس کی آغوش میں جنم لینے والی مجبور اسٹیٹ کی صورت میں ابھرا ہے۔"

روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۳ نومبر ۱۹۷۳ء ــــ بحوالہ ــــ

(United States Policy Statement Series, 1973")

روسی سرکاری اخبار 'پراودا' سے واضح ہوگیا تھا۔ اخبار نے لکھا تھا "اس ملک (پاکستان) کی تخلیق برطانوی سامراج کی تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی پالیسی کے تحت ہو رہی ہے اور یہ برطانوی توسیع پسندی کا ایک حصہ ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ روسی لیڈروں نے پاکستان کے قیام پر نہ صرف یہ کہ مبارک باد کا پیغام نہیں بھیجا، بلکہ اس نوزائیدہ ملک کو تسلیم کرنے میں بھی غیر معمولی تاخیر سے کام لیا اور پانچ چھ سال تک ہندوستان میں روسی سفارت خانہ پاکستانی امور کا نگران رہا۔ حد یہ ہے کہ روسی حکمرانوں نے قائداعظم کے انتقال پر تعزیت کا پیغام تک بھیجنا گوارا نہ کیا۔ یہ چیزیں روسی ذہن اور پاکستان کے بارے میں اس کے خارجہ رویوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو جب مئی ۱۹۴۹ء میں امریکہ کے دورے کی دعوت ملی، تو روس نے اپنے مجموعی رویے کے برعکس قطعی غیر متوقع طور پر پاکستان کے وزیراعظم خان لیاقت علی خان کو دورۂ روس کی دعوت دے ڈالی، جو منظور کر لی گئی۔ لیکن عین انہی ایام میں امریکہ کی طرف سے دعوت ملنے پر وزیراعظم پاکستان روسی دعوت کو نظرانداز کرتے ہوئے امریکہ کے دورے پر چلے گئے۔ پاکستان کے اس رویے پر روس سیخ پا ہوگیا، اور اسے اپنی سبکی سمجھا۔ چنانچہ جب کچھ ہی عرصہ بعد روسی سربراہ خروشیف نے بھارت کا دورہ کیا، تو اس نے بھارت کی خوشنودی کے لئے قیام پاکستان کے بارے میں روسی مؤقف کو ایک بار پھر اس کی سرزمین پر دہراتے ہوئے کہا کہ "سامراجی طاقتوں نے عظیم انڈیا کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کردیا ہے"۔ اسی طرح سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر ہندوستان کی حمایت اور پاکستان کی مخالفت میں روس نے فروری ۱۹۵۷ء میں اپنا پہلا ویٹو استعمال کیا۔ اس کے بعد پاکستان جب سیٹو سینٹو کے معاہدات میں شامل ہوا تو روس اس پر مزید سیخ پا ہوا اور ۱۹۶۰ء میں امریکی جاسوس طیارے "یو ٹو" کی پاکستانی علاقے (بڈبیر) سے پرواز کے واقعے نے تو پاکستان اور روس کے تعلقات کو خرابی کی انتہا تک پہنچا دیا۔

ہندوستان اور چین کے درمیان جھڑپوں (۱۹۶۲ء) کے بعد جب امریکہ نے بھارت

---

۱ Safdar Mehmood 'Op. Cit.' P. 157–159.

کو اقتصادی و فوجی امداد سے دھڑا دھڑ نوازنا شروع کیا تو روس اور بھارت کے تعلقات کے درمیان ایک عارضی سا ٹھہراؤ پیدا ہوا، اور اس موقع پر روس اور پاکستان کے درمیان تعلقات میں پیدا شدہ حجابات اٹھنا شروع ہوئے اور دوطرفہ مذاکرات کا آغاز ہوا۔ چنانچہ، مارچ ۱۹۶۱ء میں قدرتی تیل کے بارے میں ایک معاہدہ ہوا اور پھر فضائی اور تجارتی معاہدے ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں روس نے (کشمیر کے بارے میں قرارداد کو ویٹو کرنے کے بجائے) دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کرنے پر زور دیا۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں صدر جنرل ایوب خان نے ماسکو کا دورہ کیا۔ وہ روس کا دورہ کرنے والے پاکستان کے پہلے سربراہ تھے۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے مابین جنگ کے بعد روس نے مصالحتی کردار ادا کرتے ہوئے دونوں ملکوں کے درمیان معاہدہ تاشقند کرایا۔ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے "بدلتے ہوئے اور مغرب گریز مصالحانہ رویے" کے باوجود روس کے دل میں پاکستان کے لئے نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا، بلکہ عین اس موقع پر اس نے بھارت کو ۲۰۰ ملین ڈالر کی سالانہ امداد اور اعلیٰ ترین جنگی ہتھیار دینا منظور کر لئے۔[1]

۱۹۶۷ء میں پاک روس تعلقات میں اس وقت پھر کھچاؤ پیدا ہوا جب روس نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ عوامی جمہوریہ چین سے اپنے بڑھتے ہوئے دوستانہ تعلقات کم کر دے۔ چنانچہ اسی سال فروری میں دورۂ پاکستان کے موقع پر سوویت وزیر دفاع آندرے گریچکو نے واضح الفاظ میں کہا کہ "پاکستان کو روس اور چین دونوں سے ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی پالیسی سے دستبردار ہونا ہوگا"۔[2] یحییٰ خان کے دور حکومت میں پاکستان کو روسی وزیر اعظم الیکسی کوسیگن نے معاہدہ ایشیائی سلامتی (Asian Collective Security Pact) کی تجویز پیش کی، جو دراصل چین کے گھیراؤ کی ایک سیاسی و فوجی اسکیم تھی۔ پاکستان نے پاک چین دوستی کے احترام میں اس معاہدے میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ جس کے بعد پاکستان کے

1 Ibid. P. 161.

2 G.W. Choudhary "India Pakistan, Bangladesh and Major Powers" P. 57–61

بارے میں روس کا لہجہ بلند آہنگ اور غضب ناک ہوتا چلا گیا۔ اب وہ پاکستان دشمنی کے میدان میں کھل کر اتر آیا۔

اوائل ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہوئے تو ۲۸ مارچ کو روسی صدر پڈگورنی نے صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان کو ایک خط لکھا اور بین الاقوامی مسلمہ آداب کو پامال کرتے ہوئے اسلام آباد بھیجنے سے قبل شائع کرا دیا[1] خط میں دھمکی آمیز انداز میں مشرقی پاکستان کے مسئلے کے "سیاسی حل" پر زور دیا گیا تھا۔ یحییٰ خان نے بھی جواباً اپنے خط کو ماسکو بھیجنے سے قبل اشاعت کے لئے دے دیا اور لکھا کہ "آپ کا خط پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی ذیل میں آتا ہے"۔ بقول ذوالفقار علی بھٹو "یقیناً روس کی یہ حرکت پاکستان کے اندرونی مسائل میں ایک لغو مداخلت تھی[2] مگر ملک کے اندرونی نظم کی ابتری جغرافیائی سرحدوں اور بین الاقوامی سطح پر پیدا شدہ مخالفانہ ماحول میں یحییٰ خان کو ایسا کھرا جواب نہیں دینا چاہیئے تھا۔

یحییٰ خان کے دور میں ہی ایک اور واقعہ ایسا ہوا جس نے بین الاقوامی سیاست کو ایک نیا موڑ دیا۔ وہ یہ کہ پاکستان نے امریکہ اور چین کو قریب لانے کے لئے اسلام آباد سے امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کو انتہائی راز داری کے ساتھ پیکنگ پہنچا کر پوری دنیا کو حیران اور روس کو پریشان کر دیا۔ پاکستان نے یہ اقدام کر کے گویا روسی ریچھ کو سرخ رومال (Redrage) دکھا دیا تھا۔ انجام کار اسی سال اگست میں بھارت اور روس کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ ہوا جس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے کہا تھا "یہ معاہدہ پاک و ہند میں جنگ کا سبب بن سکتا ہے[3] چنانچہ اس معاہدہ کے بعد روس نے بھارت کو جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کرنا شروع کر دیا۔ جس میں مگ ۲۱ اور ۲۳ سام میزائل، ٹینک، اور ۷۳۰ ملین ڈالر کی دوسری فوجی امداد شامل تھی۔ چند ماہ نہ گزرنے پائے تھے کہ بھارت نے نومبر ۱۹۷۱ء میں روسی آشیرباد سے مشرقی پاکستان پر کھلم کھلا حملہ کر دیا حتیٰ کہ روسی ساختہ

---

[1] صدر جنرل یحییٰ خان خصوصی انٹرویو۔ "آتش فشاں" لاہور۔ دسمبر ۱۹۷۸ء

[2] "جمہوریت کی کہانی"، جلد اول ص ۲۰۴

[3] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور، ۱۲ اگست ۱۹۷۱ء

بھارتی طیاروں کو روسی ہوا باز چلا رہے تھے" پاکستانی فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل رحیم خان کے اس الزام[1] کی روس تردید نہ کر سکا۔ دہلی میں روسی سفیر نے بھارتی حکومت کو یہ یقین بھی دلایا کہ وہ امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کی آمد سے نہ گھبرائے۔ کیونکہ روس اس بیڑے کو مداخلت کی اجازت نہیں دے گا۔" چنانچہ یہ حقیقت اب کوئی راز نہیں کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو سقوط مشرقی پاکستان کا المناک سانحہ پاکستان میں برسرِ عمل اشتراکی تحریک اور اس کے جملہ مکاتب فکر اور روس کے عملی تعاون سے پیش آیا۔[2] اس بات کو پاکستان کے سوشلسٹ حلقوں نے تسلیم کیا کہ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کو بھارت کے فوجی حملے سے نہیں، بلکہ روس کے بالواسطہ حملے سے کاٹا گیا تھا۔[3]

روس کی روزِ اوّل سے پاکستان دشمنی کی وجہ اس کا یہ اندیشہ بھی ہے کہ قیامِ پاکستان کے سبب وسطی ایشیا اور روسی ترکستان کے مسلمانوں میں اپنے مسلمان ہونے کا احساس ابھرے گا اور اس ملتے ان کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہوں گی۔ اس طرح یہ لوگ مستقبل میں اشتراکی روس کے ترکستانی علاقہ میں ردِ سامراج تحریک[4] (Anti-Colonial Movement) اور اسلامی نشاۃ ثانیہ[5] (Islamic Resurgence). کا سبب بن سکتے ہیں۔

اور یہی وہ خطرہ[6] ہے جس کے سدباب کے لئے روس افغانستان پر غاصبانہ تصرف حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد کو اسی پس منظر

---

1 Pakistan Times Lahore 10. Dec. 1971)

2 پروفیسر خورشید احمد ـــــ ایضاً ـــــ ص ۹۵

3 Kuldip Nayar, "Report on Afghanistan" P. 58.

4 ابو الاعلیٰ مودودیؒ خطاب بہ مجلس شوریٰ ۱۷ جنوری ۱۹۷۲ء

5 تفصیل کے لئے دیکھئے آباد شاہ پوری کی کتب "روس میں مسلمان قومیں" اور "ترکستان میں مسلم مزاحمت اور چراغِ راہ" کا سوشلزم نمبر (ایڈیٹر پروفیسر خورشید احمد)

6 روسی مصنف دیمتری دلاسکی کے بقول سقوط مشرقی پاکستان کے تین ماہ بعد جب پاکستانی صدر بھٹو ماسکو پہنچے تو روسی وزیر اعظم کوسی گن نے برملا کہا کہ اگر بقیہ پاکستان میں "آزادی" کی تحریک اٹھیں تو ہم پھر وہی اقدام کریں گے جو گذشتہ برس کیا تھا۔ (The Developments on the Indian Subcontinent and Soviet Union 1972" (Moscow)

میں دیکھا جانا چاہیئے ۔

یہاں ہم پاکستان کی مجموعی سیاسی صورت حال کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں تاکہ ملکی افق سے اٹھنے والی گھٹاؤں کو ایک نظر دیکھا جا سکے ۔

سیاسی انتشار میں دستوری سفر (۱۹۴۷-۵۸ء)

پاکستان میں مکمل اختیارات کی حامل پہلی دستور ساز اسمبلی جن نمائندوں پر مشتمل تھی انہوں نے دستور بنانے[1] اور اختیارات کی امانت اپنی قوم کے حوالے کرنے میں مجرمانہ حد تک تاخیر کی۔ اس اسمبلی کے لیئے نہ کوئی مدت تھی کہ جس کے ختم ہونے کے بعد وہ آپ ختم ہو جاتی اور نئے انتخابات ہوتے ، نہ اس کو برخاست کرنے کی کوئی آئینی صورت تھی کہ اسے رخصت کر کے دوسرے نمائندے منتخب کرنے کا موقع ملتا جب تک کہ وہ دستور نہ بناتی، ملک کا اقتدار اعلیٰ یا شاہانہ اختیارات (Sovereigmty) اسے حاصل رہنا تھے۔ اس پوزیشن کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے۔ یہ "ناقابل تغیر اسمبلی" کئی سال تک دستور بنانے میں تاخیر کرتی رہی۔ اس دوران یہ لوگ سرکاری ملازمین (بیوروکریسی) کے بل بوتے پر اپنا اقتدار مضبوط کرنے اور صوبائی انتخابات جیتنے اور عوامی مطالبات کو ملازمین (سول اور فوجی) . . . . کی مدد سے دبا لینے کی کوشش کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۵۳ء تک ملازمین کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ملک کی طاقت کا اصل سرچشمہ اور مالک وہی ہیں[2] چنانچہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے قتل (۱۹۵۱ء) کے بعد سربراہ مملکت کا منصب سول ملازمین کے طبقے سے ایک فرد ملک غلام محمد کو حاصل ہوا اور پھر اسی طبقے کے افراد اس منصب پر فائز رہے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی (Basic Principles Committee)

---

[1] اس اسمبلی کا واحد قابل قدر کارنامہ قرارداد مقاصد کی منظوری (۱۹۴۹ء) تھا۔

[2] ابوالاعلیٰ مودودی "ترجمان القرآن"، لاہور، مئی ۱۹۶۰ء

کی رپورٹ شائع ہوئی جو قرار داد مقاصد اور پاکستان کے سربرآوردہ، تمام مکاتب فکر کے علماء کے ۲۲ نکات سے بہت قریب ہونے کے باوجود کئی پہلوؤں سے سخت قابل اعتراض تھی۔ اس زمانہ میں ملک کے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین تھے۔ دستوری مسودے کو اسلامی رنگ دینے میں ان کی خواہش اور کوشش کو بھی بڑا دخل تھا، لیکن گورنر جنرل غلام محمد اسلامی دستور کے نظریہ اور مطالبے سے سخت خائف اور مخالف تھے۔ چنانچہ غلام محمد نے ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو دستور ساز اسمبلی کے قائد خواجہ صاحب کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا۔ یہ اقدام سیاسی لیڈروں سے ملازمین ریاست کی طرف انتقال حاکمیت کا پہلا بھرپور اور زوردار اقدام تھا۔ اسی دوران غلام محمد نے جنرل (ریٹائرڈ) اسکندر مرزا کو مشرقی پاکستان کا گورنر بنا دیا۔ جہاں مسلم لیگ کی حکومت تھی۔ اس سارے قضیے کو مشرقی پاکستان کے پڑھے لکھے طبقے نے سیاسی شعور کے ساتھ اپنے حقوق کی تلفی سمجھا چونکہ ان دنوں قادیانیوں کے خلاف تحریک کے باعث لاہور میں مارشل لاء نافذ تھا اور اس کے نتیجہ میں جو حالات پیدا ہو چکے تھے ان کی وجہ سے باشندگان پاکستان گورنر جنرل کے اس غیر آئینی اور غیر جمہوری اقدام پر کوئی احتجاج بھی نہ کر سکے۔ اخبارات نے بھی زبان بند رکھی جبکہ سرکاری ملازمین (فوجی جرنیل و بیوروکریسی) نے اس کا خیر مقدم کیا۔ بعض سیاست دان بھی ایسے تھے جنہوں نے اس اقدام کو سراہا۔ حد یہ ہے کہ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی پر خود عوامی لیگی رہنما مسٹر حسین سہروردی نے گورنر جنرل کو خراج تحسین پیش کیا۔[1]

وزیراعظم کی برطرفی کے بعد دستور ساز اسمبلی میں سیاسی قائدین کو پہلی بار یہ خطرہ نظر آیا کہ وہ اب تک جس اقتدار اعلیٰ اور جن عوامی شاہانہ اختیارات (ساورنٹی) کو قوم کی طرف منتقل ہونے کی راہ میں رکاوٹ بنتے یا رکتے رہے ہیں وہ ان کے ہاتھ میں رہنے کے بجائے ملازمین ریاست کی طرف منتقل ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جلدی جلدی دستور بنانا شروع کیا۔ اور ۱۹۵۴ء کے آخر تک عارضی دستور تیار کر دیا جسے آئینی شکل دینے کے لئے ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء

---

[1] "نوائے وقت" لاہور ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء

کی تاریخ کا اعلان بھی کر دیا گیا، لیکن قبل اس کے کہ اس طرح پاکستان کے باشندوں کی طرف انتقالِ اختیارات کی نوبت آتی۔ ۲۴ راکتوبر ۱۹۵۴ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے وہ پہلی دستور ساز اسمبلی[1] ہی توڑ دی۔

سب سے بڑے جمہوری ادارے کی پائمالی کے اس اقدام کے خلاف اسمبلی کے اسپیکر مولوی تمیز الدین نے سندھ چیف کورٹ (موجودہ سندھ ہائی کورٹ) میں اپیل دائر کر دی جسٹس کانسٹنٹائن، جسٹس بچل، جسٹس ویلانی، جسٹس میمن اور جسٹس آغا ویلانی پر مشتمل فل بنچ نے متفقہ فیصلے کے ذریعے دستور ساز اسمبلی کی تنسیخ کے حکومتی فیصلے کو کالعدم قرار دے کر اسمبلی بحال کر دی، لیکن فوراً ہی بعد حکومت نے اس فیصلے کے خلاف فیڈرل کورٹ (حالیہ سپریم کورٹ) میں اپیل دائر کر دی۔ وہاں فل بنچ چیف جسٹس محمد منیر، جسٹس ایس اے رحمان جسٹس محمد شریف، جسٹس محمد اکرم اور جسٹس اے آر کارنیلیس پر مشتمل تھا۔ فیڈرل کورٹ میں چیف کورٹ کا فیصلہ بحال نہ رہ سکا۔ گورنر جنرل کے قطعی غیر جمہوری، غیر آئینی اور غیر اخلاقی اقدام کو جائز قرار دے دیا گیا[2] اور اسمبلی کی برطرفی فیصلہ کن حیثیت اختیار کر گئی۔ اب انتظامیہ اور مقننہ کے بعد پاکستانی عدلیہ کے وقار کو بھی سخت دھچکا لگا۔ پستی کے اس سارے سفر میں صرف سات برس لگے۔

۲۲ رجون ۱۹۵۵ء کے وسط میں فیڈرل کورٹ کی ہدایت پر ایک نئی دستور ساز اسمبلی وجود میں آئی جسے آئینی طور پر وہی اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو گیا، جو سابق دستور ساز اسمبلی سے

---

[1] پہلی دستور ساز اسمبلی (۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء) میں کل ممبران ۷۶ تھے جن میں مسلم لیگ ۴۲، پاکستان نیشنل کانگرس ۱۰، آزاد پاکستان پارٹی ۲۱ اور ایک آزاد ممبر تھا۔

[2] چیف جسٹس محمد منیر نے ریٹائر ہونے کے ایک عرصہ بعد انکشاف کیا کہ "فیڈرل کورٹ کا یہ فیصلہ دراصل قانونی نہیں تھا، بلکہ سیاسی تھا اور اس مجبوری کی بنا پر دیا گیا تھا کہ ملک کی بلند ترین عدالت ان ہاتھوں پر قانون کا فیصلہ نافذ کرنے سے معذور تھی جو اس وقت پاکستان میں اقتدار و اختیار پر قابض ہو چکے تھے۔" (Pakistan Times, April 23, 1960)

چھینا گیا تھا۔ اس دوسری دستور ساز اسمبلی کو بالواسطہ انتخاب کے ذریعے ۔صوبائی اسمبلیوں نے منتخب کیا تھا۔

گویا یہ پہلی دستور ساز اسمبلی[1] سے کم با اختیار تھی، مگر اس میں سیاسی توازن تھا۔ اس دوران مسلم لیگ اور متحدہ محاذ کی مخلوط حکومت کے وزیر اعظم چودھری محمد علی بنے۔ جنہوں نے سندھ، بلوچستان، سرحد، پنجاب اور مشرقی پاکستان کے درمیان سیاسی عدم توازن کو وحدت پاکستان (ONE UNIT) کے ذریعے حل کیا[2] اور اس اسمبلی کا تیار کردہ ۱۹۵۶ء کا دستور ایک متفقہ قومی دستاویز تھی، جو وفاقی پارلیمانی طرزِ حکومت کی نقیب تھی اس دستور کے مطابق گورنر جنرل کا منصب "صدر" کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ دستور اسی سال ۲۳ مارچ کو نافذ کر دیا گیا۔

اس طرح کاغذی آئین کی حد تک اختیارات کے انتقال کا رُخ ملازمین ریاست سے عوام کی جانب مڑ گیا اور عملاً ان کے منتقل ہونے میں صرف یہ کسر باقی رہ گئی کہ عام انتخابات منعقد ہوں اور باشندگان پاکستان کے نمائندے ان ملازمین سے اپنے اختیارات کی امانت وصول کر لیں۔ ان انتخابات کے لئے فروری ۱۹۵۹ء کی تاریخیں مقرر کر دی گئیں[3] لیکن انتخابات کی نوبت آنے سے پہلے ہی اس دستور ساز اسمبلی کی بساط لپیٹ دی گئی اور پاکستان کو جنرل ایوب خان کی فوجی آمریت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

---

[1] دوسری دستور ساز اسمبلی میں (۵۸-۱۹۵۵ء) کے ۷۹ ارکان تھے، جن میں نمائندگی کا تناسب یہ تھا مسلم لیگ: ۲۶، جگتو فرنٹ (متحدہ محاذ): ۲۵، عوامی لیگ: ۱۳، آزاد: ۵

[2] ۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کو دستور ساز اسمبلی نے ون یونٹ کا بل پاس کیا، جو اسی سال ۱۴ اکتوبر کو نافذ ہوا۔ اس قانون کے تحت مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو توڑ کر مغربی پاکستان کو ایک سیاسی، انتظامی اور دستوری صوبہ بنا دیا گیا۔ جب کہ دوسری جانب مشرقی پاکستان کی بھی یہی حیثیت تھی۔ دونوں صوبوں کو برابر صوبائی خود مختاری تھی، قومی اسمبلی کے لئے برابر نشستیں مخصوص کی گئیں، تاکہ سیاسی نمائندگی میں توازن قائم ہو۔ ون یونٹ کے قیام کے بعد دستور سازی کا رُکا ہوا کام آگے بڑھا اور بہت جلد مکمل ہو گیا۔

[3] ڈاکٹر خالد بن سعید، چراغِ راہ "نظریہ پاکستان نمبر" دسمبر ۱۹۶۰ء ص ۵۱-۲۵۰

جنرل ایوب خان کی آمریت (۱۹۵۸ء ۱۹۶۸ء)

اسکندر مرزا نے بحیثیت صدر مملکت ۱۹۵۶ء کے دستور کی منظوری اس شرط پر دی تھی کہ انہیں صدر مقرر کیا جائے گا۔ اس طرح وہ صدر تو بن گئے، لیکن عام انتخابات کے انعقاد سے خوف زدہ بھی رہے۔ چنانچہ اسکندر مرزا نے پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کو اعتماد میں لیا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو دستور پاکستان ۱۹۵۶ء منسوخ کرکے ملک میں مارشل لار نافذ کر دیا۔ گویا جس شاخ پر وہ بیٹھے تھے، اسی شاخ کو خود اپنے ہاتھوں کاٹ ڈالا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ صرف چند روز بعد جنرل ایوب نے بریگیڈیئر یحییٰ خان اور جنرل عتیق شیخ کے ذریعے صدر سکندر مرزا کو فارغ خطی دے کر ملک بدر کر دیا اور پاکستان میں بلا شرکت غیرے جنرل ایوب حکومت کرنے لگے۔ سیاسی جماعتیں کالعدم کر دیں اور زبان وقلم پر مارشل لار کا مہیب سایہ ڈال دیا۔[1]

اسی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا "فوج کے کمانڈر انچیف (ایوب خان) کے ہاتھ میں فوج ملک کی حفاظت کے لئے دی گئی تھی اور وہ ملک کے ایک تنخواہ دار ملازم تھے۔ فوج ان کی ذاتی نہیں تھی ملک کی تھی۔ فوج کی کمان ان کے ہاتھ میں اس لئے نہیں دی گئی تھی کہ ملک کا اندرونی انتظام وہ اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کی سربراہی کریں۔ یہ چیز نہ ان کے فرائض ملازمت میں شامل تھی نہ شرائط ملازمت میں، نہ کسی دستور و قانون نے انہیں یہ اختیار دیا تھا، نہ ملک کے باشندوں نے ان سے کہا تھا کہ اب تم ہمارے ملک کا انتظام چلاؤ۔ سوال یہ ہے کہ کس حق اور کس اختیار کی بنا پر انہوں نے یہ کام کیا؟ وہ اگر سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک پاکستانی

---

[1] جنرل ایوب خان نے مارشل لار لگاتے ہی نیویارک ٹائمز ۱۹ اکتوبر ۵۸ء کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا "سیاست دانوں کے پاس سب سے بڑا ہتھیار زبان ہوتی ہے۔ ہم نے اسے لگام دے دی ہے اور ہمارے اقتدار کی حتمی طاقت تلوار ہے"۔ (Rounaq Jehan 'op cit' p.55,61)

کی حیثیت سے یہ خیال رکھتے تھے کہ ملک کا نظام غلط ہاتھوں میں ہے اور ان کے پاس کوئی ایسا نظریہ تھا کہ انصاف اور عقل کا تقاضا یہ تھا کہ وہ فوجی ملازمت سے استعفیٰ دیتے، سیاسی پارٹی بناتے اور انتخابات کی راہ سے وہ حکمران بنتے۔[1]

۴۴ ماہ بعد ۸ جون ۱۹۶۲ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خان نے اپنی ڈکٹیٹر شپ کو آئینی جواز بخشنے کے لئے ایک خود ساختہ صدارتی آئین نافذ کر دیا۔ اس آئین نے خصوصاً مشرقی پاکستان کے سوچنے سمجھنے والے طبقے میں شدید مایوسی اور غم و غصے کی لہر دوڑا دی۔ اس فضا سے علیحدگی پسند قوتوں نے فائدہ اٹھایا۔ بڑھتے ہوئے خطرے کی شدت کو بھانپتے ہوئے، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ملک کی سیاسی جماعتوں سے رابطہ قائم کیا کہ وہ متحد ہو کر حکومت کو اس نئے آئین کے دور رس نتائج کی خطرانگیزیوں کا احساس دلائیں اور اس میں ترامیم کرانے کے لئے جدوجہد کریں۔ چنانچہ ان مذاکرات کے نتیجے میں سیاسی جماعتوں کا ایک اتحاد قائم ہوا جس کا نام متحدہ حزب اختلاف —— (Combined Opposition Parties – COP) رکھا گیا۔ اس اتحاد میں جماعت اسلامی، مسلم لیگ (کونسل)، نظام اسلام پارٹی، عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی شامل ہوئیں۔ اس سیاسی اتحاد کا قیام مولانا مودودیؒ کی بڑی کامیابی تھی، جس نے مشرقی پاکستان کی سیاسی قیادت کو محاذ آرائی کے راستے پر گامزن ہونے سے روک دیا۔[2]

۱۹۶۴ء کے آخر میں ایوب خان نے بالواسطہ صدارتی انتخاب کے انعقاد کے لئے ۲ جنوری کی تاریخ مقرر کی۔ ان انتخابات میں ملک کے اعلیٰ ترین عہدے کے لئے موزوں شخصیت کے انتخاب کا حق پاکستان کے بالغ شہریوں کو دینے کے بجائے ان اسی ہزار کونسلروں کو دیا گیا جنہیں عوام نے مقامی بلدیاتی (دیہی و شہری مسائل حل کرنے کے لئے) منتخب کیا تھا، اور جن کی عظیم اکثریت ان پڑھ یا نیم خواندہ اور بآسانی بک یا جھک سکتی تھی۔

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی: تحریک جمہوریت، اسباب اور مقاصد، ص ۵۲، ۵۳

[2] ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی —— ایضاً —— ص ۵۲

تاہم اس کے باوجود متحدہ حزب اختلاف نے مکمل جمہوریت کی منزل سر کرنے کے لئے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی امیدوار نامزد کر دیا۔ اس موقع پر مولانا مودودیؒ نے بعض معترضین کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا: "ملک پر جابرانہ اور ظالمانہ استبدادی نظام مسلط ہے جو ہمارے دین و اخلاق، تمدن و تہذیب اور معیشت و سیاست کے لئے تباہ کن ہے۔ اس نظام کو پرامن آئینی طریقے سے بدل دینے کے لئے ہمیں انتخابات میں ایک خداداد موقع مل رہا ہے ملک میں فاطمہ جناح کے سوا کوئی دوسری شخصیت ایسی نہیں ہے جس پر اہل ملک کی عظیم اکثریت مجتمع ہو سکے اور صدارتی انتخابات میں جس کے کامیاب ہونے کا کچھ امکان بھی ہو۔ فاطمہ جناح انتخابات میں کھڑی ہو چکی ہیں ان کے مقابلہ میں کسی اور شخص کو کھڑا کرنا یا غیر جانبدار رہنا دونوں یہ معنی رکھتے ہیں کہ ہم صدر جنرل ایوب خان کی کامیابی کے لئے عملاً مددگار ثابت ہو رہے ہیں اس صورت حال میں مسئلہ یہ ہے کہ آیا ایک عورت کا سربراہ مملکت ہونا شریعت میں اس قدر زیادہ قابل اعتراض ہے یا ہم اس کے مقابلے میں ظلم و جبر کی اس استبدادی حکومت کو ترجیح دیں۔ میرے نزدیک کوئی شخص جو اسلامی شریعت کی کچھ تھوڑی سی سمجھ بوجھ رکھتا ہو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان دو متقابل چیزوں میں عورت کی سربراہی ناقابل قبول اور استبدادی نظام قابل ترجیح ہے۔ میرے نزدیک کسی عورت کو امیر بنانا اگر ایک درجے کا گناہ ہے تو اس کے مقابلے میں اس جباریت (Dictatorship) کا برقرار رہنا دس درجے زیادہ بڑا گناہ ہے۔" [1]

محترمہ فاطمہ جناح کے بطور صدارتی امیدوار سامنے آتے ہی حکومت اور اس کی حامی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وزراء کرام، حکمران جماعت کنونشن مسلم لیگ کے عہدیداروں اور پریس ٹرسٹ کے سرکاری اخبارات متحدہ حزب اختلاف کے رہنماؤں پر ہی نہیں، بلکہ بانی پاکستان قائد اعظمؒ کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح پر بھی پاکستان دشمنی کا الزام دینے میں ایک

[1] ابو الاعلیٰ مودودیؒ "انتخابی تقریر ۱۹۶۴ء" ص ۸۲-۸۵

دوسرے پر سبقت لینے لگے۔ دوسری جانب حزب اختلاف میں دراڑیں ڈالنے اور ممبروں کی خرید و فروخت کی اندرخانہ مہم کا آغاز ہو گیا جس میں حکومت کو مجموعی طور پر بُری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ البتہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو (حکمران پارٹی کے سیکرٹری جنرل) پاکستان میں ترقی پسندوں کے قائد عبدالحمید بھاشانی سے سودا طے کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں[1] چنانچہ بھاشانی نے اچانک علالت کا بہانہ بنا کر اپوزیشن کی رابطہ عوام مہم سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اور پریس سے بھی غائب ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں نیشنل عوامی پارٹی نے مشرقی پاکستان کی حد تک جنرل ایوب کا ساتھ دیا لیکن حکومت کے تمام ہتھکنڈوں کے باوجود فاطمہ جناح کو ملک کے دونوں حصوں میں عوام نے اپنی آنکھوں پر بٹھالیا۔ ملک کی تاریخ میں اب تک اتنے عظیم الشان جلسے کبھی نہیں ہوئے تھے، لیکن فیصلہ عوام کے ہاتھ میں نہیں بلکہ منتخب کونسلروں کے ہاتھ میں تھا، جنہیں دبایا، ڈرایا اور خریدا جا سکتا تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عوام کی بے پناہ حمایت کے باوجود دھن، دھونس اور دھاندلی کے ہاتھوں فاطمہ جناح انتخابات ہار گئیں۔ اب ایوب خان زیادہ طنطنے کے ساتھ حکومت کرنے لگے اگرچہ وہ پہلے کی طرح پُر اعتماد نہیں رہے تھے۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اپوزیشن نے قومی مفاد میں اپنے تمام تر اصولی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس مصیبت سے نپٹنے کے لئے حکومت سے بھرپور تعاون کیا۔ مولانا مودودی نے ریڈیو پاکستان سے جہاد کے موضوع پر تقاریر کیں۔ ان ایام میں مشرقی و مغربی پاکستان کے عوام یک جان دو قالب کے مصداق تھے، لیکن جونہی روس کی سرزمین پر پاک بھارت سمجھوتہ (اعلانِ تاشقند) منظرِ عام پر آیا تو لوگوں میں شدید نفرت، غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ عوام اور اپوزیشن لیڈروں کا تاثر یہ تھا کہ میدان جنگ میں جیتی ہوئی جنگ میز پر ہار دی گئی ہے۔ بعدازاں اس تاثر کو حکومت کے وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے مخصوص اور متعین مقاصد کے

---

[1] حبیب جالب: بھاشانی گروپ، ماہنامہ "تخلیق" لاہور اگست ۱۹۸۵ء، بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور یکم اگست ۸۵ء

لئے اور گہرا کر دیا۔ حالانکہ یہ بھٹو ہی تھے جو یہ معاہدہ کرانے کے لئے ایوب خان کے ہمراہ روس گئے تھے اور انہوں نے ہی معاہدے کے بعد قومی اسمبلی کے ڈھاکہ اجلاس میں اڑھائی گھنٹے تک اس معاہدے کا دفاع کیا تھا[1] بہرحال چند ماہ بعد جولائی ۱۹۶۶ء میں انہیں حکومت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اگرچہ برسر اقتدار جماعت کنونشن لیگ سے وہ بدستور وابستہ رہے۔[2]

اعلان تاشقند، ایوب حکومت کے خلاف تحریک کا نقطۂ آغاز بنا۔ فروری ۱۹۶۶ء کے پہلے ہفتے لاہور میں اعلان تاشقند کے مضمرات پر غور کرنے کے لئے آل پاکستان نیشنل کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس کانفرنس کے دوران عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب نے چھ نکات پیش کرنا چاہے جس کی اجازت نہ دی گئی۔ اس مسئلہ پر عوامی لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ عوام میں اس معاہدے کے خلاف غم و غصے کی کیفیت سے مسٹر بھٹو نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور وہ اشاروں کنایوں اور حرکات و سکنات سے یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گئے کہ اس معاہدے میں کچھ خفیہ شقیں ہیں جو ملک کے مفاد کے سراسر منافی ہیں اور یہ کہ وقت آنے پر وہ یہ راز بے نقاب کر دیں گے۔

اگلے سال جنوری ۱۹۶۷ء میں سرکاری سطح پر معاہدہ تاشقند کی سالگرہ منائی جانے لگی، تو کالجوں، یونیورسٹیوں کے طلبہ سڑکوں پر نکل آئے۔ یہ اعلان تاشقند کے خلاف پہلا عوامی مظاہرہ تھا اس مظاہرے کے دو روز بعد عید کے مسئلے نے عوام میں بے چینی پیدا کر دی اس سال عید ۱۳ جنوری بروز جمعہ ہونا تھی، مگر ایوب خان کو کسی نے یہ باور کرا دیا کہ ایک ہی روز دو خطبے حکمران پر بھاری ہوتے ہیں چنانچہ حکومت نے ایک روز پہلے جمعرات کو عید الفطر منانے کا اعلان کر دیا۔ قدرتی طور پر علماء نے اس پر شدید احتجاج کیا۔ اس احتجاج کی پاداش میں مولانا مودودیؒ کے علاوہ چار اور علماء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز

---

[1] حنیف رامے "پنجاب کا مقدمہ" ص ۳

[2] مسٹر بھٹو نے آٹھ ماہ بعد فروری ۱۹۶۷ء میں کنونشن لیگ سے علیحدگی اختیار کی۔

کے تحت دو دو ماہ کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔ اس سے عوام میں ناراضی کی لہر اور بلند ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ خاندانی منصوبہ بندی (برتھ کنٹرول) کی حکومتی مہم، عائلی قوانین کے نفاذ اور مشینی ذبیحہ کو حکومتی سطح پر جائز اور رواج دینے کی کوشش تھی جن کے خلاف اگرچہ بے چینی تھی لیکن بے چینی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ اس ساری صورت حال پر اضافہ ملک میں غذائی بحران نے کر دیا۔ غرض یہ کہ مختلف عوامل نے ملک میں حکومت کے خلاف نفرت کی ایک لہر اس سرے سے اس سرے تک دوڑا دی۔ فروری ۱۹۶۷ء کے اوائل میں پاکستان ویسٹرن ریلوے کے ملازمین نے شدید مہنگائی سے تنگ آ کر ہڑتال کر دی اور ملک میں مواصلات کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ بعض گاڑیاں دو دو ماہ تک تعطل کا شکار رہیں۔ حکومت نے اس کا ذمہ دار جماعت اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی کو قرار دیا۔

۳۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو اپوزیشن کی جماعتوں کا ایک اتحاد آٹھ نکات کی بنیاد پر تحریک جمہوریت پاکستان (Pakistan Democratic Movement- PDM) کے نام سے عمل میں آیا۔ اس اتحاد میں جماعت اسلامی، مسلم لیگ (کونسل)، نظام اسلام پارٹی، قومی جمہوری محاذ، عوامی لیگ (نصر اللہ گروپ) شامل ہوئیں، لیکن مشرقی پاکستان عوامی لیگ (مجیب گروپ) کی عاملہ نے اس اتحاد میں شمولیت سے انکار کر دیا اور چھ نکات پر قائم رہنے پر اصرار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مرکزی حکومت کے بنگالی افسروں نے اپوزیشن کو کمزور کرنے کے لئے حکومت کے ایما پر مشرقی پاکستان عوامی لیگ کو اس اتحاد میں شامل ہونے سے باز رکھا۔ جب کہ نیشنل عوامی پارٹی نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ اس نے پھبتی کسی کہ "یہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا اتحاد ہے"۔

۹ جولائی ۱۹۶۷ء کو فاطمہ جناح کا انتقال ہو گیا۔ سیاسی اور عوامی حلقوں نے اسے غیر طبعی موت قرار دیا اور الزام لگایا کہ اس خوف سے کہ کہیں فاطمہ جناح "تحریک جمہوریت" کی سرپرست ہونا قبول نہ کر لیں، حکومت نے انہیں اپنے راستے سے ہٹایا ہے۔ فاطمہ جناح کے جنازہ کے جلوس پر لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے استعمال نے صورت حال کو اور ابتر کر دیا۔ پی ڈی ایم نے تعزیتی جلسہ کرنا چاہا، تو اجازت نہ دی گئی۔ غرضیکہ یہ اور ایسے ہی بعض

دوسرے عوامل کی بنا پر عوام کے دلوں میں نفرت کا لاوا پکتا رہا اور آخر ایک روز پھوٹ پڑا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۶۸ء کو آمریت کے خلاف عوام کا پہلا مظاہرہ ہوا اور پھر یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا گیا۔ ۸ جنوری ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ میں پاکستان تحریک جمہوریت نے جمہوری مجلس عمل" (Democratic Action Committee – DAC) کے نام سے ایک نئے سیاسی اتحاد کا اعلان کیا جس کی اپیل پر ۱۴ فروری ۱۹۶۹ء کو ملک گیر ہڑتال ہوئی۔ یہ ہڑتال اتنی بے نظیر اور کامیاب تھی کہ اس سے قبل مشاہدہ میں نہیں آئی تھی۔ اس مکمل ہڑتال کے بعد ایوب خان کے اعصاب جواب دے گئے۔ چنانچہ انہوں نے ۲۱ فروری کو آئندہ صدارتی انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر دیا اور گول میز کانفرنس میں مجیب کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیئے بھاشانی، بھٹو اور دولتانہ کے مطالبے پر ۲۲ فروری کو اگرتلہ سازش کیس واپس لینے اور اسے رہا کرنے کا اعلان کر دیا۔ گول میز کانفرنس کا انعقاد عوامی جدوجہد کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

اگرچہ مجیب کو مذکورہ سیاسی رہنماؤں کے مسلسل اصرار پر رہا کر دیا گیا، لیکن اس کے باوجود خود بھٹو اور بھاشانی نے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور اس کانفرنس پر "سودا بازی" کی پھبتی کسی۔ یہ صورت حال کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان کے عزائم کے لیئے بے حد مفید تھی، بلکہ اس سے بڑھ کر ان عناصر کی طے شدہ حکمت عملی کے تحت بھاشانی نے "طبقاتی کش مکش" کے حوالے سے مشرقی پاکستان میں گھیراؤ جلاؤ کی مہم شروع کر دی۔ ادھر مغربی پاکستان کی فضاؤں میں "بھٹو، بھاشانی، بھائی بھائی" کے نعرے بکھیرے جا رہے تھے اور ملکی صورت حال کو زہرناک بنانے کے لیئے مختلف طریقوں سے منفی قوتوں میں اتحاد کا سفر تیز تر ہوتا گیا۔ ۹ مارچ ۱۹۶۹ء کو نیشنل عوامی پارٹی اور پیپلز پارٹی کے درمیان تین نکاتی معاہدہ طے پایا، اسی روز لاہور میں جماعت اسلامی کے دفتر پر ان "اتحادیوں" نے ہلہ بول دیا۔ یہ لوگ سوشلزم زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ انہوں نے سوشلزم کے حق میں اپنی مہم کا پہلا ہدف قرآن کریم کو بنایا۔ تفہیم القرآن اور دفتر کے ریکارڈ کو باہر سڑک پر پھینک کر نذر آتش کر دیا۔ پورے ملک میں اس واقعے نے لوگوں کو سُن کر کے رکھ دیا۔[۷]

۷۔ روزنامہ "نوائے وقت"، لاہور، ۱۰ مارچ ۱۹۶۹ء

ادھر گول میز کانفرنس میں شیخ مجیب اپنے چھ نکات کو بنیاد بنانے پر مُصر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اصرار درحقیقت جنرل یحییٰ خان کی شہ پر تھا۔ چنانچہ عین کانفرنس کے دوران مجیب یحییٰ خفیہ ملاقات ہوئی جس کا اہتمام مسٹر یوسف ہارون نے کیا۔[1]

مولانا مودودیؒ نے مجیب الرحمان کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ "بالغ حق رائے دہی اور پارلیمانی جمہوریت کو تسلیم کر لینے دیں اور چھ نکات پر اصرار چھوڑ دیں، ورنہ عجب نہیں کہ دوسرا مارشل لاء لگ جائے۔" لیکن شیخ مجیب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

۱۰ مارچ کو صدر ایوب خان نے "جمہوری مجلس عمل" کے دونوں متفقہ مطالبات یعنی براہ راست انتخاب اور پارلیمانی نظام حکومت تسلیم کر لئے اور موجودہ اسمبلی کے ذریعے ۶۲ء کے دستور میں یہ بنیادی ترامیم کر کے انتخابات کرانے کا وعدہ تسلیم کر لیا۔[2] جب کہ باقی تمام نزاعی امور آئندہ اسمبلی پر چھوڑ دیئے۔ یہ نتیجہ مثبت جمہوری قوتوں کی بہت بڑی کامیابی تھا۔ مگر شیخ مجیب کی ہٹ دھرمی اور بھاشانی اور مسٹر بھٹو کی پیدا کردہ ملک گیر بدامنی نے جنرل یحییٰ خان کے لئے حالات سازگار بنا دیئے۔ اور ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو جنرل یحییٰ خان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا، ایوب خان سے جبری استعفیٰ لیا اور ۱۹۶۲ء کا دستور منسوخ کر دیا۔ اس طرح ایک مرتبہ پھر پاکستان اندھے غار میں دھکیل دیا گیا۔

جنرل یحییٰ خان، شیخ مجیب اور مسٹر بھٹو

جنرل آغا یحییٰ خان نے ۲۶ مارچ ۱۹۶۹ء کو اپنی پہلی نشری تقریر میں قوم کو یقین دلایا کہ ان کے پیش نظر کوئی ذاتی مفاد یا کوئی سیاسی عزائم نہیں، وہ صرف قومی نمائندوں کو آئین بنانے کے لئے مدد دینا چاہتے ہیں کہ آئینی حکومت قائم ہو۔[3] مسٹر بھٹو نے اس

---

[1] نوابزادہ نصراللہ خان "ہفت روزہ "اداکار" ۱۱ ستمبر ۱۹۷۲ء و جنرل یحییٰ خان۔ انٹرویو اردو ڈائجسٹ، جنوری ۱۹۷۹ء [2] نوابزادہ نصراللہ خان، قومی ڈائجسٹ مارچ ۱۹۸۱ء

[3] "نوائے وقت" لاہور ۲۷ مارچ ۱۹۶۹ء

مارشل لار کا خیر مقدم کیا[1] اور یہ صورت حال مجیب کے متعین مقاصد کے لئے مفید تھی۔ جب کہ جماعت اسلامی کے ایک جریدے نے نئی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "عین اس وقت جب کہ تحریک جمہوریت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر پارلیمانی جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو رہی تھی، بدقسمتی سے ملک پر مارشل لار نافذ کر دیا گیا ہے"[2] یہ مارشل لار بالخصوص مشرقی پاکستان میں سیاسی اور نفسیاتی صدمے کا کرب ناک پیغام لے کر آیا۔ وہاں کے عوام کو گول میز کانفرنس سے بلند توقعات وابستہ تھیں، مگر مارشل لار نے ان کی جمہوری امنگوں کا لہو کر دیا۔ یہ جذبات مارشل لار کے کڑے ضابطوں کے باوجود ان کے دلوں میں لاوے کی طرح ابلتے رہے اور اظہار رائے کے ہر مرحلے پر جذبات کا سیلاب امڈا چلا آتا ہے[3] اگرچہ اس مارشل لار کے نفاذ سے عارضی طور پر امن وامان کی صورت بہتر ہو گئی تھی، لیکن جب یحییٰ خان حکومت نے ایوب خان کے خلاف (مشرقی پاکستان میں) تحریک کے دوران قتل عام میں ملوث مجرموں سے کوئی بازپرس نہ کی، اس سے امن پسند عوام کو حکومت کے رویہ پر افسوس اور تعجب ہوا وہیں یہ شرپسندوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ واضح رہے کہ تحریک کے دوران مشرقی پاکستان کے مختلف حصوں میں بھاشانی کی تحریک و ترغیب پر سینکڑوں افراد کو گھروں میں بند کر کے نذر آتش کر دیا گیا، بے دریغ گولیاں ماری گئیں اور بھالوں سے انسانی جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے . . . اگرچہ مغربی پاکستان میں ایسی خبریں بہت کم شائع ہو سکیں، بالخصوص اشتراکی لابی کے زیر اثر پریس نے تو ان واقعات پر پردہ ڈالا۔ شرپسند عناصر اور تخریبی سیاست پر یقین رکھنے والے سیاست دان مارشل لار کے باعث کچھ عرصہ دبکے رہے، لیکن جب انہوں نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیئے تو پھر بھاشانی نے کسان کانفرنسوں کی آڑ میں اپنی تخریبی سیاست کو آگے بڑھایا۔

---

[1] ـــــ ایضاً ـــــ ۱۰ اپریل ۱۹۶۹ء

[2] نصر اللہ خان عزیز، ہفت روزہ "ایشیا" لاہور ۲۸ مارچ ۱۹۶۹ء

[3] میجر جنرل فضل مقیم، ایضاً۔ ص ۴۷-۴۹

اکتوبر ۱۹۶۹ء میں مشرقی پاکستان کے قریب شاہ پور کے مقام پر ایک دو روزہ کانفرنس منعقد کی جس میں کسانوں کو سرخ ٹوپیاں پہن کر اور لاٹھیاں بھالے لے کر شرکت کرنے کی اپیل کی گئی۔ اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بھاشانی نے شرکاء سے اپیل کی کہ وہ اپنے اپنے گاؤں میں لاٹھی بردار "سماج سیوک باہنی" بنائیں اور ہر گاؤں سے سماج دشمن عناصر کا قلع قمع کر دیں۔ ادھر شرپسند عناصر موقع کی تاک میں تھے اور یہ موقع انہیں اس وقت مل گیا۔ جب ووٹروں کے رجسٹریشن فارم بنگلہ زبان کے بجائے اردو زبان میں چھاپے گئے ہنگامے اتنے بڑھے کہ فوج کو ڈھاکہ میں گولی چلانا پڑی اور ادھر پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے حکومت کو دھمکی دی کہ اگر انتخابی فہرستیں سندھی زبان میں شائع نہ کی گئیں تو ان کی پارٹی آئندہ انتخابات کا بائیکاٹ کرے گی۔

۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو صدر جنرل یحییٰ خان نے ون یونٹ توڑ دینے اور ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو قومی اسمبلی کے لئے عام انتخابات "ایک آدمی ایک ووٹ" کی بنیاد پر کرانے کا اعلان کر دیا[1] اور کہا یہ اسمبلی ۱۲۰ دن کے اندر اندر نیا آئین تیار کرے گی۔ مولانا مودودی نے اس اعلان سے چند روز قبل ہی ۸ نومبر ۶۹ء کو اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ "اگر نئی دستور سازی کے لئے آ.ملی قائم کی گئی تو ملک تباہ ہو جائے گا"[2] جب کہ انتخابات کے انعقاد کا اعلان ہو جانے پر مرکزی مجلس شوریٰ، جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے ایک اجلاس کی قرارداد میں کہا "آئندہ اسمبلی کے انتخابات سے پہلے بعض اہم آئینی مسائل کا ادھورا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ ان حالات میں اگر متضاد نظریات اور اغراض رکھنے والے عناصر منتخب ہو گئے تو اندیشہ ہے کہ وہ طے شدہ مسائل کو متنازعہ بنا دیں گے اور نئے جھگڑے بھی اٹھائیں گے۔ جس سے پاکستان کا خواب ہی پریشان ہو کر رہ جائے گا"۔ قرارداد میں ملک کی حالت پر تبصرہ

---

[1] فرد واحد کی جانب سے ون یونٹ جیسے نازک مسئلے اور دونوں علاقوں میں سیاسی توازن کے "برابری" (پیریٹی) کے اصول کو ختم کرنے کا حتمی فیصلہ پاکستان کے وجود پر کاری ضرب تھا۔

[2] روزنامہ جنگ، کراچی، ۷ نومبر ۱۹۶۹ء (یاد رہے کہ مولانا ۵۶ء کے آئین کی بحالی چاہتے تھے)

کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ "ہر علاقے میں ایسی قیادتیں ابھر رہی ہیں جن کا سارا کاروبار سیاسی، علاقائی، نسلی اور طبقاتی جذبات کو ہوا دینے پر مبنی ہے اور ان کو انتخابات میں کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان ایسے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے جو کسی طرح باہم مل کر نہ رہ سکیں" جماعت اسلامی نے اپنی قرارداد میں حکومت پر بھی یہ الزام لگایا کہ وہ ان عناصر کو "راضی" کرنے کی کوشش کر کے ان کی مزید ہمت افزائی کر رہی ہے۔[1]

یحییٰ خان نے جب مارشل لاء کے نفاذ کے کچھ عرصہ بعد یہ کہا کہ "بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست عام انتخابات کرائے جائیں گے اور اس طرح جو عوامی نمائندے منتخب ہو جائیں گے وہ ملک کا نیا دستور بنائیں گے" تو اس وقت ملک کی بیشتر محب وطن اور سنجیدہ سیاسی جماعتوں نے یحییٰ خان کو مشورہ دیا تھا کہ نئے دستور کا تجربہ کرنے کی بجائے ۱۹۵۶ء کے آئین کو بحال کر کے نافذ کر دیں۔ جماعت اسلامی پاکستان جمہوری پارٹی (جو قومی جمہوری محاذ، عوامی لیگ نوابزادہ نصر اللہ خان گروپ، نظام اسلام اور جسٹس پارٹی کو باہم مدغم کر کے تشکیل دی گئی تھی) مسلم لیگ کونسل، حتیٰ کہ مسلم لیگ کنونشن بھی یہ مطالبہ کرنے میں پیش پیش تھیں، لیکن یحییٰ خان نے جناب بھٹو، مجیب، جی ایم سید اور بعض غیر معروف سیاسی عناصر جو ۵۶ء کے دستور کی بحالی کے مخالف تھے کی رائے پر عمل کیا۔

۱۹۷۰ء انتخابی مہم کا سال

یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو سیاسی سرگرمیوں سے ہر قسم کی پابندی ہٹا دی گئی۔ مسٹر بھٹو نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز خاصے معنی خیز انداز میں کیا۔ انہوں نے ۱۹ جنوری کو صدر جنرل یحییٰ خان کی جرأت اور فوجی مہارت و بصیرت کی تعریف کرتے ہوئے کہا: "اگر وہ (یحییٰ) کمانڈر انچیف ہوتے تو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھارت کو شکست دی جا سکتی تھی"۔[2] اسی بات کو مسٹر بھٹو

---

[1] ایضاً، ۱۹ دسمبر ۱۹۶۹ء

[2] روزنامہ امروز لاہور ۹ مارچ

نے دو ماہ بعد پھر دہرایا۔[1] نوابزادہ نصراللہ خان نے اس موقع پر اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ بھٹو صاحب پاکستان کی مسلح افواج میں اپنے لئے ملقہ اثر پیدا کرنے کے لئے یہ ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں جس سے ان کے عزائم کے بارے میں سنگین قسم کے شکوک پیدا ہوتے ہیں کہ آج تک اس ملک کے کسی سیاستدان نے اس طریقہ سے مسلح افواج کے اعلیٰ افسروں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔[2] پھر آہستہ آہستہ مسٹر بھٹو نے اپنی انتخابی مہم کا رخ اور لہجہ بدلا اور یحییٰ حکومت کے خلاف شدید نوعیت کی جارحانہ تقریریں کرنے لگے۔ مگر گرفتار نہ کئے گئے۔ یحییٰ خان کے راستے میں تین مجبوریاں حائل تھیں۔ اوّلاً وہ جانتے تھے کہ بھٹو ایک زبردست Unsurpassed ہنگامہ جو (Agitator) ہیں۔ ثانیاً گول میز کانفرنس کو ناکام بنا کر ایوب خان کو اقتدار سے ہٹانے اور یحییٰ خان کو اقتدار سنبھالنے میں بھٹو صاحب نے مدد دی تھی جس کے وہ زیر احسان تھے۔ ثالثاً یحییٰ حکومت کے طاقتور جرنیلوں جنرل پیرزادہ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان سے مسٹر بھٹو کا یارانہ تھا، وہ حکومت کی پالیسیوں اور اہم فیصلوں سے باخبر رکھتے تھے۔[3] دراصل پیپلز پارٹی کو فوجی جرنیلوں کی ہی نہیں بلکہ بائیں بازو کی اشتراکی تحریک اور امریکہ کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ دوسری جانب عوامی لیگ بھی بائیں بازو کی حمایت اور امریکی سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی چھتری تلے محوکار تھی۔[4]

۱۹۷۰ء مشرقی پاکستان میں انتخابی مہم

جنوری ۱۹۷۰ء میں سیاسی سرگرمیوں سے پابندی ہٹائے جانے کے بعد اگر صرف اسی ایک مہینے کی سیاسی سرگرمیوں کا مختصراً جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس

---

[1] روزنامہ مشرق، لاہور ۲۰ جنوری ۱۹۷۰ء

[2] روزنامہ امروز، لاہور ۱ مارچ ۱۹۷۰ء

[3] — Safdar Mahmud "Pakistan Divided" p 77.

[4] · Herbert Feldman "The End of Beginning" p.78

دوران مارشل لاء کا ضابطہ نمبر ۶۰ (مجریہ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۹ء) جس میں سیاسی سرگرمیوں سے متعلق تمام امور کو طے کر دیا گیا تھا، بالکل بے اثر اور بے کار ہو کر رہ گیا۔ جلسوں میں قانون شکنی کے سنگین واقعات رونما ہوئے۔ قومی سالمیت کے خلاف نعرے لگے۔ مشرقی پاکستان میں کھلم کھلا "بنگلہ دیش" کے لفظ کا تذکرہ ہونے لگا۔ آتشیں ہتھیاروں کا نہ صرف کھلے عام مظاہرہ ہونے لگا، بلکہ ان کا استعمال بھی بلا جھجک ہونے لگا۔ حکومت نے ان واضح خلاف ورزیوں کے باوجود کوئی سنجیدہ اور ٹھوس عملی قدم نہ اٹھایا۔ چشم پوشی کے اس رویہ سے غنڈہ عناصر کے حوصلے بلند ہوتے اور قانون شکن زیادہ دیدہ دلیری کے ساتھ دندنانے لگے[1]

عوامی لیگ نے ۱۱ جنوری کو پلٹن میدان میں پہلا بڑا جلسہ کیا۔ اس جلسے میں شیخ مجیب الرحمٰن نے دستور میں برابری Parity کے نظریے کو مسترد کر دیا۔ اور مشرقی پاکستان کے لئے بنگلہ دیش کا لفظ استعمال کیا۔

۱۸ جنوری ۱۹۷۰ء کو ڈھاکہ پلٹن میدان میں جماعت اسلامی کا پہلا جلسہ[2] غنڈہ گردی کا نشانہ بنا۔ اس جلسہ سے جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی کو خطاب کرنا تھا، مگر وہ خطاب نہ کر سکے۔ آغاز کے کچھ دیر بعد ایک منظم پروگرام کے تحت کچھ لوگوں نے جلسگاہ کے درمیان سے اچانک "بھاگو بھاگو" کا شور مچایا اور اٹھ کھڑے ہوئے مگر جب اس حرکت سے جلسہ نہ اکھڑا تو اسٹیڈیم والے گیٹ سے چاقوؤں سے مسلح ایک ہجوم سامعین پر ٹوٹ پڑا۔ اسی اثناء میں جناح روڈ کی طرف سے شدید سنگ باری شروع ہو گئی۔ یہ حملہ آور سٹیڈیم کی چھت پر قابض تھے۔ سینکڑوں افراد اینٹوں کے ٹکڑے ان غنڈوں کو سپلائی کر رہے تھے۔ پولیس غائب تھی اور حملہ آوروں کا دباؤ چاروں جانب سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔

---

[1] محمد ایوب "مشرقی پاکستان ۱۹۷۰ء کے انتخابات" پنجاب یونیورسٹی - ص ۲۵۹

[2] اس جلسہ کے بارے میں ہم قدرے تفصیل سے بیان کر رہے ہیں، کیونکہ مشرقی پاکستان کی مسموم سیاسی فضا میں اس وقت ایک پاکستان اور اسلامی نظریے کی علامت تنظیم کا جلسہ الٹا بعد ازاں دور رس نتائج کا حامل واقعہ ثابت ہوا۔

ان غنڈوں نے سٹیج پر قبضہ کر کے اسے آگ لگا دی اور سٹیج پر لگا ہوا کلمہ طیبہ اور پاکستان کا پرچم جلا دیا۔ حملہ آور "جے بنگلہ" کے نعرے لگا رہے تھے اور ان کی قیادت اسٹوڈنٹس لیگ (چھاترو لیگ) کے صدر طفیل احمد، جنرل سیکرٹری عبدالرب وغیرہ کر رہے تھے۔ اس سانحہ میں ۲۰۰ سے زائد افراد زخمی ہوئے۔ جماعت اسلامی کے تین کارکن کو موقع پر شہید کر دیئے گئے۔[1] چند روز بعد جماعت اسلامی نے جلسہ میں شرکت کرنے والے ۲۶ لاپتہ افراد کی فہرست اخبارات کو جاری کی۔[2] واضح رہے کہ پی ڈی پی کے مولوی فرید احمد (شہیدؒ) نے دو روز قبل راولپنڈی کے جلسہ عام میں حکومت کو خبردار کر دیا تھا کہ "شیخ مجیب اور بھاشانی کے حامی مولانا مودودیؒ کے جلسہ میں گڑبڑ کریں گے جس سے سنگین نتائج برآمد ہوں گے"۔ لیکن حکومت نے ذرہ بھر احتیاطی اقدامات نہیں کئے۔ ایک ذمہ دار فوجی افسر نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ درحقیقت حکومت اپنی "غیرجانبداری" قائم رکھنے کے لئے سر بام بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی۔[4] جب کہ ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان نے کہا کہ "ڈھاکہ میں جماعت اسلامی کے جلسہ میں گڑبڑ فوجی حکومت کے ایماء پر ہوئی۔[5] ایک دوسرے جرنیل میجر جنرل فضل مقیم خان کا اس واقعہ پر تبصرہ یہ ہے کہ "عوامی لیگ کے کارکن، حکومت کے سول افسروں، پولیس اور حتٰی کہ مارشل لاء کے ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ میں متعین مشرقی پاکستانی فوجی افسروں نے بھی باہمی تعاون سے اس جلسہ کو تہس نہس کرنے میں حصہ لیا۔ چنانچہ ایک سیاسی قوت جس سے توقع ہو سکتی تھی کہ وہ عوامی لیگ کے مذموم عزائم کے خلاف محاذ آراء رہے گی۔ اس کی قوت اور پروگرام کو ایسا شدید صدمہ پہنچا کہ پھر اس کے بعد عوامی لیگ کے راستے میں کوئی رکاوٹ

---

[1] مجیب الرحمٰن شامی۔ ہفت روزہ "زندگی" لاہور ۲ فروری ۱۹۷۰ء

[2] روزنامہ "ندائے ملت" (ایڈیٹر مجید نظامی) لاہور ۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء

[3] روزنامہ "جنگ" کراچی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۰ء

[4] صدیق سالک ایضاً ص ۱۷

[5] روزنامہ "مشرق" لاہور ۲۶ جنوری ۱۹۷ء

حائل نہ رہی"۔[1] میجر جنرل راؤ فرمان علی خان نے اس المناک واقعے کے حوالے سے اپنی یادداشتوں میں مارشل لاء انتظامیہ کی مجرمانہ اعانت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا: "ڈھاکہ میں مارشل لاء کے تحت "لاء اینڈ آرڈر" کے انچارج بریگیڈیئر مجید الحق تھے[2] وہ سخت متعصب بنگالی افسر تھے۔ جماعت اسلامی کے جلسے پر حملے کی اطلاع باقاعدہ ان کو دی گئی مگر انہوں نے امن وامان کو برقرار رکھنے میں اپنی ذمہ داری کو بالکل محسوس نہ کیا"۔[3]

اس سارے ہنگامے کے بعد سٹوڈنٹس لیگ کے صدر طفیل احمد نے جو بیان دیا وہ یہ تھا کہ "ہم کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہمارے چھ نکات اور گیارہ نکات کی عوامی تحریک کے خلاف بات کرے"۔[4]

۲۱ جنوری ۱۹۷۰ء کو بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی نے سنتوش (ڈھاکہ سے ۴۵ میل دور) کے مقام پر "کسان ریلی" کا انعقاد کیا اور اس میں ان تمام پارٹیوں کو مدعو کیا جو سوشلزم پر مکمل یقین رکھتی تھیں۔ مارشل لاء حکومت نے اس ریلی کو کامیاب بنانے کے لئے خصوصی ریل گاڑیاں چلائیں۔ جلسہ گاہ تک بجلی پہنچانے کے لئے جنریٹر لگا دیا گیا۔ ٹیوب ویل کھودے گئے اور ڈاک خانہ و تار گھر قائم کیا گیا۔ ریلی میں شریک اکثر و بیشتر افراد کلہاڑیوں، تلواروں اور لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ حالانکہ مارشل لاء کے ضابطہ نمبر ۶۰ کے تحت ان چیزوں پر سختی سے پابندی تھی۔ اس ریلی سے جو نعرے برآمد ہوتے وہ یہ تھے: "جالو جالو آگن جالو (جلاؤ جلاؤ آگ جلاؤ) ووٹ سے پہلے روٹی، کسان مزدور آزادی مانگو" اور "کلہاڑی ہاتھ میں پکڑو" "آزادی حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہتھیار اٹھاؤ، سمجھوتہ نہیں جنگ جنگ"۔[5]

---

[1] میجر جنرل فضل مقیم "پاکستان کا المیہ" ص ۵۵-۵۶

[2] بریگیڈیئر مجید الحق بعد میں بنگلہ دیش فوج میں میجر جنرل ہوئے اور صدر ضیاء الرحمٰن کے مشیر بنے۔

[3] راؤ فرمان علی "یادداشتیں" ہفت روزہ "بادبان" لاہور ۳۰ اپریل ۱۹۷۸ء

[4] ہفت روزہ "زندگی" لاہور فروری ۱۹۷۰ء

[5] روزنامہ "مشرق" لاہور ۲۲ جنوری ۱۹۷۰ء و صدیق سالک۔ ایضاً۔ ص ۱۷

یکم جنوری کو پاکستان جمہوری پارٹی کے زیر اہتمام ڈھاکہ پلٹن میدان میں جلسہ ہوا تو عوامی لیگ اور بھاشانی گروپ کے کارکنوں نے اس جلسہ کو الٹ دیا۔ مولوی فرید احمدؒ سمیت متعدد افراد زخمی ہوئے۔ مظاہرین چھ نکات زندہ باد" ہم مولوی فرید احمد اور نور الامین کا سر قلم کردیں گے" اور پنجابی دلالو واپس جاؤ" کے نعرے لگا رہے تھے[1] اسی ماہ کی ۲۷ر تاریخ کو چاٹگانگ کے روزنامہ "بنیاد" اور "سنگرام" کے دفاتر پر حملے کئے گئے۔ پے در پے ایسے واقعات کی روک تھام سے حکومت کی غفلت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے کہا کہ کوئی موثر اقدام اٹھانے میں مزید تساہل کے معنی یہ ہوں گے کہ آئندہ انتخابات میں ایک پارٹی کو زبردستی انتخاب جیتنے کا کھلا موقع دیا جا رہا ہے"[2]

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا رویہ بھی اس پورے عرصے میں ایسا رہا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ خان ہی کو نہیں، بلکہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی کامیابی خود انہیں بھی مطلوب ہے۔ چنانچہ وہ مغربی پاکستان کے سیاست دانوں میں واحد سیاست دان تھے جنہوں نے یحییٰ خان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر برسر اقتدار فوجی گروہ کے دل میں اپنے لئے نرم گوشہ پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی۔ مثلاً یحییٰ خان کے حکومت سنبھالنے کے چند روز بعد انہوں نے لندن کے سوشلسٹ روزنامہ 'SUN' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ میں موجودہ حکومت کو ایوب حکومت کی نسبت کہیں زیادہ اچھی حکومت سمجھتا ہوں"[3] ایک اور موقع پر موچی دروازہ میں تقریر کرتے ہوئے سابق صدر ایوب کا خاکہ اڑاتے ہوئے کہا کہ "۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر جنرل یحییٰ خان کشمیر محاذ پر تھے اور وہ اکھنور پہنچ کر دم لینا چاہتے تھے، لیکن صدر ایوب خان نے انہیں بھارتی فوجی چھاؤنی پر قبضہ کرنے کی مہلت نہ دی۔ ورنہ موجودہ صدر یحییٰ خان اور موجودہ ایئر مارشل رحیم خان

---

[1] روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۲ فروری ۱۹۷۰ء

[2] روزنامہ "امروز" لاہور ۲۹ فروری ۱۹۷۰ء

[3] نوائے وقت۔ لاہور ۱۰ اپریل ۱۹۶۹ء بحوالہ ہفت روزہ "آئین" اشاعت خصوصی مارشل لاء کے تین سال مرتبہ جمیل احمد رانا (مئی ۱۹۷۲ء)

ہندوستان کو صدیوں تک یاد رہنے والا سبق سکھانے کے حق میں تھے، لیکن موسیٰ خان (سابق کمانڈر انچیف) بوکھلا گئے اور صدر ایوب کے اعصاب جواب دے گئے۔[1] اپنی اس تقریر کے چند روز بعد ہی ۱۱ مارچ کو مسٹر بھٹو نے صدر یحییٰ خان سے ملاقات کی اور دو روز بعد ۱۳ مارچ کو ڈھاکہ ایئرپورٹ جا اترے جہاں انہوں نے کہا کہ "طلبہ کا گیارہ نکاتی پروگرام دراصل تمام سیاسی پارٹیوں کے پروگراموں کی روح ہے اور قومی مفاد میں اس پر اتفاق رائے ہونا چاہیئے"[2] واضح رہے کہ گیارہ نکاتی پروگرام میں شیخ مجیب کے چھ نکات جوں کے توں شامل تھے۔ انہی ایام میں عبدالحمید بھاشانی لاہور آئے تو ان کا استقبال کرنے والوں نے بھٹو بھاشانی بھائی بھائی کے نعرے لگائے۔ کچھ روز پہلے مسٹر بھٹو یہ اعلان کر چکے تھے کہ "بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی اور میری پیپلز پارٹی کے نظریات ایک ہیں۔ میں بھاشانی کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔"[3]

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور نیپ بھاشانی گروپ جب کہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور اس کی حلیف جماعتیں تشدد کا کھیل رچاتے ہوئے تھیں اور ہر قیمت پر برسر اقتدار آنے کا تہیہ کر چکی تھیں۔ جماعت احمدیہ اور شیعہ تنظیموں[4] نے اپنا تمام تر وزن مسٹر بھٹو کے پلڑے میں ڈالنے کا اعلان کر دیا۔ مارشل لاء حکومت کے ضابطوں کی ملک کے دونوں حصوں میں دھجیاں بکھیری جا رہی تھیں، لیکن مارشل لاء حکام اس ساری صورت حال پر خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ خود مارشل لاء حکومت یہ چاہتی تھی کہ یہ ملک دو ٹکڑوں میں بٹ جائے۔

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے لئے رستہ صاف کرنے کے بعد فوجی جنتا مرکز میں بیٹھی انتخابی مہم کے بارے میں بے شمار اندازے لگاتی رہی کہ نتائج کیا ہوں گے۔ کبھی وہ

---

[1] آزاد لاہور، ۹ مارچ ۱۹۷۰ء

[2] جنگ کراچی، ۱۵ مارچ ۱۹۷۰ء

[3] "حریت" کراچی ۲۵ جولائی ۱۹۶۹ء

[4] لیکن چند جید شیعہ علماء نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

(دولتانہ گروپ) مسلم لیگ، عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) کی مخلوط حکومت کی توقع رکھ کر اس قیاس پر کام کرتے۔ کبھی مسلم لیگ (قیوم خان) اور مسلم لیگ (دولتانہ) کی لڑائی میں پیپلز پارٹی کو ابھرتا دیکھتے مگر جنرل ہیڈ کوارٹر کی اس سیاسی شطرنج اور جوڑ توڑ میں ہمیشہ جماعت اسلامی کو غیر جانبدار اور ذوج کے کسی دام فریب میں نہ آنے والی پارٹی سمجھا جاتا تھا۔[1]

لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب خان ان دنوں مشرقی پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ انہوں نے ایڈیٹروں کے سامنے مارشل لاء کی اس بے اثری کا جواز یہ پیش کیا: "پاکستان میں لوگ مارشل لاء کو دہشت اور خوف کی علامت سمجھتے ہیں۔ اس لئے جمہوریت کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ مارشل لاء کی کاٹ کو ذرا کند رکھا جائے۔"[2]

انتخابی نتائج سامنے آئے تو معمولی سی بھی سیاسی بصیرت رکھنے والے شخص کو نظر آنے لگا کہ اب پاکستان کا متحد رہنا معجزہ سے کم نہیں ہوگا۔ نتائج کے مطابق مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ ۱۵۱ نشستیں لے کر اور مغربی پاکستان سے پاکستان پیپلز پارٹی ۸۱ نشستیں لے کر بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئیں اور عوامی لیگ کا کوئی امیدوار مغربی پاکستان سے اور پیپلز پارٹی کا کوئی امیدوار مشرقی پاکستان سے کامیاب نہ ہوا۔ ان نتائج پر ٹیلیفون سے شیخ مجیب اور مسٹر بھٹو نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔[3]

انتخابات کیسی فضا میں ہوئے؟ اس بارے میں یحییٰ خان مارشل لاء انتظامیہ کے ایک ذمہ دار فرد جنرل راؤ فرمان علی کا اعتراف ملاحظہ ہو: "ہر سرکاری محکمہ عوامی لیگ کے ووٹروں کے لئے کھلا ہوا تھا۔ اعلیٰ سے ادنیٰ منصب تک ان کی پہنچ تھی۔ ان لوگوں نے عوامی لیگ کی فتح میں زبردست کردار ادا کیا۔ انتخابات کے سارے انتظامات جن

---

[1] میجر جنرل فضل مقیم۔ "پاکستان کا المیہ"۔ ص ۶۰
[2] صدیق سالک ـــــ ایضاً ـــــ ص ۲۸۔ ۳۳
[3] جنگ، کراچی ۱۰ دسمبر ۱۹۷۰ء بحوالہ۔ مارشل لاء کے تین سال، جمیل احمد رانا

لوگوں کے ہاتھ میں تھے وہ عوامی لیگ کے طرف دار تھے۔ عوامی لیگ کے مخالفین پولنگ سٹیشنوں تک بھی نہ آسکے۔ زبردستی مہریں لگوائی گئیں کسی کو احتجاج کی جرأت نہ ہوئی احتجاج کس سے کیا جاتا۔ فوج اپنے آپ کو سارے معاملے سے "بے تعلق سمجھتی تھی۔ ان انتخابات میں خاصے جعلی ووٹ بھگتائے گئے اور پوری سول انتظامیہ مجیب کی پشت پر تھی" [1]

عوامی لیگ کے ایک حامی سیاست دان نے پاکستان سپریم کورٹ کے اعلیٰ سطحی کمیشن کے روبرو اپنے حلفی بیان میں کہا: "مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۰ء کے انتخابات نہ تو آزادانہ تھے اور نہ صاف ستھرے ماحول میں ان کا انعقاد ہوا" [2]

جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس عاملہ کے ہنگامی اجلاس (۱۱ دسمبر ۱۹۷۰ء) سے خطاب کرتے ہوئے امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کہا تھا:

" قومی نقطۂ نظر سے عام انتخابات کے موجودہ مایوس کن نتائج کے بعد اب مشرقی پاکستان کی علیحدگی حقیقی خطرہ بن چکی ہے . . . . . لیکن ہمیں اس المناک صورت حال کو روکنے کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے اور تمام مثبت تدابیر اختیار کرنی چاہییں۔ گو انتخابات ہنگامی فضا، مارشل لا حکومت کی نااہل انتظامی صلاحیت، جھوٹے وعدوں، نفرتوں کے فروغ کے نتیجہ میں ہوئے ہماری قوت تھوڑی اور وسائل محدود ہیں۔ سردست یہ کام کیے جانے چاہییں:

• مجیب کے وعدے اس کے گلے میں لٹکا دیئے جائیں تاکہ جھوٹے وعدوں کا طلسم ٹوٹے۔ بنگلہ زبان میں ہنگامی بنیادوں پر اسلامی لٹریچر کی وسیع اشاعت و ترجمے کا اہتمام

---

[1] راؤ فرمان علی۔ "یادداشتیں" اردو ڈائجسٹ لاہور۔ مئی ۱۹۷۸ء

[2] خان عبدالولی خان۔ "حمود الرحمان کمیشن کے سامنے بیان" ہفت روزہ اداکار (زندگی) لاہور ۲۸ اگست ۱۹۷۲ء

کیا جائے۔ دانشور طبقے میں کام کو آگے بڑھانے کے لئے خطوط کار طے کئے جائیں۔ علیحدگی کی فضا پیدا کرنے والے ہر بیان اور ایسی ہر کوشش کا نوٹس لیا جائے۔ اس فکر پر بھرپور تنقید کی جائے اور علیحدگی کے نتائج کھول کر بیان کئے جائیں۔ تاکہ اگر خدانخواستہ علیحدگی ہو تو اس کے نتائج آتے دیکھ کر عوام شیخ مجیب اور ہندو کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں"[1]

آخری مرحلہ: ۱۹۷۱ء

انتخابی نتائج سامنے آنے کے فوراً بعد دونوں کامیاب پارٹیوں عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی اور فوجی بیورو کریسی کے درمیان اقتدار کی کش مکش شروع ہو گئی۔ مسٹر بھٹو نے کہا "مرکزی حکومت میں دونوں پارٹیوں کا مساوی حصہ ہونا چاہیے اور ہو گا"[2] اس پر شیخ مجیب نے کہا: "ہمیں عوام کی اکثریت نے دستور سازی اور ملک کے تمام حصوں میں بسنے والے عوام کے مسائل حل کرنے کا حق سپرد کر دیا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس حق سے محروم نہیں کر سکتی"[3] چند روز بعد ۴ جنوری ۷۱ء کو صدر یحییٰ خان نے اعلان کر دیا کہ "شیخ مجیب الرحمٰن ملک کے آئندہ وزیر اعظم ہوں گے"[4] اسی دوران مسٹر بھٹو نے صدر یحییٰ خان کو لاڑکانہ میں شکار کھیلنے کی دعوت دے کر فوری ملاقات کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ۱۷ جنوری کو صدر یحییٰ خان اور مسٹر بھٹو کے درمیان المرتضیٰ میں طویل مذاکرات ہوئے پاکستان پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار "مساوات" لاہور نے اس ملاقات کو یوں رپورٹ کیا:

"المرتضیٰ کے خوبصورت صحن میں آم کے درخت کے سائے میں صدر یحییٰ اور مسٹر بھٹو کے درمیان بات چیت کا پہلا دور تنہائی میں ہوا۔ ایک گھنٹے بعد پاکستانی فوج کے

---

[1] روایت پروفیسر عبدالحمید صدیقی"۔ مدیر ماہنامہ ترجمان القرآن سے مولف کا انٹرویو (۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

[2] روزنامہ "جنگ" کراچی ۲۳ دسمبر ۱۹۷۰ء بحوالہ ہفت روزہ "آئین" اشاعت خصوصی "مارشل لاء کے تین سال" مرتبہ جمیل احمد رانا۔

[3] روزنامہ "امروز" لاہور ۱۱ جنوری ۱۹۷۱ء

[4] روزنامہ "جاوداں" لاہور ۱۵ جنوری ۷۱ء

چیف آف سٹاف جنرل عبدالحمید خان اور بعض دوسرے اصحاب بھی شامل ہو گئے۔ بات چیت کا دوسرا مرحلہ تقریباً دو گھنٹے جاری رہا۔ کل شام چائے کے بعد جناب بھٹو اور یحییٰ خان کے درمیان مزید دو گھنٹے مذاکرات ہوتے رہے۔ بات چیت کے دوران المرتضیٰ پر مکمل آزادی کا عالم رہا۔ المرتضیٰ کے ارد گرد حفاظتی اقدامات بہت سخت تھے دونوں رہنما مذاکرات میں مصروف تھے۔ جب کہ صدر مملکت کے پرسنل سٹاف آفیسر لیفٹیننٹ جنرل ایس جی ایم پیرزادہ گھاس کے سبز خطے پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ ملاقات کے خاتمہ پر صدر یحییٰ جناب بھٹو کے ہمراہ ڈرِگ جھیل روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر دونوں رہنما خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے"[1]

مکمل "رازداری" اور "تنہائی" کے عالم میں ہونے والی بات چیت کے بعد مسٹر بھٹو ڈھاکہ پہنچ کر شیخ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کرتے ہیں۔ "یہ خفیہ مذاکرات"[2] ۲۷ جنوری سے ۲۹ جنوری تک جاری رہے۔ ان مذاکرات میں بھٹو صاحب نے مجیب سے مل کر یہ طے کرنا چاہا کہ دونوں آپس میں مل کر اقتدار بانٹ لیں، لیکن ان کے درمیان سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ شیخ مجیب یہ چاہتے تھے کہ جلدی سے جلدی اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے۔ مسٹر بھٹو کی کوشش یہ تھی کہ جب تک اقتدار بانٹنے کے لئے ان سے سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ اسمبلی کا اجلاس نہ ہونے پائے۔

مسٹر بھٹو ۲۹ جنوری کو ڈھاکہ سے واپس لاہور پہنچتے ہیں اور اگلے ہی روز ۳۰ جنوری کو انڈین ایئر لائنز کا فوکر فرینڈشپ طیارہ گنگا اغوا کر کے لاہور لایا جاتا ہے۔ مسٹر بھٹو لاہور ایئر پورٹ پر پہنچ کر طیارہ اغوا کر کے لانے والوں سے "علیحدگی" میں بات چیت کرتے ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ آپ ہرگز نہ گھبرائیں ہم آپ کے ساتھ ہیں[3]۔ ۲ فروری کو یہ طیارہ لاہور ایئر پورٹ پر نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ شیخ مجیب نے طیارہ تباہ کرنے کے اس اقدام کو

---

[1] روزنامہ "مساوات" لاہور ۱۹ جنوری ۱۹۷۱ء

[2] روزنامہ "مساوات" لاہور ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء

[3] روزنامہ "مساوات" لاہور یکم فروری ۱۹۷۱ء

" اقتدار کی پرامن منتقلی کو سبوتاژ کرنے کی غرض سے غیر معمولی حالات پیدا کرنے کی مفاد پرستانہ کوشش" قرار دیا اور مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس واقعہ کی تحقیقات کرائے[1] طیارہ نذر آتش کر دیئے جانے کے واقعہ کی آڑ میں بھارتی حکومت نے ۴ فروری کو پی آئی اے اور پاکستان کے دوسرے سول طیاروں کو بھارت پر سے گزرنے کی ممانعت کر دی۔ بھارتی حکومت کے اس اقدام کے بعد مسٹر بھٹو نے اچانک قومی اسمبلی کے اجلاس بلائے جانے کا مطالبہ کر دیا اور کہا کہ اب اس اجلاس کے انعقاد میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیئے[2] چنانچہ اس مطالبہ کے اگلے ہی روز (۱۳ فروری کو) صدر یحییٰ خان نے ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر مسٹر بھٹو اس اجلاس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے منتخب ارکان میں سے ایک بھی قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیئے ڈھاکہ نہیں جائے گا۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر ہماری پارٹی کا کوئی رکن ڈھاکہ گیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی، اگر مغربی پاکستان کے دوسرے ارکان اسمبلی گئے تو پیپلز پارٹی کے ورکر ان سے انتقام لیں گے اور اگر ہماری غیر حاضری میں اجلاس شروع کیا گیا تو ہم اس کے خلاف مغربی پاکستان میں بھرپور تحریک چلائیں گے۔"

مولانا مودودیؒ نے مسٹر بھٹو کے اس فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا :

" اس وقت اسمبلی کے اجلاس میں شرکت سے انکار کر کے آئینی تعطل پیدا کر دینا یا معاملات کو اسمبلی کے اندر طے کرنے کے بجائے اس سے بالا بالا ہی طے کرنے کی کوشش کرنا غلط ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اسمبلی کے اجلاس میں وہ سب لوگ شریک ہوں جنہیں عوام نے منتخب کیا ہے"[3]

دوسری جانب مولانا مودودیؒ نے شیخ مجیب الرحمان سے ایک تار میں یہ دردمندانہ اپیل کی، ·

[1] روزنامہ "جاوداں" لاہور۔ ۳ فروری ۱۹۷۱ء

[2] روزنامہ "مساوات" لاہور ۱۳ فروری ۱۹۷۱ء

[3] روزنامہ "جاوداں" لاہور ۱۷ فروری ۱۹۷۱ء

مسٹر بھٹو کی اس دھمکی کے اگلے ہی روز ترقیم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جماعت اسلامی کا پارلیمانی وفد اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ پہنچا۔

"گذشتہ چند ہفتوں کے دوران میں پیش آنے والے واقعات نے قوم کو ایک عظیم بحران سے دوچار کر دیا ہے اور سب سے بڑی مسلم ریاست پاکستان تیزی سے ایک ایسے المیے کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے جو اسپین کے المیے سے بھی بہت بڑا ہوگا۔ اس موقع پر نہایت احتیاط اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اگر اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا جائے یا کوئی اور صورت پیش آئے تو خدارا صورت حال کو زیادہ بگڑنے سے بچانے کی کوشش کیجئے"[1]

قومی اسمبلی کے اجلاس میں مسٹر بھٹو کی شرکت سے انکار پر صدر یحییٰ خان نے یکم مارچ کو تااطلاع ثانی اجلاس ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس پر شیخ مجیب الرحمان نے کہا: "یہ التوا ایک گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ یہ اجلاس محض اقلیتی پارٹی کے جذبات کے تحت ملتوی کیا گیا ہے، ہم اس اقدام پر خاموش نہیں بیٹھیں گے"۔ لیکن التوا کی خبر سنتے ہی جس تنظیم نے سب سے پہلے اپنے باقاعدہ ردِ عمل کا اظہار کیا وہ اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان تھی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اسی روز ڈھائی بجے بعد دوپہر جمعیت نے ایک احتجاجی جلسہ کیا۔ جس میں واضح طور پر اعلان کیا گیا کہ "اسمبلی کے اجلاس کا التوا ایک سازش ہے اور مطالبہ کیا اقتدار فوراً عوامی نمائندوں کو منتقل کیا جائے"۔ کہا جاتا ہے کہ اسمبلی کے اجلاس کے التوا کا اعلان مسٹر بھٹو اور جنرل پیرزادہ نے تیار کیا تھا اور اسی ڈرافٹ پر صدر جنرل یحییٰ خان نے دستخط کئے تھے[2]۔

اس کے بعد حالات نے خونیں رنگ اختیار کر لیا اور ۳ مارچ تک ڈھاکہ، سلہٹ، رنگ پور اور کھلنا کرفیو کی زد میں آ چکے تھے۔

مولانا مودودی نے اس صورتِ حال پر ایک بیان جاری کرتے ہوئے کہا:

"قومی اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ مغربی پاکستان کے ایک لیڈر کی دھمکیوں کے فور

---

[1] روزنامہ "جاودان" لاہور ۲۶۔ فروری ۱۹۷۱ء

[2] بریگیڈیر صدیق سالک "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا"۔ ص ۵۲

بعد ملتوی کرنے سے جو تباہ کن نتائج نکلے ہیں وہ اب سب کے سامنے ہیں، صدر یحییٰ خان صاحب نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو ملک کے انتظام کا چارج اس غرض کے لئے لیا تھا کہ ملک کی آئیڈیالوجی اور اس کی سالمیت کا تحفظ کرتے ہوئے یہاں جمہوریت بحال کریں گے۔ ۷ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو انتخابات مکمل ہو جانے کے بعد بجائے اس کے کہ جلد ہی اسمبلی کا اجلاس بلا کر آئین سازی کا کام شروع کر دیا جاتا۔ مختلف پارٹیوں کے درمیان ریشہ دوانیوں بند کمروں میں گفتگوؤں، بیان بازیوں اور جلسہ ہائے عام میں پرجوش تقریروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس سے آئین سازی کے امکانات دُور سے دُور تر ہوتے چلے گئے۔ اس خرابی میں جو کچھ کسر باقی رہ گئی تھی وہ اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ مقرر کر دینے کے بعد اس کے انعقاد سے صرف دو دن پہلے اس کو منسوخ کر دینے سے پوری ہو گئی۔ صدر یحییٰ خان اور ان تمام حضرات کو جو اس وقت ان کے مشیر ہیں اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے کہ اس برصغیر کی تاریخ میں وہ اپنے لئے کیا مقام پسند کرتے ہیں۔[1]

اعلان التوا کے بعد

اعلان التوا کے بعد مارے غم و غصہ کے لوہے کی سلاخیں، بانس کی لاٹھیاں تھامے عوام سڑکوں پر نکل آئے، نفرت اور دشنام کے نعروں سے پورا ڈھاکہ کانپنے لگا مجیب نے ۲ مارچ کو ڈھاکے میں اور ۳ مارچ کو سارے مشرقی پاکستان میں ہڑتال کی اپیل کر دی۔۔ مشرقی پاکستان سے مارشل لاء حکام نے اسلام آباد فون کئے کہ نئی تاریخوں کا اعلان کر دیا جائے تو حالات قابو میں آسکتے ہیں مگر مرکز میں اہل اقتدار کچھ سنتے ہی نہ تھے۔[2] ہڑتال کے روز ۲ مارچ کو سنٹرل اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کی دعوت پر شیخ مجیب نے ایک احتجاجی جلسہ میں شرکت کی اور اس کی موجودگی میں سرزمین پاکستان پر پہلی مرتبہ بنگلہ دیش

---

[1] روزنامہ "جاودان" لاہور ۲ مارچ ۱۹۷۱ء

[2] صدیق سالک ـــــ ایضاً ـــــ ص ۵۳

کا جھنڈا لہرایا گیا۔[1]

عملاً بغاوت کا آغاز ہو چکا تھا۔ سرکاری ملازمین نے دفتروں میں جانا بند کر دیا۔ ملیں کارخانے۔ بنک، ریل گاڑیاں اور اسٹیمروں تک کا نظام متاثر ہو گیا۔ عوامی لیگی غنڈے، دندناتے پھر رہے تھے، جو ان سے تعاون نہ کرتا اسے ٹھکانے لگا دیتے۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے صوبے کے بنگالی چیف سیکرٹری نے ۲ مارچ کو سول امور کے انچارج جنرل راؤ فرمان علی خان کو کہا کہ " فوج کو شہر میں طلب کرلیں " فرمان علی خان نے جواب میں کہا۔ " اس سے پیچیدگی پیدا ہو گی۔ آپ قانون نافذ کرنے والے سول اداروں کو بلالیں " لیکن چیف سیکرٹری جو عوامی لیگ کے حامی کی حیثیت سے مشہور تھا اس نے اصرار کیا کہ فوج کو سڑکوں پر طلب کرلیا جائے۔" اس پر راؤ فرمان نے کہا " مجیب سے پوچھو " تو چیف سیکرٹری بولا " میں مجیب کی منظوری سے ہی یہ کہہ رہا ہوں "[2] چنانچہ فوج شہر میں آگئی اور عوامی لیگ کا آلہ کار چیف سیکرٹری مشرقی پاکستان گرم احتجاج کی مشہور اشتراکی تکنیک برتنے کے کار لانے میں کامیاب ہو گیا جو نہی فوج کی گولی سے چھ سر پھرے شرپسند مارے گئے ، مجیب نے فوج کی بیرکوں میں واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ حالانکہ فوج طلب کئے جانے کے مطالبے پر ابھی دو دن ہی گزرے تھے۔ دراصل مجیب فوج کے خلاف نفرت کو ہوا دے کر جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ چنانچہ فوج واپس چلی گئی[3] اب پورا انتظام مجیب کے ہاتھ میں تھا اور عوامی لیگ، پٹھانوں، پنجابیوں اور اردو بولنے والوں کے جان و مال سے کھیلنے میں پوری طرح آزاد تھی۔ ان حالات کو قابو میں لانے کی تجویز لے کر مشرقی پاکستان سے ایک اعلیٰ فوجی افسر ۵ مارچ کو اسلام آباد پہنچے۔ وہ کہتے ہیں :

---

[1] پاکستان کا جھنڈا نذر آتش کر دیا گیا، پاکستان کے قومی ترانے کو چھوڑ کر رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم کو " قومی ترانے " کے طور پر گایا گیا، جسے ٹیگور نے ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال رد کرنے کی ہندو مہم کے لئے لکھا تھا۔ (Maniruzzaman, 'Op cit'' P 43)

[2] صدیق سالک۔ ایضاً۔ ص ۵۴ ؛ ۵۵۔ [3] ایضاً ص ۵۷ - ۶۴

"جب میں ایوانِ صدر میں داخل ہوا تو برآمدے میں صدر یحییٰ خان، جنرل حمید خان اور مسٹر بھٹو شراب پی رہے تھے۔ میں نے آتے ہی مشرقی پاکستان کی پریشان کن صورتحال کے بارے میں کچھ کہنا شروع کیا تو مسٹر بھٹو شراب کا جام اٹھائے ساتھ والے کمرے میں چلے گئے میں شکستہ روح اور گرفتہ دل کے ساتھ وہاں سے اٹھا ڈھاکہ میں خون بہہ رہا تھا اور بھٹو، حمید، یحییٰ رنگ رلیوں میں غرقاب تھے"۔[1]

بعد از خرابیٔ بسیار ۶ مارچ کو صدر یحییٰ خان نے ۲۵ مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کا اعلان کر دیا، لیکن شیخ مجیب نے اس اجلاس میں شرکت کے لئے ۷ مارچ کو ڈھاکہ ریس گراؤنڈ میں ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے چار مطالبات پیش کئے۔ واضح رہے کہ اس جلسے کی کارروائی ڈھاکہ ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوئی۔ مطالبات یہ تھے:۔

۱۔ "مارشل لاء اٹھایا جائے (۲) اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کیا جائے (۳) فوج کو بیرکوں میں واپس بھیجا جائے۔ (۴) حالیہ کشت و خون کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے"۔

شیخ مجیب نے کہا "اگر متذکرہ شرائط پوری کر دی گئیں تو ہم اس بارے میں غور کریں گے کہ ہمیں اجلاس میں شریک ہونا چاہیئے کہ نہیں"۔

اسی روز مغربی پاکستان سے لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان بحیثیت گورنر مشرقی پاکستان ڈھاکہ پہنچے، لیکن ڈھاکہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صدیقی نے نئے گورنر کو حلف اٹھوانے کی رسم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ "شیخ مجیب نے چونکہ عدالتوں سمیت سب سے یہ کہا ہے کہ اقتدار منتقل ہونے تک وہ کوئی کام نہ کریں۔ اس لئے وہ حلف اٹھوانے کی رسم ادا کرنے سے معذور ہیں"۔[2]

۱۴ مارچ کو مسٹر بھٹو نے کراچی کے ایک جلسہ میں مطالبہ کیا کہ اگر کسی آئینی مفاہمت سے

---

[1] جنرل فرمان علی یادداشتیں، اردو ڈائجسٹ مئی ۱۹۷۸ء

[2] روزنامہ "مشرق" لاہور، ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء، بحوالہ ہفت روزہ آئین۔ اشاعت خصوصی مارشل لاء کے تیرہ سال مرتبہ جمیل احمد رانا۔

قبل اقتدار منتقل کرنا ہے تو پھر مشرقی پاکستان میں اقتدار عوامی لیگ کو اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو سونپ دیا جائے[1]۔ اسی روز اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان نے منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے، اسمبلی کا اجلاس بلانے اور پاکستان کی حفاظت کرنے کے عزم کی قرارداد منظور کی۔

ادھر مشرقی پاکستان کی شاہراہوں، اسٹیشنوں، قصبوں اور شہروں پر قاتلوں اور غنڈوں کا راج تھا۔ غیر بنگالی مسلمانوں کا لہو دریاؤں کا پانی سرخ کر رہا تھا۔ مقتل سجے ہوتے تھے۔ اور انسانوں کو محاورۃً نہیں فی الحقیقت سڑکوں پر لٹا لٹا کر ذبح کیا جا رہا تھا۔ لندن کے معروف اخبار سنڈے ٹائمز (۲ مئی ۱۹۷۱ء) میں اس کے نمائندۂ خصوصی نے اپنے دورۂ مشرقی پاکستان کا بڑا رقت آمیز رپورتاژ لکھا:

"مکتی باہنی کے غنڈوں نے چٹاگانگ میں ایسٹ پاکستان رائفلز کے ایک افسر کی کھال ادھیڑ کر قتل کر دیا۔ پھر اس کے دو معصوم بچوں کے سر کاٹ ڈالے ان دونوں کٹے ہوئے سروں کو ان کی منقولہ ماں کی عریاں لاش پر ڈال دیا۔ بہت سی غیر بنگالی مقتولہ کنواری لڑکیوں کے جسموں (Wombs) میں سے بنگلہ دیش کے پرچم نکالے گئے۔ جنہیں مکتی باہنی کے وحشیوں نے ان کے جسموں میں ٹھونس ٹھونس کر قتل کر دیا تھا۔"[2]

اس قتل عام میں مظلوم بہاری ماؤں کو اپنے بچوں کا لہو پلایا گیا۔ قتل سے پہلے ان افراد کے اپنے ہاتھوں سے قبریں کھدوائی گئیں۔ سراج گنج شہر میں چار سو عورتوں اور بچوں کو ایک بڑے ہال میں بند کر کے پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ ان مظلوموں میں صرف مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے مسلمان ہی نہ تھے، بلکہ وہ لاکھوں دوسرے مسلمان بھی تھے جو تقسیم ملک کے وقت ہندوستان سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہو گئے تھے اور ان کا کوئی گھر مشرقی پاکستان کے سوا نہ تھا۔ ستم یہ ہے کہ ان غیر بنگالی مسلمانوں کو قتل کرنے اور ان کی

---

[1] روزنامہ "مساوات" لاہور ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء

[2] "From East Pakistan to Bangladesh" p.10. —

عورتوں کو بے آبرو کرنے اور ان کے مال لوٹنے میں بنگالی نسل پرستوں اور سوشلسٹ "مسلمانوں" کے دوش بدوش ہندو بھی شریک تھے۔ شاید ہی کہیں دنیا میں ایسی صورت پیش آئی ہو کہ کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں نے مسلمانوں کو مارا ہو اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی ہو لیکن بنگالی قوم پرست اور سوشلسٹ لوگوں نے جن کے نام مسلمانوں کے سے تھے یہ کارنامہ بھی انجام دے دیا[1] ۵ ارمارچ کو جنرل یحییٰ خان کڑے حفاظتی انتظامات میں ڈھاکہ پہنچا تاکہ اس آگ کو بجھانے کا راستہ نکل سکے۔ جس کے بھڑکانے میں خود اس کا ہاتھ تھا۔ یحییٰ مجیب مذاکرات کے دوران بھٹو نے ٹیلی فون پر یحییٰ خان سے بالواسطہ طور پر رابطہ قائم رکھا۔ ۲۱ مارچ کو یحییٰ خان کی طلبی پر مسٹر بھٹو اپنے رفقاء کے ہمراہ ڈھاکے پہنچے۔ جہاں جنرل جہانزیب ارباب نے انہیں اپنی حفاظت میں قیام گاہ تک پہنچا دیا[2]

شام کو مسٹر بھٹو نے ایوان صدر پہنچ کر صدر یحییٰ خان سے دو گھنٹے تک تنہائی میں بات چیت کی۔

یحییٰ مجیب بھٹو مذاکرات کے ان ایام میں صدر کے اقتصادی مشیر اور معروف قادیانی ایم ایم احمد بھی ڈھاکہ میں موجود رہے۔ سیاسی حلقوں نے ان کی سیاسی مذاکرات کے موقع پر موجودگی کو معنی خیز قرار دیا۔ خان عبدالولی خان نے اس موقع پر انکشاف کیا کہ "ڈھاکہ میں ہونے والے سیاسی مذاکرات میں زیادہ اہمیت اقتدار کی تقسیم کے سوال کو دی جا رہی ہے اور آئینی مسائل کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے" جب کہ ایک واقف راز حلقہ درون خانہ کا کہنا ہے کہ ڈھاکہ میں مذاکرات کے دوران ہی یحییٰ خان اور بھٹو کے درمیان "آرمی ایکشن" پر اتفاق رائے ہو گیا تھا[3] اور جنرل ٹکا خان کو اس خون ریز اندھے آرمی ایکشن کی کمان سونپی گئی۔ تفصیلات جاننے کے بعد ۲۵ر کی شام یکایک صدر یحییٰ خان ڈھاکہ سے کراچی پہنچے اور اسی شب آرمی ایکشن کا آغاز

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی "ترجمان القرآن" جون ۱۹۷۱ء

[2] جنرل ٹکا خان انٹرویو۔ روزنامہ "جنگ" ۲۲ جولائی ۱۹۸۳ء

[3] صدیق سالک۔۔ ایضاً۔۔ ص ۷۵

کردیا گیا۔ یحییٰ خان کی پراسرار روانگی کے فوراً بعد مسٹر بھٹو نے تجاہل سے کام لیتے ہوئے مجیب کو فون کیا کہ "میں مذاکرات کے لئے تمہارے گھر آرہا ہوں"۔ اس پر مجیب نے جواب دیا "کس سے مذاکرات ہوں گے؟ تمہارا باپ (یحییٰ خان) تو یہاں سے جاچکا ہے"۔[1] ۲۶ مارچ کو مسٹر بھٹو نے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل ڈھاکہ سے فوج کی حفاظت میں ایئرپورٹ پر قدم رکھے، اور انہوں نے شیخ مجیب کو غدار، عوامی لیگ کو خلاف قانون قرار دیئے جانے اور مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے کہا:[2]

"خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا"۔

"قدم" بڑھتا ہے

آرمی ایکشن کا آغاز شیخ مجیب الرحمان کی گرفتاری سے کیا گیا جب کہ عوامی لیگ کے دوسرے رہنما بھارت فرار ہو گئے۔ میدان صاف پاکر مسٹر بھٹو نے کہا کہ پاکستان کے اس بحران کو صرف منتخب نمائندے ہی حل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یکم اپریل کو صدر یحییٰ خان سے سوا چھ گھنٹے طویل ملاقات کی جس میں اقتدار پیپلز پارٹی کے حوالے کر دیئے پر اصرار کیا چنانچہ ۲۳ مئی کو ایک بیان میں انہوں نے کہا کہ اس وقت ملک میں دو قوتیں ہیں۔ ایک پیپلز پارٹی اور دوسری مسلح افواج پاکستان کے مفاد کی خاطر ان دونوں کو آپس میں سمجھوتہ کر لینا چاہیئے[3] ۳۰ مئی اور ۴ جون کو وہ پھر یحییٰ خان سے ملے اس کے بعد مسٹر بھٹو ایران کے دورے پر چلے گئے اور شہنشاہ ایران سے ملاقات کی۔ ———— انہوں نے پھر یحییٰ خان سے ملاقات کی۔ روزنامہ "مساوات" کے مطابق یہ ملاقات صبح دس بجے سے دوپہر دو بجکر ۲۵ منٹ...

---

[1] جنرل ٹکا خان، انٹرویو "جنگ" لاہور ۲۲ جولائی ۸۳ء بعد میں جنرل یحییٰ خان نے اعتراف کیا کہ "مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کی تجویز مجھے مسٹر بھٹو نے دی تھی، مگر اس تجویز سے دوسرے لیڈروں کو اتفاق نہیں تھا"۔ (انٹرویو "آتش فشاں" لاہور دسمبر ۱۹۷۸ء)

[2] روزنامہ "مساوات" اور روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء

[3] روزنامہ "امروز" لاہور ۲۴ مئی ۱۹۷۱ء

تک جاری رہی"۔

۲۹ر جولائی ۲۵ر اگست، ۱۳ر ستمبر اور صدر یحییٰ خان کے سہ روزہ دورۂ ایران سے واپسی پر ۱۸ر ستمبر کو مسٹر بھٹو نے ان سے پھر ملاقات کی۔ الغرض ادھر اقتدار ہتھیانے کے لئے جوڑ توڑ ہو رہا تھا اور ادھر مکتی باہنی، بھارتی فوج (بلا اعلان جنگ برسرپیکار تھی) اور بھارتی جاسوس تنظیم "را" کے خفیہ ایجنٹ (جو مشرقی پاکستان کے اعصابی مراکز اور دفاتر میں موجود تھے)[1] پاکستان کے لئے دردسر بنے ہوئے تھے۔ بنگالی فوجیوں کی بغاوت و فرار کے بعد اب مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجی جوان ہی برسرعمل تھے، مگر وہ چونکہ بنگلہ زبان سے نابلد تھے اس لئے ان کی مشکلات کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔

مکتی باہنی

بھارت نے اگرچہ خفیہ طور پر ۱۹۶۸ء ہی سے مشرقی پاکستان میں تخریبی سرگرمیوں کے لئے اپنے ایجنٹوں کو اسلحہ کی فراہمی اور ان کے لئے تربیتی پروگرام شروع کر رکھا تھا، لیکن ۱۹۷۰ء کے اختتام اور ۱۹۷۱ء کے اوائل میں تو کھلم کھلا یہ سلسلہ شروع کر دیا گیا، جسے عملی صورت دینے کے لئے مکتی باہنی یعنی نام نہاد "سپاہ آزادی" (Liberation Force) تشکیل دی۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں ایسٹ پاکستان رائفلز (EPR) اور ایسٹ بنگال رجمنٹ (EBR) کے باغی افسر اور سپاہی، پولیس، انصار فورس، عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کے رضاکار مکتی باہنی میں شامل ہو گئے جس کی قیادت بظاہر ریٹائرڈ کرنل ایم۔ اے عثمانی کر رہے تھے، لیکن امر واقعہ کیا تھا؟ وہ مکتی باہنی کے ہی ایک فرد سے سنیئے!

" ہم ابتداہی سے فوجی تربیت اور اسلحہ کے لئے بھارتی افواج کی سپلائی کے محتاج تھے۔ حکومت ہند کی جانب سے بھارتی افواج کے کچھ اعلیٰ افسران کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ہم سے گہرا ربط و تعلق رکھیں۔ یہ افسران بریگیڈیئر کے منصب پر فائز تھے جن کی براہِ راست کمان

1 — Ashoka Rina "Inside RAW" p.52

بھارتی مشرقی کمانڈ کے ہاتھ میں تھی مکتی باہنی کے تمام انتظامی اور حملہ آوری کے منصوبے انہی کے ہاتھ میں تھے۔ مکتی باہنی کی تمام جنگی پالیسیاں اعلیٰ درجے کی نشستوں میں طے ہوتی تھیں جن میں مکتی باہنی کے ہیڈکوارٹر کے لوگ اور بھارتی مشرقی کمانڈ کے اعلیٰ حکام شامل ہوتے تھے۔[1]

یہی نہیں بلکہ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے مکتی باہنی کی عملی رہنمائی کے لئے بھارت کے دوسرے ملکوں میں موجود اعلیٰ سطحی جاسوسی ادارے "را" (RAW) نے بھی بے پناہ کام کیا اور مسلسل خفیہ رپورٹیں فراہم کر کے پاکستان کے وجود پر ضرب کاری لگانے میں انہیں عملی مدد دی۔

مکتی باہنی کے لئے حسب ذیل اہداف مرتب کئے گئے تھے:

پہلے، سارے مشرقی پاکستان میں پھیل کر پاک فوج سے جھڑپیں کرنا تاکہ اس کی نقل و حرکت معطل ہو جائے اور وہ اپنے علاقوں میں محصور ہو کر رہ جائے۔

پھر: گوریلا کارروائیاں تیز کر کے پاکستان کی دفاعی افواج کا حوصلہ پست کر دیا جائے

آخر کار، جب پاکستان اس سے تنگ آ کر بھارت سے کھلی جنگ کے لئے مجبور ہو جائے تو مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے پھیلے ہوئے ایجنٹ بھارت کی باقاعدہ "مشرقی فیلڈ فورس" کا کام دے سکیں۔[2]

انہی ترجیحات کو سامنے رکھ کر بھارتی جرنیلوں نے مکتی باہنی کو تربیت دینا شروع کی تھی نتیجۃً پہلے مرحلے میں ستر ہزار افراد کو گوریلا جنگ کی تربیت دے کر مشرقی پاکستان میں آثار دیا گیا۔[3]

البدر نے مکتی باہنی کے بارے میں جو تفصیلات جمع کیں ان کے مطابق اس فورس کے دو مرکزی اور چھ ذیلی گروپ تھے جنہیں ہر پولیس سٹیشن (تھانے) کی سطح پر اس طرح منظم کیا گیا تھا۔

---

1 Rafiqul Islam "A Tale of Millions" p.198

2 Prain Chopra "Indian's Second Liberation" p.155.

3 صدیق سالک ــــــ ایضاً ــــــ ص ۱۰۷

۱۔ مکتی باہنی (سابقہ فوجی/پولیس/ایسٹ پاکستان رائفلز/ہندوستانی افواج کے ریگولر ایجنٹ) (۲) مجیب باہنی (عوامی لیگی، بنگالی ہندو، کمیونسٹ) ۔ (الف) جاسوسی گروپ (ب) سبوتاژ گروپ (ج) آرمڈ گروپ (د) افواہ ساز گروپ۔

عوامی رابطے میں زیادہ فعال گروپ مجیب باہنی تھا لیکن مکتی باہنی کو شہرت زیادہ ملی۔ بقیہ چار گروپ ان کے لئے مشترکہ خدمات انجام دیتے رہے۔

علاوہ ازیں مکتی باہنی کی دو ادر ذیلی برانچیں تھیں:

۱۔ خواتین آزادی گروپ (۲) سائنٹیفک گروپ۔

اوّل الذکر گروپ نوجوان لڑکیوں پر مشتمل تھا جس میں زیادہ تر ہندو طالبات تھیں۔ انہوں نے رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کیا تھا۔ عوامی لیگ کی حامی ان خوبرو لڑکیوں کا کام، مکتی باہنی کی سبوتاژ سرگرمیوں کو آسان بنانے کے لئے تنصیبات پر پہرہ داروں کو چند لمحوں کے لئے غافل کرنے کی خاطر ہر ہتھکنڈا استعمال کرنے کی تربیت دی گئی تھی زمانہ قدیم سے لے کر جدید جنگوں تک طوائفیت (Prostitution) کو ایک فوجی ہتھیار جیسی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ لڑکیاں اہم افراد سے لے کر تیسرے درجے تک کے افراد کی رفاقت میں "رضاکارانہ" وقت گزارنے کے بہانے راز اگلوانے اور غفلت کا شکار کرنے کی کوششیں کرتی تھیں۔[2]

جب کہ سائنٹیفک گروپ میں سائنس کے طالب علم بھارتی سرحد کے قریب خفیہ مقام پر بھارتی انتہاپسند ہندو تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ (RSS) کے کارکنوں کی رفاقت میں ایسی تباہ کن

---

[1] گویا کہ مکتی باہنی دراصل مجیب باہنی اور مکتی باہنی دونوں کے اشتراک کا نام ہے۔

[2] میاں طفیل محمد نے جولائی ۷۱ء کو دورۂ مشرقی پاکستان سے واپسی پر ایک انٹرویو میں بتایا کہ "بھارت نے مشرقی پاکستان میں اخلاقی حملے (Moral Attack) کے لئے بیس ہزار دوشیزاؤں کو تیار کیا ہے جن میں سے اب تک دو ہزار کو مشرقی پاکستان بھیجا جا چکا ہے" (ہفت روزہ "زندگی" لاہور ۲ اگست ۱۹۷۱ء)

دستی چیزیں تیار کرتے جو تباہی پھیلا کر ماحول کو دہشت زدہ کرتیں۔

گویا کہ مکتی باہنی محض "سیاسی" کارکنوں یا "ناراض بنگالی" مزدور تنظیموں کا نام نہ تھا بلکہ بھارتی حکومت کی سرپرستی، بھارتی افواج کی عملی رفاقت، پاکستان کی مسلح باغی بنگال فورس کے تعاون[1]، روسی یا چینی کیمونسٹ پارٹی کے زیرِ اثر گوریلوں کی یکسوئی، اکھنڈ بھارت کے حامی انتہا پسند ہندوؤں، بنگلہ قوم پرست اشتراکی طلبہ و مزدور تنظیموں کے کارکنوں پر مشتمل ایک مربوط نظام کا نام مکتی باہنی تھا۔ جسے تازہ دم بھارتی مسلح افواج کی چھتری اور جدید ترین روسی و مغربی ہتھیاروں کی سپلائی میسر تھی۔

امن وامان : اقدامات

فوجی ایکشن کے بعد افواج پاکستان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ روپوش علیحدگی پسندوں، مداخلت کاروں اور وطن دشمن عناصر کو تلاش کر کے امن و امان بحال کیا جائے۔ ابتداً فوج نے تمام بنگالیوں پر عدم اعتماد کی پالیسی اختیار کی، لیکن محب وطن سیاسی رہنماؤں نے ملٹری حکام پر یہ واضح کیا کہ "اگر یہ پالیسی اختیار کئے رکھی تو نتائج تباہ کن ہوں گے"۔ ہر بنگالی پر عدم اعتماد ملک کی وحدت کو پارہ پارہ کر دے گا۔ حکام کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور انہوں نے ایک جانب امن کمیٹیاں قائم کیں اور دوسری جانب اس کے ساتھ ساتھ محب وطن الخیال بنگالی نوجوانوں کو نیم عسکری تنظیم "رضا کار فورس" میں منظم کیا۔

---

[1] ۱۹۷۱ء کے واقعات پر ایک اہم باغی افسر (رفیق الاسلام) اے فرسٹ ایسٹ پاکستان رائفلز) نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "مشرقی پاکستان میں مختلف سیکٹروں پر پاکستانی فوج کے جن باغی افسروں نے مکتی باہنی کی رہنمائی یا کمان کی، ان میں (بعد ازاں ترقی پانے والے) ۲ لیفٹیننٹ جنرل، ۸ میجر جنرل، ۹ بریگیڈیئر، ۲۰ کرنل، ۴۴ لیفٹیننٹ کرنل، ۷۶ میجر، ۴۲ کیپٹن اور ۱۱ لیفٹیننٹ شامل تھے۔" (Rafiqul Islam opcit. Annexure: 4)

امن کمیٹیاں

امن کمیٹیوں میں محب وطن پارٹیوں کے ارکان شامل تھے ان کے ذمہ دو کام تھے۔ عوام میں اعتماد کی فضا بحال کرنا اور بھارتی مداخلت کاروں اور علیحدگی پسندوں کو بے نقاب کرنا ان کمیٹیوں کا بحیثیت مجموعی تعاون اور جذبہ قابل قدر تھا۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان کمیٹیوں میں اس طرح کے لوگ بھی شامل ہوگئے تھے جنہوں نے آرمی ایکشن سے قبل اپنے گھروں پر بنگلہ دیش کے جھنڈے تک لہرائے۔ گویا امن کمیٹیوں میں اگر ایک جانب محب وطن اور راسخ العقیدہ (Committed) افراد شامل تھے تو دوسری جانب مفاد پرست اور منفی فکر و نظر رکھنے والے عناصر بھی شریک ہو گئے تھے۔ موخر الذکر عناصر نے مفرور ہندوؤں کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے اور روپے پیسے کے عوض مداخلت کاروں کو تحفظ دینے کا دھندا شروع کیا۔ اگرچہ اس نوعیت کی بے اعتدالیاں بعض مقامات پر ہی سرزد ہوئیں۔[1]

رضا کار فورس

رضا کار فورس پولیس کے تعاون سے امن قائم کرنے، مداخلت کاروں کا مقابلہ کرنے اہم تنصیبات اور پلوں کی حفاظت کرنے پر مامور تھی۔ ان کو ماہانہ الاؤنس بھی ملتا تھا۔ ابتداء میں اسلامی جمعیت طلبہ نے اپنے مشرقی پاکستانی کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ رضا کار فورس میں شامل ہو کر عملی تعاون کریں۔ مگر امن کمیٹیوں کی طرح اس تنظیم میں بھی مختلف الخیال گروہوں اور منفی سوچ کے حامل افراد کے سبب خرابیاں در آئیں۔ رضا کار فورس میں جہاں ایک طرف خوف خدا کے ساتھ قربانی پیش کرنے والے جانثار تھے، وہیں پر اردو بولنے والے شہداء کے کچھ پسماندگان کا انتقامی جذبہ اور دیگر مفاد پرست بنگالی عناصر کا غیر صحت مندانہ رویہ

---

[1] انٹرویو ٹکا خان اردو ڈائجسٹ اگست ۱۹۷۱ء ص ۲۳

افسوس ناک صورت حال پیدا کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ چند ہی ہفتوں بعد یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اس فورس کے بعض افراد دشمن کو پاک افواج کی نقل و حرکت سے باخبر رکھنے کے لئے جاسوسی تک کر رہے ہیں [1] اور بعد میں تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ "مکتی باہنی" نے "رضا کار فورس" میں اپنے بہت سے آدمی داخل کر دیئے تھے جو باغیوں کے ہیڈ کوارٹر کو قیمتی معلومات فراہم کرتے تھے [2] دراصل اس کردار کے حامل لوگوں کا اس تنظیم میں شامل ہو جانے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ سیاسی گروہوں نے جن کے لیڈر زیادہ اور کارکن برائے نام تھے۔ اپنی "افرادی قوت" ظاہر کرنے کے لئے اِدھر اُدھر سے بلا تحقیق افراد کو رضا کاروں میں شامل کرا دیا تھا اور یہی وہ لوگ ہوتے جو وقت آنے پر دشمن کا ساتھ دیتے۔

یہ صورت حال اسلامی جمعیت طلبہ کے محب وطن کارکنوں کے لئے سخت کرب ناک تھی کہ ان کی جانب سے نظم و ضبط اور احساس ذمہ داری و نزاکتوں کو ملحوظ رکھنے کے باوجود "رضا کار فورس" میں کالی بھیڑوں کی سرگرمیوں کے باعث خود ان کی حب الوطنی اور خلوص و دیانت پر حرف آرہا تھا۔ چنانچہ مئی ۱۹۷۱ء کے وسط میں جمعیت کے قائدین نے مطالبہ کیا کہ ہمارے کارکنوں کو الگ سے منظم کیا جائے تاکہ دوسروں کی غلطیوں سے بچ کر سالمیت پاکستان کی جدوجہد میں وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ حصہ لے سکیں [3]

دباؤ

۱۱ جون ۱۹۷۱ء کو امریکی سینٹ میں برسراقتدار پارٹی اور حزب مخالف نے ایک مشترکہ قرارداد پیش کی جو منظور کر لی گئی کہ پاکستان کو دی جانے والی ہر قسم کی مالی و فوجی امداد بند کر دی جائے جب تک کہ وہ بھارت میں پناہ لینے والے مہاجروں کو واپس قبول نہیں

---

[1] صدیق سالک ——— ایضاً ——— ص ۱۶۱

2. Rafiq-ul-Islam 'op cit' p. 228.

[3] ۱۲ مئی کو البدر کا قیام عمل میں آیا۔ تفصیلات اگلے باب میں ملاحظہ ہوں۔

کرلیتا۔ اسی ماہ کے آخری عشرے میں عالمی بنک کے کنسورشیم نے بھی اپنی بنیادوں پر پاکستان کی امداد بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔ جب کہ دوسری جانب ۹ راگست ۱۹۷۱ء کو روس نے بھارت کے ساتھ ایک جنگی معاہدہ کر کے پاکستان کے خلاف اس کے عزائم کو شہ دی۔

امریکہ، روس اور بھارت کے دباؤ میں آکر ۵ ستمبر کو صدر یحییٰ خان نے ان تمام افراد کو معافی دینے کا اعلان کر دیا جنہوں نے مشرقی پاکستان میں یکم مارچ سے ۵ ستمبر تک کے عرصہ میں جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ صدر کے بیان میں کہا گیا تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "توقع ہے کہ مشرقی پاکستان کے سیاسی ہنگاموں کی گرما گرمی میں جن لوگوں سے جرائم سرزد ہو گئے تھے اور جو خوف کی وجہ سے ملک سے باہر چلے گئے تھے یا روپوش ہو گئے تھے، عام معافی کے اس اعلان کے بعد سامنے آجائیں گے اور اپنا روزمرہ کا کام شروع کر دیں گے" بیان میں یہ وضاحت بھی کی گئی تھی کہ "اس اعلان کا اطلاق مسلح افواج کے بنگالی جوانوں افسروں اور ایسٹ پاکستان رائفلز پر بھی ہوگا۔"

۲۲ اکتوبر کو مسٹر بھٹو دس روزہ نجی دورے پر بیرون ملک روانہ ہوئے۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ "وہ عوام کے لئے اپنی انفرادی حیثیت میں ملک سے باہر جا رہے ہیں اور وہ عوام کے سوا کسی کی نمائندگی نہیں کر رہے"[1] یہاں یہ بات واضح رہنے کہ حکومت کی جانب سے پاکستانی باشندوں کے غیر ملکی نجی دورے پر پابندی عائد تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے وائس چیئرمین میاں محمود علی قصوری نے اس موقع پر بتایا کہ مسٹر بھٹو "خصوصی مشن" پر باہر گئے ہیں۔ مسٹر بھٹو کی جنیوا میں موجودگی کے دوران بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی آمد محض "حسن اتفاق" ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ برصغیر کی موجودہ کشیدہ صورتِ حال کے بارے میں بھی بات چیت کریں۔"[2]

۵ نومبر کو مسٹر بھٹو کو "اعلیٰ سطح کے سیاسی اور فوجی وفد" کے قائد کی حیثیت سے چین روانہ

---

[1] روزنامہ "مساوات" لاہور ۲۴ راکتوبر ۱۹۷۱ء

[2] روزنامہ "جنگ" کراچی۔ ۲۳ راکتوبر ۱۹۷۱ء

کیا گیا - وفد میں ان کے ہمراہ ایئر مارشل رحیم خان، پاکستان فوج کے چیف آف سٹاف جنرل گل حسن اور پاک بحریہ کے چیف آف سٹاف ریئر ایڈمرل اے رشید بھی شامل تھے (اول الذکر دو حضرات مے آگے چل کر مسٹر بھٹو کو اقتدار دلانے میں فعال حصہ لیا اور ان تینوں حضرات رحیم خان، گل حسن اور بھٹو) کے درمیان "باہمی سمجھوتہ" کی بات اسی دورۂ چین کے دوران ہوئی تھی۔ مسٹر بھٹو کی اس اعلیٰ سطحی وفد کی قیادت کے لیئے نامزدگی بھی اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ "۱۹۷۱ء کی جنگ سے قبل اور جنگ کے دوران جنرل یحییٰ خان نے پاکستان کی خارجہ اور داخلہ پالیسی کی تشکیل نو کی ذمہ داری مسٹر بھٹو اور ان کی جماعت پیپلز پارٹی کو سونپ رکھی تھی۔"[1] حکومت چین نے اس وفد پر بغیر کسی لاگ لپیٹ کے واضح کیا کہ "روس بھارت جنگی معاہدہ" کی موجودگی میں اس کے لیئے پاکستان کی کسی قسم کی ٹھوس فوجی امداد کرنا ممکن نہیں۔ ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی سمجھوتہ کرنے کی کوششوں پر تمام توجہ مرکوز کر دی جائے، لیکن مسٹر بھٹو نے واپس آکر جو کچھ کہا وہ قوم کو کھلا چکمہ دینے کے مترادف تھا۔ انہوں نے ریگل چوک لاہور میں ۱۰ نومبر کو تقریر کرتے ہوئے کہا: "اندرا سن لو میں پیکنگ سے واپس آگیا ہوں۔ خبردار اگر تم نے میرے ملک پر جارحیت کی۔ تم کبھی روم، کبھی پیرس، کبھی لندن اور کبھی واشنگٹن جاتی ہو، لیکن ہمیں نہ لندن جانے کی ضرورت ہے، نہ ہم کسی اور ملک جانا چاہتے ہیں۔ میں پیکنگ سے ہو آیا ہوں اور ہمارے لیئے یہ کافی ہے"[2]۔ مسٹر بھٹو نے قوم کو خود فریبی اور خوش فہمی کا شکار بنانے کے لیئے پورے مغربی پاکستان کا ایک سپیشل ٹرین پر دورہ کیا، ہر جگہ ایسی ہی تقریریں کیں اور قوم کو باور کرایا کہ "پاکستان اور بھارت کے درمیان کھلی جنگ کا کوئی امکان نہیں ہے"۔ جب بھارت نے دیکھا کہ پاکستانی فوج کے جوان اور عوام مسٹر بھٹو کے ساحرانہ بیانات سے اچھی طرح مسحور ہو چکے ہیں تو اس نے ۲۲ نومبر کو مشرقی پاکستان پر کھلا حملہ کر دیا اور اس سے ٹھیک اگلے روز مسٹر بھٹو نے اعلان کیا کہ "حکومت کی ذمہ داریاں

1- Lawrence Ziring " op cit" p 230

[2] روزنامہ "مساوات" لاہور ۱۱ نومبر ۱۹۷۱ء

ہمارے حوالے کرنے کا وقت آپہنچا ہے"[1] چنانچہ انہوں نے فوری طور پر مولانا مفتی محمودؒ اور خان عبدالولی خان سے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں وزارت سازی کے لئے جوڑ توڑ کا آغاز کر دیا۔ اس ضمن میں وہ یکم دسمبر کو ولی خان سے اور ۲ دسمبر کو مفتی محمودؒ سے ملے۔

مشرقی پاکستان، فوجی کیفیت

مشرقی بازو، مغربی پاکستان سے ۱۶۰۰ کلومیٹر دور تھا اور تین اطراف سے بھارتی سرحدوں سے جڑا ہوا تھا جب کہ چوتھی جانب خلیج بنگال تھی۔ بھارت نے مشرقی پاکستان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لینے کا فوجی عمل شروع کیا۔

آرمی ایکشن کے وقت مشرقی پاکستان میں متعین فوج صرف ۱۴ ڈویژن تھی۔ ۲۶ اپریل تک مغربی پاکستان سے مزید نفری پہنچی جس میں دو ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز، پانچ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر، ایک کمانڈو بٹالین اور بارہ انفنٹری بٹالین شامل تھیں۔ یہ سب اپنے بھاری ہتھیار توپیں وغیرہ مغربی پاکستان چھوڑ آئے تھے، کیونکہ انہیں شرپسندوں ہی کی سرکوبی کرنا تھی کہ باقاعدہ جنگ لڑنا تھی۔[2]

مشرقی پاکستان میں متعین فوج کی صورت حال یہ تھی کہ وہ لگاتار آٹھ ماہ سے بھارتی اور سرکش بنگالی تخریب کاروں سے نبرد آزما تھی۔ اس عرصہ میں اسے سستانے کا بھی کبھی موقع نہ ملا۔ فوج کی صف بندی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ تازہ کمک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پاکستان کے اندر اور پاکستان سے باہر پاک افواج پراپیگنڈے کا ہدف تھیں جن میں بعض ناکردہ گناہوں کے الزام بھی شامل تھے۔[3]

ہلکے ہتھیاروں سے مسلح صرف تین انفنٹری ڈویژن مشرقی پاکستان میں مقیم تھے، ان کے پاس نہ تو ضرورت کے مطابق بھاری اسلحہ تھا اور نہ کور تھا۔ پاکستان کی یہ فوج نامکمل آلاتِ حرب

[1] روزنامہ "مساوات" ۲۳ نومبر ۱۹۷۱ء

[2] صدیق سالک ——— ایضاً ——— ص ۹۶

[3] فضل مقیم ——— ایضاً ——— ص ۲۱۸

محدود سازد سامان اور تھوڑے سے تجربے کے باوجود جذبے اور بلند حوصلے کی مالک تھی۔ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجی اپنی فوج سے الگ ہو کر بھارت کا رُخ کر رہے تھے۔ اگرچہ ایسے افراد کی تعداد کل فوج کا بیس فی صد تھی لیکن یہ علیٰحدگی پاک فوج کی کارکردگی پر بُری طرح اثرانداز ہوئی۔ فوج کے مشرقی پاکستانی اعلیٰ افسر، جنگی کارروائیوں، منصوبوں خفیہ مراکز اور رازوں سے واقف تھے جو اس زمانے میں پوری طرح بھارتی افواج تک پہنچ گئے۔[1]

یاد رہے کہ پاک فوج کے پاس دوسری جنگ عظیم کے فرسودہ پی ٹی ۷۶ اور ایم ۲۴ قسم کے چند ٹینکوں کے سوا کوئی ٹینک نہ تھا۔ یہ ٹینک بھی بلڈوزر سے گھسیٹے جاتے تھے۔

مشرقی پاکستان میں پاک فضائیہ کے پاس کل بارہ ایف ۸۶، طیارے تھے۔ جن میں سے ایک خراب تھا، بھارتی فضائیہ نے بلا روک ٹوک بقیہ طیاروں کو چند روز بعد ہوائی اڈے پر ہی تباہ کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اینٹی ائیر کرافٹ رجمنٹ نے بھارتی فضائیہ کے تیس طیارے (ناٹ اور مگ ۲۱) مار گرائے جو ایک ریکارڈ ہے۔[2]

ہماری بحریہ ایک ریئر ایڈمرل صاحب اور چار مسلح جنگی کشتیوں پر مشتمل تھی جو اسمگلنگ کی روک تھام کے لئے پندرہ برس قبل خریدی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں سترہ کشتیاں حاصل کی تھیں جن میں سے بعض پر ۷ء۱۲ ملی میٹر کی مشین گنیں اور بعض پر ۵۰ ایم ایم کی براؤننگ مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کشتیاں صرف شرپسندوں کا تعاقب کر سکتی تھیں۔ بحری جنگی جہازوں یا آبدوزوں کا کسی طور مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔[3] پاک بحریہ ۵، دسمبر تک دم توڑ چکی تھی۔ ہماری اس دفاعی پونجی میں ۳۷، ہزار البدر، رضاکار، اسکاؤٹوں وغیرہ پر مشتمل عسکری ٹیم موجود تھی۔

---

[1] ایضاً ———— ص ۲۱۲، ۲۱۳

[2] بریگیڈیئر باقر صدیقی روزنامہ "جنگ" ۲۸ ستمبر ۱۹۸۳ء

[3] بریگیڈیئر صدیق سالک ——— ایضاً ——— ص ۱۳۳۔ ۱۳۴

پاکستان کے خلاف اعلان جنگ [1]

طویل عرصے تک مشرقی پاکستان میں مداخلت کرنے اور پھر ۲۲ نومبر کو مشرقی پاکستان پر کھلے حملے کے بعد ۳ دسمبر کو بھارت نے مغربی پاکستان کی سرحدوں پر بھی حملہ کر دیا اور بیک وقت سیالکوٹ، چھمب، لاہور اور رحیم یار خان کے محاذ کھول دیئے۔

۵ دسمبر کو سلامتی کونسل میں روس نے اس قرارداد کو ویٹو کر دیا جس میں بھارت اور پاکستان سے جنگ بند کر کے اپنی فوجوں کو اپنی سرحدوں تک ہٹا لینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ۶ دسمبر کو دوسری مرتبہ پھر روس نے اس مضمون کی اٹلی، جاپان اور دوسرے سات ممالک کی قرارداد کو ویٹو کر دیا۔ جنرل اسمبلی میں البتہ یہ قرارداد ۱۱ کے مقابلے میں ۱۰۴ ووٹوں سے منظور ہو گئی۔ لیکن بھارت نے اعلان کر دیا کہ "وہ پاکستان سے جنگ بند کرنے اور فوجوں کی واپسی کے لئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی اپیل کو منظور نہیں کرتا اور نہ اسے قابل توجہ سمجھتا ہے۔"

۷ دسمبر کو یحییٰ خان نے مسٹر بھٹو کو پاکستان کا نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ نامزد کرنے کا اعلان کیا اور اگلے روز وہ اس حیثیت میں اقوام متحدہ کے اندر پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے نیویارک روانہ ہو جاتے ہیں ادھر پاکستان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے اور ہر آنے والے لمحہ میں صورت حال مخدوش تر ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن جناب بھٹو رکتے رکاتے نیویارک کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ ۹ دسمبر کو وہ تہران ٹھہرتے ہیں۔ ۱۰ دسمبر کو فرینکفرٹ میں کچھ دیر کے لئے سستاتے ہیں۔ اسی رات نیویارک پہنچ جاتے ہیں، نزلے کے باعث اقوام متحدہ

---

[1] ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ پر تفصیلی مطالعہ کے لئے بریگیڈیئر صدیق سالک کی کتاب "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" اور جنرل فضل مقیم خان کی کتاب "پاکستان کا المیہ" ملاحظہ ہو۔ جب کہ سقوط مشرقی پاکستان پر خوبصورت "تاثراتی مجموعے" "چہرے" اور "لمحے" ہیں۔ جنہیں مسعود مفتی، آخری سیکرٹری وزارت تعلیم مشرقی پاکستان نے تحریر کیا۔ مجموعی صورت حال پر ڈاکٹر صفدر محمود کی کتاب "PAKISTAN DIVIDED" ایک مؤثر کاوش ہے۔

کے اعلیٰ مندوبین سے بات چیت کا پروگرام ملتوی کر دیتے ہیں۔ البتہ ایران کی شہزادی اشرف پہلوی کے عشائیہ میں ضرور شریک ہوتے ہیں۔ اسی روز خبر آتی ہے کہ مشرقی پاکستان میں بھارت نے وسیع پیمانے پر چھاتہ بردار فوج اتار دی ہے لیکن مسٹر بھٹو کی طبیعت "ناساز" ہے اس لئے وہ ۱۳ دسمبر کو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھان سے ملاقات موخر کر دیتے ہیں۔ البتہ ۱۲ دسمبر کو جب وہ سلامتی کونسل سے خطاب کرتے ہیں تو پوری طرح فارم میں ہیں انھوں نے گرجدار آواز میں اعلان کیا کہ "ہم لڑیں گے، ہزار سال لڑیں گے۔ اگر ڈھاکہ میں بھارت کا قبضہ ہو جاتا ہے تو کیا ہے۔ جنگ میں شکست بھی ہو جائے تو ملک تباہ نہیں ہو جاتا"۔[1] اگلے روز اپنی درخواست پر بلائے گئے سلامتی کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "آخر میں یہاں وقت کیوں ضائع کروں، میں اپنے وطن جاؤں گا اور جنگ لڑوں گا۔ مشرقی پاکستان پر بھارت کا قبضہ ہو جانے دو۔ لڑنا پڑا تو ہم ایک ہزار سال تک لڑیں گے"۔ تقریر ختم کرتے ہی جناب بھٹو نے اجلاس کا ایجنڈا پھاڑ دیا[2] اور اپنے وفد کے ساتھ اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔[3]

اور اس کے ساتھ ہی ۱۶ دسمبر کو بھارتی فوجیں ڈھاکہ شہر میں داخل ہو گئیں!

جہاں اسی روز سوا نو بجے صبح ریس کورس گراؤنڈ میں لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے بھارتی لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ——— اور پاکستان ٹوٹ گیا۔[4]

---

[1] روزنامہ "مساوات" لاہور ۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء

[2] بعض معتبر حلقوں کے مطابق یہ اجلاس کا ایجنڈا نہیں بلکہ پولینڈ کی جانب سے جنگ بندی کیلئے پیش کی گئی قرارداد تھی جسے اشتراکی ملک ہونے کے ناطے روس کی تائید بھی حاصل تھی۔

[3] روزنامہ "مساوات" لاہور ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء

[4] "جمہوریت کی بحالی" اور "استحصال کے خاتمے" کے نعرے بلند کر کے بنگلہ دیش تو بنوا لیا گیا لیکن خود عوامی لیگ اور شیخ مجیب نے وہاں بدترین آمریت قائم کی، ایک جماعتی نظام نافذ کیا، تمام اخبارات (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بند کر کے ایک سرکاری اخبار جاری کیا گیا۔ طالب علموں، مزدوروں اور کسانوں پر اندھادھند فائرنگ کرانا حکومتوں کا معمول بن گیا۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ چھوڑ کر باقی تمام عرصہ مارشل لا ہی نافذ رہا اور کبھی جمہوریت بحال نہ ہوئی، البتہ اب سرحد و پنجاب کے جرنیلوں کے بجائے خود بنگال کے جرنیل حکمران بنے تو زیادہ جابر ثابت ہوتے۔ اقتدار پر قابض طبقے وہی رہے، یعنی بیوروکریسی، فوج اور چند نعرہ باز سیکولر سیاستدان۔ مصدقہ اعداد و شمار کی روشنی میں شہری بدترین معاشی استحصال کا شکار ہیں۔ عوام کی حالت متحدہ پاکستان کی نسبت کہیں زیادہ دگرگوں ہے۔ خارجہ اور دفاعی اور معاشی پالیسی بری طرح ہندوستان کے تابع ہے۔ اب وہاں ہندو کو شدید ترین نفرت کا سامنا ہے۔ مگر عوام بے بس ہیں۔

البدر: تعارف

جنوری ۱۹۷۱ء سے رفتہ رفتہ عوامی لیگ و پیپلز پارٹی اور بر سرِ اقتدار مارشل لاء حکومت کے درمیان اقتدار کی کشمکش عروج کو پہنچی اور ملکی اتحاد کی بنیادیں ہل گئیں۔ ملک آہستہ آہستہ خانہ جنگی کے دھانے پر پہنچ گیا۔ مشرقی پاکستان میں ایک مخصوص طبقے کی جانب سے بغاوت کے آثار، حقیقت کا روپ دھارنے لگے آخر کار یکم مارچ سے غیر بنگالیوں اور فعال محبِ وطن بنگالیوں کا قتل عام شروع ہوا انتظامیہ معطل ہو گئی یا بیشتر جگہوں پر تخریب کاروں سے مل گئی۔ شر پسند پوری طرح فضا پر چھا گئے۔ مارشل لاء شل ہو گیا۔ اس بارودی فضا میں سیاسی حل تلاش کرنے کے بجائے حکومت حماقتوں پر، پیپلز پارٹی شرارتوں پر اور عوامی لیگ بغاوت پر تل گئی۔

پالیسی اعلان

اس افسوس ناک صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے اسلامی جمعیت طلبہ (اسلامی چھاترو شنگھو) مشرقی پاکستان نے ڈھاکہ میں صوبائی مجلسِ شوریٰ اور ناظمین اضلاع کا اجلاس ۱۰ مارچ ۱۹۷۱ء کو طلب کیا جس میں صوبے کی عمومی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد تین ممکنہ راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر غور ہوا کہ اس وقت صرف یہ تین ہی راستے تھے۔

۱۔ حالات کے رخ پر بہتے ہوئے کھل کر علیحدگی پسندوں کا ساتھ دیا جائے ــــــ یا

۲۔ حالات کو اپنے رخ پر بہنے دیا جائے اور غیر جانبدار رہا جائے ــــــ یا

۳۔ حالات کا رخ موڑنے، پاکستان کی سالمیت اور مظلوم عوام کے تحفظ کے لیے میدان عمل

میں اتر کر اپنی ذمہ داری کو ادا کیا جائے۔

ان تینوں تجویزوں پر بڑی طویل بحث ہوئی۔ صوبائی شوریٰ کے رکن مصطفیٰ شوکت عمران رشید نے دلائل کے ضمن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تقاریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ قائد تحریک نے ۱۹۶۵ء میں فرمایا تھا۔

"ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سرزمین ہمارا نہیں بلکہ اسلام کا گھر ہے۔ ہمیں صدیوں کے بعد پھر موقع ملا ہے کہ خدا کے دین کو اس کی اصلی صورت میں قائم کریں اور دنیا کے سامنے اس کی صداقت کی عملی شہادت پیش کریں۔ ہمارے لیے یہ سب سے بڑی نعمت ہے اور ہم ہر قیمت پر اس کی حفاظت کے لیے تیار ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کے ہر مسلمان میں اس نعمت کی قدر کا جذبہ پیدا کریں اور اس کے قلب و روح میں یہ خیال جاگزیں کردیں کہ اس نعمت کی حفاظت میں کوئی قربانی بھی گراں نہیں ہے۔ یاد رکھیے خدا اور اس کے دین کی خاطر جان دینے کا مرتبہ اپنے گھر بار اپنے مال اور دولت کی خاطر جان دینے سے بدرجہا زیادہ بلند ہے اور اس جذبہ کے ساتھ جو شہادت میسر ہو وہ بہت اونچے درجے کی شہادت ہے۔"

—— اور جب بھارت نے ستمبر ۶۵ء میں پاکستان پر کھلی جارحیت کی تو مولانا نے فرمایا:

"پاکستان کا ہر مسلمان اس ملک کو، جو اس برعظیم میں اسلام کا قلعہ ہے اور اس کی پوری زمین ہمارے لیے ایک مسجد کا حکم رکھتی ہے، بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائے۔" مجوز نے تجویز دیتے ہوئے کہا:

" اس پس منظر میں۔ باوجودیکہ پاکستان کے حکمران طبقے نے اپنی غلط پالیسیوں اور انتہا پسند سیاسی پارٹیوں نے منافرت کو ہوا دے کر علیحدگی کی فضا پیدا کردی ہے، ہمیں اس خطہ پاکستان کا تحفظ کرنا ہے بالکل اسی طرح جس طرح مسجد کا تحفظ کیا جاتا ہے!!"

ایک دوسرے رکن شوریٰ نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے یہ دلیل دی کہ مغربی پاکستان سے برسراقتدار قیادت نے پہلے بھی اور آج بھی اپنے تئیں مشرقی پاکستان کو الگ کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اس لئے ملک کے توڑنے اور بچانے کی کم از کم ذمہ داری

ملک کی سیاسی، فوجی، انتظامی مشینری پر آتی ہے۔ ہمیں اس حالت میں غیر جانبدار رہنا چاہیئے"

اس ہنگامہ خیز اجلاس میں کسی ایک ممبر نے بھی علیحدگی پسند تحریک کا ساتھ دینے کی تجویز پیش نہیں کی۔ گویا متحدہ پاکستان کے بارے میں تمام شرکائے اجلاس یک سو تھے۔ آخر کار چار دن کی بحث و تمحیص کے بعد جمعیت کے اس اہم اجلاس نے فیصلہ کیا:

"اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان، سالمیت پاکستان اور شہریوں کے جان و مال اور آبرو کے تحفظ کے لیے آگے بڑھے گی۔ مشرقی پاکستان کے شہری دو طاقتوں کے درمیان پس رہے ہیں جن میں ایک جانب دشمن گماشتے، انتہا پسند ہندو ایجنٹ اور خونی انقلاب کے علمبردار کمیونسٹ ہیں جو ملک کی آزادی کو پارہ پارہ کر کے اسے ہندوستان کا زیر نگیں بنانا چاہتے ہیں۔ جبکہ دوسری جانب پاکستان کی سول اور فوجی انتظامیہ میں شامل کچھ متعصم کے غلط عناصر بھی ہیں۔ ان دونوں طبقوں کے خلاف بیک وقت سرگرم عمل ہونے کے لیے ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم ایک جانب اسلامی جذبے کے ساتھ دشمن کی طاقت سے میدان عمل میں ٹکر لیں اور دوسری جانب طاقت کے قریب پہنچ کر اس کی اصلاح کرنے کی اپنی سی کوشش کریں۔ ہمارا یہ فیصلہ پاکستان کے بے گناہ شہریوں کی جان و آبرو بچانے کا فیصلہ ہے۔"

اس فیصلے کے اعلان کے لیے ۱۴ مارچ کو جامع مسجد ڈھاکہ یونیورسٹی میں کارکنوں کا اجتماع ہوا۔ ڈھاکہ جمعیت کے ناظم سید شاہ جمال چودھری (شہید) نے بڑی دردمندی اور پُر زور دلائل کی تمہید کے ساتھ پالیسی کا اعلان کیا۔ جس سے خطرات میں پھنسے ہوئے جمعیت کے کارکن یک سو ہو گئے۔

ملحے جمعیت کے اجلاس نے قومی اسمبلی کا فوری اجلاس طلب کرنے اور منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے کی قرارداد بھی منظور کی جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے (روزنامہ "اتفاق" ڈھاکہ ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء)

جمعیت کے اس فیصلے[1] کو پورے مشرقی پاکستان کے طول و عرض میں پہنچانا بڑا کٹھن مسئلہ تھا۔ ڈاک کا نظام درہم برہم تھا، فون کا ذریعہ مہنگا ہی نہیں غیر محفوظ بھی تھا۔ تحریری سرکلر جاری کرنا ایسے حالات میں گویا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے طے پایا کہ صوبائی شوریٰ کے چار ارکان مختلف اضلاع کے دورے پر نکلیں اور کارکنوں کو مذکورہ فیصلہ پہنچانے کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی دیں کہ وہ :

"عوامی نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی کا مطالبہ کریں۔ جہاں تک بس چلے عوام کو ظلم و تشدد سے بچانے کا اہتمام کریں۔ حالات کو پُر امن بنانے کے لیے اپنا ممکنہ اثر و رسوخ استعمال کریں۔ ..... اپنی دینی اور پاکستانی ذمہ داریوں سے آگاہ رہیں اور ہر قسم کی انتہائی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہیں۔"

پندرہ اور سولہ مارچ کی درمیانی شب چاروں ارکان اس مہم پر نکلے اور ہفتہ بھر میں پورے مشرقی پاکستان کے مرکزی مقامات کا دورہ مکمل کیا۔ ہر جگہ اجتماعات کارکنان میں فی امان اللہ کہا، ان اجتماعات کا اختتام بڑا رقت آمیز ہوتا۔ اللہ سے گڑگڑا کر اسلام اور پاکستان کی سلامتی کی دعائیں مانگی جاتیں۔ اور ان دعاؤں کے ساتھ ساتھی ایک دوسرے سے ایسے جدا ہوتے، جیسے پھر اس دنیا میں شاید کبھی نہ مل سکیں گے۔

البدر کی تاسیس

امن کمیٹیوں اور "رضاکار فورس" کے بعض جگہوں پر ناخوشگوار تجربات سے جمعیت کے محبِ وطن اور بے لوث نوجوان بہت پریشان تھے۔ چنانچہ ۱۵ مئی ۱۹۷۱ء کے اجلاس منعقدہ ڈھاکہ میں جمعیت کی صوبائی مجلسِ شوریٰ نے جمعیت کے کارکنوں پر مشتمل

---

[1] یہ فیصلہ بڑا جرأت مندانہ اقدام تھا، خصوصاً ایسی صورتِ حال میں جب کہ عمامے کھل چکے تھے، تحریکِ پاکستان کی کئی "یادگاریں" بنگلہ دیشی قومیت کی چوکھٹ پر سرنگوں ہو چکی تھیں، چاروں طرف دھوئیں اور لہو کی فضا میں یہ اعلان کرنا کہ "ہم اسکے ساجھی نہیں" عزیمت کی تابندہ روایت تھی۔

ایک الگ رضاکار فورس کے قیام کی تجویز پیش کی مگر پاکستان کی ایسٹرن کمانڈ نے اس تجویز کو لال فیتے کا شکار بنا دیا۔ لیکن پاک فوج میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جو ان کمیٹیوں اور رضاکار فورس کی کارکردگی کے پیش نظر اپنی جگہ متبادل صورتوں پر غور کر رہے تھے۔ ۳۱۔بلوچ رجمنٹ کے جواں سال میجر ریاض حسین ملک انہی میں ایک تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی اس سمت میں مثبت قدم اٹھایا۔ ڈیڑھ ماہ تک میدان جنگ میں عملاً سرگرم کار رہ کر انہیں یقین ہو چکا تھا کہ اب زیادہ دیر تک "رضاکار" پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں البدر کی تاسیس کا پس منظر ان الفاظ میں بیان کیا۔

"دشمن تعداد میں بہت زیادہ تھا۔ تخریبی عناصر بھی کچھ کم نہ تھے۔ ہمارے ذرائع معلومات نہ ہونے کے برابر اور ذرائع مواصلات غیر مربوط تھے۔ ہمارے جوان بنگلہ زبان اور بنگال کی طبعی فضا سے قطعی ناواقف تھے کیونکہ ہماری تربیت کے دوران کبھی اس صورت کے امکان پر سوچا بھی نہ گیا تھا۔ ان حالات میں دفاع وطن کا فریضہ انجام دینا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ ہمیں ایک مخلص، قابلِ اعتماد اور محب وطن بنگالی گروہ کی ضرورت تھی جو سالمیتِ پاکستان کے لیے ہمارے شانہ بشانہ کام کر سکتا ہو۔ ابتدائی ڈیڑھ ماہ میں ہمارا رضاکار فورس کا تجربہ ناکام ہو چکا تھا۔ تاہم میں نے یہ دیکھا کہ میرے علاقے (اسیکٹر) میں اسلامی جمعیت طلبہ کے بنگالی طلبہ بڑے اخلاص کے ساتھ دفاع، رہنمائی اور حفظِ راز کی ذمہ داری ادا کر رہے تھے۔ اس لیے میں نے ہائی کمان سے کوئی باقاعدہ اجازت لیے بغیر قدرے جھجکتے ہوئے ان طلبہ کو الگ کیا۔ یہ تعداد میں ۴۷ تھے اور سب اسلامی چھاترو شنگھو (اسلامی جمعیت طلبہ) کے کارکن تھے۔ ۱۶ مئی ۱۹۷۱ء کو شیر پور (ضلع میمن سنگھ[1]) کے مقام پر انہیں مختصر فوجی تربیت دینے کا آغاز کیا گیا۔

ان کارکنان کی لگن محنت اور تکنیک کو سمجھنے میں کمال ذہانت کو دیکھ کر میں نے ۲۱ مئی ۱۹۷۱ء کی صبح ان سے خطاب کیا۔ تقریر کے دوران بے ساختہ

---

[1] "میمن سنگھ" اور "مومن شاہی" ایک ہی جگہ ہے۔

میرے منہ سے یہ بات نکلی کہ آپ جیسے سیرت و کردار اور مجاہدانہ جذبہ رکھنے والے فرزندانِ اسلام کو "البدر" کے نام سے پکارا جانا چاہیئے تب فوراً ہی ذہن میں برق کی مانند یہ خیال کوندا کہ کیوں نہ اس تنظیم کو "البدر" کا نام دے دیا جائے۔ چنانچہ یہ نام اور جمعیت کے کارکنوں کی الگ تنظیم کا یہ تجربہ اس قدر کامیاب ہوا کہ دو تین ماہ کے اندر اندر پورے مشرقی پاکستان میں اسی نام سے، جمعیت سے وابستہ نوجوانوں کو منظم کر لیا گیا۔ البدر کے پہلے کمانڈر کا نام کامران تھا اور وہ اس وقت انٹر سائنس کے طالب علم تھے۔[2]"

البدر پروگرام

البدر فورس کا پانچ نکاتی پروگرام یہ تھا:

۱۔ پاکستانی عوام میں اعتماد بحال کرنے کے لیے عوام سے وسیع رابطہ رکھنا۔ دیہاتوں اور دور دراز علاقوں میں پہنچنا، اجتماعات اور جلسوں کا انعقاد کرنا، دشمن کے منفی پروپیگنڈے کو زائل کرنا۔ حالات کو پرسکون بنانا اور عوام کو اندرونی و بیرونی زیادتیوں کی مدافعت پر ابھارنا۔

۲۔ بنگالی و غیر بنگالی کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کو پاٹنا، مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان اخوت و محبت کے جذبات پروان چڑھانے کے لیے عملی و فکری اقدامات کرنا۔

۳۔ پاکستان دشمن عناصر، تخریب کاروں اور ہندوستانی مداخلت کاروں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے کے لیے معتبر اطلاعات کا نظام قائم کرنا۔

۴۔ دفاعِ پاکستان اور سالمیت پاکستان کے لیے عسکری نقل و حرکت میں پاک

---

[1] اس کتاب میں سردست "البدر" کے بارے میں معلومات فراہم کی جا رہی ہیں جبکہ "الشمس" کے بارے میں ذکر شامل نہیں ہے۔

[2] میجر ریاض حسین سے مولف کا انٹرویو ۱۰ جون ۱۹۸۵ء (کوہاٹ چھاؤنی)

فوج اور سول انتظامیہ کے ساتھ مثبت عملی تعاون کرنا۔ نظم و نسق کی بحالی اور تنصیبات کے تحفظ کے لیے محب وطن طلبہ کو منظم کرنا اور عسکری تربیت دلوانا۔

۵۔ سرکاری و نیم سرکاری ملازمتوں میں موجود ملک دشمن عناصر کے بارے میں مکمل چھان بین کے بعد سول و فوجی انتظامیہ کو مصدقہ معلومات بہم پہنچانا۔[1]

بعد ازاں ستمبر ۱۹۷۱ء کے اختتام تک مشرقی کمان نے البدر کو تقریباً پورے مشرقی پاکستان میں منظم کر دیا۔

عسکری تربیت

پاک فوج کی جانب سے البدر کو عسکری تربیت دی جاتی تھی۔ یہ ٹریننگ سات سے بارہ روز کی ہوتی تھی۔ تربیت کے دوران خودکار ہلکا اسلحہ استعمال کرنے، اُسے کھولنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے، بارودی سرنگوں کو ناکارہ بنانے اور وائرلیس پیغام سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جاتی۔

میدان عمل میں حسب ذیل مختلف ہتھیاروں کی تربیت البدر کے مختلف مجاہدوں کو مختلف جگہوں پر دی جاتی تھی۔

بارہ بور گن، تھری ناٹ تھری، لائٹ مارٹر گن (Light Morter Gun) طیارہ شکن توپ (Anti Aircraft Gun) اسٹین گن، دستی بم (Hand Grenade) بارودی سرنگیں (Mines) جنگی کشتیاں (Gun Boats) ریوالور اور مکتی باہنی سے چھینا ہوا روسی و ہندوستانی اسلحہ۔[2]

اس سلسلے میں عملی صورت حال یہ تھی کہ:

---

[1] مجلہ "ہم قدم" کراچی اکتوبر ۱۹۷۱ء

[2] "محور" پنجاب یونیورسٹی میگزین

"(ان) رضاکاروں کو جدید اسلحہ سے لیس نہیں کیا گیا تھا کیونکہ ہمارے پاس ہتھیاروں کی کمی تھی، یہاں تک کہ ہمیں سول آرمڈ فورسز کے لیے بھی ٹھیک طرح اسلحہ سپلائی نہ ہوا تھا۔ بعض رضاکاروں کو تو ہم نے بہ امر مجبوری بارہ بور کی شارٹ گنیں دیں۔ جو ناشیا۔ ہمارے پاس تھیں وہ یا تو مطلوبہ تعداد میں نہ تھیں یا فرسودہ ہو چکی تھیں۔ دشمن کے تمام یونٹ حتیٰ کہ پولیس اور مکتی باہنی کے پاس بھی جدید ہتھیار اور نئی ٹرانسپورٹ تھی"[1]

فکری تربیت

البدر کا تعلق چونکہ ایک اسلامی نظریاتی تنظیم سے تھا، اس لیے جمعیت کی قیادت نے البدر کیڈٹوں کی فکری و نظریاتی تربیت جاری رکھنے کا بطور خاص اہتمام کیا۔ اس ضمن میں تربیتی پروگرام یہ تھا۔

روزانہ درس قرآن ، درس حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ، شب بیداریاں ، مجالس ذکر، ایک روزہ تربیتی کیمپ ، فلسفہ جہاد (گروپ میٹنگ) فکر آخرت (گروپ میٹنگ) باہمی احتساب ، دعا وغیرہ۔

یہ پروگرام اس قدر توازن کے ساتھ ہوتے کہ البدر مجاہدوں کی اگر رات جہاد بالسیف میں گزرتی تو ان کے دن کا بیشتر حصہ فکری تربیت حاصل کرنے میں صرف ہوتا یا پھر دن بھر میدان جنگ کے تھکے ماندے یہ مجاہد اپنی راتیں تہجد اور خدا کے حضور گریہ وزاری میں گزارتے یہی وہ کردار تھا جس نے پاک فوج کے کئی آفیسرز اور جوانوں کو اسلام کے عملی تقاضوں کی جانب متوجہ کیا، اور ان کے سر آج بھی البدر کا نام سنتے ہی عقیدت سے جھک[2] جاتے ہیں۔

---

[1] جنرل نیازی "قومی ڈائجسٹ" جولائی ۱۹۷۸ء ص۵۷

[2] مگر "ملازمت" اور "سیاست" کی مجبوریوں کے باعث وہ البدر کے بارے میں کھل کر کچھ لکھنے سے ہچکچاتے ہیں۔

تقسیم کار

وسیع تر دفاع کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے البدر کے ہر یونٹ کو تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا:

۱۔ شعبہ امور رابطہ عوام "Civil Affairs Department"

۲۔ شعبہ امور دفاع Defence Affairs Department

۳۔ شعبہ امور اطلاعات " Information & Intelligence Department"

پہلا شعبہ

اس کی ذمہ داری مشرقی پاکستان کی رائے عامہ کو متحدہ پاکستان کے لیے ہموار کرنا تھا۔ کیونکہ عوام مسلسل افواہوں، BBC، ریڈیو ماسکو اور آل انڈیا ریڈیو کی خبروں سے سخت بد دلی کا شکار تھے۔ اس غلط پروپیگنڈے کا جواب دینا، حقائق سے آگاہ کرنا، جلسہ ہائے عام کا انعقاد کرنا، اسکولوں اور کالجوں میں طلبہ و اساتذہ کو تحفظ دینا اس شعبے کے ذمے تھا۔

دوسرا شعبہ

اس کی ذمہ داری مختلف دستوں کی صورت میں قومی املاک کی حفاظت، دشمن سے عملاً پنجہ آزمائی اور جارحیت کو روکنا تھی۔ البدر اس سلسلے میں ضلعی سطح پر فوج کی ہدایت یا اجازت سے کارروائی کرتے تھے۔

تیسرا شعبہ

اندرون ملک شر پسندوں کی ملک دشمن کارروائیوں سے متعلق صحیح اطلاعات بہم پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا تھا جس کے ذریعے پاکستانی فوج اور البدر ڈیفنس فورس دشمن کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں کا اندازہ لگا کر منصوبہ سازی کرتے تھے۔

علاوہ ازیں البدر کی الگ میڈیکل یونٹ بھی تھی جو میڈیکل کالجز کے کارکنوں پر مشتمل تھی۔ اس میں سابقین جمعیت ڈاکٹرز شامل تھے[1]

---

[1] یادگاری مجلہ "البدر" کراچی، اکتوبر ۱۹۷۲ء

تنظیمی ڈھانچہ

البدر کا تنظیمی ڈھانچہ اس طرح تھا :

۱۔ یونٹ ۳۱۳ کیڈٹس

۱۔ یونٹ = تین کمپنیاں . . . . اور ہر کمپنی میں ۱۰۴ مجاہد

۱۔ کمپنی = تین پلاٹون . . . . . اور ہر پلاٹون میں ۳۲ غازی

۱۔ پلاٹون = تین سیکشن ٹروپس . . . اور ہر ٹروپ ۱۱ البدر پر مشتمل تھا[1]

ہر یونٹ کا ایک کمانڈر اور دو سیکنڈ کمانڈر ہوتے تھے۔ تنظیم ضلع کی سطح پر ہوتی تھی جبکہ صوبائی سطح پر کوئی کمانڈر نہ تھا البتہ جمعیت کی صوبائی مجلس شوریٰ تمام امور پر نظر رکھتی تھی مقامی سطح پر قیادت کے چناؤ کا یہ دوٹوک اصول طے تھا کہ اس کے کمانڈر تقویٰ، عمل، دیانت اور راہ حق میں استقامت پر اپنے تمام ساتھیوں سے بہتر ہوں۔

الاؤنس

پاک فوج کی جانب سے البدر کو باقاعدہ تنخواہ دینے کی پیشکش کی گئی جسے جمعیت کی مجلس شوریٰ نے قبول نہ کیا اور کہا کہ یہ رقوم "دفاعی فنڈ" میں دے دی جائیں۔ فوج کی جانب سے مسلسل اصرار رہا کہ ضابطے کے مطابق یہ الاؤنس آپ کو قبول کرنا ہوگا۔ اس پر جمعیت کی قیادت نے فیصلہ کیا کہ انفرادی طور پر کوئی فرد یہ الاؤنس نہیں لے گا بلکہ یہ رقوم ہر مقام پر البدر کے اکاؤنٹ میں جمع کی جائیں گی۔ یاد رہے کہ یہ الاؤنس صرف ۹۰ روپے ماہانہ فی کس تھا۔ البتہ دوران جنگ البدر کے کارکنوں نے آمد و رفت اور خوراک کی سہولتوں سے استفادہ کیا[2]

---

[1] یادگاری مجلہ "البدر" کراچی اکتوبر ۱۹۷۲ء

[2] روزنامہ "جنگ" لاہور جمعہ میگزین ۹ دسمبر ۱۹۸۳ء۔ د۔ ہم قدم اکتوبر ۱۹۷۱ء

حلف نامہ البدر

البدر کا ہر مجاہد تربیت کی تکمیل کے بعد اپنے ساتھیوں کے روبرو حسب ذیل حلف نامہ پڑھتا[1] :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ

میں ۔ ۔ ۔ ۔ خدائے بزرگ و برتر کو حاضر ناظر جان کر اعلان کرتا ہوں کہ :

پاکستان کی سالمیت پر آنچ نہ آنے دوں گا۔

پُر امن شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کروں گا۔

اسلام اور پاکستان کے لیے ہر سطح پر جیتے جی جنگ جاری رکھوں گا۔

اور اپنی جان و مال کو اس مقصد کے لیے وقف کر دوں گا۔

اللہ میرا حامی و ناصر ہو ——— آمین :

البدر مجاہدوں کا اجتماعی حلف نامہ یہ ہوتا تھا ———

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین

خدا کو حاضر ناظر جان کر اقرار کرتے ہیں کہ ہم البدر کے رضا کار :

- سیاسی مخالفت یا خاندانی رنجش کی بنا پر کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔
- کسی فرد کے خلاف محض عوامی لیگ کا حامی یا ہندو ہونے کی بنا پر تادیبی کارروائی نہیں کرینگے۔ تا آنکہ پوری تحقیق کے بعد غداروں کی اعانت کرنے یا براہ راست ملکی مفاد کو نقصان پہنچانا ثابت نہ ہو جائے
- متحدہ پاکستان کے لیے پُر امن جمہوری ماحول کی تیاری اور عام زندگی کے معمولات کی

---

[1] مجلہ "ہم قدم" کراچی اکتوبر ۱۹۷۱ء

بحالی کے لیے تمام مثبت اقدامات کریں گے۔

ذرائع مواصلات کو درہم برہم کرنے کے لیے پُلوں کو تباہ کرنے والوں، لوٹ مار ، قتل وغارت اور عصمت وناموس پر حملہ کے مرتکب افراد کے خلاف جدوجہد کریں گے۔

خدا ہمارا حامی وناصر ہو۔ آمین !

ایک آپریشن گروپ سے خطاب

چٹاگانگ سے پندرہ میل دور نواکھالی کے مقام پر ہندوؤں کے ایک مضبوط سنٹر کی اطلاع ملی یہ سنٹر باغیوں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں پر چٹاگانگ کے البدر کا پہلا آپریشن گروپ روانہ ہونے لگا تو اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم ضلع اور البدر کے ضلعی کمانڈر نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

"میرے ساتھیو !

میں آپ کو دورِ اوّل کے مسلمانوں کی ہدایات یاد دلاتا ہوں اور ان پر عمل کی وصیت کرتا ہوں۔ آپ نے مہم کے دوران میں کسی بوڑھے یا کسی بچے پر ہاتھ نہیں اٹھانا، کسی عورت پر زیادتی یا تشدد نہیں کرنا، گھروں کو آگ نہیں لگانی اور کھیتوں کو اجاڑنا نہیں ہے۔ دشمن پر آپ اس وقت تک وار نہیں کریں گے۔ جب تک کہ وہ خود پہل نہیں کرتا۔ دشمن گڑبڑ کریں تو آپ کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ان کو گرفتار کریں اور اسلحہ پر قبضہ کرلیں اور اگر وہ پوری طرح جنگ پر اتر آئے تو پھر سختی کے ساتھ پیش آئیں۔ ان کو ختم کردیں یا خود مرتبہ شہادت پر فائز ہو جائیں۔ اگر آپ میں سے کوئی فرد خدانخواستہ پکڑا جائے تو وہ استقامت کا مظاہرہ کرے اور تشدد کا کوئی حربہ اس سے ملکی سالمیت کے بارے میں کوئی راز نہ اگلوا سکے۔

"خُدا آپ کا حامی وناصر ہو۔ !"

دعاؤں کے جلو میں یہ دستہ اپنے ہدف کو روانہ ہوا اور رات گئے مکمل کامیابی سے ہمکنار واپس لوٹا۔ روسی اور ہندوستانی خودکار اسلحہ مالِ غنیمت کی صورت میں ہاتھ آیا۔

ڈھاکہ

ڈھاکہ میں جمعیت کے قائدین نے میجر جنرل عبدالرحیم سے ملاقات کی۔ قانون کی بحالی،
ہندوستانی ایجنٹوں کی سرگرمیوں کے خاتمہ اور البدر کی تشکیل کے بارے میں ان سے بات چیت
ہوئی۔ جنرل رحیم نے جنرل راؤ فرمان علی خان سے ملاقات کے بعد "او۔کے" کر دیا اور لیفٹیننٹ
کرنل احسن اللہ کو البدر کی تشکیل کے سلسلے میں ابتدائی آرڈر بھیجنے کی ہدایت کی۔ بریگیڈیئر بشیر ڈھاکہ
شہر میں البدر کے انچارج مقرر ہوئے اور دھان منڈی میں ڈھاکہ البدر کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا گیا۔

ڈھاکہ میں تشکیل دی جانے والی البدر کی تین کمپنیوں کے نام یہ تھے۔

شہید عبدالمالکؒ کمپنی کمانڈر ابو محمد جہانگیرؒ (شہید)

شہید عزیزؒ بھٹی کمپنی ۔ کمانڈر عبدالحیؒ (شہید)

غازی صلاح الدین کمپنی ۔ کمانڈر محمد اشرف الزمان

چٹاگانگ

یہاں ۱۰ مئی ۱۹۷۱ کو لیفٹیننٹ کرنل اعظم اور آپریشن چیف کرنل فاطمی نے جمعیت کے
ذمہ داران سے مشاورت کی۔ اس سلسلہ کی ایک میٹنگ نیول ہیڈ کوارٹر میں اور دوسری چھاؤنی میں
ہوئی۔ اسلامی جمعیت طلبہ چٹاگانگ کے ناظم نے تعاون کے لئے شرط عائد کی اور کہا "اگر واقعتاً
آپ ہم سے تعاون چاہتے ہیں تو کوئی آپریشن مشورے کے بغیر نہیں ہوگا۔" اس بات کو اصولی طور
پر طے کر لیا گیا۔ چنانچہ جون کے وسط میں چٹاگانگ شہر میں سلطان ٹیپوؒ، خالد بن ولید، تطہیر الدین بابر،
اور طارق بن زیاد کے نام سے البدر کی چار کمپنیاں تشکیل دی گئیں جبکہ ضلع میں ۲۷ پلاٹونیں تھیں
یہاں پاک فوج کی ۲۰ فرنٹیئر فورس رجمنٹ تعینات تھی۔ اس رجمنٹ کے میجر جمال دار، کیپٹن پرویز طور
صوبیدار منور خان قابل رشک کردار کے حامل افسران تھے۔

چٹاگانگ شہر میں بازاروں کی حد تک آرمی کا عمل دخل تھا جبکہ رہائشی علاقوں کی حفاظت و
نگرانی البدر کی ذمہ داری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ چٹاگانگ کے علاقے میں سب سے کم قتل و
غارت کے واقعات ہوئے اور پورے مشرقی پاکستان کا یہ وہ علاقہ تھا جہاں پر عوام میں پاکستانی

احساسات سب سے زیادہ پائے جاتے تھے۔ چٹاگانگ سیکٹر میں البدر کا زیادہ تر کام فوج اور سول انتظامیہ کو انتظامی و دفاعی معاملات میں مدد دینا تھا۔ یہاں اکثر و بیشتر البدر کو فرنٹ لائن پر یا سپلائی لائن پر متعین رکھا گیا۔

اصلاحی اقدامات

البدر کو اپنے طور پر آرمی اور سول انتظامیہ کے ان اقدامات پر نظر رکھنا پڑتی تھی کہ جن سے عوام کو بے جا تکلیف پہنچ رہی ہو۔

البدر کے جن کمانڈروں سے ملاقاتیں ہوئیں انہوں نے بتایا کہ "پاک آرمی اپنے افعال و کردار میں عام تصور سے زیادہ اچھی ثابت ہوئی لیکن بعض مقامات پر اس نے اعتماد کو ٹھیس بھی پہنچائی۔ مختلف الفاظ میں پولیس کا مجموعی طور پر اور فوجی جوانوں کا رویہ جزوی طور پر قابل اصلاح تھا۔ یہ کمزور پہلو جن کی جانب خفیف سا اشارہ کیا گیا ہے اگر نہ ہوتے تو حالات کو سنبھالنے اور سنوارنے میں بڑی مدد ملتی"۔

البدر نے فوجی افسروں میں نماز کا ذوق پیدا کرنے کے لیے بھی کام کیا۔ جہاں اس کا موقع میسر آتا، وہ نماز کے اوقات میں دفاتر اور فوجی بارکوں میں جاتے اور ادھر ادھر کی مختصر گفتگو کے بعد کہتے "نماز کا وقت ہوگیا ہے پہلے آپ لوگ پڑھ لیں، ہم حفاظت کرتے ہیں، پھر ہم پڑھ لیں گے"۔ یہ حکمت موثر ثابت ہوئی اور رفتہ رفتہ مزید فوجی افسران نماز کی جانب راغب ہونے لگے۔ البدر کے جوان

ا۔ افسوس کہ پاکستان کی عمومی فضا اس پراپیگنڈہ سے متاثر ہوئی، جس کا ہدف پاکستان کی دشمن لابی نے پاک افواج کے جوانوں کو بنایا۔ اس طرح ذہنی مرعوبیت کا شکار ہو کر جوانوں کی عزیمت، استقلال اور بہادری کی پوری تاریخ ماضی کے غاروں میں دفن کر دی گئی۔ کاش! اس پہلو پر قومی پریس اور افواج کے تحقیقی ادارے کام کرتے ــــ جہاں تک پاک فوج سے منسوب بہت سے ناگفتنی واقعات و افسانوں کا تعلق ہے، اس ضمن میں امر واقعہ یہ ہے کہ بعض جگہوں پر اکا دکا واقعات ہوئے۔ علاوہ ازیں مشرقی پاکستان میں بڑے پیمانے پر آبروریزی، وحشیانہ قتل، اور لوٹ مار کے جو واقعات ہوئے، وہ بھارتی جاسوسوں اور پاکستانی فوج کی وردیوں میں ملبوس بھارتی فوجیوں نے کیے تاکہ پاکستان کے خلاف نفرت تیزی سے پھیلتی رہے، اس طرح ان ضلالتوں کی گرد بھی پاک فوج پر پڑگئی، جو درحقیقت دشمن کا گھٹیا جنگی منصوبہ تھا۔

گفت گو کے دوران قرآن مجید کی حسب موقع آیات کا برمحل استعمال کرتے قرآن کے یہ الہامی اور سرمدی بول انہیں متاثر کیے بغیر نہ رہتے۔ بیشتر فوجی افسروں کا نماز اور قرآن سے ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ جانے کے بعد عوام کی عمومی شکایات میں بھی کمی آتی چلی گئی۔

ایک اہم اطلاع

ستمبر کے وسط میں بھارتی فوج کا ایک پلان البدر کے انٹیلی جنس گروپ کو ملا جو فوراً ایسٹرن کمانڈ کو پہنچا دیا گیا۔ پلان یہ تھا کہ بھارتیوں اور پاک فوج کے بھگوڑوں کی ملی بھگت سے ایک لاکھ افراد کو فوجی تربیت دی جائے گی۔ انہیں اکتوبر کے اواخر میں مشرقی پاکستان میں داخل کر دیا جائے گا۔ ہر ضلعی صدر مقام پر پانچ پانچ ہزار، البتہ چٹاگانگ، کھلنا، راجشاہی میں دس دس ہزار اور ڈھاکہ شہر میں ۱۵ ہزار تربیت یافتہ گوریلے بھیجے جائیں گے، جو اس بات کا انتظار کریں گے کہ موسم برسات کے بعد نومبر کا اختتام ہوتے ہی بھارتی مسلح افواج باقاعدہ اعلان جنگ کر کے مشرقی پاکستان پر حملہ کریں۔ پاکستانی دفاعی افواج کے براہ راست مقابل بھارتی افواج ہوں گی جبکہ ان کی پشت پر سپلائی لائن کو تباہ کرنے کے لیے یہ تربیت یافتہ گوریلے مناسب وقت کا انتظار کریں گے تا آنکہ انہیں مختلف خفیہ مقامات پر بھارتی فضائیہ ہلکے ہتھیار چھاتہ بردار فوج کے ذریعے مہیا کر دے۔

یہ پلان ستمبر کے آخری ہفتے میں حکومت کے حوالے کر دیا گیا تھا، شاید وہاں اسے پوری طرح اعتماد کے قابل نہ سمجھا گیا۔ لیکن صرف ڈیڑھ ماہ بعد یہ ثابت ہو گیا کہ اطلاع بالکل درست تھی۔

بھنور

۱۹۷۱ء کا سال جمعیت (البدر) کے لیے انتہائی پر آشوب تھا۔ البدر کے ایک کمانڈر نے بتایا کہ ہم بدترین حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھیوں کو ایک جانب بھارتی شر پسندوں، دوسری جانب بنگالی قوم پرستوں، تیسری جانب مقامی کمیونسٹوں، چوتھی جانب ہندوؤں، پانچویں جانب کئی مقامات پر اپنی فوج اور چھٹی جانب اردو بولنے والوں کے تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کچھ اردو بولنے والے افراد میں بنگالیوں کے خلاف جو جوابی نفرت ابھری تھی اس کے نتیجے میں انہوں نے کئی جگہ بلا امتیاز بنگالیوں کو اپنا نشانہ بنایا۔ چونکہ البدر کے تمام مجاہد بنگالی تھے اس لیے وہ بھی ان کے جنونِ انتقام کا نشانہ بنتے رہے۔۔۔۔ اس ہمہ جہتی ابتلاء کے باوجود البدر کے پائے استقامت

میں لرزش پیدا نہ ہوئی ۔ محض اس لیے کہ البدر نے اسلام کے نام پر حاصل کردہ پاکستان اور اس ملک کے عوام کو بچانے کے لیے ہتھیار اٹھائے تھے ۔ اور وہ آخرت میں اس کے اجر کا یقین کامل رکھتے تھے !

آخری خطاب

۱۶ دسمبر تاریخ کا وہ الم ناک دن آن پہنچا جب ایک جانب ریس کورس میں ہتھیار ڈالنے کی تقریب کے انعقاد کا اہتمام ہو رہا تھا ۔ اور اس سے دو گھنٹے قبل ، ڈھاکہ شہر میں البدر کے ہیڈ کوارٹر پر "البدر" کے مجاہد یک ہاتھ وہ ہتھیار ڈالنے کے فیصلے پر سخت برہم اور چند گھنٹوں بعد ہونے والے المیئے سے سخت نالاں تھے ۔ البدر کے لیے سفر کا ایک نیا موڑ آگیا تھا ۔ انہیں آج جمع ہو کر بکھر جانا تھا ۔ متحدہ پاکستان کی یہ آخری آواز ، آہستہ آہستہ بلند ہوئی اور سسکیوں کے درمیان اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان کے ناظم بڑی خود اعتمادی سے البدر کے جوانوں کو خطاب کر رہے تھے ۔

" أشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمد عبده ورسوله

إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين ۔

" مجاہد ساتھیو !

ہمارے جسم و جان صرف اور صرف اسلام کے لیے ہیں ۔

ہم نے اسلام ہی کی خاطر وہ کردار ادا کیا ، جسے ہم خدا کی کتاب اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق درست جانتے تھے ۔

ہم نے پاکستان کو معبود سمجھ کر نہیں ، مسجد سمجھ کر اپنے سروں کی فصل اور اپنے مستقبل کو اس پر نچھاور کیا ہے ۔

ہمیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ دوسرے لوگ ہمارے اس کردار کو قبول کرتے ہیں یا نہیں ۔

جسے قبول کرنا ہے وہ اُٹھا تا ہی ہے کہ ہمارے سامنے اس کی مرضی تھی ۔

یہ خدا کی مرضی تھی کہ ہم سربکف نکل کھڑے ہوں ۔ آزمائش کی اس گھڑی میں ہم نے اسی سے مدد مانگی اور اسی کے بھروسے پر اس نازک گھڑی سے نمٹنے کی کوشش کی ۔

" اے مظلوم پاکستان کے مجبور بیٹو !

ہمارے ساتھ آج جو کچھ ہونے والا ہے، ہم گزرے ہوئے کل میں اُس سے واقف تھے اور آج ہم اُس سے بھی واقف ہیں جو آنے والا کل ہمارے لیے لے کر آئے گا۔

ہم نہ اپنے گزرے ہوئے دنوں پر شرمندہ ہیں اور نہ آنے والے کل سے مایوس ہیں۔

آزمائش خدا کی سنت ہے اور ہمیں سکھایا گیا ہے کہ آزمائش سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

لیکن جب وہ مسلط ہو جائے تو سرخروئی کی دعا اور کامرانی کی اُمید کے ساتھ خدا کے حضور جھک جانا چاہیے۔

آج کا سورج ایک کڑے امتحان کے ساتھ طلوع ہوا ہے اور آنے والا کل دہکتے انگاروں کی بارش کے ساتھ نمودار ہونے والا ہے۔

ہمیں اللہ کی رضا پر راضی رہنا ہے اور ان آزمائشوں سے ایک صاحبِ ایمان کے عزم اور صبر کے ساتھ گزرنا ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ اس راہ میں جان دے دینا وہ عظیم ترین سعادت ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

کیا اپنے رب سے اپنی جانوں کے عوض جنت کا سودا کرنے سے پہلے ہم نے خوب سوچ سمجھ نہیں لیا تھا؟

آزمائش کی یہ گھڑی اُس دنیا کی کامرانیوں کی بشارت بھی ہے۔ اس لیے ان کڑی ساعتوں کا سامنا ایمان، عزم اور استقلال کی دعا سے کیجئے کہ عزم اور ایمان کو کبھی فنا نہیں۔

"اے دنیا بھر کی سب کامرانیوں سے عزیز دوستو!

آپ آج بھی وقت کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

اقامتِ دین، شہادتِ حق اور اسلامی انقلاب کے لیے ان زندگیوں کی حفاظت آپ پر فرض ہے۔

اگر آپ کے گھروں کی دہلیزیں آپ کے لیے بند اور راحت کدوں کی وسعتیں آپ کے لیے تنگ کر دی جائیں تو ہجرت کر جائیے کہ ہجرت، وفا کے راستے کا لازمی سفر ہے۔ ہجرت خدا کے آخری رسولؐ کی سنت ہے۔

ہجرت کی کلفتوں میں قرآن، نماز اور سیرتِ رسولؐ و سیرتِ صحابہؓ سے روشنی حاصل کیجئے کہ زندگی

سا ظلمت کدہ انہی سے منور ہو سکتا ہے

——— اور مت بھولیے ، آپ ہی روشنی کے امانت دار ہیں ۔ قرآن و سیرت اور کردار روشنی ہے ، جہاں بھی رہیے اسی کے چراغ روشن کیجئے ۔

اے میرے بھائیو!

کسے معلوم کہ کل ہم میں سے کون زندہ رہے اور کون کس سے مل پائے ۔ وہاں تو ملاقات یقیناً ہوگی مگر اس دنیا میں بکھر جانے سے پہلے ان چہروں کو جی بھر کے دیکھ لو ، اور ان سینوں سے آخری بار معانقے کر لو کہ شاید یہ سب ایک بار پھر یہاں اس طرح جمع نہ ہو سکیں ۔

سوائے اس کے ، کہ ہمارا رب چاہے اور ؛

وہ چاہے تو ہم یہاں پھر بھی مل سکتے ہیں ۔

ساتھیو! دوستو! بھائیو!

اب ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہو جانا ہے ۔

اپنے حواس مجتمع کر لیجئے ۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو ——— آیئے ! ہم ایک دوسرے کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کریں ۔ فی امان اللہ ۔

خطاب[1] ختم ہونے پر البدر و الشمس کے مجاہد بھیگی پلکوں اور لرزتے ہونٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے ۔ یہ سب ساتھی اپنے خطاب کرنے والے قائد کو پہلے الوداع کہنے پر مُصر تھے ۔ مگر وہ ، اس بات پر چٹان کی طرح جم گیا ، کہ اس کیمپ سے میں آخری فرد ہوں گا ، جو آپ سب کے سرگرم سفر ہونے کے بعد جائے گا ——— اصرار بڑھا تو ناظم نے کہا ۔" دوستو! میں مجبوراً حکم دیتا ہوں ، کہ آپ بچھڑتوں پر چلے جایئے ۔" ——— اور تمام مجاہد ان دیکھی راہوں پر چل نکلے ———

سقوطِ ڈھاکہ اور البدر پر تشدد

" سقوط کے بعد مکتی باہنی ، ہندوستانی فوج ، اور کمیونسٹوں کے تشدد کا اولین ہدف جماعت اسلامی ، اسلامی جمعیت طلبہ ، اور جمعیت طلبہ عربیہ کے کارکنان بنے ۔ تشدد کے لیے

[1] اس یادگار تقریر کو وہاں پر موجود مؤلف البدر حرانوں نے روایت کیا ، اور تقریر کرنے والی شخصیت نے ان الفاظ کی تصدیق کی ۔

نوزائیدہ بنگلہ دیشی قوت نے سنگدلی کے وہ وہ حربے اختیار کیے کہ پتھر سے پتھر دل انسان بھی آنسوؤں کو ضبط نہیں رکھ سکتا۔ ان مظلوموں کا صرف ایک گناہ تھا کہ وہ ایک ایسی اسلامی ریاست کی تشکیل کے جرم میں کٹ کٹ کر گر رہے تھے جہاں مظلوم طاقتور ہوتا اور ظالم کمزور تر ہوتا۔ وہ چاہتے تھے کہ ۸ کروڑ مسلمانوں کا یہ وطن ہندوؤں کی مقبوضہ نو آبادی نہ بنے۔ ان کا یہی اقدام "جرم عظیم" ٹھہرا، اور اسلامی تحریک کے کارکنوں کی پیٹھوں نے کوڑے، سینوں نے سنگینیں اور گردنوں نے پھندے تو قبول کر لیے مگر "جے بنگلہ" کا نعرہ لگانے سے انکاری رہے، تب ان سخت جانوں کے سینوں پر گرم چاقوؤں سے "جے بنگلہ" کھدوا گیا... والدین کے سامنے ان کے بچے اور بیویوں کے سامنے ان کے شوہروں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا۔ ایسا بھی ہوا کہ امام مساجد کو ان کے مقتدیوں کے سامنے گولی مار کر شہید کر ڈالا گیا۔ اور مقتدی جان کے خوف سے دم بخود رہے۔[1]

ایک مغربی نامہ نگار لکھتا ہے:

"پانچ ہزار کے ایک بڑے مجمعے نے پاکستان کے حامی چار افراد کو ظالمانہ انداز سے قتل کیا۔ قتل سے پہلے پاؤں کی ٹھوکریں اور جوڈو کراٹے کی ضربیں مسلسل ان کے زیر ناف حصوں پر لگائی گئیں جس سے وہ بے سدھ ہو کر گر پڑے، تب رائفل کی سنگینیں ان کے دل سے آر پار کر دیں، یہ سارا کام بڑی مہارت سے کیا جا رہا تھا۔ اسی دوران ایک گوریلا جب اپنی سنگین سے لہو پونچھ رہا تھا اسوقت ایک بچہ بھاگتا ہوا آیا اور چیختا ہوا اپنی ماں کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔ پھر مکتی باہنی کے گوریلے نے اس بچے کو زور سے ٹھوکر ماری اور اگلے لمحے وہ سنگین معصوم بچے کی گردن سے پار ہو چکی تھی"۔[2]

"سقوط مشرقی پاکستان کے بعد البدر میں شامل محب وطن طلبہ، پوری طرح ہندوستانی فوج اور مکتی باہنی کے رحم و کرم پر تھے۔ نام نہاد بنگلہ دیش کے جنم کی المیہ کہانی کے بعد البدر پر ظلم و وحشت

1 "The Tale That Was Never Told" Lebanon (1972) p.28-30.

2 News Week, January, 1972 (ibid)

کالٹرا ان ٹوٹ پڑا، اور ان کے جسموں اور جانوں کو انہی کی مادرِ وطن کے سینے پر سنگینوں کے ذریعے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا[1]

"ایک بنگالی مسلمان خاتون جو رِیڈر پاکستان میں نیوز کاسٹر تھی، اسے سقوط کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے اقبال ہال لے جایا گیا۔ جہاں مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج کے بدمعاشوں نے سرِعام اس کی عصمت دری کی۔ خود عوامی لیگ کے ترجمان" روزنامہ اتفاق" ڈھاکہ (۲۰ نومبر ۱۹۷۲ء) نے اپنے اداریے میں اعتراف کیا" بنگلہ دیش بننے کے بعد عورتوں کی عصمت برباد کرنے کے واقعات بڑی تیزی سے بڑھے ہیں"

" چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے میں بنگلہ دیش رائفلز کے اسلحہ بردار بدمعاشوں نے قیامت صغریٰ برپا کر دی۔ اس علاقے کے قبائلیوں نے ہندوستانی فوج کے قبضے کو نامنظور اور مشرقی پاکستان سے وفاداری پر کاربند رہنے کے عزم کا اظہار کیا تو بنگلہ دیش رائفلز کے دستوں نے ان کی بستیوں کو تہس نہس اور عورتوں کی ناموس و جان کو پامال کر کے رکھ دیا۔ جنگل میں ایک جگہ پر ان قبائلی مسلمان عورتوں کے جسم کے کٹے ہوئے نازک حصوں کا ڈھیر اور دوسری جگہ ان کی مسخ شدہ نعشیں ملیں"[2]

تہمت چند

پاکستان اور بنگلہ دیش میں البدر کو دو بڑے اعتراضات کا ہدف بنایا گیا ہے:

ایک یہ کہ" پاکستانی فوج کا ساتھ دیا"

دوسرا یہ کہ" قتل عام میں حصہ لیا"

واقعہ یہ ہے کہ الزامات کی یہ عمارت بے بنیاد کھڑی کی گئی ہے۔ لیکن یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ ہندو اور اشتراکی لابی کے زیرِ اثر" اہلِ فن" نے اس کی تعمیر میں مہارتِ تامہ کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ" فنکار"

---

1 "From East Pakistan to Bangladesh" London (1973) p.10.

2 "From East Pakistan to Bangladesh" p.19,20.

وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک پاکستان سے بے وفائی کا نام "وفا" اور نظریۂ پاکستان سے وابستگی کا نام رجعت پسندی ہے — یہی عہدِ وفا اور وفائے عہد البدر والشمس کا "جرم" ہے!

سالمیتِ پاکستان کی جنگ (۱۹۷۱ء) کے دوران افواج پاکستان سے تعاون کے بارے میں کوئی دیانتدارانہ رائے قائم کرنے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ اُس زمان و مکان (Time and Space) کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے کہ کن حالات میں تعاون کا فیصلہ کیا گیا تھا اسے نظر انداز کر کے قائم کی گئی کسی بھی رائے کو دیانت پر مبنی ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ستم یہی ہے کہ وہ اس ماحول اور فضا سے یکسر صرفِ نظر کر دیتے ہیں کہ جس کے پس منظر میں البدر کا وجود عمل میں آیا۔

البدر اُس وقت تشکیل[1] دی گئی، جب مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر بھارت کی یلغار شروع ہو چکی تھی اور پاکستانی فوج کی رجمنٹیں بغاوت پر اُتر آئی تھیں۔ اس صورتِ حال میں مشرقی پاکستان کی حفاظت کے لیے متعین پاک فوج کو ایک قابلِ اعتماد اور محبِ وطن معاون فورس کی ضرورت تھی — اور یہ دُنیا بھر کا قاعدہ ہے کہ جب ملک کی سرحدوں کو خطرہ ہو تو تمام محبِ وطن عناصر، وطنِ عزیز کی حفاظت کے لیے اپنے تمام باہمی اختلافات بالائے طاق رکھ کر سربکف ہو جاتے ہیں۔ — تاریخ شاہد ہے کہ ملک کو خطرہ لاحق ہوا تو حکمران پارٹی سے شدید اختلافات کے باوجود، حزبِ اختلاف بھی آمادۂ تعاون ہو گئی کہ ملک سے محبت کا یہی تقاضا ہے — پھر آخر البدر کے عمل ہی پر غیر اصُولی، اور حب الوطنی کے منافی ہونے کی تہمت کیوں تراشی جائے؟

ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت کی فوجیں پاکستان کی بین الاقوامی سرحد کو پامال کرتے ہوئے پاک

---

[1] اسلامی جمعیت طلبہ کا یہ تعاون برسرِاقتدار گروہ سے نہیں بلکہ وطن سے تھا۔ حزبِ اقتدار سے اصُولی اختلاف اور اس کا اظہار بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ کب ہوا ہے کہ سیاسی اختلاف کی بنا پر کسی دوسرے دشمن ملک کا آلۂ کار بن کر اپنے ہی ملک کی سالمیت پر تیشہ چلا دیا جائے۔ تحریکِ اسلامی کو یحییٰ حکومت کی پالیسیوں اور فیصلوں سے شدید اختلاف تھا۔ (جبکہ مسٹر بھٹو اس کے گہرے رفیق، مشیر اور مددگار تھے) مگر تحریکِ اسلامی "حکومت" اور "ریاست" کا الگ الگ وجود جانتی پہچانتی تھی۔ اس طرح یہ تعاون حکومت سے کے بجائے "ریاست" سے تھا۔

سرزمین میں داخل ہو گئیں تھیں تو ایوب خاں سے سیاسی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود حزب اختلاف کی ایک اہم جماعت ، جماعت اسلامی نے سب سے پہلے حکومت کو تعاون کی پیشکش کی اور حکمران پارٹی سمیت حزب اختلاف کی تمام جماعتوں کو دفاع وطن میں مشترکہ جدوجہد کرنے کے لیے جمع کیا ـــ ایسا کیوں ہوا ؟ اور ایسا کیوں کیا گیا ؟ اس لیے کہ یہ اصول ہے کہ ملک کو خطرہ ہو تو تمام اختلافات ختم ہو کر صرف ایک مسئلہ رہ جاتا ہے اور وہ تحفظ وطن کا ہوتا ہے ۔ "البدر" نے اس سے مختلف طرز عمل اختیار نہیں کیا پھر آخر اسے کیوں مورد الزام ٹھہرایا جائے ؟

اب اسے ایک دوسرے حوالے سے دیکھئے ، بھارتی پارلیمنٹ میں اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان میں پاک فوج کی کارروائی کے خلاف ۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء کو جب ایک قرارداد پیش کی تو پوری حزب اختلاف نے یک زبان ہو کر اپنی حکومت کا ساتھ دیا اور جب اسی سال ۲۴ مئی کو تقریر کرتے ہوئے اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان کو "بنگلہ دیش" کا نام دیا تو تائید میں سب سے زیادہ تالیاں حزب اختلاف کے بنچوں سے بجائی گئیں ۔ جے پرکاش نارائن ، اندرا گاندھی سے شدید اختلافات کے باوجود (۵ ۷ ء کی ایمرجنسی کے بعد اندرا کے خلاف برپا ہونے والی تحریک کا قائد) پاکستان توڑنے پر اس کا پورا پورا ہمنوا تھا ۔ اور اگر اندرا نے عالمی رائے عامہ کو "بنگلہ دیش کی تشکیل" کے حق میں ہموار کرنے کے لیے یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا تو جے پرکاش نارائن بھی پیچھے نہیں رہا ۔ اس نے اس مقصد کے لئے متعدد ممالک کا دورہ کیا ۔

سوچنے کا مقام ہے کہ دشمن پاکستان کو توڑنے پر متفق و متحد ہے ، لیکن دفاع وطن کے لیے پاکستان کے محب وطن عناصر کو متحد ہو کر دفاع وطن کا فریضہ انجام دینے پر طعن کا نشانہ بنایا جا رہا ہے ، اور فوج سے تعاون کو غلط رنگ دے کر مجرم ٹھہرایا جا رہا ہے ۔ حیرت ہے کہ اپنے وطن کے مفاد کے خلاف دشمن کو تو سب کچھ کرنے کی اجازت ہو لیکن یہاں وطن سے محبت کرنے والوں کو گردن زدنی قرار دیا جائے ؟

یہ رویہ ملک دشمنوں کا تو ہو سکتا ہے ، ملک دوستوں کا ہرگز نہیں ـــ اور البدر ملک دوستی کا کردار ادا کرنے پر نہ اس وقت شرمندہ تھے اور نہ آج پشیمان ہیں ـــ

اس موقع پر یہ حوالہ دینا مفید رہے گا کہ جب نازی جرمنی نے دوسری جنگ عظیم ۴۵-۱۹۳۹ء

میں روس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تو روس اپنے دشمن نمبر ایک استعماری ممالک امریکہ، فرانس اور برطانیہ کا اتحادی بن گیا اور خود برصغیر پاک و ہند کے کمیونسٹ عناصر بشمول احمد فیض کی قیادت میں ان "اتحادیوں" کے گن گانے لگے۔ انہی اتحادیوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے بے گناہ عوام کو ایٹم بم سے بھون کے رکھ دیا ــــ ایک طرف تو یہ موقع پرستی اور ظلم "قابل اطمینان" قرار دیا جاتا ہے ــــ لیکن اگر پاکستان کے شہری اپنے ملک کو بچانے کے لیے اپنی فوج سے تعاون کریں تو انہیں ہدف تنقید و تنقیص بنایا جاتا ہے۔

اب آئیے! اس "اعتراض" کی جانب کہ "البدر نے مشرقی پاکستان میں "بے گناہ" لوگوں کو قتل کیا" ــــ یہ الزام لگانے والے پھر بھول جاتے ہیں کہ قتل و خونریزی کا آغاز تو اصل میں وطن دشمنوں نے کیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان تین بار ہلاکت خیزی سے دوچار ہوا:

پہلا دور یکم مارچ سے ۲۵ مارچ پر محیط ہے۔ اس دوران میں عوامی لیگ کے زیر اثر بنگالی "قوم پرست" ہندو، اور بھاشانی کی زیر قیادت کمیونسٹ مسلح ہو کر نکلے، اور انہوں نے غیر مسلح پر امن اردو، پنجابی پشتو بولنے والوں اور متحدہ پاکستان پر یقین رکھنے والے بنگالیوں کا بے دریغ قتل عام کیا۔ انسانوں کے مذبح خانے بنائے گئے۔ سرنجیں لگا کر انسانی جسموں سے لہو نچوڑا گیا، عورتوں کی بے حرمتی کی گئی، اور بے دریغ مار ڈالا گیا۔ اس طرح صرف پچیس روز میں ایک لاکھ سے زائد مظلوم و بے کس پاکستانیوں کو قتل کر دیا گیا۔ جن میں کوئی بھی "سرمایہ دار" نہ تھا لیکن اس قتل عام پر کسی "ترقی پسند" اور "انسان دوست" کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور نہ قلم سے نوحے پھوٹے۔

ہلاکت خیزی کا دوسرا دور آرمی ایکشن کی صورت میں ۲۵ مارچ کی رات سے وسط اپریل تک پھیلا ہوا ہے۔ سیاسی حل نظر انداز کر کے "آرمی ایکشن" کا یہ فیصلہ جنرل یحییٰ نے مسٹر بھٹو کی مشاورت سے کیا اور اس کی کمان لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان (بعد ازاں پیپلز پارٹی کے مرکزی رہنما) نے کی۔

تیسرا قتل عام ۱۶ دسمبر کے بعد بھارتی فوج کی زیر نگرانی ہوا۔ جس میں بنگالی قوم پرستوں، ہندوؤں اور کمیونسٹوں نے کھل کر حصہ لیا۔ اس قتل عام میں پاکستان دوست فعال بنگالی خصوصاً البدر والشمس، اور جماعت اسلامی کے کارکنان، نیز پاکستان جمہوری پارٹی اور مسلم لیگ کے ثابت قدم رہنما نشانہ بنے۔ جبکہ غیر بنگالی مسلمان اس موقع پر بھی بری طرح لوٹے مارے گئے۔

ان تینوں سلسلہ ہائے قتل عام میں البدر والشمس شریک رہتیں اس لیے کہ البدر کی تشکیل ۲۱ ر مئی ۱۹۷۱ کو عمل میں آئی تھی۔ اس طرح "البدر" کے بعد کے بارے میں جب بھی بات ہوگی تو وہ ۲۱ مئی سے ۱۵ دسمبر کے درمیانی زمانے پر محیط ہوگی اس عرصہ میں عوامی سطح پر بہت کم لوگ مارے گئے۔ ان مارے جانے والوں میں بیشتر وہ لوگ ہیں جنہیں جوابی طور پر تباہ حال بہاریوں نے مارا۔ مگر یہ تعداد اس قدر کم ہے ------------- دوسرے

وہ لوگ ہیں جو بہر حال تخریب کاری کے لیے پاکستان میں داخل ہوئے اور مسلح پائے گئے انہیں البدر کی تنظیم اپنے طے شدہ فیصلے کے مطابق سول وار ڈائریکٹوریٹ کے سپرد کر دیتی تھی۔ البتہ مدافعت کاروں کے حملہ آور ہونے کی صورت میں البدر کے جوان ان کے مدمقابل ضرور ہوتے تھے۔

بھارتی فوج نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر جب گولہ باری شروع کی تو اس کی تائید میں مکتی باہنی نے اندرون ملک تخریب کاری شروع کر دی۔ داخلی محاذ پر مصروف عمل انہی تخریب کاروں کے انسداد کے لیے "البدر" کی ضرورت پیش آئی۔ یعنی ایک ایسی فورس ہو جو آستین کے سانپوں کا تدارک کر سکے جن کی تربیت مشرقی پاکستان سے ملحق بھارت کے حدود کے اندر قائم شدہ کیمپوں میں ہوتی تھی۔ اندرا گاندھی کا ایک سوانح نگار زرینہ سلانی لکھتا ہے۔

"بھارت نے مشرقی پاکستان سے ملحق بھارتی علاقے میں عوامی لیگ کی چھاپہ مار تنظیم مکتی باہنی کو اڈہ دے دیا تھا۔ جہاں بھارتی فوج اس کو تربیت دیتی اور انڈین بارڈر سیکورٹی فورس ان کی اسلحہ اور روپے سے مدد کرتی تھی۔"

یہ سارا انتظام مشرقی پاکستان کا داخلی محاذ کمزور کرنے کے لیے تھا۔ یعنی اگر ملک کے اندر بدامنی ہوتی ہے تو فوج کو نہ اندر سے مدد مل سکے گی، اور نہ یک سوئی کے ساتھ وہ سرحدوں کی حفاظت کر سکے گی۔ اس صورت حال میں کیا البدر کے لیے اندرونی تخریبی عناصر "Fifth Columnists" کا ہاتھ پکڑنا جرم تھا؟ یہ عجیب و غریب تصور ہے، کہ دشمن کے ایجنٹ تو جو چاہیں کریں۔ جس کو چاہیں گولی کا نشانہ بنا دیں۔ لیکن محب وطن عناصر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ ظاہر ہے باغی عناصر سے نبرد آزما ہونے کے لیے نہ تو البدر کو زیتون کی چھڑی اٹھانا تھی، اور نہ گولیوں کے جواب میں گلاب کے پھول نچھاور کرنا تھے۔

بس یہ ہے البدر کا "قصور" کہ انہوں نے پاکستان کو توڑنے والے ہاتھوں کو روکا اور اس دستِ شر انگیز سے عوام کو بچانے کی جدوجہد کی۔ یہی وہ قصور ہے جسے کوئی نام نہاد ترقی پسند معاف کرنے کو تیار نہیں لیکن ہمارے نزدیک یہی "قصور" البدر کا کریڈٹ ہے، جس پر وہ نہ نادم ہیں اور نہ شرمسار۔

البتہ اس تعاون پر طعنہ زنی کرنے والوں کا معاملہ قابلِ غور ہے کیونکہ یہ لوگ اپنے قول و فعل میں کبھی جمہوریت کے قائل نہیں رہے۔ خود ان کی مثالی ریاستوں یعنی اشتراکی روس اور اس کی مقبوضہ مملکتوں میں بدترین آمریت کے استبداد کا چلن ہے ان کے فکری معبودوں کے نزدیک اقتدار و انقلاب کا رستہ بندوق کی گولی سے بنتا ہے۔ فوج کا قومی ادارہ ان کی نگاہ میں اسوقت تک قابلِ نفرت ہے، جب تک کہ وہ ان کے "مخصوص مقاصد" کی راہ میں حائل ہے۔ البتہ جب وہ روس کو سلے آئے، تو پھر سب کچھ درست؛ اس سلسلہ میں حالیہ افغانستان کی مثال کافی ہے۔

البدر: دشمن کی جانب سے اعتراف

ویسے تو اخبارات میں "البدر و الشمس" کے دفاعی کارناموں کی خبریں شائع ہوتی رہی ہیں، لیکن یہاں ہم محض بابتی کے پس پردہ حامی ایک اخبار کی دو خبریں نقل کرتے ہیں جن سے "البدر و الشمس" کے اہداف اور نتائج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

" البدر" کے رضاکاروں نے درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے ہندوستانی ایجنٹوں کی کمین گاہ پر چھاپہ مار کر پندرہ ہزار گولیاں، پانچ سو پونڈ، آتش گیر مادہ، تین سو پچاس بارودی سرنگیں، اور دو سو بیس دستی بم قبضے میں لے لیے اور "الشمس" کے رضاکاروں نے دیناج پور بازی سال میں ہندوستانی ایجنٹوں پر کامیابی سے شب خون مارا، جس میں پانچ بھارتی ایجنٹ مارے گئے جبکہ تین رائفلیں، دو سو پچاس گولیاں، ستر دستی بم اور پچاس پونڈ آتش گیر مادہ قبضے میں لے لیا[1]....

ایک متعصب قوم پرست لکھتا ہے!

---

1 "The Pakistan Observer" Dhaka 6.11.71.

"۱۹۷۱ء میں "البدر" اور "الشمس" اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنان پر مشتمل دفاعی تنظیمیں تھیں جنہوں نے پاکستان دشمن لٹریچر اور بنگلہ دیش کے حامی لٹریچر کو تباہ کرنا شروع کر دیا اور اشتراکی فکر کے حامل ماہرین کا محاسبہ کیا۔" [۱]

پاکستان کا مخالف ایک امریکی مصنف اپنی کتاب میں حقیقت اور تاثر کے ساتھ یوں رقم طراز ہے:

"البدر" اور "الشمس" جو کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے باہمی تعلق کو قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے ان کے بہت سے قتل ہونے والے افراد کی فہرستیں دستیاب نہیں ہو سکیں۔ یہ لوگ (سقوط ڈھاکہ کے بعد) روپوش ہو گئے اور سقوط کے فوراً بعد (بنگلہ دیشی حکومت کی جانب سے) یہ حکم نامہ جاری کر دیا گیا کہ ان میں سے جو کوئی جہاں کہیں بھی نظر آئے فوراً اُسے گولی مار دی جائے۔" [۲]

"شیخ مجیب نے جس روز پاکستان سے رہا ہو کر ڈھاکہ پہنچنا تھا تو ڈھاکہ میں یہ افواہ گرم تھی کہ پاکستان سے محبت اور دینی رجحانات رکھنے والے "البدر" اور "الشمس" کے نوجوان بڑی تعداد میں چھپے ہوئے ہیں جو مجیب کو قتل کر دیں گے۔ اس لیے پولیس نے یہ تجویز پیش کی سب سے بہتر یہ ہو گا کہ شیخ مجیب کو ایئرپورٹ سے کسی بکتر بند گاڑی یا ٹینک میں محفوظ بٹھا کر ریس کورس گراؤنڈ تک پہنچایا جائے۔" [۳]

اور ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر حملہ آور بھارتی فوج کے ایک جرنیل کو تسلیم کرنا پڑا:

"البدر کے رضاکار باہم متحد و مربوط ہو کر بر سر پیکار رہے اور کمتی باہنی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ انہیں آسانی سے کچل دے سکے۔" [۴]

---

1 Maniruzzaman "Radical Politics and The Emergence of Bangladesh Dhaka (1975) p.47.

2 Robert Payne "Massacre" New York (1973) p.85

3 ——— Ibid ——— p,141

4 Maj General Lachman Singh "Indian Sword Strikes in East Pakistan" Delhi 23,24.

پاکستان سے علیحدگی کا پروپیگنڈہ کرنے میں پیش پیش ایک ہندو صحافی نے لکھا:

"یہ ۱۹۷۲ء کے وسط کی بات ہے۔ میں بنگلہ دیش کے صحافیوں کے ایک وفد کے ہمراہ وزیر اعظم ہاؤس میں شیخ مجیب سے ملنے گیا تو مجیب نے ہمیں ملتے ہی بتایا "میں نے حکم دے دیا ہے کہ البدر کے تمام (رو پوش) رضا کاروں کو فوراً گرفتار کر لیا جائے"۔"[1]

مکتی باہنی کے ایک ذمہ دار لیڈر اور بعد میں ایک فوجی افسر نے اعتراف کیا:

"البدر و الشمس انتہا پسند مذہبی تنظیمیں تھیں جنہوں نے بنگالیوں کے "مفاد" کے منافی پاکستانی ریاست کا ساتھ دیا۔ یہ لوگ بنگالی تھے اس لیے بڑی آسانی کے ساتھ اور بغیر کسی شور شرابے کے مکتی باہنی کے بارے میں اطلاعات اکٹھی کر کے نقصان پہنچاتے۔"[2]

جبکہ ایک مارکسی امریکی مصنف نے اپنی تصنیف میں پاکستان کے خلاف زہر اگلنے کے باوجود یہ تسلیم کیا:

"البدر راسخ العقیدہ مسلم نوجوانوں کی تنظیم تھی، جس نے پاکستانی افواج کے ہمراہ دفاع پاکستان کا فریضہ انجام دیا۔"[3]

البدر کی شاندار خدمات کا اعتراف

میجر ریاض حسین ملک نے اپنے ایک انٹرویو میں البدر کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا:

"البدر کے عظیم نوجوانوں نے بے پناہ قربانیاں دے کر تاریخ اسلامی کا ایک نیا باب کھولا ہے۔ یہ تنظیم ایک ایسی مالا تھی، جس کا ایک ایک موتی اپنی چمک میں بے مثال تھا۔ سوء اتفاق سے ان کی عظیم کارکردگی سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں، حالانکہ ان کی جدوجہد ہر زندہ قوم کیلئے باعث فخر ہے۔..........."

1 Sukrangan Das Gupta "Midnight Massacre in Dacca" Delhi (1977) p.28.

2 Rafiqul Islam "A Tale of Millions" Dhaka (1978) p.226,227.

3 Lawrence Lifschultz "Bangladesh : The Unfinished Revolution" London (1979) p.126.

"البدر کے جوان، عمل کی وہ تصویریں تھیں جن میں اسلامی تاریخ کے دورِ اوّل کا جذبہ، ایثار، ایمان، اطاعت اور تنظیم ہاتھ کی پانچ انگلیوں کے مانند مربوط و ہم آہنگ دکھائی دیتی تھی۔ تاریخ اسلام کے جو سپاہیانہ کردار رفتہ رفتہ ہماری تاریخ کا رومانی حصہ بن کر چشمِ تصوّر کی گرفت سے بھی باہر ہو چکے تھے، بخدا اس کردار کا پرتو ہم نے البدر کے نوخیز مجاہدوں کی شکل میں بچشمِ سر دیکھا۔ ان کا نصب العین واضح اور ان کا ایمان کامل تھا۔ وہ بنگالی ہونے کے باوجود سالمیت پاکستان اور دفاع پاکستان کو دین کے تقاضوں اور ایمان کا جزو سمجھتے تھے۔ اس معرکۂ خیر و شر میں ابھرنے والے ہر چیلنج کو انہوں نے اس جرأت کے ساتھ قبول کیا

کہ مقتل ہے محوِ تماشائے لبِ بامِ ابھی[۱]"

البدر : ناقابلِ فراموش کردار

"میجر جنرل (ریٹائرڈ) راؤ فرمان علی خاں نے پاکستانی پریس کو بتایا:

"البدر اور الشمس کے کردار کا میں خود عینی شاہد ہوں ان تنظیموں کے رضاکاروں نے علیحدگی پسندوں کے مقابلے میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ اور اسی طرح مشرقی پاکستان کا اسلامی تشخص برقرار رکھنے کے لیے تحریکِ اسلامی کی قربانیوں کو کسی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا[۲]"

البدر : پاکستان کے لیے سربکف

المیۂ مشرقی پاکستان کے ایک اور چشم دید گواہ بریگیڈیئر صدیق سالک نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے۔

۱۔ میجر ریاض حسین ملک سے مصنف کا انٹرویو، ۱۰ جون ۱۹۷۵ء (کوہاٹ چھاؤنی) و مکتوب ۲۴ر نومبر ۱۹۸۳ء

۲۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور و روزنامہ جنگ راولپنڈی۔ ۳ رجولائی ۱۹۸۳ء

"البدر اور الشمس" کے رضا کاروں نے پاکستان کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں۔ وہ ہر وقت حکم پر لبیک کہتے تھے۔ انہیں جو کام سونپا جاتا وہ پوری ایمانداری اور جانی قربانی سے ادا کرتے۔ اس تعاون کی پاداش میں تقریباً پانچ ہزار رضا کاروں یا اُن کے زیرکفالت افراد نے شرپسندوں کے ہاتھوں نقصان اٹھایا۔ ان کی بعض قربانیاں روح کو گرما دیتی ہیں" [1]

البدر، تاریخ اسلام کی زریں شہادت

مفتی اعظم فلسطین محمد امین الحسینیؒ نے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ہاں ایک عشائیہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا ....

"مشرقی پاکستان میں پاک افواج کے دوش بدوش بھارتی افواج سے مقابلہ میں داد شجاعت دینے والے" البدر اور الشمس" کے کارنامے تاریخ اسلام میں زریں حروف سے لکھے جائیں گے۔ میرے نزدیک یہ امر بڑی خوشی کا ہے کہ اسلامی تحریک نے مشرقی پاکستان میں نئی نسل کے نوجوانوں میں اپنے اثرات بڑھائے اور ان کے اندر ایسے تازہ دم مجاہدین پیدا کر لیے جو اسلام کی خاطر جان، مال اور گھر بار قربان کر دینے کے لیے تیار ہیں مجھے یقین کامل ہے کہ اگر ایسے نوجوان مشرقی اور مغربی پاکستان میں سرگرم عمل رہے اور وطن کی خدمات میں لگے رہے تو انشاء اللہ پاکستان اس عارضی آزمائش سے نکل جائے گا جس سے وہ اس وقت گزر رہا ہے" [2]

البدر: وحدت پاکستان کا نشان

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے مفتی اعظمؒ فلسطین کے اعزاز میں استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

---

[1] صدیق سالک "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" ص ۱۱۲ - ۱۱۳

[2] روزنامہ "جسارت" کراچی، ۲۴ مئی ۱۹۷۳ء

"البدر اور الشمس" سے وابستہ بنگالی نوجوانوں کی تعداد ۲۰ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ مشرقی پاکستان میں جب شیخ مجیب الرحمان اور عوامی لیگ بھارت کے حق میں فضا ہموار کر رہے تھے اور مغربی پاکستان سے اس کی علیحدگی کی تحریک چلا رہے تھے تو اس زمانے میں ان نوجوانوں نے وحدتِ پاکستان کا پرچم بلند کیا، اور جب پاکستانی فوج نے شرپسندوں اور بھارتی فوج کے گوریلوں کے خلاف کارروائی کی تو ان نوجوانوں نے پاک فوج کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا بلکہ فوجی کارروائیوں کی کامیابی انہی نوجوانوں کے بل بوتے پر ہوتی رہی، کیونکہ فوج کی بڑی تعداد مغربی پاکستان سے متعلق تھی اور وہ مشرقی پاکستان کی زبان اور راستوں سے ناواقف تھی۔ اس وقت یہی نوجوان اسلام کی محبت اور حبِ وطن کے جذبے سے لبریز ہو کر آگے بڑھے اور انہوں نے بھارتی فوج کے جارحانہ حملوں کو روکنے کے لیے اپنی فوج کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا اور بھرپور قربانیاں دیں۔ یہی وہ نوجوان تھے جو پاکستانی فوج کے ہراول دستے تھے۔ ان میں سے تقریباً ۵ ہزار اس بحران کے دوران شہید ہو گئے اور جو باقی رہ گئے وہ بعد میں اپنے بنگالی بھائیوں کے ہاتھوں شہید کیے جا رہے ہیں۔ یہ نوجوان (کارکنان اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان) جو آپ کو کلیوں اور شگوفوں کی شکل میں نظر آتے ہیں صرف یہی ایک آرزو اپنے سینے میں دبائے ہوئے ہیں کہ کسی طرح پاکستان کی وحدت برقرار رہے اور یہاں اسلام کا بول بالا ہو۔"[1]

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بجا فرمایا تھا:

"ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کی سب سے بڑی مملکت پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو کچھ ہمارے بس میں تھا۔ مشرقی پاکستان کو بچانے کے لیے جو زیادہ سے زیادہ قربانی کوئی انسانی گروہ یا جماعت دے سکتی تھی وہ ہم نے دی۔ ہمارے ۵ ہزار آدمیوں نے مشرقی پاکستان کو بھارت کے قبضے میں جانے سے روکنے کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔"[2]

---

[1] روزنامہ "جسارت" کراچی ۲۴ مئی ۱۹۷۳ء

[2] روزنامہ جسارت کراچی ۳ مئی ۱۹۷۲ء

البدر: حد درجہ وفادار پاکستانی

مشرقی پاکستان میں پاکستان کے آخری کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) امیر عبداللہ خان نیازی نے اپنے طویل مضمون میں برملا اعتراف کیا ہے:

"البدر اور الشمس" حد درجہ وفادار، محب وطن، پرجوش اور سرگرم پاکستانی تھے جنہوں نے دل وجان کے ساتھ پاکستانی افواج کے ساتھ تعاون کیا۔ انہوں نے ہمیں کبھی دغا نہیں دی، کبھی فریب نہیں دیا۔ ہمارا ساتھ چھوڑ کر وہ مکتی باہنی سے نہیں ملے، ہمارے دشمن سے کبھی ساز باز نہیں کی۔ مجھے اپنے کمانڈر دشمن کے علاقے میں بھیجنے کی اجازت نہ تھی، چنانچہ دشمن کی سرزمین میں اکثر و بیشتر یہ کارروائیاں "البدر" کے رضاکار ہی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے "اگرتلہ" (بھارت) کے ایک تھیٹر میں بم پھینکے تھے اور اس واقعے سے بھارتی شہریوں کا حوصلہ خاصا پست ہو گیا تھا۔۔۔ ان جوانوں (البدر) نے کلکتے میں بھی بہت اچھی کارروائی کی تھی۔ مشرقی پاکستان کے ان تمام رضاکاروں اور اسلام پسند قائدین کی خدمت میں مجھے بس یہی کہنا ہے۔

با آں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند [1]

"یہ امر واقعہ ہے کہ البدر کے نوجوان آخری وقت تک پاکستان کی بقا کے لیے لڑتے رہے۔" [2]

البدر، حق شناسی کی بہترین مثال

پروفیسر خورشید احمد، سابق ڈپٹی چیئرمین پاکستان پلاننگ کمیشن، وفاقی وزیر اور چیئرمین انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد نے لکھا:

---

[1] جنرل امیر عبداللہ خان نیازی "ٹائیگر بولتا ہے" "قومی ڈائجسٹ" جولائی ۱۹۷۸ء ص ۵۶ / ۵۷۔
[2] " " " " " " " انٹرویو" ہفت روزہ "چٹان" لاہور ۵ / جنوری ۱۹۸۱ء ص ۸۔

" البدر، اسلام اور پاکستان کے وہ جاں نثار ہیں جنہوں نے پاکستان کو اس کے اصل تصور کے مطابق باقی رکھنے اور مستحکم کرنے کے لیے جدوجہد کی اور شکست یا مجبوری پر شہادت کو ترجیح دی ـــــ ان نوجوانوں نے برصغیر پاک و ہند کی سیاست کو امور خارجہ کے نام نہاد ماہرین سے زیادہ صحیح سمجھا ـــ اور تعداد کی کمی، وسائل کے فقدان، گھر کے غداروں اور بیرونی سامراجیوں کی کثرت کے باوجود حق شناسی اور اصول پرستی کی بہترین مثال پیش کی۔

ـــ بڑھی نہ قطرے کی وسعت حباب سے آگے
مگر دکھا کو گیا اک جھلک سمندر کی [1]

البدر کے بغیر سلامتی ناممکن تھی

پاکستان جمہوری پارٹی، مشرقی پاکستان کے رہنما مولوی فرید احمد شہیدؒ کے فرزند ظہیر احمد فریدی نے کہا۔

" اگر " البدر و الشمس " کے جان نثار موجود نہ ہوتے تو مکتی باہنی اس سے بھی زیادہ تباہی مچاتی اور پاکستانی فوج صحیح سلامت نہ بچ کر واپس نہیں آسکتی تھی۔ البدر و الشمس نے ڈٹ کر مکتی باہنی کا مقابلہ کیا۔" [2]

البدر عظمت رفتہ کی درخشندہ روایت

ایک صحافی اپنی کتاب میں البدر کی خدمات کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

" البدر" بیسویں صدی عیسوی میں اسلام کی عظمتِ رفتہ کا مینار ہے،" البدر" نے اسلامی تاریخ کے شجاعانہ اور مجاہدانہ کردار کا بھرپور مظاہرہ کیا ان کی درخشندہ روایات کو آج بھی مشرقی پاکستان کے غیر جانبدار افراد خوشگوار واقعات کی صورت میں یاد کرتے ہیں۔" البدر" کے نوجوان

---

[1] پروفیسر خورشید احمد " پاکستان، بنگلہ دیش اور جنوبی ایشیا کی سیاست"۔ کراچی ۱۹۷۳ء ص ۶

[2] روزنامہ " مشرق" لاہور، ۲۹ مارچ ۱۹۸۳ء جبکہ پاکستان جمہوری پارٹی کے سربراہ نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہا " البدر والشمس تنظیموں نے اکثر مقامات پر مکتی باہنی کے دانت کھٹے کر دیئے، ان تنظیموں کے تعاون سے (عبوری سول) حکومت نے بڑی حد تک داخلی حالات پر قابو پا لیا۔" (قومی ڈائجسٹ۔ مارچ ۱۹۸۱ء)

مجاہدوں کی اعلیٰ پیمانے پر نظریاتی و فکری تربیت ہوئی تھی جس کے باعث وہ اسلام کے تحفظ اور پاکستان کی سالمیت کے لیے اعلیٰ درجے کی قربانی پیش کرنے کے لیے کٹتاں کٹتاں سر بکف شہید مجاہد ہوتے چلے گئے۔ نتیجتاً لادینیت پسندوں، ہندوؤں، یہودیوں، کمیونسٹوں اور دوسرے تمام اسلام دشمن عناصر نے "البدر" کی کردار کشی کے لیے بدنیتی پر مبنی ایک منظم مخالفانہ پروپیگنڈہ مہم کا آغاز کیا۔ "البدر" کے نوجوان عقلی بصیرت، فکری ذہانت، اخلاقِ حسنہ اور جاں سپاری کے جذبوں سے سرشار اعلیٰ تعلیم یافتہ مجاہد تھے جو عظمتِ اسلام کے احیاء کے لیے بڑی قربانی کے لیے قولاً و عملاً میدانِ عمل میں مصروف تھے۔ "البدر" کے نوجوان کرائے کے سپاہی (Mercenaries) نہ تھے بلکہ اسلام کے تصورِ جہاد کے واقف سراپا ایثار اور بے لوثی کا نمونہ تھے انہوں نے تمام مادی اور جسمانی خطروں کو خاطر میں لائے بغیر اسلام اور پاکستان کے دشمنوں سے چومکھی جنگ لڑی۔[1]"

البدر ناقابلِ تسخیر

ول نے مزید لکھا:

"البدر کے ان ہزاروں مجاہدوں اور شہیدوں نے آج کی انسانیت کو آغازِ اسلام میں میدانِ بدر کے بے خوف، حوصلہ مند اور ناقابلِ تسخیر نوجوانوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر دکھائی اور رنگ و نسل کے بتوں کو توڑ کر اپنے لہو کی قربانی دے کر ثابت کیا کہ اسلام کے تصورِ جہاد کو سمجھنے والے افراد کی لغت میں فی الواقع پسپائی کا حرف سرے سے موجود نہیں۔ اس طرح انہوں نے امن پسند شہریوں میں امید اور تحفظ کے امکانات کو واضح کیا۔ مگر جب اچانک افواجِ پاکستان کی جانب سے ہتھیار ڈالنے کا روح فرسا لمحہ آیا تو اس حادثے کی صدمہ انگیزی ان کی روح پر بجلی بن کر گری۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ جو "البدر" کی صورت میں منظم تھے اور اسلام کے ابتدائی عملی تقاضوں پر عملدرآمد کرنے والے تھے بجا طور پر پاکستان کے دشمنوں کے لیے

---

[1] " The Tale That Was Never Told " p.25

"ناقابل قبول تھے ..... "البدر" کے خلاف لوٹ مار، ذاتی انتقام، اور کسی بھی غیر اخلاقی حرکت کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا"۔[1]

البدر: مسلم بنگال کے نقیب

مشرقی پاکستان کے امور کے ممتاز تجزیہ نگار اور مورخ مطیع الرحمان نے نشاندہی کی:

"عوامی لیگ حکومت کے ذرائع اس بات پر پختہ یقین کا اظہار کرتے تھے کہ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد بنگلہ دیش میں) "مسلم بنگال تحریک" کے سرچشمے "البدر"، "الشمس" اور جماعت اسلامی کی دیگر برادر تنظیموں سے پھوٹتے ہیں"۔[2]

البدر، ہتھیار نہ ڈالنے والے،

خواجہ خیر الدین (جنرل سیکرٹری مشرقی پاکستان مسلم لیگ) کے بقول:

"جب کسی کو خیال نہ تھا اس وقت مولانا مودودیؒ نے ایک نظریاتی ریاست کو نظریاتی کارکن فراہم کرنے اور پاکستان کو صحیح راہ پر ڈالنے کے لیے بروقت صحیح قدم اٹھایا اور ان کی کوششوں کا ایک نتیجہ اسلامی جمعیت طلبہ ہے۔ میرا تعلق ایک ایسی جماعت (مسلم لیگ) سے ہے جس نے پاکستان بنایا، ہم اپنے آپ کو پاکستان کا وارث بھی کہتے ہیں لیکن پاکستان کو صحیح معنوں میں پاکستان بنانے کے لیے کس نے کام کیا؟ میں سوال کرتا ہوں کہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے معلوم نہیں ہمیں شرم کیوں آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کیا، اس بوڑھے شخص نے نوجوانوں کی ایسی ٹیم تیار کی جو اسلام کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ میری نظروں نے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں دیکھا کہ کس طرح اللہ کے نام پر جمعیت کے نوجوانوں نے پاکستان کے دفاع کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔ پاکستان کی افواج کے تو وسائل ختم ہو چکے تھے اور حالات

1– The Tale That Was Never Told" (Lebanon) p. 26.

2 Matiur Rahman "Iron Bars of Freedom" London (1980) p.53.

خراب ہو جانے کی بنا پر ہتھیار ڈال دیئے تھے، لیکن اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوانوں نے آج تک ہتھیار نہیں ڈالے اور یہ انہیں مجاہدوں کا کارنامہ ہے کہ بنگلہ دیش کے حکمران مجبور ہوئے کہ بنگلہ دیش کے نام سے سیکولر کا لفظ ہٹائیں [1]"

البدر، ملی تاریخ کا روشن باب

بریگیڈیر ریٹائرڈ محمد حیات خان (جیسور، کھلنا سیکٹر) نے اپنے درج ذیل مشاہدات کو یوں بیان کیا:

"مجھے سلام کرنے دیجئے البدر اور الشمس کے ان جیالوں کو جو پاکستانی افواج کے شانہ بشانہ لڑے اور جنہوں نے اپنے لہو سے عزیمت و استقامت کے نئے باب رقم کیے۔ اس ضمن میں خاص طور پر اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوانوں کا تذکرہ کروں گا جنہوں نے شجاعت کے عظیم کارنامے انجام دیئے اور سنگین حالات میں عزم کی شمعیں روشن کیے رکھیں۔ ان میں بہت سے شہید ہوگئے، بہت سے بار بار زخمی ہوئے۔ ان کے گھر بار لُٹے، عزیزوں کو قتل کیا گیا اور ان کے سامنے ان کے والدین اور بھائیوں سے وہ سلوک کیا گیا کہ پتھروں کا دل شق ہوتا تھا مگر ان کے قدم ذرا متزلزل نہ ہوئے۔ ان نوجوانوں نے متحدہ پاکستان کے لیے جو قربانیاں دیں اور جو کارنامے انجام دیے یقیناً وہ ہماری ملی تاریخ کا روشن باب ہیں۔ کئی نام ہیں جو میرے دل پر نقش ہیں نہ مٹنے والی دردمندی کے ساتھ مشرقی پاکستان کا چپہ چپہ ان کی جان سپاریوں کا گواہ ہے۔" [2]

---

[1] ہفت روزہ "ایشیا" (ایڈیٹر عبدالقادر حسن) لاہور ۳۰ دسمبر ۷۷ء

[2] انٹرویو ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" لاہور اگست ۷۸ء

☆

"میں نے "البدر" ہاتھ آتے ہی اسے جہاں سے بھی چکھا، یوں محسوس ہوا کہ یہ کتاب تو میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں۔ یہ واقعات میرے دیکھے بھالے، اور یہ کردار میرے وطن کے جیالے ہیں۔ ان کے خون سے کھینچی ہوئی کہکشاں عروس وطن کے لئے جھومر کا درجہ رکھتی ہے مصنف نے ہماری تاریخ کا یہ باب رقم کر کے ہم سب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ کاش! میں یہ کتاب لکھ سکتا"

* برنگیڈیر صدیق سالک (۲۲ جنوری ۱۹۷۸ء)

☆

"چٹاگانگ میں "البدر" اور "الشمس" کے رضاکاروں کے ساتھ صرف چھ دن (اکتوبر ۱۹۷۱ء) میں گزارنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ، اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے نیک اور محب وطن نوجوانوں کا ساتھی بنا دیا ہے، جن سے کبھی ملنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نوجوان انتہائی خستہ حالت میں تھے، اور انہوں نے کوئی قابل ذکر فوجی تربیت (بھی) حاصل نہیں کی ہوئی تھی۔ لیکن وہ انتہائی پرعزم، محب وطن، اور صابر تھے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت انہیں نہیں تھکاتی تھی، با جماعت نماز ان کی زندگی کا طریقہ تھا، وہ جو کام بھی کرتے تھے، با جماعت کرتے تھے، با جماعت نماز کو مد نظر رکھ کر کرتے تھے۔ "البدر" اور "الشمس" سے میں نے یہ سبق حاصل کیا کہ پانچ وقت با جماعت نماز پڑھنے والوں کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم رہتا ہے، وہ (کسی دوسری طاقت سے) ہرگز نہیں گھبراتے"

* ابوذر غفاری (یکم نومبر ۱۹۸۳ء، "نوائے وقت" لاہور)

جنگی مہمیں

البدر نے پہلا آپریشن بھارتی سرزمین پر کیا

" البدر" کے مجوّز میجر ریاض ۳۱ بلوچ رجمنٹ نے بتایا :

یہ غالباً ۲۸ مئی ۱۹۷۱ء کا واقعہ ہے جب میرے ضلع میں البدر کی پہلی کمپنی نے ہفتہ بھر کی سرسری تربیت مکمل کر لی۔ ایک دن ایک آدمی دوڑا دوڑا آیا اور کہنے لگا کہ مکتی باہنی کے لوگ ہمارے مویشی چوری کر کے لے جا رہے ہیں ہم نے ان کا پیچھا کرنے کے لئے فوراً ایک فوجی دستہ روانہ کیا۔ دوسری طرف بھارتی فوج کے ایک گوریلا دستے نے پاکستان کی سرحد میں داخل ہو کر ہمارے فوجیوں پر حملہ کر دیا اور اس حملہ کے دوران میں ہمارے ایک ساتھی کیپٹن صاحب شہید ہو گئے۔ میں پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ اس صورت حال سے کیسے نپٹا جائے اور اس کا بدلہ کیسے لیا جائے۔

اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ البدر کے پہلے کمانڈر (اور اسلامی جمعیت طلبہ کے مقامی یونٹ کے ناظم) کامران جو ایف-اے-ال اول کے طالب علم تھے میرے پاس آئے اور کہا "سر! شہید کیپٹن صاحب کا بدلہ ہم لیں گے"؟

میں نے کہا: "بھئی! ہندوستان کا بارڈر پار کر کے وہاں جانا اور پھر تجربہ کار اور بھارتی فوج پر شب خون مارنا ایک مشکل کام ہے۔ یہ آپ سے کیسے ممکن ہو گا ؟"

بھولے بھالے سانولے کامران نے معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "انشاءاللہ ہم بدلہ لے کر دکھائیں گے۔"

میں نے کہا: "اچھا آپ ہی کی کمان میں آج رات ایک گروپ بھیجوں گا، اپنے ساتھ پانچ "البدر" ساتھیوں کو لے آنا۔"

نماز عصر سے کچھ پہلے کامران سات ساتھیوں (جو انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے) کے ساتھ آیا اور کہا: "میجر صاحب! ہم چاہتے ہیں آپ ہمیں ہمارا ہدف (Target) بتلائیں اور کچھ حفاظتی اسلحہ بھی دیں۔"

میں نے ٹارگٹ تو بتلا دیا، لیکن اسلحہ دینے کے بارے میں کچھ تذبذب کی کیفیت کا شکار ہوگیا، کیونکہ اس سے قبل ہماری عام رضاکار فورس کے کچھ افراد نے اچھا تاثر نہ دیا تھا۔ وہ اسلحہ لے کر فرار ہوگئے تھے اور بعض لوگوں کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ انہوں نے ہمارے خلاف جاسوسی کی ہے۔ میں کوئی (Risk) نہیں لینا چاہتا تھا۔ ایک طرف یہ اندیشہ تھا اور دوسری طرف اسلامی جمعیت طلبہ کے ان معصوم جوانوں کا جوش و جذبہ۔ جی یہی چاہتا تھا کہ اسلحہ دیا جائے۔ مگر دوسرے لمحے پھر یہ خیال غالب آجاتا کہ

"البدر" کی تاسیس میرے علاقے اور میری نگرانی ہی میں ہوئی تھی اور یہ کوئی مشرقی کمانڈ کی ہدایت پر نہیں ہوا تھا، بلکہ ہماری مقامی حکمت عملی تھی۔ اس لئے اور زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ میں اس کش مکش میں تھا۔ ان سے کہا: "نماز مغرب کے بعد بات کروں گا۔"

نماز کے بعد پھر وہی مسکراتے مسکراتے سانولے چہرے میرے سامنے تھے۔ میں نے انہیں ایک پستول دو دستی بم اور دو ڈائنامیٹ دیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلحہ ان میں سے کسی ایک کے لئے بھی کافی نہ تھا۔ کامران نے آہستگی سے کہا: "میجر صاحب! اور نہیں تو ہر ایک ساتھی کے ذاتی تحفظ کے لئے ہی ایک ایک ہلکا ہتھیار دے دیجئے۔"

اس کا مطالبہ غلط نہ تھا، لیکن میں اس سے زیادہ اعتماد نہ کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحے پراسرار خاموشی میں گزرے۔ پھر نہ معلوم میرے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا کہ فوراً کمرے میں چلا گیا اور سورہ یٰسین کا ایک نسخہ لے آیا جو میرے نام آنے والے ایک پرانے عید کارڈ میں لگا ہوا تھا اور وہ خاموشی سے کامران کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ دیکھ کر اس نے مزید کوئی تقاضا کئے بغیر خدا حافظ کہا اور رات کے اندھیرے میں اپنی راہ لی۔ اور میں ساری رات احساس جرم میں بیٹھا رہا کہ شاید ان ساتھیوں

سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکے۔

سرحد قریب ہی تھی اس لئے وہ سورج نکلتے ہی میرے پاس واپس آگئے، کامران نے کہا: "میجر صاحب! بس کمال ہو گیا۔ ہم اپنا شکار مارنے میں کامیاب رہے ہیں"۔

تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ البدری شاہین سرحد پار کر کے رینگتے رینگتے بھارتی فوج کے مورچوں تک پہنچے۔ وہاں ایک ٹرک میں دو بھارتی آفیسرز اور مکتی باہنی کے کچھ ایجنٹ اونگھ رہے تھے۔ مزے کی بات ہے کہ اس لمحہ پہرہ دار ٹیم بھی سو رہی تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی پاکستان سے کسی گوریلا حملے کا خطرہ موجود نہ تھا اس لئے البدر نے سب سے پہلے تو ٹرک کے گرد ڈائنامیٹ لگائے۔ پھر دو البدر کیڈٹ چھلانگ لگا کر ٹرک میں سے دو رائفلیں اٹھا کر تیزی سے پیچھے آ گئے اور بڑی تیزی سے ایک بھارتی میجر، اور تین بھارتی سپاہیوں کو جہنم واصل کیا۔ اسی دوران میں ایک البدر کیڈٹ نے ڈائنامیٹ آپریٹ کیا اور اسی طرح خاموشی سے یہاں پہنچ گئے اور پھر یہ آپریشن ایک لازوال حقیقت بن گیا۔

ہماری انٹیلی جنس نے بھی تصدیق کی کہ البدر کے نوجوانوں نے بھارتی فوج کو زک پہنچائی ہے۔ یہ تھا البدر کا پہلا آپریشن جو بھارت کی سرزمین پر بھارتی فوج کے خلاف ہوا۔

اسلحے کا بڑا ذخیرہ ہمارے ہاتھ لگا

کامران اولین کمانڈر "البدر" بیان کرتے ہیں "مئی کے چوتھے ہفتے شیر پور سے سولہ میل دور ایک مقام چندر نگر کے متعلق خبر آئی کہ وہاں بھارتی ایجنٹوں نے بہت تشویشناک صورت حال پیدا کر رکھی ہے۔ یہ سن کر ہم وہاں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس آپریشن کے لئے ۱۲۰ آرمی کے اور ۱۸ البدر کیڈٹ تھے۔ کمان میجر ریاض ملک کر رہے تھے۔ ہم لوگ رات کے اندھیرے میں نکلے۔ وہاں پہنچے تو ایک گھر سے کچھ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم تین البدر ساتھی ان کے پاس گئے اور ان سے کہا: دوست پاکستانی فوج پر حملہ کرنا چاہتے ہیں"۔

یہ طریقہ ہم اس لئے اختیار کر رہے تھے کہ وہ ہمیں ساتھی سمجھ کر راز کی بات بتا دیں اور

اس وقت ہماری یہ تدبیر سو فی صد کامیاب ثابت ہوئی۔ وہ فوراً کھل گئے اور بتانے لگے "ہم خود اسی فکر میں ہیں، لیکن ابھی ذرا رکے ہوئے ہیں۔"

ہم نے انہیں فوراً گرفتار کر لیا۔ اس مکان سے بہت سا اسلحہ اور ہندوستانی کرنسی ملی۔ قیدیوں کو ساتھ لیکر ہم نے پیدل ہی چندر نگر کی طرف کوچ کیا اور رات کے کوئی دو بجے وہاں جا پہنچے۔

ہمارا ارادہ تھا اب آرام کریں گے، لیکن میجر صاحب نے کہا۔ ایک اور خطرناک گروہ کے بارے میں اطلاع آئی ہے۔ اس لئے البدر کی ڈیوٹی لگاؤ اور اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی جب ہم لوگ نئے آپریشن پر روانہ ہوئے تو فائرنگ کی آواز آئی۔ میں نے ساتھیوں کو چوکنا رہنے کی ہدایت کی اور خود خبر لینے گیا۔

مکتی باہنی کے لوگ بالکل ہمارے قریب ہی تھے۔ ہم نے انہیں للکارا تقریباً دو گھنٹے گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔

رات کے اندھیرے میں یہ اندازہ لگانا تو مشکل تھا کہ ان کی تعداد کتنی تھی، لیکن وہ سات لاشیں، دس سٹین گنیں، ۲۵ ہینڈ گرنیڈ، بہت سا ایمونیشن اور پاکستان کے خلاف بھاشانی کی تقریر کے بہت سے سائیکلوسٹائل کاغذ چھوڑ گئے۔ اس قسم کی مہمات میں ہم کامیابیاں حاصل کرتے رہتے تھے، لیکن ہمیں سب سے بڑی کامیابی شیر پور سے پندرہ میل دور "نالیتا باڑی" مقام پر حاصل ہوئی۔ یہاں ہمیں اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ ملا۔

مومن شاہی سے ۲۵ میل دور پھول پور کے مقام پر "تل کلا" نامی پانچ میل چوڑی جھیل ہے جس میں کئی جزیرے ہیں۔ اگست کے آخری ہفتے میں ہمیں اس مقام کے متعلق یہ اطلاعات ملیں کہ یہاں مکتی فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

جب ہم جھیل کے نزدیک پہنچے تو اس سکیم کے تحت کہ ہمارے وہاں پہنچنے کے فوراً بعد فوج بڑھے گی اور ہم سامنے بھاگنے والے ایجنٹوں کا صفایا کریں گے۔ ہم نے کارروائی شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس سکیم کے تحت کارروائی شروع کرنے سے قبل ہی ہمارا ان سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ہم صرف ۲۴ البدر کیڈٹ اور ۱۵ فوجی نوجوان تھے۔ جب کہ مقابلہ

میں مکتی باہنی کے ۳۰۰ سے زائد مسلح افراد تھے۔

انہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا، لیکن ہم نے ہمت نہ ہاری۔ سارا دن فائرنگ ہوتی رہی۔ ہماری چیک پوسٹ ۹ میل دور تھی اور رابطہ قائم نہیں ہو رہا تھا۔ اس صورت حال میں ہم بہت محتاط ہو کر فائر کر رہے تھے۔ یہ اندیشہ موجود تھا کہ اگر گولہ بارود ختم ہو گیا تو بری طرح مارے جائیں گے۔ لیکن محتاط انداز سے فائرنگ سے بھی دشمن کے قدم اکھڑنے شروع ہو گئے اور جب وہ فرار ہوتے تو ۱۲ مشین گنیں، ۹ بندوقیں اور ۲۵ گرنیڈ مال غنیمت میں ملے۔

یہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہم پانچ پانچ افراد کا گروپ بن کر چیک پوسٹ کی طرف روانہ ہوتے۔ اپنا ایمونیشن ساتھ لیا اور وہاں سے نکلنے لگے۔ لیکن مکتی باہنی نے گھات لگا کر ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ وہ راستوں کے ارد گرد چھپ گئے اور یوں ہمارے لئے پھر خطرہ پیدا ہو گیا۔ اسی دوران میں ہمارے فوجی دستوں نے راکٹ لانچر استعمال کرنے شروع کئے اس ہتھیار کی آواز بہت ہی خوفناک ہوتی ہے۔ وہ سمجھے کہ شاید ہمیں کمک مل گئی ہے اور اب ہم نئے اسلحہ سے ان پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس لئے خوفزدہ ہو کر انہوں نے اپنے مورچے بھی خالی کر دیئے اور ہم رات کے تقریباً ۹ بجے بخیریت اپنی چیک پوسٹ پہنچ گئے۔

اس مہم میں رن کچھ اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شرکت کرنے والے فوجی ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا سخت معرکہ ان دونوں جنگوں میں بھی ہم نے نہیں دیکھا۔" نومبر کے پہلے ہفتے کی بات ہے کہ کمال پور سرحد پوسٹ پر پلیس البدر اور ساٹھ فوجی جوان تعینات تھے۔ رات کے وقت سابق ایسٹ پاکستان رائفلز، مکتی باہنی اور مقامی ہندوؤں نے ہماری چوکی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ حملہ آوروں کے مقابلے میں ہماری تعداد بالکل کم تھی اور اس کم تعداد میں سے بھی کچھ لوگ غیر حاضر تھے۔ تاہم ہم نے آہستہ آہستہ فائرنگ ختم کر دی دشمن سمجھا شاید ہم سب ختم ہو گئے ہیں، چنانچہ انہوں نے پیش قدمی شروع کر دی۔ ہم یہی چاہتے تھے۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھے ہم نے یک دم فائرنگ شروع کر دی۔ وہ بوکھلا گئے اور ۲۸ لاشیں اور بہت سا اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

اس قسم کی کامیابیاں ہم ہر دوسرے تیسرے روز حاصل کرتے رہتے تھے۔ اس دوران میں ہمارے دو ساتھی شہید ہوئے۔

دشمن سراسیمگی کے عالم میں فرار ہو گیا

نجم الثاقب (مومن شاہی) نے معرکوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ جولائی کا مہینہ تھا۔ ایک دن تو ہم مکتی باہنی سے دو دو ہاتھ کرنے کی نیت سے نکلے اور ان کے اڈے کا سراغ لگا کر ان کے سر پر جا پہنچے اور ایک تخریب کار پکڑ لیا جس سے مفید معلومات ملیں۔ ابھی تفتیش کر رہے تھے کہ اطلاع ملی شیرپور اور احمد نگر کی درمیانی شاہراہ والا پل تخریب کاروں نے اڑا دیا ہے۔ اسی اطلاع پر ہمارا دل بہت دکھا۔

میجر ریاض صاحب نے البدر کے کیڈٹس سے پوچھا:

"مکتی باہنی کی اس شرارت کی سزا دینے کے لئے کون کون آپریشن پر جائے گا؟"

سب ساتھیوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے کہ ہم جائیں گے۔ حالانکہ سبھی نے صبح کے وقت ہلکا سا ناشتہ کیا تھا اور سارا دن شدید گرمی میں بھاگ دوڑ کرنے کی وجہ سے نڈھال ہو چکے تھے۔ مگر پل تباہ ہونے کی خبر نے سب کی بھوک مٹا کر تازہ دم کر دیا تھا۔

چودہ البدر اور چودہ آرمی کے جوان روانہ ہوئے اور دس میل پیدل چلنے کے بعد اپنے ہدف کے قریب پہنچے اور سات سات البدر، سات سات آرمی کے دو گروپ بنا کر اس بستی کو گھیر لیا جس میں دہشت پسند چھپے ہوئے تھے۔ ہم لوگ سادہ کپڑوں میں تھے گھومتے گھومتے ایک سکول میں جا پہنچے۔ جہاں ایک سو سے زائد مکتی باہنی کے غنڈے مورچہ بند تھے۔

اس اسکول کی ایک جانب ندی تھی۔ ہمارا ایک گروپ ندی کی جانب سے اور دوسرا خشکی کی جانب سے حملہ آور ہوا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہوتی رہی، لیکن جلد ہی دشمن بے حوصلہ ہو گیا۔ انہوں نے ندی کی طرف سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ ہمارے ندی والے گروپ نے فائر کر کے گیارہ تخریب کار اڑا دیئے۔ مال غنیمت اور چار قیدی ہاتھ لگے۔ ہمارا کوئی

مالی و جانی نقصان نہیں ہوا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ آپریشن ہماری تربیت کے دوران میں ہوا۔

واپسی پر مومن شاہی شہر رک گئے۔ یہاں البدر منظم ہو رہی تھی۔ ہم تربیت میں شامل ہو گئے اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

چونکہ یہ ابتدائی زمانہ تھا۔ اس لئے فوج بھی پوری طرح اعتماد نہیں کر رہی تھی۔ آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ ہم چالیس البدر تھے اور ہمارے پاس صرف سولہ رائفلیں تھیں چند دن بعد دیگر ساتھی بھی تربیت کے پروگرام میں شامل ہو گئے۔ اس دوران میں مجھے پچاس البدر کیڈٹوں کے گروپ کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ ان پچاس ساتھیوں کے پاس چودہ رائفلیں اور ستر گولیاں تھیں، یعنی فی رائفل پانچ گولیاں۔

ایک دن ہم اسی ساز و سامان کے ساتھ آپریشن پر گئے اور رات کے وقت ایک ہندو کے گھر چھاپہ مارا۔ وہاں سے ہمیں سات رائفلیں ملیں۔ ہم نے یہ مالِ غنیمت فوج کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد انہیں ہم پر مکمل اعتماد ہوا اور مزید دس رائفلز دے دیں۔

اگلے روز ہم چار ساتھی آپریشن کے لئے روانہ ہوتے۔ اطلاع ملی تھی کہ شہر سے پندرہ میل دور ایک مقام پر ہندوستان سے آنے والے مکتی باہنی کے لوگ ہماری سرحد میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ اطلاع ہمارے ہی ساتھی نے مہیا کی تھی۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور ایک جیپ میں سوار ہو کر اس طرف روانہ ہو گئے۔ ہم اس جگہ پہنچے ہی تھے کہ مکتی باہنی کو ہماری آمد کا علم ہو گیا اور یوں دونوں جانب سے فائر کھل گیا۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر بلند کرتے ہوئے ہمارے ایک ساتھی عبدالغفور نے خوب جوہر دکھائے۔ ہم اسے برابر کہتے رہے کہ فائرنگ لیٹ کر کرو مگر وہ پوری طرح جوش میں تھا۔ اس کی گولی سے مکتی باہنی کا ایک غنڈہ مر گیا جس سے دیگر لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سمجھے کہ کوئی بڑی فورس ہماری پشت پر گاؤں کے باہر کھڑی ہے۔ اس لئے وہ سراسیمگی کے عالم میں فرار ہو گئے۔ ہم نے دشمن کے مورچہ میں پہنچ کر دو رائفلیں، ۲ گرنیڈ اور تین سو کے قریب گولیاں اپنے قبضے میں کر لیں اور واپس لوٹ آئے۔

ہم چاروں طرف سے گھیرے میں آگئے

نجم الثاقب (مومن شاہی) نے مزید بتایا کہ ایک دن بعد میرا الیف ایس سی کا فائنل امتحان تھا اور میں تیاری میں مصروف تھا کہ البدر انٹیلی جنس گروپ نے اطلاع دی۔ پچاس میل دور ایک گاؤں میں ۲۵ غداروں کا مسلح گروپ موجود ہے۔ اس اطلاع پر ہم تیس البدر تیار ہوئے اور بس میں سوار ہو کر ادھر روانہ ہوئے۔ دوپہر کے دو بجے کا عمل ہوگا۔ جب ہم اس گاؤں کے قریب پہنچے . . . .

غداروں نے ہمیں دیکھا تو گھبرا گئے۔ ان پر پوری طرح قابو پانے کے خیال سے ہم نے اپنے آپ کو نام بنگالی ظاہر کیا۔ جس پر مطمئن ہو گئے اور اپنے مرکز کا پتہ بتا دیا اس کے بعد ہم مکتی باہنی کے اڈے کی طرف روانہ ہوئے جو تین میل دور تھا۔ ہم تین گروپوں میں تقسیم ہو کر اپنی اپنی سمت بڑھے۔ ایک گروپ کے انچارج اقبال (رفیق جمعیت) دوسرے کے سراج (رفیق جمعیت) اور تیسرے گروپ کا انچارج میں تھا۔ پہلے ہمارے ایک گروپ نے حملہ کیا۔ اس کے ذرا دیر بعد دوسرا گروپ دائیں طرف سے بڑھا، مکتی باہنی نے مدافعت کے لئے زبردست فائرنگ شروع کر دی۔ اب ہمارا گروپ حملہ آور ہوا اور فائرنگ کرتے ہوئے پیش قدمی کرنے لگا۔ دشمن خفیہ پختہ مورچے میں ہونے کے باوجود گھبرا گیا انہوں نے ایک ایک کر کے کھسکنا شروع کر دیا جس پر بائیں جانب والے ہمارے گروپ نے فائر کھول دیا۔ اب ان کے لئے کوئی راہ فرار نہ تھی۔ جان بچانے کے لئے وہ قریبی ندی میں کود گئے ہم نے پوزیشن چھوڑ کر ان کا تعاقب کیا۔ ہم ندی کے کنارے کنارے دوڑ رہے تھے اور اکا دکا فائر بھی کرتے جاتے تھے۔

ہم نے انہیں ہتھیار ڈالنے کو کہا۔ پہلے تو وہ تیار نہ ہوتے کہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں، لیکن آخر حوصلہ ہار گئے اور ہتھیار ڈالنے پر رضامندی کا اظہار کرنے لگے۔ اس لڑائی میں دشمن کے دو آدمی ہلاک ہوئے۔ ایک فرار اور بقیہ گرفتار کر لئے گئے گرفتار شدگان سے نہایت اہم معلومات ملیں۔

عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ جب ہم یہ مہم سر کر کے اپنے کیمپ پہنچے۔ ہم سخت تھکے ہوئے تھے، لیکن کیمپ آئے ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ آرمی کی طرف سے اطلاع ملی ایک اور آپریشن کے لیے تیس البدر چاہئیں۔ ہم فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور آپریشن پر جانے کے لیے آمادگی کا اظہار کیا اور ۲۰ رضاکار اور تیس البدر پر مشتمل گروپ رات کے بارہ بجے نیا شکار کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

اس آپریشن کے بارے میں ہمیں معمولی معلومات بھی نہ تھیں۔ صرف اس اطلاع پر کہ دشمن شرارت پر آمادہ ہے۔ ہم تیار ہو کر چل پڑے تھے۔

اس گروپ کے انچارج کیپٹن عبدالقدوس تھے (جو اس آپریشن میں زخمی ہو گئے)۔ ایک گاڑی میں رات بھر سفر کر کے چالیس میل دور ایک پل پر اترے۔ پھر دس میل پیدل سفر کرنے کے بعد ایک جزیرے میں پہنچے —— ہمیں بتایا گیا کہ اس جزیرے میں مکتی باہنی کا ایک مضبوط اڈہ ہے۔ ایسٹ پاکستان رائفلز، بھارتی فوج اور دیگر باغیوں پر مشتمل پانچ سو افراد یہاں جمع ہیں۔ ابتدائی ہدایات کے بعد کیپٹن عبدالقدوس نے البدر کو ایک ٹیلے کی اوٹ لے کر حملہ کرنے کی ذمہ داری دی جس کے لیے خاصا لمبا چکر لگا کر جانا تھا۔

جب ہم اپنی پوزیشن کے لیے آگے بڑھے تو دشمن کی جانب سے مشین گن اور مارٹر کے فائر کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اس وجہ سے ہم اس ٹیلے تک بھی نہ پہنچ سکے۔ اب ہمارے گرد چاروں طرف گھیرا پڑنا شروع ہو گیا۔ پاک آرمی والا گروپ بھی پھنس گیا۔ دشمن بہت بہتر پوزیشن میں تھا۔ اس نے ہمیں ہتھیار ڈالنے کی ہدایت کی اور رضاکاروں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کش مکش میں البدر اور آرمی کے درمیان ہر قسم کا رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ تاہم اپنے اپنے محاذ پر دونوں ہی سر پر کفن باندھے لڑ رہے تھے۔

دشمن درختوں سے فائر کر رہے تھے۔ گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ دوسری مصیبت یہ کہ آرمی اور البدر دونوں کے پاس ایمونیشن ختم ہو رہا تھا۔ پاک آرمی کا ایک جوان شہید ہو گیا تھا اور البدر کا ایک جی دار ساتھی محمد یوسف شدید زخمی ہو کر گر پڑا تھا۔

اس صورت حال میں ہم نے سوچا جان بچنے کی تو کوئی صورت نہیں۔ پھر کیوں نہ آخری

سکے لڑتے ہوئے دشمن کو بھی گہرا نقصان پہنچائیں۔ یہ سوچ کر دیوانہ وار کھڑے ہو کر نعرہ تکبیر اللہ اکبر پکارتے ہوئے آگے بڑھے۔ پاک آرمی کا ایک جوان شہید اور دو شدید زخمی ہو گئے پھر بھی ہم جارحانہ انداز میں آگے بڑھے۔ محمد یوسف بھائی نے جو شدید زخمی تھے کہا: "آپ میری نگرانی کے لئے کسی کو یہاں نہ چھوڑیں، بس آگے بڑھتے جائیں"۔ ان کی یہ بات سن کر ہمارا حوصلہ اور بڑھا اور اس بے جگری سے حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اس لڑائی میں مکتی باہنی کے سات افراد مارے گئے۔

ہم آگے بڑھتے وقت زخمی یوسف (البدر) کے پاس ایک ساتھی کو چھوڑ کر دریا عبور کرنے کے لئے جونہی آگے بڑھے . . . . . تو ایک سنسناتی گولی آئی اور یوسف بھائی کے سر پر لگی وہ وہیں پر شہید ہو گئے اور جس ساتھی کو ان کے پاس چھوڑا تھا وہ بھی شہید ہو چکا تھا۔

اس جنگل میں ہاتھی اور شیر بھی تھے

افتخار الاسلام (چاٹگام) نے بتایا: "یہ رمضان المبارک کے اواخر کی بات ہے۔ میں کاکس بازار کے ناظم جناب عبدالاول سے ملنے کو ریش کھالی گیا۔ لوٹتے وقت شاہ جلال صاحب (رکن چاٹگام جمعیت) اور حنیف بھائی سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے سرسری طور پر کہا کہ آپ "البدر" میں شامل ہو جائیں اور بات آئی گئی ہو گئی۔

عید کے ایک ہفتہ بعد مو ہش کھالی گیا تو وہاں ان دونوں کو اور کاکس بازار کے ناظم کو متفکر بیٹھے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ "البدر" کے لئے طلبہ کو لینے یہاں آئے ہیں اور چونکہ اس جزیرے میں اجنبی ہیں۔ اس لئے تھانیدار اور رضاکار کمانڈر انہیں مکتی باہنی سمجھ کر گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ میں چونکہ انہیں اچھی طرح جانتا تھا اس لئے تھانیدار سے مل کر انہیں گرفتاری سے بچایا اور ان کی خاطر تواضع کی۔

حنیف بھائی نے مجھ سے کہا کہ "آپ جمعیت کے ان طالب علموں کو جو البدر میں شامل ہونا پسند کریں۔ ساتھ لے کر فوراً چاٹگام آ جائیں"۔ یہ کہہ کر وہ لوگ چلے گئے۔

تعلیمی مصروفیت کے باعث میرے پاس وقت نہ تھا۔ ورنہ میں کم از کم سو ساتھیوں کو لے

جاسکتا تھا۔ بہر حال ۱۲ کارکنان کو ادھر اُدھر سے اکٹھا کیا اور انہیں ساتھ لے کر چاٹگام پہنچا۔ کاکسس بازار کے ناظم عبدالاول بھی ہمارے ساتھ آملے۔ ان بارہ ساتھیوں میں سب سے چھوٹا طالب علم ساتویں جماعت کا سراج الاسلام تھا۔ یہ سبھی جوش وجذبہ سرفروشی سے سرشار تھے انہوں نے مکتی باہنی کے خلاف جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان بہادر دوستوں میں سے مختار احمد فراز (متعلم نہم) بشیر احمد، (متعلم ہشتم) اور سراج الاسلام (متعلم ہفتم) کو شہادت کا درجہ حاصل ہوا۔

تربیت کے لئے مجھے چاٹگام چھاؤنی بھیج دیا گیا۔ جہاں حوالدار ایوب نے بارود کی سرنگیں اور دستی بم وغیرہ کی ٹریننگ دی اور دوسرے دن ہی دس فائر بطور امتحان دیئے۔ میں نے تین فائر کیے۔ تینوں سیدھے اندرا گاندھی کے پیٹ میں لگے۔ اس بات کو مذاق نہ سمجھئے۔ دراصل ہم نے نشانہ بازی کے لئے اندرا کی ایک تصویر لٹکا رکھی تھی۔ استاد ایوب نے میری پیٹھ ٹھونکی۔ اور اعتمادی خط دے کر کیپٹن کے پاس بھیج دیا۔ جس نے مجھے البدر میں باقاعدہ شامل ہونے کی اجازت دے دی اور اس طرح میں دس دن کے بجائے ایک ہی دن کی تربیت کے بعد البدر میں شامل ہوگیا۔

ہمیں البدر کے ایک شہری کیمپ میں رکھا گیا۔ ہم تخریب کاروں کا پتہ چلا کر فوج کو بتاتے۔ ابتدا میں یہی کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔ چند روز بعد ہم اپنے ہیڈ ماسٹر سے ملنے عیدگاہ گئے وہ ہمیں اور اپنے بیٹے مختار احمد فراز شہید کو وردی میں کیل کانٹوں سے لیس دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ ہماری وردی پہلے سیفد کرتا پاجامہ تھی۔ پھر ہم باقاعدہ فوجی ڈریس پہننے لگے۔

ایک دن دیہاتیوں نے ہمیں بتایا کہ یہاں سے اٹھارہ میل بینگنڈیا کے قریب جنگل میں ایک پہاڑی پر مکتی باہنی کا اڈہ ہے۔ جہاں سے وہ حملہ کرتے ہیں اور کل ہی ایک معزز شہری کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔

اس گھنے جنگل میں کچھ وحشی جانور بھی تھے۔ تاہم ہمارے خون نے جوش مارا اور ہم تینوں ساتھیوں نے فوج کے بارہ سپاہی اور ۹۰ رضاکار اپنے ساتھ لئے اور رات کے ایک بجے کے قریب مکتی باہنی کو ان کے اڈے کے قریب جالیا۔ ان دنوں فوج کے سپاہیوں کو

مخصوص حالات میں البدر کی رہنمائی میں وقتی طور پر دے دیا جاتا تھا۔

اس اڈے میں مکتی باہنی کے تین سو مداخلت کار موجود تھے۔ ہم نے پوزیشن سنبھالی اور عام حملہ شروع کر دیا۔ رات بھر لڑائی ہوتی رہی۔ صبح ہوئی تو پیش قدمی کر کے اڈے کو گھیر لیا مکتی باہنی والے خوفزدہ ہو کر بھاگتے رہے اور ہم مارتے رہے۔ تین گھنٹے بعد وہاں پر ہمارا مکمل قبضہ ہو گیا۔

پہاڑی کی چوٹی پر ان کا ہیڈ کوارٹر تھا جس میں باقاعدہ ڈائننگ روم بھی موجود تھا۔ مال غنیمت میں ہمیں ۳۱ رائفلیں، چودہ گرنیڈ، تین اسٹین گنز اور کئی پیٹی ایمونیشن ملا۔ پچاس تخریب کار مارے گئے۔ ہمارا کوئی نقصان نہ ہوا۔ البتہ ایک رضاکار اپنی غلطی کی وجہ سے اپنے ہاتھوں مارا گیا۔ ظہر کی نماز کے بعد اٹھارہ میل پیدل چل کر ۹ بجے کے قریب نعرۂ تکبیر اور "البدر زندہ باد" بلند کرتے ہوئے اپنے کیمپ میں آ گئے۔

اب ہمارے دن رات شہر میں آپریشن پر گزرتے۔ کرفیو لگتا اور ہم تخریب کاروں کو ڈھونڈنے لگتے۔ شہر کے علاوہ ہم مضافات میں بھی شر پسندوں کی تلاش میں نکل جاتے۔

ایک مہم کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جنگ کے دوران میں دس دسمبر ۷۱ء کو رات ۱۲ بجے چاٹگام۱؎ خبر پہنچی کہ رنگا ماٹی سیکٹر میں بھارتی چھ میل اندر گھس آئے ہیں۔ صوبیدار منور خان کے ساتھ ہم دس البدر اور دس رضاکار وہاں جا پہنچے۔ بھارتی فوجیوں کا حملہ جاری تھا۔ وہ مسلسل آگ برسا رہے تھے۔ ہم نے کچھ دیر فائرنگ کی اور پھر خاموش ہو گئے۔ بھارتی سمجھے کہ پاکستانی فرار ہو گئے، چنانچہ انہوں نے مورچوں سے باہر نکل کر پیش رفت شروع کر دی اب ہم نے عام حملہ کر دیا۔ تکبیر کی صدائیں گونجتی رہیں اور بجے کار سے دور جاتے رہے۔ وہ فرار ہو گئے تو ہم تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ اسی طرح کسی پیچیدہ جنگی حکمت عملی کے بغیر سیدھے سادھے انداز میں ہم نے تین گھنٹے کے اندر اندر دشمن کو کئی میل پیچھے دھکیل دیا اور اپنے پرانے مورچوں پر پھر ڈٹ گئے۔ ہم مزید آگے بڑھ سکتے تھے اور بڑھنا چاہتے تھے۔ ہمارا ساتھی صوبیدار بے تاب تھا۔ مگر ہمیں ایڈوانس سے روک دیا گیا۔

۱؎ چٹاگانگ اور چاٹگام ایک ہی شہر کا نام ہے۔

"جدھر سے گولی آئے ادھر چلو"

اسلام الدین (جمال پور) ایک معرکے کا تذکرہ کرتے ہوئے بتا رہے تھے "ہم ماہ اکتوبر میں سحری کے وقت سریشا باڑی سے پانچ میل دور قصبے مونگیلیا کے آپریشن پر روانہ ہوئے۔ بائیس البدر کیڈٹ، پانچ آرمی کے سپاہی اور دس رضاکار تھے۔

راستے میں دشمن کا کوئی سپاہی نظر نہیں آیا، لیکن جب گاؤں کے درمیان میں پہنچے۔ تو چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ برسات کا موسم تھا، ہر طرف پانی، کیچڑ اور دلدل تھی۔ پھسلن اس قدر تھی کہ چلنا دشوار تھا۔ ہم سخت پریشان ہوئے۔ چاروں طرف سے مکتی باہنی کا فائر آ رہا تھا۔ ہم نہ چھپنے کی پوزیشن میں تھے اور نہ پوزیشن لینے کا موقع مل رہا ہے جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو ہم کیچڑ ہی پر لیٹ گئے اور جواب دینا شروع کیا۔

میاں محمد خان حوالدار آپریشن انچارج تھے کچھ دیر بعد انہوں نے اسی حال میں پیشقدمی کا حکم دیا اور کہا جدھر سے گولی آ رہی ہے۔ ادھر چلو! حکم ماننا ضروری تھا اس لئے ہم رینگتے رینگتے دو گروپوں میں منقسم ہو کر دشمن کی طرف بڑھنے لگے۔

مکتی باہنی کے لوگ ایک پختہ مکان میں تھے اور وہیں سے فائر کر رہے تھے۔ ہم نعرۂ تکبیر کی گونج میں اس مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ یہ عمل ساڑھے چار گھنٹے میں مکمل ہوا۔ یہ اس قدر طوفانی لمحے تھے کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ مکتی باہنی نے ہمیں روکنے اور قابو پانے کی بہت کوشش کی، لیکن معمولی سی کامیابی بھی حاصل نہ ہوئی اور اسے راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔

اس مکان پر قبضہ کرنے کے بعد ہم آگے روانہ ہوئے۔ ایک جگہ معلوم ہوا دشمن کے کچھ آدمی ایک مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم نے انہیں للکارا تو فائر آنے لگا، لیکن ہم نے آدھ گھنٹہ میں انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

اب آپریشن انچارج نے واپسی کا حکم دیا اور جب ہم واپس ہونے لگے تو معلوم ہوا کہ ہمارے نہایت مخلص ساتھی نورالامین موجود نہیں، تحقیق پر معلوم ہوا کہ وہ زخمی ہو کر گر گئے تھے۔

مکتی باہنی کے فرار ہونے والے غنڈوں نے انہیں خنجر گھونپ کر شہید کر ڈالا۔ وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ مزید افسوس ناک بات یہ تھی کہ ان کے والد معاشی طور پر نہایت ہی کمزور تھے، لیکن بات ایسی تھی کہ کچھ مداوا نہ ہو سکتا تھا۔ نورالامین شہید کی لاش دفن کر کے ہم اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئے۔ اس نقصان سے قطع نظر یہ آپریشن نہایت کامیاب رہا تھا۔

روسی ساخت کا اسلحہ ہاتھ لگا

اسلام الدین ہی نے بتایا کہ ماہِ رمضان میں ایک رات البدری ساتھیوں میں راشن تقسیم ہو رہا تھا۔ گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ہم کل چونتیس ساتھی تھے اور ابھی تقسیم کرنے والا پندرھویں ساتھی تک پہنچا تھا کہ آرڈر ہوا فوراً آپریشن پر چلیے۔

یہ حکم سن کر باقی ساتھیوں نے راشن نہیں لیا۔ پندرہ ساتھیوں کا راشن بھی ایک تھیلے میں بند کر کے رکھ دیا گیا۔

سرشیا باڑی تھانہ کے ایک گاؤں کالی باڑی سے اطلاع ملی کہ وہاں کے ہندوؤں نے مکتی باہنی کے ایک گروپ کو پناہ دے رکھی ہے۔

میجر ریاض کی قیادت میں ۳۵ آرمی جوان اور میری نگرانی میں ۲۵ البدر ساتھیوں کا دستہ روانہ ہوا اور سحری کے وقت جعفر شہید ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا اور ریل گاڑی سے اتر کر منزل کی طرف مارچ کرنے لگا۔ راستے میں چلتے چلتے سوکھی روٹی کے ٹکڑے ایک دوسرے کو بانٹ رہے تھے۔

کالی باڑی اسٹیشن سے تقریباً سات میل تھا۔ یہ راستہ ہم نے بہت تیزی سے طے کیا۔ ہم تین گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ دو گروپ گھیرا ڈالنے کے لئے مخصوص کئے گئے اور ایک ممکنہ راہِ فرار کو مسدود کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ میں اپنے گروپ کو لے کر ابھی اپنی پوزیشن پر نہیں پہنچا تھا کہ میجر صاحب کے گروپ نے مورچہ شکن فائر کر دیا۔ دس پندرہ منٹ تک فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور پھر دشمن بہت سا اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ ان کے مرکز میں بھارتی اور روسی ساخت کے اسلحہ کی پیٹیاں تھیں جن پر قبضہ کر لیا گیا۔

ہم نے ان کا تعاقب کیا تو راستہ میں ایک اور خفیہ مرکز دریافت ہوا۔ اس سے بھی ان کا گروپ فرار ہو گیا تھا۔ مورچے میں پہنچے تو مولوی عبدالستار اور ان کے بیٹے کو رسیوں سے جکڑا ہوا پایا۔ انہیں مکتی باہنی کے غنڈوں نے صبح شوٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا ان کے بچنے کے لیئے واحد صورت یہ تھی کہ کسی طرح چودہ ہزار روپے مہیا کرتے اور یہ کسی طور بھی ممکن نہ تھا انہیں ہم نے رہا کر دیا اور بہت عزت کے ساتھ اپنے ساتھ لے آئے۔

موت بھاگتی ہے

اسلام الدین نے مزید بتایا کہ عیدالفطر کے دو روز بعد جمال پور سے پانچ میل جنوب میں ندی کی دوسری جانب تخریب کاروں نے شب خون مارا اور وہاں پر موجود جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے پانچ کارکنوں کو شہید کر دیا۔

رات کے پچھلے پہر ہمیں اس المناک واقعے کی اطلاع ملی جس پر ہم کیمپ البدر جائے حادثہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم ندی سے کچھ دور تھے کہ معلوم ہوا وہ ندی کا پل اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں جب انہیں ہماری آمد کا علم ہوا تو انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ہمارے ساتھ آرمی کا ایک مجاہد دستہ بھی مل گیا۔

دشمن کے پاس تین کمپنیوں کی مددی قوت تھی۔ یہاں ساڑھے تین گھنٹے کی لڑائی کے بعد ہی مکتی باہنی نے راہ فرار اختیار کی۔ وہ اپنا اسلحہ دریا میں پھینک کر دوسری جانب ہو رہے تھے۔ اب ہم ایک طرح نہتے تھے۔ گولہ بارود بالکل ختم ہو گیا۔ لیکن ہم بے حوصلہ نہ ہوئے ہم نے رائفلوں پر سنگینیں چڑھالیں اور ان کا پیچھا کرنے لگے۔

ان میں سے کچھ من چلے بھاگتے بھاگتے فائرنگ کرتے جا رہے تھے۔ گولیاں ہمارے قریب سے گزر رہی تھیں۔ مگر اللہ کی مہربانی سے ہمارے کسی ایک فرد کو بھی گولی نہ لگی۔ دشمن کے سات آدمی ہلاک ہوئے۔ ایک زخمی کو ہم نے گرفتار کر لیا۔ اس نے بتایا کہ ہم خود

حیران تھے کہ ہماری گولیاں آپ کو لگتی کیوں نہیں۔

میرے خیال میں یہ ایک نہایت خطرناک مہم تھی جس کے ہمارے لئے ہولناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ اسلحہ ختم ہو گیا تھا اور ہماری تعداد بھی کم تھی، لیکن یہ خدا کا انعام تھا کہ ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی خوف زدہ نہ ہوا۔ بلکہ آرڈر کی تعمیل کرتے ہوئے برابر چلتا گیا۔ سچ ہے کہ جب موت کا خوف نہ رہے تو پھر انسان کے آگے آگے موت بھاگتی ہے۔

البدر "بدر" کی امین تھی

کیپٹن احسن نے بتایا کہ وہ اور ان کے ساتھی ضلع میمن سنگھ کے ایک جنگل میں تھے کہ ایک دن ان پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ یہ حملہ اچانک اور چھپ کر کیا گیا تھا لیکن ہم ہراساں نہ ہوئے۔ ذرا دیر بعد ہی گولی چلانے والے خود گولیوں کی زد میں تھے اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

پہلے تو میں سمجھ رہا تھا کہ پاک فوج کا کوئی دستہ ہماری مدد کو پہنچ گیا ہے اور اس کی فائرنگ نے مکتی باہنی کو بدحواس کر دیا ہے۔ مگر جب مکتی باہنی کو گھیرے میں لے لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ہماری فائرنگ ہی سے بدحواس ہو گئے تھے۔

یہ علاقہ ایسا تھا کہ وہ آسانی سے اپنا بچاؤ کر سکتے تھے۔ پاکستانی فوج اس علاقے سے بالکل ناواقف تھی۔ مزید پریشانی یہ تھی کہ فوج کا بنگالی حصہ غداری کر چکا تھا، لیکن اس کمزوری کے باوجود ہم ان پر قابو پا چکے تھے اور یقیناً یہ سب کچھ اللہ کی خاص مہربانی سے ہوا تھا۔

اس خوفناک جنگل کے چپے چپے سے واقف ہونا لازمی تھا۔ میں ابھی معمے کو حل کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک طرف سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور پھر پاکستان زندہ باد کے نعروں سے پورا جنگل گونج اٹھا اور اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے مکتی باہنی پر زوردار حملہ ہو چکا تھا۔ مکتی باہنی اپنے بچاؤ کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اب میں نے اپنے ساتھیوں کو زبردست فائرنگ کرنے کا حکم دیا جس سے رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ وہ تقریباً ۲۰۰ افراد تھے جن میں سے ۴۰ ہلاک یا زخمی ہو چکے تھے۔ جب ہم انہیں

حراست میں لینے کے لئے آگے بڑھے تو دوسری طرف سے کسی نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ بیس بائیس برس کا ایک طالب علم اپنے ساتھیوں کے ساتھ تقریباً بھاگتا ہوا ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ جب آپ لوگوں نے کارروائی شروع کی تو میں نے بھی فائر کھول دیا تھا۔ اب ہماری سمجھ میں آیا کہ دشمن اتنی تعداد میں ہونے کے باوجود اتنی جلدی کیوں بدحواس ہو گیا تھا۔

اس نوجوان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ اس کا نام قمر العالم ہے وہ جمعیت کا کارکن اور البدر پلاٹون کمانڈر ہے اور کشور گنج کا رہنے والا ہے۔

اس مہم کے بارے میں اس نے بتایا کہ جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ پاک فوج کا ایک دستہ اس جنگل کو تخریب پسندوں سے پاک کرنے کے لئے آپریشن کے لئے آیا ہے، تو یہ سوچتے ہوئے کہ پاک فوج اس جنگل سے ناواقف ہے اور یہاں مکتی باہنی کی طاقت بھی کافی ہے۔ ہم نے جنگل میں داخل ہو کر مکتی باہنی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم دیکھ بھال کے لئے اس طرف آئے تھے کہ آپ لوگوں کو دشمن سے مقابلہ کرتے دیکھا اور ہم بھی اس لڑائی میں شریک ہو گئے۔

اب ہمارا البدر سے رابطہ ہو گیا تھا۔ ایک دن میں نے قمر سے کہا کہ اس علاقے میں مکتی باہنی کا لیڈر کوئی بڑا خطرناک آدمی ہے۔ وہ کتنی ہی تخریبی کارروائیوں کی قیادت کر چکا ہے۔ اسے پکڑنے کے لئے کچھ کرنا چاہیے۔

قمر نے کہا آپ کا خیال درست ہے وہ شخص واقعی بہت خطرناک ہے۔ میں خود اس کی فکر میں ہوں اور اسے گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اجازت دیں تو آج ہی روانہ ہو جاؤں۔

میں نے پوچھا تم کتنے آدمی ساتھ لے جانا چاہتے ہو اس نے کہا: "اس کام میں میرے ساتھ ابو نذیر اور کبیر احمد ہی کافی ہیں!"

میں چاہتا تھا وہ زیادہ آدمی لے جائے مگر ان تینوں کی دلیری اور ذہانت کا اندازہ کر کے خاموش رہا۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے ہوں گے کہ قمر، ابو نذیر اور کبیر احمد میرے پاس پہنچ گئے میں نے دیکھا ایک جوان آدمی بھی اُن کے ساتھ، ان کی گرفت میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ چھاپہ کامیاب رہا اور مکتی باہنی کا مقامی لیڈر گرفتار ہو چکا ہے۔

میرے پوچھنے پر ابو نذیر نے اس کی تصدیق کر دی اور پھر میں اس لیڈر سے مختلف قسم کے سوالات پوچھنے لگا۔ مگر وہ کسی قسم کی معلومات مہیا کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنی رائفل کی نالی اس کے سینے پر رکھ دی تو اس نے کہا: "کیپٹن صاحب! میں آپ کا دشمن سہی، مگر قمر العالم کا بھائی بھی ہوں، کیا مجھے بھی گولی مار دیں گے؟"

میں سناٹے میں آ گیا اور تقریباً چیختے ہوئے اس سے پوچھا: "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

اس نے دوبارہ یہی کہا۔ میں نے قمر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔ اُس نے کہا:

"واقعی یہ میرا بھائی ہے۔ ہمارا باپ عوامی لیگ کا مقامی رہنما ہے اور میرا یہ بھائی مکتی باہنی کا لیڈر رہے"۔

یہ سن کر میں نے اپنی رائفل زمین پر پھینک دی اور کہا:

"اگر یہ ایک مجاہد کا بھائی ہے تو اسے گولی مارنا میرے بس کی بات نہیں"۔

قمر نے جلدی سے رائفل اٹھالی اور اپنے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا: "تم اگرچہ میرے بھائی ہو، مگر اس وقت معاملہ پاکستان کی سالمیت کا ہے۔ پاکستان جس کی حیثیت ہمارے لئے ایک مسجد کی سی ہے۔ اگر تم اس مسجد کو نقصان پہنچانے سے باز آنے کا وعدہ کرو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ ورنہ یہاں غزوۂ بدر کی تاریخ دھرائی جائے گی اور اس مسجد کی حفاظت کرتے ہوئے کوئی رشتہ میری راہ میں حائل نہیں ہو گا"۔

قمر کا بھائی خاموش تھا۔ غالباً وہ ہندوؤں اور علیحدگی پسندوں کے دیئے ہوئے نام نہاد نعرے سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا اور پھر اپنے بھائی کے جملوں کی صداقت پر بھی شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ اس کا بھائی تھا۔ ذرا دیر بعد اس نے ہولے سے انکار میں سر ہلایا اور اس کے ساتھ ہی گولی اس کے سینے سے پار ہو گئی۔

ایک تخریب پسند زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا اور اس کا مجاہد بھائی عزم و استقامت کی تصویر بنا اس کے پاس کھڑا تھا اور پھر وہ آنکھوں میں آنسو لئے میرے سینے سے لپٹ گیا۔ میں خود اس سارے منظر کو دیکھ کر تڑپ گیا۔

جہانگیر بھائی شہید ہوئے اور فوج ہم سے الگ ہوگئی: ابو نصر فاروقی نے بتایا:

"زائن گنج ڈھاکہ سے ۱۱ میل دور ہے۔ ہمیں وہاں سے کافی فاصلے پر منشی گنج کے جنوب مغرب میں ایک آپریشن کا آرڈر ملا۔ اس آپریشن پر آرمی کے ۱۰ ، البدر کے ۵۰ اور ۴۰ رضاکار روانہ ہوئے۔ اپنے مرکز سے روانہ ہو کر رات کے تین بجے زائن گنج پہنچ گئے۔ یہ ماہ نومبر کے ایام تھے۔ ہم نے سحری کھائی اور لانچ میں بیٹھ کر آپریشن کے مقام پر جا پہنچے۔

توقع کے مطابق وہاں بھارتی تخریب کار مورچہ بند تھے۔ انہوں نے یہ پورا علاقہ خالی کرا لیا تھا اور اپنی پوزیشن ہر لحاظ سے مضبوط بنالی تھی۔ تاہم ہم پُر امید تھے۔ یقین تھا ہماری مدد کے لئے پاک بحریہ بھی آرہی ہے، مگر بدقسمتی سے وہ راستہ بھول گئے اور کسی دوسری جانب نکل گئے۔

اس افسوسناک صورت حال کا سبب دراصل وائرلیس کوڈ (Wirless Code) کا آؤٹ ہو جانا تھا۔ ہمیں پوری کارروائی کے دوران میں پاک بحریہ کا پتہ نہ چل سکا۔

تقریباً چار بجے رات دشمن سے ہماری پہلی جھڑپ ہوئی۔ ہم نے زبردست فائرنگ کی۔ ہماری جانب سے سٹین گن استعمال ہو رہی تھی، لیکن ایک پریشانی یہ تھی کہ ہم نشیب میں اور کھلی جگہ تھے۔ جہاں کوئی درخت بھی نہ تھا۔ ہندوستانی فوج اور مکتی باہنی اونچی جگہ سے فائرنگ کر رہے تھے۔ وہ درختوں کی اوٹ میں تھے اور اپنے مورچوں میں بیٹھے فائر کر رہے تھے۔

ہمارے البدر کمانڈر ابو محمد جہانگیر بھاگ دوڑ کر کے ہماری صف بندی کر رہے تھے۔ مسلسل ہدایات دے رہے تھے کہ دشمن کی جانب سے اسٹین گن کی ایک باڑ (Burst) آئی اور ان کے سر اور سینے میں گولیاں پیوست ہو گئیں اور وہ شدید زخمی ہو کر گر گئے۔ گولیوں کی بوچھاڑ اس قدر شدید تھی کہ کسی کو انہیں اٹھانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ پھر وہ البدر

آگے بڑھے اور انہیں اٹھا کر محفوظ جگہ پر لے آئے۔ محفوظ جگہ بھی کیا تھی، نہ طبی امداد کا معقول انتظام اور نہ فوجی ڈاکٹر، بس ہری بھری گھاس کا خدائی فرش اور دو درختوں کا سایہ تھا۔

لڑائی مسلسل جاری تھی۔ دشمن کے پاؤں نہیں اکھڑ رہے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی اعتبار سے پسپا نہیں ہونا چاہتا۔ ہم ان پر حاوی ہونے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔ اسی اثناء میں خبر پہنچی کہ جہانگیر بھائی شہید ہو گئے۔ ساتھ ہی ہمارے فوجی کمانڈر نے آرڈر دیا کہ "پیچھے ہٹ جاؤ!"

ہم نے کہا ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے کیونکہ ہمارے کمانڈر شہید ہو گئے ہیں۔ ہم ان کا بدلہ ضرور لیں گے۔ اس بات پر فوجی افسر سے تلخی ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس معرکے میں پاک فوج کو مزید ملوث نہیں کر سکتے۔ آپ کی جو مرضی ہو کریں۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو شوق سے لڑیں ہم فوجی جوان پیچھے ہٹائیں گے اور اس کے ساتھ ہی فوج اس معرکہ سے الگ ہو گئی۔

ہمارے ساتھی جذبہ شہادت سے سرشار ہو کر والہانہ طور پر آگے بڑھے۔ ہماری یہ کارروائی اس قدر اچانک اور جارحانہ تھی کہ دشمن بدحواس ہو گیا اور پسپا ہونا شروع ہو گیا۔

مغرور ہندوستانی فوج کے کچھ سپاہی ایک سکول کی عمارت میں اور کچھ ایک مسجد میں گھس گئے باقی فرار ہو گئے۔

اس کامیاب معرکے کے بعد ہم نے ان کے مورچوں میں جا کر دیکھا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سب مورچے کنکریٹ کے بنے ہوئے تھے۔ یہ بات سمجھ نہ آتی تھی کہ ایسے حالات میں اور اتنی جلدی انہوں نے کنکریٹ کے مورچے کس طرح تعمیر کر لئے، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب مورچے کافی دن پہلے بنائے گئے تھے اور انہیں مٹی ڈال کر چھپا دیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بھارتی ایجنٹ بہت پہلے سرگرم عمل تھے۔ انہوں نے نہایت منظم انداز میں پیش بندی کے طور پر تمام ضروری اقدامات کر لئے تھے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ اس زمانے میں پاکستان کی سول انتظامیہ اور جاسوسی کے اداروں سے یہ اقدامات کیونکر پوشیدہ رہے۔

مسجد اور اسکول میں گھسنے والوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان جنگی قیدیوں سے ہمیں معلوم ہوا

کہ وہ اس پوائنٹ سے ڈھاکہ پر قبضہ کرنے کے لیئے راستہ ہموار کرنے آئے تھے۔

اگلے روز جہانگیر شہید تجہیز و تکفین کی گئی۔ انہیں عظیم پور قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ہر چہرہ اشکبار تھا، البدر کے جوانوں کی آنکھیں رو رو کر سوج گئیں۔ ساتھیوں کو صبر کرانا مشکل ہو گیا تھا۔

دشمن طوفانی حملہ برداشت نہ کر سکا

ندار الاسلام (ڈھاکہ) نے پہلے آپریشن سے متعلق بتایا۔

"شام چار بجے ہمیں آرمی نے اطلاع دی کہ آپریشن پر جانے کے لیئے تیار ہو جاؤ! یہ پہلا آپریشن تھا جس پر میں روانہ ہوا۔ ہم رات ۹ بجے نرائن گنج پہنچے۔ سردی بہت تھی۔ مزید یہ کہ ہمارے پاس مناسب گرم کپڑے بھی نہیں تھے۔

فیصلہ ہوا کہ رات بھر آرام کیا جائے اور صبح کارروائی شروع کی جائے۔ لیکن پھر طے پایا کہ رات چار بجے ہی حملہ کیا جائے۔ اسی فیصلے کے مطابق لوگ پاک آرمی کی گن بوٹ میں سوار ہوئے اور اپنے ہدف سے چند میل ادھر دریا کے کنارے اتر گئے۔

سحری کا وقت تھا۔ شدید سردی اور پیدل سفر، جسم سن ہو رہا تھا۔ تاہم ہم مردانہ وار آگے بڑھ رہے تھے۔ راستے میں ایک ندی حائل ہوئی تو اسے انہی کپڑوں میں اپنے اپنے سامان سمیت تیر کر عبور کیا اور پھر پروگرام کے مطابق اس گاؤں کو گھیرے میں لے لیا جس میں مکتی باہنی نے مورچے قائم کر رکھے تھے۔ دشمن کو ہماری کارروائی کا علم ہوا تو اُس نے شدید فائرنگ شروع کر دی۔ ہم زمین پر لیٹ گئے اور رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ ہدف کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ہمارے ایک ساتھی کو گولی لگی، لیکن خدا کی شان دیکھئے یہ گولی اس کی رائفل کے بٹ پر لگی جس سے بٹ کے پرخچے اڑ گئے۔ مگر وہ خود بالکل محفوظ رہا۔ البتہ کچھ دیر بعد ہمارا ایک فوجی شہید ہو گیا۔

دشمن کی دفاعی لائن بہت مضبوط تھی۔ کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا اور ہم زیادہ نقصان میں تھے۔ البدر کمپنی کے کمانڈر ابو محمد جہانگیر رائفل اٹھائے ہوئے اچانک کھڑے ہوئے اور

دشمن کے مورچوں کی طرف فائر کرتے کرتے صف بندی کرنے لگے اس سے ساتھیوں کے حوصلے زیادہ بڑھے اور وہ بھی پرجوش نظر آنے لگے۔ ابو محمد جہانگیر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے میرے قریب سے گزرے۔ اچانک سٹین گن کا فائر آیا اور گولی جہانگیر کے سر اور سینے میں پیوست ہوگئی۔ ہمارے میڈیکل کالج کے دو سینیئر ساتھیوں نے انہیں تھاما اور پیچھے لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ شہید ہوگئے۔ پھر کیا تھا ہم سب دیوانہ وار آگے بڑھنے لگے ہمارا عہد یہی تھا کہ ہر شخص نتیجے کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھے۔ نعرۂ تکبیر کی گونج میں ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ دشمن بھی بے جگری سے جواب دے رہا تھا، لیکن ہمارے اس طوفانی حملے کے سامنے وہ حوصلہ برقرار نہ رکھ سکا۔ دن کے تقریباً ایک بجے ہم نے وہ گاؤں فتح کرلیا۔

۱۸ تخریب کار پکڑے گئے اور کافی ہتھیار ہاتھ آئے۔ ہمارا یہ حملہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا تھا۔

دو دن بھوک پیاس اور محاصرے میں گھرے رہے

فضل الاسلام نے مزید بتایا کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں ہماری کمپنی نواب گنج آپریشن کے لئے روانہ ہوئی۔ یہاں ایک جزیرہ مکتی باہنی کے قبضے میں تھا۔

ہم وہاں پہنچے تو کسی طرح دشمن کو ہماری آمد کی اطلاع مل گئی۔ وہ چوکنا ہوگیا اور بہت چالاکی سے ہمیں گھیرے میں لے لیا، لیکن ہم نے ہمت نہ ہاری پوری طاقت سے مقابلہ کرتے رہے۔ یہ مقابلہ دو دن جاری رہا اور ہمیں بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔ مورچوں میں لیٹے لیٹے نمازیں پڑھیں۔ کھانے پینے کو کچھ پاس نہ تھا۔ پتے اور گھاس کھا کر گزارا کیا۔

حالات کا اندازہ کرکے ہم نے وائرلیس پر ڈھاکہ مدد کے لئے سگنل بھیج دیا تھا۔ دو دن بعد وہاں سے البدر کی ایک پلاٹون اور پاک آرمی کے کچھ سپاہی ہماری مدد کو پہنچے اور پھر گھیراؤ ٹوٹ گیا۔

اب ہم موٹر لانچ میں بیٹھے اور دوسرے کنارے جا اترے اور وہاں جا کر تین گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔

اِدھر اُدھر سے ابھی تک فائر آ رہا تھا، لیکن ہم اس کی پرواہ نہ کر رہے تھے۔ بس ایک ہی دھن تھی کہ جس طرح بھی ہو دشمن کو خاک میں ملا دیں۔ اس لڑائی میں ہمارا یا پاک آرمی کا ایک بھی آدمی شہید نہ ہوا۔ جب کہ مکتی باہنی کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ ہم اس محاذ پر تین دن ڈٹے رہے اور پھر لوٹ آئے۔ اس طرح ہمارا تین روز تک لڑنا اور پھر محفوظ رہنا اللہ کی غیبی امداد اور اس کا احسان عظیم تھا۔

ہندوستان کی سرحد میں دہشت پھیلا دی

فضل الرحمٰن (فینی) نے بتایا: اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ہم نے مقامی انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ ہمیں "البدر" منظم کرنے کی اجازت دی جائے۔ مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اس مرحلے پر بریگیڈیئر اسلام، کیپٹن اسحاق (۲۴ فرنٹیئر فورس)، میجر بخاری (۳۹ بلوچ رجمنٹ) نے حوصلہ افزائی کی اور بالآخر اکتوبر کے وسط میں البدر کی تشکیل ہو گئی۔

اس سے قبل جمعیت کے کارکنان پر مشتمل گروپ کو رضا کار یا مجاہد نہیں بلکہ والنٹیئر کہا جاتا تھا۔

البدر بننے کے بعد محمد الیاس اس کے کمانڈر مقرر ہوئے اور فوجی نقطۂ نظر سے شعبہ جات کی تشکیل ہوئی۔ ایک گوریلا پلاٹون تیار کی جس نے اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہو کر دہشت پھیلا دی۔ اس نے ہندوستانی علاقے میں تھانوں اور دیگر تنصیبات کو بہت نقصان پہنچایا اور ہمارا کوئی کیڈٹ گرفتار ہوا اور نہ زخمی۔

اسی گروپ کی کاوش کے نتیجے میں مکتی باہنی کے چار چوٹی کے کمانڈر اپنے انجام کو پہنچے۔

اسی طرح نومبر کے آخری ہفتے میں پاشن رام تھانہ پاکستان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے تحفظ کے لئے بڑی کوشش کی گئی تھی لیکن دشمن کا دباؤ اس قدر شدید تھا کہ کامیابی نہ ہوئی۔ یہاں پر میجر بابر

کی زیر قیادت بلوچ رجمنٹ کی ایک کمپنی نے ہتھیار ڈال دیئے۔

روح القدس کمانڈر البدر کی زیر قیادت ۔ ۴۰ البدر نے تین دن تک بھارتی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن اسلحہ ختم ہوجانے کی وجہ سے وہ بھی گھیرے میں آگئے اور سب شہید کردیئے گئے۔ ان میں سے کوئی بھی ساتھی بعد میں کہیں دیکھا نہیں گیا۔

بعد ازاں ساگل نایا اور شنگ باغ تھانہ جات بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ پاک فوج کا اس علاقے میں حصار ٹوٹ گیا۔ تھانہ پاشورام البدر کا کیمپ تھا۔ اس جگہ شدید جھڑپیں ہوئیں ہمارے ساتھی حمید الدین شہید ہوگئے۔

اس ناکامی کے باوجود پاک فوج اور البدر نے صفیں درست کرکے فینی کے تحفظ کے لئے جنگ شروع کی، لیکن ذرائع مواصلات کی تباہی کے سبب زیادہ عرصہ تک مقابلہ ممکن نہ تھا، تاہم مقابلہ جاری تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان ہوگیا اور ہم لوگوں کو بھی ہتھیار رکھنے پڑے۔

. . . . . اور تختے پر گرتے ہی شہید ہوگیا

احمد الرحمان (کھلنا) بیان کرتے ہیں کہ پائنگاسا تھانہ کے شمالی علاقہ میں ہمارا ایک چھوٹا سا کیمپ تھا۔ جس میں البدر کیڈٹس کی معمولی سی تعداد تھی۔ یہ جگہ کھلنا سے بہت دور ہے، راستہ بھی بہت دشوار گزار ہے۔ ہیڈکوارٹر کھلنا سے رابطہ قائم رکھنا ہوتا تو ایک دن سے کم وقت میں ممکن ہی نہ تھا۔

اکتوبر کا چوتھا ہفتہ تھا ہمیں کھلنا سے اطلاع ملی کہ تخریب کاروں نے ایک تھانہ لوٹ لیا ہے اس خبر کے پہنچتے ہی کھلنا سے ایک نیول آفیسر کی قیادت میں ایک پارٹی روانہ ہوئی۔ اس پارٹی کے پاس دو بھاری مشین گنیں (Heavy Machineguns) بھی تھیں۔ جو برطانوی حکومت کے خاتمہ پر ہمارے حصہ میں آئی تھیں۔ ان میں بھی ایک ایچ ایم جی کا کلپ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس پارٹی کی روانگی سے تھوڑی دیر بعد ہی مکتی باہنی نے حملہ کردیا اور جوابی کارروائی میں یہ ہتھیار بے کار اور ناکارہ ثابت ہوئے۔ چنانچہ اس وجہ

سے یہ پارٹی لوٹ آئی اور تقریباً تین بجے دوپہر البدر کے کیمپ میں پہنچ گئی۔

تمام حالات سن کر صرف پانچ ساتھی کیمپ کی نگرانی کے لئے چھوڑ دیئے گئے اور باقی اٹھارہ البدر آپریشن پارٹی کے ساتھ روانہ ہوئے۔

اس جگہ پٹ سن کے کھیت اور جھاڑیاں تھیں جن میں شرپسند چھپے ہوتے تھے مخالف سمت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہمارے ساتھیوں نے ان کھیتوں اور جھاڑیوں کے اندر رینگتے ہوئے پیش قدمی شروع کی۔ ہم روزے سے تھے، شام ہوئی تو جھاڑیوں کے پتوں سے روزہ افطار کیا اور رات دیر تک ایڈوانس جاری رکھا۔

ہماری یہ کارروائی ایسی مؤثر تھی کہ سقوط مشرقی پاکستان تک شرپسندوں نے اس طرف آنے کی جرأت نہیں کی۔ اس کارروائی کا پورا منصوبہ البدر ہی نے بنایا تھا مخصوص حالات کے مطابق اس بارے میں قدم اٹھایا گیا تھا۔

نومبر کے تیسرے ہفتے کی بات ہے۔ معلوم ہوا، کھلنا کے جنوبی علاقے میں بھارتی فوج اور مکتی باہنی نے ایک اڈہ بنا رکھا ہے اسے تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس وقت ہمارے پاس ہتھیار بہت ہی کم تھے۔ البدر کیڈٹس کے پاس صرف تھری ناٹ تھری کی رائفلیں تھیں یہ ساری مہم البدر پر مشتمل تھی۔ نشان زدہ علاقے میں آپریشن پر جانے کے لئے ہمیں ایک موٹر لانچ دی گئی حالانکہ گن بوٹ موجود تھی، لیکن وہ نہیں دی گئی۔ یاد رہے پانی کی جنگ میں موٹر لانچ کے استعمال کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے۔ خیر ہم اس کو لے کر روانہ ہوتے۔

اس موٹر لانچ کا انجن بھی پرانا تھا اور پانی کی رفتار خاصی تیز تھی جس کے مقابل ہمیں چلنا تھا دفاعی نقطۂ نظر سے لانچ کے چاروں طرف ریت کی چند بوریاں جما دی گئیں اور ہم کھلنا سے ستر میل آگے پہنچ گئے جہاں سے اپنے ہیڈ کوارٹر اور پاک فوج سے کسی طرح کا بھی رابطہ ممکن نہ تھا۔

دریا کے دونوں جانب جنگل ہی جنگل تھا۔ تخریب کار عناصر کی انٹیلی جنس نے انہیں ہمارے بارے میں فوراً باخبر کر دیا کہ آپریشن کے لئے البدر کی ایک پلاٹون ایک موٹر لانچ کے ذریعے روانہ ہو چکی ہے، اس لئے وہ مقابلے کے لئے پوری طرح چوکس تھے۔

جزر کا وقت تھا جس میں دریا کا پانی اترائی میں ہوتا ہے اور یہاں بھی پانی خاصا نچلی سطح پر تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ دشمن خشکی پر درختوں کی آڑ میں محفوظ تھا اور ہم تیز گہرے پانی کے مخالف بہاؤ پر کم تر درجہ کی سواری پر سفر کر رہے تھے اور معمولی ہتھیاروں سے مسلح تھے۔

اچانک دریا کے دونوں کناروں سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہم نے ریت کی بوریوں کی آڑ میں وقفہ وقفہ سے جوابی فائرنگ سے کارروائی کا آغاز کر دیا۔

ہماری پلاٹون میں جماعت ہم کا ایک ساتھی مقبول احمد بھی تھا وہ بھی تھری ناٹ تھری کے ذریعے فائرنگ کر رہا تھا۔ یاد رہے کہ تھری ناٹ تھری جیسی دقیانوسی رائفل کی لوڈنگ ہر ہر لمحہ کرنا پڑتی ہے جس میں زور اور فائر کا جھٹکا بھی خاصا محسوس ہوتا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ ہماری پون گھنٹے کی جھڑپ میں مقبول کچھ تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا اس کا ہاتھ لوڈنگ کے لئے پہلے کی طرح مضبوط نہ تھا۔ ساتھیوں نے کہا "مقبول بھائی! آپ آڑ میں ذرا دیر آرام کر لیں تاکہ تھکاوٹ دور ہو جائے۔" مقبول تھکی تھکی، مگر پرعزم آواز میں بولا:

"نہیں بھئی، انشاءاللہ دشمن کو ختم کر کے آرام کروں گا۔ میں بزدل نہیں جو آرام کروں!"

پھر وہ تیزی سے اٹھا اور بوری کی آڑ سے نکل کر کھڑا ہو گیا اور نہایت تیزی سے دشمن پر فائرنگ شروع کر دی۔ نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے اس نے پانچواں فائر کیا تھا کہ اوپر سے دشمن نے مشین گن کا فائر کیا جو مقبول کے سر اور پیشانی کو پاش پاش کرتا ہوا دریا کے پانی میں چلا گیا اور مقبول کوئی آواز نکالے بغیر لانچ کے تختے پر گر کر شہید ہو گیا۔

اب تمام ساتھیوں نے نہایت زوردار حملہ کیا اور دریا کے دوسرے کنارے پر اتر کر اسے پوری طرح ہندوستانی ایجنٹوں سے آزاد کرا لیا۔

اس آپریشن میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ لگا۔

حیوانی تشدد کی منہ بولتی تصویر

نومبر میں آرمی اور البدر ایک مشترکہ آپریشن پر گئے۔ ہمارے ہمراہ اس مرتبہ پاک نیوی گن بوٹ تھی۔ ہم سندربن کے قریب پہنچے تھے کہ وائرلیس کے ذریعے پیغام موصول

ہوا۔ دشمن آرہا ہے ! فلاں جانب مدد کے لئے پہنچو"۔
معلوم ہوا یہ پیغام کسی پاکستانی کا نہ تھا، بلکہ بھارتی دے رہے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود سگنل مین نے اپنے لوگ سمجھتے ہوئے جواب دیا" پریشان نہ ہوں۔ ہم اتنی دیر تک پہنچ رہے ہیں"۔
اس کے بعد ہم نے اپنے آدمیوں کی مدد کے لئے راستہ تبدیل کیا تو فوراً معلوم ہو گیا کہ سازش کا شکار ہوگئے ہیں، کیونکہ اس کے ساتھ ہی زبردست فائرنگ ہماری جانب آنا شروع ہوگئی۔ ہم نے بھی سنبھل کر جوابی کارروائی کا آغاز کر دیا۔
میرا مشاہدہ ہے کہ کم از کم کھلنا ضلع میں جب کبھی بھی البدر اور آرمی اکٹھے آپریشن پر گئے۔ تو آرمی نے بسا اوقات البدر کو اگلی صفوں پر بھیجا۔ یہاں بھی یہی صورت تھی۔ دشمن سے زوردار مقابلہ ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب البدر کو پاک فوج نے قدرے بہتر اسلحہ استعمال کرنے کی اجازت دی تھی۔ ہم نے آگے جاکر لائٹ مارٹر گن، ہیوی مشین گن، تیرنے والی بارودی سرنگیں اور ڈائنامیٹ استعمال کئے۔
دشمن بھاگ گیا۔ جب ہم ان کے مورچوں میں پہنچے تو وہاں اسلحہ کے ساتھ ساتھ بہت سی عریاں تصاویر، اور بدقماش ہندو عورتیں بھی موجود تھیں۔ ان کے علاوہ چند مظلوم بہاری لڑکیاں ان کے حیوانی تشدد کی منہ بولتی داستانیں تھیں

جنگی ضابطے، سوکھے کتابی پھول لگے

کیپٹن عمر فاروق (نرائن گنج) نے بتایا ۲۲ نومبر کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور ساتھ ہی مکتی باہنی کی تخریبی کارروائیاں بھی شدت اختیار کر گئیں۔ ہم نے بھی البدر کے ساتھ مل کر ملک دشمنوں کے خلاف کارروائیاں تیز کر دیں۔ نارائن گنج سے تقریباً دس میل دور گھیب چر ہیں جو دریائے میگھنا میں کئی میل تک پھیلا ہوا ایک جزیرہ ہے۔ اس پر مکتی باہنی کا بہت بڑا مورچہ قائم تھا۔ جس کی وجہ سے ڈھاکہ اور چاند پور کے درمیان

ہماری آبی شاہراہیں غیر محفوظ ہو چکی تھیں۔

۲۳ نومبر کو مجھے حکم ملا کہ البدر کے ۴۰ کیڈٹوں کو لے کر پاک فوج کے ایک دستے کے ساتھ روانہ ہو جاؤں۔

اس حملے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ اتنی طاقت کے ساتھ فتح حاصل کرنا مشکل ہے۔ اس لئے تجویز پیش کی کہ جب تک کمک نہ مل جائے حملے کو روک دیا جائے، مگر البدر کمانڈر نذرل نے اصرار کیا کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے اور حملہ جاری رکھا۔ نذرل اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے اتنا قریب جا کر گولیاں برسا رہا تھا کہ دشمن بھی حیرت میں آ گیا تھا، لگتا تھا۔ وہ تنہا ہی پاک سرزمین کو ملک دشمنوں سے پاک کر دینا چاہتا ہے۔

یہ جوش اور جذبہ یقیناً قابلِ قدر تھا، لیکن فوجی نقطۂ نظر سے اس کی ضرورت نہ تھی، پھر جلد ہی نتیجہ سامنے آ گیا۔ ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کے سر میں لگی اور وہ اپنی حقیقی منزل کو پا گیا۔ اس کے ساتھی اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بمشکل اس کی لاش لائے۔

اب ایک بار پھر میں نے حملہ روکنے کی تجویز پیش کی، مگر انہوں نے انتہائی سختی کے ساتھ اس تجویز کو رد کر دیا اور نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے اور اس بار انہوں نے واقعی میدان مار لیا۔ دشمن کا مورچہ ٹوٹ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان معرکوں میں مجھے قدیم جنگی تکنیکی ضابطے، کتابی دنیا کے سوکھے پھول سی محسوس ہوئے، ثابت یہ ہوا جنگ میں جو چیز فتح کی ضمانت بنتی ہے وہ سرفروشی کا جذبہ اور شجاعت ہے جو جنگ کی آگ میں بے خطر کود پڑتا ہے اس کے لئے یہ آگ گلزار بن جاتی ہے۔

خاصا مالِ غنیمت ہاتھ لگا

حسین خان (ڈھاکہ) نے بتایا: ضلع ڈھاکہ میں مدھیا باڑی کپڑے کی صنعت کے لحاظ سے مانچسٹر آف ایسٹ پاکستان کہلاتا تھا۔ اس کے نزدیک ایک گاؤں میں ہندو زمیندار کی بہت بڑی بلڈنگ تھی جس میں مکتی باہنی والوں نے اپنا خفیہ اڈہ بنا رکھا تھا۔

دشمن کے اس قلعے کو فتح کرنے کے لئے ایک رات البدر کے ۲۵ کیڈٹوں نے شب خون مارا۔ مقابلے میں مکتی باہنی کے ایک سو سے زائد رضاکار تھے۔ تعداد میں زیادہ ہونے کے علاوہ انہیں یہ برتری بھی حاصل تھی کہ وہ بہت محفوظ مورچوں میں تھے، لیکن قدرت نے ناممکن کو ممکن بنانے کے لئے ہماری مدد کی، ہمارے چند ساتھی فائرنگ کے درمیان رینگتے ہوتے ایک کھڑکی کے ذریعے بلڈنگ کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوگئے اور بہت مہارت سے مکتی باہنی سے ہتھیار رکھوا لئے۔

اس عمارت کو تباہ کر دیا گیا اور اچھا خاصا مالِ غنیمت ہاتھ لگا، جس میں مشین گنوں مارٹرز اور دیگر ہلکے ہتھیاروں کی بہت بڑی مقدار تھی۔ ۲۷ شر پسند مارے گئے، کچھ زخمی ہوتے اور باقی بھاگ گئے۔ خدا کے فضل سے ہمارے تمام ساتھی صحیح سلامت رہے۔ صرف ایک البدر زخمی ہوا۔

ان کے مورچوں میں گھس گئے اور ۔۔۔۔

عبدالرحمن (چٹاگانگ) نے کہا مشرقی پاکستان میں تخریب پسندوں کا قلع قمع کرنے کے لئے جب پاک فوج نے کارروائی شروع کی تو ان دنوں جمعیت کے کارکن، جمعیت کے لیٹر پیڈ پر اپنی تصویر لگا کر سول اور فوجی انتظامیہ سے تصدیق کرا لیتے اور یہی ان کا شناختی کارڈ ہوتا تھا۔ مکتی باہنی کو جب اس امر کی اطلاع ملی تو اس نے ہمارے کارکنوں پر شدید حملے شروع کر دیئے۔ یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو مقامی فوجی انتظامیہ سے مشورہ کیا گیا اور باہمی مشورے سے ایک ہفتے کے لئے انفرادی رائفل ٹریننگ کا سلسلہ شروع ہوا اس طرح البدر کے تین بیچوں نے ٹریننگ حاصل کی، لیکن یہ معمولی تربیت قابلِ اطمینان نہ تھی۔ ہم سادہ کپڑوں میں کام کرتے تھے۔

چٹاگانگ کے اندر اسلحہ کے تین مراکز تھے، ایک وسط میں دوسرا شمال میں تیسرا جنوب میں۔ ہمارے دس ساتھی ایک رات شمالی پوسٹ پر حفاظتی ڈیوٹی دے رہے تھے کہ مکتی باہنی نے حملہ کر دیا۔ نفری کم ہونے کی وجہ سے ہم نے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا، لیکن ہماری گاڑی پنکچر

ہوگئی۔ پیچھے سے مکتی باہنی نے اور سامنے سے فوج نے فائر کھول دیا، بڑی مشکل میں پھنس گئے، لیکن ہمت مردانہ نے ساتھ دیا۔ کوئی اور جائے پناہ نہ پائی تو رینگ کر اپنی گاڑی کے پیچھے چلے گئے اور بہت ہوش مندی سے فائر کرنے لگے۔ ہمیں معلوم تھا کہ کہیں سے امداد نہ ملے گی اس لئے بہت احتیاط سے فائر کر رہے تھے۔

ادھر دشمن شاید ہماری حالت سے بے خبر تھا۔ اسے شاید یہ گمان تھا کہ ہم بہت زیادہ ہیں اور محفوظ مورچوں سے فائر کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہماری ثابت قدمی یا دشمن کی غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مکتی باہنی کے رضاکار بدحواس ہو کر فرار ہونے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ان کے مورچوں میں جا گھسے اور ان سے ہتھیار رکھوا لئے۔

دوسرا آپریشن نہایت ہی مشکل تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ ایک باغی بنگالی کپتان کو گرفتار کرنا تھا جس نے گذشتہ چار ماہ سے چاٹگام کے علاقے میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔

البدر کی تشکیل کے فوراً بعد اس کپتان کی گرفتاری کا فریضہ ہمیں سونپا گیا اور ہماری انٹیلی جنس نے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس کا ٹھکانہ معلوم کر لیا، وہ ایک ہوٹل میں چھپا ہوا تھا۔ ہم نے چھاپہ مار کر آسانی سے اسے گرفتار کر لیا۔

اس ہوٹل کے اسٹورز سے روسی اور ہندوستانی ساخت کے اسلحہ کا بڑا ذخیرہ ہاتھ لگا۔

اس واقعہ کے بعد ہمارے کچھ ساتھیوں کو بہتر تربیت کے لئے پتنگا ائیرپورٹ پر بھیج دیا گیا۔ وہاں انہوں نے صرف تین دنوں میں تربیت حاصل کی۔ ہمارے چار ساتھیوں نے تو صرف ایک ایک دن میں انٹی ائیر کرافٹس گن، ۴۰ ایم ایم، ۳۷ ایم ایم اور ۴ ایم ایم کی تربیت حاصل کر لی۔

ائیرپورٹ اور آئل ریفائنری کی حفاظت کے لئے ذمہ داری اٹھانے کے لئے کیپٹن الطاف نے امتحان لیا اور ہم سب ساتھی پاس ہوگئے۔ اس کے بعد چند ساتھیوں کو مشاہداتی مراکز او پی (آبزرویشن پوسٹ) ٹریننگ دی گئی اور چار البدر کو شہر سے پانچ چھ میل دور ایک درخت پر مچان باندھ کر ڈیوٹی سونپ دی گئی۔ ان پوسٹوں پر بہت ہوشیار اور چاق و

چوہند لوگوں کو رکھا جاتا تھا۔ وہ بہت توجہ سے چاروں طرف دیکھتے رہتے تھے اور خفیہ الفاظ میں سائرن والوں کو پیغامات بھیجتے رہتے تھے۔ ہمارے ساتھی ہی بریگیڈ ہیڈکوارٹر کو اطلاع دیتے تھے۔ یہ سارا عمل دو منٹ میں مکمل ہوجاتا۔

اد پی ساتھیوں کی مدافعت وحفاظت کے لئے چار چار ساتھی ہر وقت تیار رہتے اور یہ پوسٹیں چوبیس گھنٹے مستعد رہتیں۔

کیپٹن انوارالحق نے ہمیں بتایا کہ چھ چھ ماہ کی تربیت کے باوجود فوجی اس قدر بہتر ڈیوٹی دینے کی پوزیشن میں نہیں جس قدر بہتر البدر کے کیڈٹ ثابت ہورہے ہیں۔

ایک گولی چلائے بغیر آپریشن کامیاب رہا

ابوعثمان (نرسندی) اپنی یادداشت کو مجتمع کرکے کہتے ہیں کہ ہمیں اطلاع ملی کہ نرسندی، ڈھاکہ روڈ پر ایک قصبہ میں شرپسند آگھسے ہیں، چالیس البدر ایک بس میں سوار ہوکر وہاں پہنچے اور دس دس کی چار ٹولیوں میں تقسیم ہوکر حملہ کر دیا، دشمن نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی، لیکن پاؤں نہ جما سکے۔ ہم نے انہیں چند گھنٹوں ہی میں زیر کرلیا شرپسند بھاگ نکلے۔

پھر ہم نے مشکوک گھروں کی تلاشی لی، لیکن کہیں اور سے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ہم واپس ہونے کا ارادہ کررہے تھے کہ ایک دکان پر مجھے کچھ شک گزرا، اس کا تالا توڑا تو یوں لگا کہ اسلحہ کا بہت بڑا ڈپو ہے۔ ہم نے ان ہتھیاروں پر قبضہ کرلیا۔ دو شرپسند بھی پکڑے جنہوں نے اسلحہ کے مزید ذخائر کی نشاندہی کی۔

یہ آپریشن ایک گولی چلائے بغیر کامیاب رہا۔

جواب دینے کے بجائے ہم نے گھیراؤ کیا

محمد کمال (فریدپور) کے بقول ماہ جون میں فریدپور کے علاقہ میں البدر کی تشکیل ہوئی ۲۹ بلوچ رجمنٹ کے میجر عطا محمد صاحب نے نگرانی کی۔ پہلے گروپ میں ۲۸۰ کارکنان جمعیت

نے البدر کے تحت باقاعدہ تربیت حاصل کی۔

تربیت کے فوراً بعد ہم آپریشن پر گئے۔ اس آپریشن میں ۱۰ البدر اور پانچ آرمی کے جوان تھے۔ رات ۲ بجے جب ہم لوگ شرپسندوں کے مرکز کے قریب پہنچے تو فائرنگ کا آغاز دشمن کی جانب سے ہوا، لیکن ہماری جوابی فائرنگ سے وہ فرار ہو گئے اور ان کے مرکز پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔

اس آپریشن میں کیپٹن ہدایت اللہ ہمارے ہمراہ تھے۔ صبح صادق کے وقت ہم واپس اپنے کیمپ میں بخیریت پہنچ گئے۔ دشمن ۲۵ لاشیں چھوڑ کر فرار ہوا تھا۔

فرید پور سے تین میل دور ادکا لور گاؤں میں مسلم لیگ کے ایک چیئرمین کے گھر پر مکتی باہنی نے حملہ کر دیا۔ اس کا گھر لوٹ لیا اور عورتوں پر ظلم کیا۔

چیئرمین صاحب کسی طرح بچتے بچاتے ہمارے پاس پہنچے اور اپنی دردناک کہانی سنائی، ہم نے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور ۳۰ البدر ابو الحسن بھائی کے زیر قیادت اور ۳۰ پاک آرمی، کیپٹن فیاض کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ ہم نے تیس تیس افراد پر مشتمل دو دستے تیار کئے اور پیش قدمی جاری رکھی، ابھی ہم اپنے ہدف سے ایک کلومیٹر دور تھے کہ دشمن نے فائر کھول دیا۔

ہم نے جواب دینے کے بجائے دشمن کا گھیراؤ کرنے میں زیادہ سرعت دکھائی لیکن وہ گھیرے میں آنے کے بجائے ایک ایک دو دو کر کے تتر بتر ہو گئے۔ پھر بھی ان کے ۱۱ افراد ہلاک ہوئے۔

جب ہم چیئرمین کے گھر پہنچے تو وہاں سے ہندوستانی ساختہ ۲۵۷ گرنیڈ، اسٹین گن کی کئی ہزار گولیاں، ۷ پستول اور ایک طاقت ور دوربین ملی۔

بھارت کی سرحد عبور کر لی

معین الرحمان (جمال پور) نے کہا: یہ بارہ نومبر کی سرد رات کا ذکر ہے: ہندوستان کے ایک گوریلا حملہ کا جواب دینے کے لئے پاک آرمی کے دو سو جوانوں اور البدر کے

چالیس کیڈٹوں پر مشتمل ایک حملہ آور گروپ گارو پہاڑ کی جانب چل پڑا۔ رات گیارہ بجے ہمارا گروپ پہاڑی راستے کے آخری کنارے پہنچا، کچھ سردی تھی، دوسرا اندھیرا اور تیسرا یہ کہ بارش ہو رہی تھی، رائفل کا وزن سوہانِ روح بن رہا تھا، اسی طرح چلتے چلتے ہم ساڑھے تین بجے بھارتی سرحد عبور کر کے ہندوستانی علاقے میں جا پہنچے اور ان کی ایک پوسٹ کا گھیراؤ کر لیا۔ ایک گھنٹہ کی مسلسل لڑائی کے بعد دشمن سامان حرب چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ بھارتی فوج کی تازہ کمک آنے تک ہم پاکستانی پہاڑی سلسلے میں آن پہنچے تھے۔ پر سارا دن ہم بھوکے رہے۔

جمنا کی خونی موجوں میں چھلانگ لگا دی

معین الرحمان دھال پور نے ایک دوسرے آپریشن کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا: اگست کے دنوں میں ایک مرتبہ ہمیں تخریب کاروں کے خطرناک اڈے کو تباہ کرنا تھا۔ اس آپریشن میں ڈھائی سو پاک آرمی اور چالیس البدر تھے۔ ٹرین سے سفر کرنے کے بعد ہم موٹر لانچ میں بیٹھے اور جگن ناتھ گھاٹ کی جانب روانہ ہوئے۔ ہماری مدد کے لئے پاک نیوی کی دو کشتیاں بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ بیس میل کا سفر کرنے کے بعد ہمیں جمنا کنارے لانچ سے اتار دیا گیا۔ موسم برسات کی وجہ سے دریائے جمنا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔

ہم نے اس کنارے پر آباد گاؤں میں اپنا مورچہ جمایا۔ تین روز بعد رات کے وقت ایک چھوٹا بھارتی جہاز پاکستان کی سرحد میں داخل ہوا اور تھوڑی دور جا کر لنگر انداز ہوا ہم نے ایک طوفانی حملہ کر کے اس جہاز سے بھارتی اسلحہ پر قبضہ کر لیا اور بھارتی عملے کے کچھ ارکان کو ہلاک کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد بھارتی علاقے سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ سارا دن موسلا دھار بارش ہوتی رہی اور گولیاں برستی رہیں۔ دشمن کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ دو دن کی تھکاوٹ کے باعث ہم باری باری آرام اور بھارتی فوج سے مقابلے کرنے لگے، میں اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ تباہ شدہ دکان کے برآمدے میں لیٹا تھا۔ ایک تھکے ماندے میجر صاحب

بھی ہمارے قریب آ کر اسی طرح زمین پر سو گئے۔ جنگ شدید ہو گئی تو ہم تینوں پھر بیدار ہو گئے۔ لڑائی جاری تھی اور جمنا کا پانی کناروں سے باہر آ چکا تھا۔ ہم پانی میں سینے سینے تک ڈوب چکے تھے اور وطن عزیز کی حفاظت کے لئے گولے کا جواب فائر کے ذریعے دے رہے تھے۔ صبح کے وقت ہمیں ایک پاکستانی جہاز سے کمک پہنچی اور باری باری جہاز میں سوار ہوئے۔ خشک جگہ پر جا کر اترے اور مقابلہ جاری رہا۔ اس دوران میں بھارتی فوج خاموش ہو گئی۔ ہم واپس پلٹے تو اچانک خیال آیا کہ ہماری فوج کے کچھ قیمتی کاغذات وہیں پر رہ گئے ہیں اس پر مجھے حکم ملا کہ تیرتا ہوا جاؤں اور وہ کاغذات لاؤں اس خونی سیلاب کی موجوں میں میں نے چھلانگ لگا دی، جہاز وہیں کھڑا رہا اور میں جان ہتھیلی پر رکھ کر پلاسٹک میں بند ان کاغذات کو لے کر واپس جہاز تک پہنچا۔

جہاد کے تصور سے موت کا ڈر ختم ہو گیا

عبدالجبار (جبال پور) نے بتایا: "ہمیں مشرقی سرحدی علاقے میں غدار تخریب کاروں کی الم ناک سرگرمیوں کا علم ہوا۔ ان کی سرکوبی کے لئے البدر کے بچیس کیڈٹوں پر مشتمل چھاپہ مار گروپ تشکیل دیا گیا۔ ہم اس روز آدھی رات تک آپریشن کی تفصیلات طے کرتے رہے۔ کافی بحث مباحثہ کے بعد فیصلے کئے اور طے پایا کہ اگلے روز روانہ ہوا جائے گا اس لمحے ہم جہاد اور وطن سے محبت کے جذبوں میں موجزن دھڑکنوں کے ساتھ لیٹ گئے۔ شہادت اور ملت کے لئے قربانی دینے کی بھوک یوں چمک اٹھی جیسے خالی پیٹ ہوتے وقت چاول کھانے کو جی مچلتا ہے۔ میں بھی ساتھیوں کی طرح زمین پر لیٹا اور سر کے نیچے اینٹ رکھی۔

صبح نماز فجر ادا کی، نہائے اور ناشتہ کرنے کے بعد تیاریاں شروع ہوئیں۔ دن کے وقت خاصے کام نپٹائے اور رات کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ رات کے پچھلے پہر ہم سرحد کی جانب روانہ ہوئے۔ ہماری راستہ کچا تھا۔ رائفل کندھے پر تھی۔ ایمونیشن ہماری پشت سے بندھا ہوا تھا۔ میجر ریاض حسین ہماری کمان کر رہے تھے۔ ہمارے ہمراہ پاک آرمی کے

بھی پچیس جوان تھے۔ فجر کی اذان سے کچھ پہلے ہم اپنے منتخب مقام جینائی گاتی پر پہنچ گئے ارد گرد ٹیلے اور جھاڑیاں تھیں۔ چند لمحوں بعد ہماری جانب دشمن کی گولیاں برسنا شروع ہوئیں یقین کے ساتھ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کس جانب سے گولی آرہی ہے۔ ہم نے فوری طور پر چاروں طرف جھاڑیوں کی جانب فائر کھولا مگر اندازہ ہوا کہ ہماری جوابی کارروائی نے دشمن کو بالکل پریشان نہیں کیا۔ اسی دوران میں، میجر ریاض حسین مجھے لے کر رینگتے ہوئے دھان کے کھیت تک پہنچے، ایک لمحہ نہ گزرا تھا کہ دشمن کی جانب سے ہلکی توپوں کی گولہ باری شروع ہوگئی۔ ایک گولہ بالکل ہمارے قریب آن گرا، مگر دلدل میں دھنس جانے کے باعث پھٹ نہ سکا، ہم فوراً کھیت سے نکلے اور ایک جھاڑی کی آڑ میں کھڑے ہوکر گولہ باری کی سمت معلوم کرنے لگے۔ اندازہ ہوا کہ یہ فائر دریا کے کنارے پر واقع ایک گاؤں سے آرہے ہیں۔

میجر صاحب نے اشارہ دیا اور اس جانب ہماری گنوں کا رخ ہوگیا۔ آدھ گھنٹے بعد دو بھارتی جنگی کشتیاں بھارت کی طرف بھاگتی ہوئی دیکھی گئیں۔ ہم ٹیلوں کی اوٹ سے نکلے اور شمال مغرب کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے تا داچوکا کے مقام پر پہنچے۔ ہمارے چاروں طرف گولے پھٹ رہے تھے، مگر بچتے بچاتے ہمیں آگے بڑھنے کا حکم تھا۔ اس روز معلوم ہوا کہ جہاد کے تصور کے ساتھ ہی موت کا خوف دور ہو جاتا ہے۔ اس لڑائی کی آدا نہ پر میجر ایوب کی قیادت میں ایک گروپ آن ملا۔ تب ہم نے مل کر اس گاؤں کی تلاشی لینا شروع کی۔ دشمن پسپا ہو چکا تھا۔ ہم اس گاؤں کے باہر دو روز تک ٹھہرے رہے۔ کسی قسم کے جوابی حملے کو نہ پاکر اپنی پتھریلی چٹانوں اور پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے واپس آگئے۔ پھر سقوطِ مشرقی پاکستان تک اس علاقے میں کوئی تخریبی کارروائی نہ ہوئی۔

تقریر ختم کرتے ہی گولی ان کے سینے میں لگی

عبدالجبار (جمال پور) ہی نے ایک دوسرے آپریشن کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔ "نومبر کے پہلے ہفتہ ہم کچھ ساتھی بہادر گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے، کیونکہ معلوم ہوا تھا کہ جمالپور

اور رنگ پور کے سرحدی علاقے میں ایک دریائی جزیرے پر مکتی باہنی نے کیمپ بنا رکھا ہے۔ البدر کے تیس کیڈٹ موٹر لانچ میں سوار ہو کر دریائے جمنا میں ہندوستان کی جانب روانہ ہوئے، یہ سفر بڑا پر خطر تھا کیونکہ کسی بھی لمحے دریا کے کناروں پر درختوں کے جھنڈ سے ہم کو گولیوں کا بے دریغ نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ ظہر کے وقت ہم نے لانچ روکی تاکہ نماز ادا کر سکیں۔ ابھی دوسری رکعت ہی میں تھے کہ ہم پر گولیاں برسنا شروع ہو گئیں چونکہ نماز قصر تھی، اس لئے جلد فارغ ہو کر اپنی اپنی رائفلوں کی لبلبی دبادی اور ٹھیک ٹھیک نشانے لگے اور دشمن اپنی کمین گاہوں سے کھسک گیا۔ ہم نے گروپ کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور ٹکڑیوں کی مانند گھیراڈالنے چل پڑے۔ راستے میں دیہاتیوں نے پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کر کے ہمارا استقبال کیا۔ اس لمحے جس چیز کو دیکھ کر میں لرز اٹھا وہ یہ تھی کہ عورتیں اور بچیاں بھارتی پراپیگنڈا اور کچھ فوجیوں کی حرکتوں کے باعث ڈر کے مارے کھیتوں میں چھپ رہی تھیں یا تالابوں اور ندیوں میں گلے تک ڈوبی اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جب ہم نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا اور عزت سے پیش آئے تب ان کی ہمت بندھی۔ اس لمحے میں نے لوگوں کو کہتے سنا کہ "آرمی اور البدر میں بڑا فرق ہے"۔ ظاہر ہے کہ بدمعاشی چند افراد نے کی ہو گی، مگر فوج کے نیک دل اور پاکیزہ کردار کے لوگ بھی نفرت کا نشانہ بن گئے۔ بہرحال اس آپریشن میں بھی کوئی خون خرابہ نہ ہوا ایک پرائمری سکول سے بھاری تعداد میں گولہ بارود، گرنیڈ اور بارودی سرنگیں ملیں۔

نومبر کے دوسرے ہفتہ جیناٸی گاٸی اور لالیتا باڑی پر ہندوستانی سرحدی علاقے میں پاک فوج کے کچھ جوان مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج کے گھیرے میں آ گئے۔ اور مکتی باہنی نے سپلائی لائن کاٹ دی ... ان کو چھڑانے کے لئے میجر ایوب کی قیادت میں پاک فوج اور البدر کا ایک برق رفتار دستہ روانہ کیا گیا۔ یہ مہم بڑی خطرناک تھی، کیونکہ دشمن نے جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں اور ہمیں رینگ رینگ کر چلنا پڑتا تھا۔ منزل دور تھی اور بے احتیاط ہمارے اور ہمارے گھرے ہوئے ساتھیوں کے لئے خطرے کا باعث تھی۔ اس لئے میجر ایوب اچانک رکے اور گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ ہم ان کے

حکم کے انتظار میں تھے۔ کچھ دیر بعد یوں لگا جیسے وہ مراقبے سے اُٹھے ہوں۔ تھکے ہوئے چہرے اور سنجیدہ نظروں کے ساتھ ہم سب لوگوں کو دیکھتے ہوئے کھڑے ہوئے اور بلند آواز میں ہم کو مخاطب ہو کر کہا" مسلمان کسی رکاوٹ اور موت کی پرواہ نہیں کرتا شہادت ہماری آرزو ہے وطن کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لئے دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لئے ٹوٹ پڑو اور تیزی سے آگے بڑھو" ابھی میجر صاحب اتنا کہنے پائے تھے کہ دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ میجر ایوب کا جسم ان گولیوں سے چھلنی ہوگیا وہ تڑپے اور جھنجھنا کر گر پڑے۔ اب ہم نے اور زیادہ جارحانہ انداز میں حملہ کرنا اور آگے بڑھنا شروع کیا۔ دشمن گاجر مولی کی طرح کٹ رہا تھا اور اس میں چند البدر اور فوجی جوان شہید ہوگئے، لیکن دشمن پسپا ہوگیا فوجی جوان گھیرے سے نکل آئے اور راستہ صاف ہوگیا لیکن ساتھیوں کی شہادت سے دل بہت دکھی ہوا۔

ایک ساتھی کا ہاتھ الگ ہوگیا اور رسی باندھ کر لہو روکا

اکرام الحق (ڈھاکہ) نے بتایا کہ نومبر ۱۹۷۱ء میں ہمیں عبدالحق شہید نے ایک دفعہ ملک گنج تین روزہ آپریشن سے واپسی پر بتایا کہ "جب ہم دریا سے ایک میل آگے پہنچے تو چاروں طرف ہندوستانی فوج اور مکتی باہنی کے گوریلوں کے گھیرے میں آگئے۔ ہمارے پاس ہلکے اور تعداد میں کم ہتھیار تھے جب کہ دشمن کے پاس اعلیٰ درجے کا بڑی مقدار میں اسلحہ تھا۔ دشمن آگے نہیں بڑھ رہا تھا کہ شاید البدر بڑی تعداد میں ہوں گے، حالانکہ ہماری تعداد پچیس سے زیادہ نہ تھی۔ جن میں پندرہ البدر اور دس آرمی کے جوان تھے کھانے کے لئے کچھ پاس نہ تھا، پانی کے دیس میں قطرہ قطرہ پانی کو ترس گئے۔ ڈیڑھ دن بغیر کھائے پیئے گزارا۔ کچھ دور نہر تھی مگر وہاں تک جانا خلاف مصلحت تھا۔ جب گلے سوکھ کر کانٹا ہوگئے اور آنکھوں کی بصارت تک کمزور محسوس ہوئی تو ہم نے طے کیا کہ ریت کو ہاتھ سے کھود کر مورچے بنائے جائیں۔ بڑی مشکل سے رات کے وقت یہ مرحلہ طے

ہوا اسی اثنا میں دشمن کی جانب سے فائر آنا شروع ہوا۔ ہمارا جو وائرلیس سیٹ تھا خراب ہو چکا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ درست ہو گیا۔ اس پر ہم نے ڈھاکہ ہیڈ کوارٹر میں اپنی حالت کے بارے میں پیغام بھیجا۔ اس پر البدر صلاح الدین کمپنی کے کمانڈر کی رہنمائی میں ایک آپریشن گروپ برق رفتاری کے ساتھ وہاں پہنچا اور ہمیں بحفاظت نکال لایا کیپٹن طاہر نے بتایا کہ تیسرے روز ایک گولی ان کی قمیض کی جیب پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ بہر حال تیسرے روز شام کے وقت واپس پہنچ کر دوستوں نے کھانا کھایا۔ اس آپریشن کے دوران میں عبد الحق کا پاؤں زخمی ہو چکا تھا۔ دوسرے البدر ساتھی شمس الرحمان (باریسال) کا ایک ہاتھ ہی الگ ہو چکا تھا اور ایک رسی باندھ کر ان کے لہو کو بہنے سے روکا ہوا تھا۔ پورا بازو سوج گیا تھا۔ ان کے بارے میں عبد الحق نے بتایا تھا کہ جب ہم دشمن کے محاصرہ میں تھے۔ اس وقت ہمارے پاس کشتی بھی نہ رہی۔ اس پر میں نے ساتھیوں کو کہا کون ہے جو دریا کے اس پار سے کشتی واپس لے کر آئے اس پر سب سے پہلے جس فرد نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا وہ شمس تھے جو تیرتے ہوئے دوسرے کنارے پہنچے اور کشتی لے کر دونوں ہاتھوں سے چپو چلا کر واپس لوٹ رہے تھے کہ دشمن کی جانب سے ایک زبردست گولی ان کے بائیں ہاتھ کی کلائی پر لگی اور ہاتھ ٹوٹ کر دریا میں جا گرا۔ گولیوں کی بوچھاڑ جاری رہی اور یہ اکیلا ساتھی ایک ہاتھ سے کشتی کو چلاتا کنارے پر آن پہنچا۔ یہ خدا کا شکر تھا ان کو کوئی اور گولی نہ لگی، یہ واقعہ دوسرے روز شام کے وقت ہوا تھا۔ بھوکا پیاسا رہنے سے ساتھیوں کی شکلیں زرد پڑ گئیں اور رات بھر جاگنے سے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ مگر اس کے باوجود کسی نے ناجائز سمجھ نہ کھایا۔ موت کو سامنے دیکھ کر تقویٰ اور توکل بڑھ گیا۔ اسی سے قوت ایمانی بھی بڑھتی ہے۔

ہینڈز اپ تم گھیرے میں ہو

سید اکرم حسین کے بقول: ۲۱ اگست کو چٹاگانگ سے کسی کمانڈ ایسے راستہ پر ۵ میل دور مکتی باہنی کے

ایک اڈے کے بارے میں معلومات ملیں اس اڈے میں تربیت یافتہ مکتی باہنی کے لوگ تھے۔ اسی رات البدر کے ۲۷ کیڈٹس کی ایک آپریشن ٹیم تیار کی گئی۔ سب نے مل کر کافی بحث کے بعد ایک گھنٹہ کے اندر اندر آپریشن کا پلان بنایا۔ نو نو کیڈٹس پر مشتمل تین گروپ بنائے گئے۔ پہلے گروپ کے ذمہ آپریشن اور حملہ تھا۔ دوسرے گروپ کے ذمے دشمن کی سپلائی لائن پر نگاہ رکھنا اور تیسرے گروپ کے ذمے ہنگامی ضرورت کے لئے محفوظ فورس کا کام تھا۔ رات بارش ہو رہی تھی۔ جس کوٹھی کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ وہ شرپسندوں کی آماجگاہ ہے۔ حملہ کرنے والے گروپ کے ایک فرد نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اسی لمحے کوٹھی کے اندر گرنیڈ کا زبردست دھماکہ ہوا یہ دراصل ان کا خفیہ اشارہ تھا جس پر پچھلے دروازے سے شرپسند بھاگ نکلے اس دروازے کا ہمیں علم نہ تھا۔ ہنگامی مدد کے لئے کھڑے گروپ نے قدموں کی آواز سن کر گھیرا ڈال لیا۔ نصف گھنٹہ فائرنگ کے بعد بلند آواز میں کہا "ہینڈز اپ ... تمہارے چاروں طرف فوج اور البدر کی بڑی فورس موجود ہے"۔ اس پر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ۲۶ افراد گرفتار کئے جن میں ۱۱ ہندو ۳ ہندوستانی فوجی اور بارہ قوم پرست تھے۔ بعد میں کوٹھی کے اندر داخل ہو کر ۲۸ ریوالور، ۷ ۴ ہیوی مشین گنز اور ہدایات کے چارٹس قبضے میں لئے جن سے اندازہ ہوا کہ ان کی ہدایات کا مرکز اگرتلہ ہے۔

بھارتی فوج سے ایک مہینہ تک جنگ لڑی

ابو عثمان اچیا گانگ بتاتے ہیں کہ رانگا مائی کے ہندوستانی بارڈر پر شدید جنگ ہوئی، پاک فوج کے ہمراہ دو سو البدر کیڈٹ نے بھارت کی باقاعدہ فوج سے ایک مہینہ تک جنگ لڑی۔ اس علاقہ کے لوگ آج تک آرمی اور البدر کی اس شجاعانہ جنگ کے واقعات کو خوشگوار یادوں کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں ایک بار اطلاع ملی کہ کپتائی کے علاقہ میں مکتی باہنی کا اڈہ ہے جس پر شاہ جلال کی زیر قیادت ایک مہم روانہ کی جس نے علاقے کا گھیراؤ کر کے حلقہ تنگ کرنا شروع کیا اس آپریشن

یں بغیر کسی خون خرابے کے ہندوستانی ایجنٹوں کا بہت سا اسلحہ نقشے اور بلیں تخریب کار پکڑے گئے۔

میں نے جئے بنگلہ کا نعرہ لگایا اور دشمن مار بھگایا

میر حسن (رچا ٹانگ) نے واقعات بتاتے ہوئے کہا لوآل کھالی ہندوؤں کا اکثریتی علاقہ تھا اس کے قریب البدر کیمپ لگایا گیا۔ میں کیمپ سے ذرا دور گیا ہوا تھا اچانک دیکھا کہ البدر کا کیمپ چاروں طرف سے مکتی باہنی کے گھیرے میں آچکا ہے اور فائرنگ ہو رہی ہے۔ میں نے پیچھے سے آکر جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک حربہ اختیار کیا۔ رائفل اٹھا کر بلند آواز میں شور کرتے اور اچھلتے ہوئے کہا، "پاکستانی اسلحہ کا ذخیرہ مل گیا اور جئے بنگلہ"۔ یہ سنتے ہی مکتی باہنی والے پلٹے ان میں سے کوئی بھی مجھے نہ پہچانتا تھا۔ وہ یہی سمجھے کہ میں کوئی انہی کا فرد ہوں۔ جونہی وہ میری طرف پلٹے البدر کے محصور ساتھیوں کو وار کرنے کا موقع مل گیا اور اس قدر تابڑ توڑ حملہ کیا کہ چھ مکتی باہنی مارے گئے باقی فرار ہو گئے۔

اور ایک صاحب نے ہماری اطلاع مکتی باہنی کو کر دی

محمد ابو عاطر کا تعلق ضلع رنگ پور کے چیلا ہوٹی مقام سے ہے۔ انہوں نے معرکوں کا حال بیان کرتے ہوئے بتایا:

ہمارے ہاں البدر کا پہلا گروپ ابھی زیر تربیت تھا کہ آٹھ البدر اور سات رضاکاروں کو پاک آرمی نے ایک مشن پر روانہ کیا۔ ان میں ایک رضاکار کے علاوہ کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔

راستے میں تخریب کاروں نے گھیرا ڈال لیا۔ سات افراد کو گرفتار کر لیا اور سات کو شہید کر دیا۔ ان میں چار رضاکار تھے اور تین البدر۔ محمد الرحمان (جماعت دہم)، اکرام الحق (سال اول) اور محمد الیاس (فاضل عربی) شہید ہو گئے۔

ٹریننگ حاصل کرتے ہوئے ابھی چار دن گزرے تھے کہ تھانہ شاٹی باڑی سے اس المناک حادثے کی اطلاع ملی۔ یہ جمعے کا روز تھا۔ ہم فوراً اس جگہ پہنچے اور رات بارہ بجے سے صبح چار بجے تک لڑائی ہوتی رہی۔ دس شرپسند مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے اس پانچ میل کے علاقے میں تخریب کاروں کے ایک اور اڈے کا پتہ چلا۔ ہم نے اس کا بھی تیا پانچا کیا۔ اس آپریشن میں اسلحہ کے علاوہ دشمن کی قیمتی دستاویزات ہاتھ آئیں ایک البدر کیڈٹ سخت زخمی ہوا مگر کسی طریقے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح ہمارا ایک اور ساتھی عطاء الرحمان جو گرفتار ہوگیا تھا ہندوستانی فوجی کیمپ سے فرار ہوکر ہم سے آن ملا۔

جون کے آخری ہفتے میں میجر غلام رسول (۴۸ پنجاب رجمنٹ) نے چلاہاٹی کیمپ کا دورہ کیا اور سرحد پر ڈیوٹی کے لئے ۱۵ البدر ۱۵ رضاکار اور ۳۰ پاک آرمی کے جوانوں کی ڈیوٹی لگادی۔ صوبیدار خادم حسین ہماری کمان کر رہے تھے۔

ہم سرحد کے قریب پہنچے تو مکتی باہنی کو ہماری آمد کا پتہ چل گیا۔ رات اندھیری تھی۔ اور وہ ہمارے راستے کے آس پاس چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اس راستے سے ہم گزرے انہوں نے فائرنگ شروع کردی اور اس اچانک حملے میں ہمارے چار رضاکار، تین پاک فوج کے جوان اور چار البدر شہید ہوگئے۔ جن میں عبدالسلام (بی اے آنرز) محمد قابل (ایف اے) مقبول حمید (بی اے) حسن الرحمان (منشی) تھے۔ ہماری پوزیشن بہت نازک تھی، لیکن ہم لوگوں نے پوزیشن لے کر جوابی فائرنگ شروع کردی اور کچھ ہی دیر بعد ان کا فائر بند ہوگیا۔ ہم پھر سرحد کی طرف چل پڑے، لیکن جلد ہی محسوس ہوگیا کہ یہ جلد بازی تھی۔ ہم شرپسندوں کے گھیرے میں آگئے۔ تین اطراف سے فائر آنا شروع ہوا۔

پاک آرمی نے میجر صاحب کو وائرلیس کی اور اس کے ذرا دیر بعد ہی چلاہاٹی سے ۳۵ آرمی اور ۲۰ رضاکار مدد کے لئے پہنچ گئے۔ ہم رک رک کر فائرنگ کر رہے تھے۔ جیسے ہی کمک پہنچی، پھر ہم نے زبردست فائرنگ شروع کردی۔ تین گھنٹے کی جنگ کے بعد دشمن فرار ہوگیا۔ اب ہم وہیں مورچہ بند رہے۔ اس جھڑپ میں ہندوستان کی بنی ہوئی

آٹومیٹک رائفلیں ملیں اور پچاس شرپسندوں کی لاشیں جو نشان عبرت تھیں۔

جولائی کے پہلے ہفتے ہمیں معلوم ہوا کہ ایک گھر میں مکتی باہنی نے اڈہ بنا رکھا ہے ہمیں ان کی قوت کا اندازہ نہ تھا، بہرحال ۲۵ البدر اس طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک مولوی صاحب نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ ہمارے انچارج ساتھی نے کہا، فلاں جگہ۔ یہ سن کر وہ آگے بڑھ گیا اور مکتی باہنی کے اڈے پر جا کر انہیں ہماری آمد کی اطلاع دے دی۔ مکتی باہنی چوکنی ہو گئی اور بہت ہوشیاری سے ہمیں گھیر لیا چاروں طرف سے فائر آنے لگے۔ ہم لوگوں نے بھی پوزیشن سنبھال کر جواب دینا شروع کیا اور ساتھ ہی خود کو محفوظ کرنے کے لیئے درختوں کے جھنڈ کی طرف پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ ہمارے پاس صرف چند رائفلیں اور پستول تھے اور وہ بھی پرانے ماڈل کے تاہم ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے۔ نقصان اٹھائے بغیر گھیرے سے نکل آئے۔ محفوظ مقام پر آ کر حالات کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ وہ تقریباً آٹھ سو مسلح افراد ہیں۔ ظاہر ہے ہماری پوزیشن نازک تھی، لیکن خدا نے اعانت فرمائی۔ فائرنگ کی آواز سن کر پاک فوج کا گشتی دستہ وہاں آ گیا۔ اس دستے میں صرف پچاس فوجی تھے اور اب ہمارے مشترکہ حملے سے مکتی باہنی نے آہستہ آہستہ فرار کی راہ تلاش کی۔ اب دونوں طرف سے زمین پر کھڑے ہو کر شدید فائرنگ ہو رہی تھی۔ اس لڑائی میں ڈیڑھ سو مکتی باہنی مارے گئے۔ ایک گروپ فرار ہو کر ندی کے دوسرے کنارے جا پہنچا۔ آرمی کے کیپٹن صاحب نے ان کا تعاقب کیا اور ۸ البدر کے ساتھ ندی کے پار جا پہنچے۔ ان کے ساتھ ہی پاک آرمی کے ایک دستے نے بھی ندی عبور کر لی، لیکن اس کوشش کا کچھ فائدہ نہ ہوا، بلکہ ایک شدید نقصان یہ ہوا کہ مکتی باہنی کے ایک فائر سے کیپٹن صاحب شہید ہو گئے۔ اس لڑائی میں تین فوجی اور دو البدر بھی شہید ہو گئے جن میں محمد اسلم (بی اے آنرز) کمال حسین (جماعت ہشتم) شامل ہیں۔

۲۶ جولائی کو چلاہاٹی میں البدر کے کیمپ پر شام ساڑھے چار بجے مکتی باہنی نے اچانک حملہ کر دیا۔ ہم لوگوں نے جوابی فائرنگ کی چند ساتھی درختوں پر چڑھ گئے اور بلندی

سے دشمن کی صفوں کو توڑنے کے لئے فائر کھول دیا۔ پاک آرمی بھی لڑائی میں شامل ہوگئی۔
اس وقت ۲۵ البدر اور ۸۰ پاک آرمی کے جوان لڑ رہے تھے۔ نیلفاماری سے ہمیں کمک بھی پہنچ گئی جس میں چند توپیں اور ٹینک بھی تھے۔
توپ کے فائروں کی آواز سن کر مکتی باہنی والے کھسکنے لگے۔ ہم خوش تھے کہ میدان مار لیا، لیکن سورج غروب ہوتے ہی ہندوستانی فوج کی توپوں کا فائر ہمارے اوپر پڑنے لگا۔ معلوم ہوا کہ بھارتی ٹینک پاکستانی سرحد میں آگھسے ہیں۔
پاک آرمی کے میجر مہدی (۴۸ پنجاب رجمنٹ) کمان کر رہے تھے اور سچ یہ ہے کہ وہ بہت ہی بہادری اور ہوش مندی سے لڑ رہے تھے، چنانچہ ان کی قابلیت کی وجہ سے دشمن کے سات ٹینک تباہ ہوئے اور وہ پسپا ہوگیا۔ اب ہم پیش قدمی کر کے بھارت کی سرزمین تک پہنچ گئے۔
اس جنگ میں مکتی باہنی اور بھارتی فوج کے ۸۰۰ افراد مارے گئے، پاک آرمی کے تین ٹینک تباہ ہوئے اور ۱۵ آرمی جوان اور گیارہ البدر شہید ہوئے۔ جن میں عبداللطیف (بی اے)، عبید حسین (ایم اے)، حفیظ الرحمٰن (ایم اے)، احمد کامران (بی ایس سی)، شمشیر علی (ہشتم)، منٹو بھائی (ہفتم)، عباس بھائی (دہم)، دانش بھائی (ہشتم)، سلیمان بھائی (دہم)، محسن علی (سال اول) اور انعام الرحمٰن (دہم) . . . . . شامل تھے۔

پھر فتح کا پھول ہمارے ہاتھ میں تھا

محمد ابوالحسن (شیب گنج ـــ بوگرہ) نے ایک معرکے کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ ضلع بوگرہ میں ایک منڈی جئی پور ہاٹ ہے اس کی حفاظت کے لئے البدر کے پچیس اور پاک آرمی کے چالیس افراد کو مقرر کیا گیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس جانب سے چار سو افراد پر مشتمل بھارتی فوج بڑھ رہی ہے، اس اطلاع کے ملتے ہی ہماری یہ مختصر سی دفاعی ٹیم سرحد کی طرف روانہ ہوگئی، گو عددی لحاظ سے ہمارا پلڑا ہلکا تھا، لیکن اس جذبے کے تحت ہم مسلسل آگے جا رہے تھے کہ دشمن ہماری سرزمین کو تر نوالہ نہ سمجھ بیٹھے

چاہے ہم شہید ہو جائیں اگر دشمن کے لئے لوہے کے چنے ثابت ہوں۔ سرحد سے پانچ میل اندر ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔ ہم میں سے کسی نے بھی مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا اور آگے بڑھتے رہے۔ چھ گھنٹے کی جنگ میں فتح کا پھول ہمارے ہاتھوں میں تھا اور دشمن کے ناپاک قدم اس سرزمین سے ہٹ چکے تھے۔ چھ بھارتی فوجیوں کی لاشیں عبرت کا نشان بنی ہوئی تھیں۔ یہ اللہ کی کرم نوازی تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی زخمی ہوا اور نہ شہید۔

اسی طرح ضلع راجشاہی میں بدل گاچھی کے قریب ایک صحرائی علاقہ ہے۔ یہاں بھی ایک معرکہ ہوا۔ جس میں پچیس البدر، پچاس رضاکار اور بیس پاک آرمی جوان شریک ہوئے۔ آپریشن کمانڈر میجر افضل حسین تھے۔ اس سیکٹر پر گھمسان کا رن پڑا۔ دشمن کی سپلائی لائن کاٹنے کے بعد ہم نے بھارتیوں کو محاصرے میں لے لیا۔ دوسرے روز ہمیں کامیابی حاصل ہوئی اور اکتیس بھارتی فوجیوں کو گرفتار کر لیا۔ ہماری جانب سے ایک رضاکار شہید ہوا۔

جاوِداں
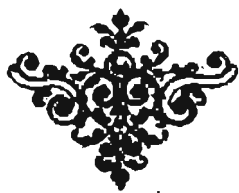
حضرت ابو عبیدہؓ کے نقش قدم پر

بریگیڈیئر محمد حیات خان صاحب نے کہا کہ میں البدر کے اس تذکرے کا آغاز اس نوجوان سے کرنا چاہتا ہوں جس نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی روایت تازہ کی۔ اس نوجوان کا تعلق اسلامی جمعیت طلبہ سے تھا۔ وہ چند ساتھیوں کے ہمراہ اپنے گاؤں میں راتوں کو پہرہ دیا کرتا ایک رات مکتی باہنی کا ایک ٹولہ گاؤں پر حملہ آور ہوا۔ حملہ آوروں میں اس نوجوان کا باپ بھی شامل تھا۔ شدید جھڑپ ہوئی۔ اس جھڑپ میں باپ اپنے بیٹے کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اگرچہ بیٹے کو یہ بات صبح کی روشنی میں معلوم ہوئی کہ رات کی لڑائی میں اس کا باپ مارا گیا ہے۔ نوجوان نے اپنے باپ کی لاش دیکھی، مگر وہ نہ تو رویا نہ غمگین ہوا۔ بلکہ ایمان اور یقین کا عجیب مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے صرف یہ کہا: "ٹھیک ہے وہ میرا باپ تھا، مگر وہ میرے دین اور ملت کے دشمنوں کا ساتھی تھا۔ وہ اپنے درست انجام کو پہنچا ہے۔"

میں نے اس سے ملاقات کی۔ اس کے جذبے کو سراہا اور یاد دلایا کہ اس نے یہ کارنامہ انجام دے کر حضرت امین الامت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی روایت دہرائی ہے تو اس نے بڑے انکسار سے کہا: "میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ مجھے اپنا مقصد دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے اپنے دین کی خاطر ہر باطل قوت کے خلاف لڑنا ہے۔ میرے راستے میں اگر میری ماں بھی حائل ہوئی تو میں اس سے بھی ٹکرانے سے نہیں ہچکچاؤں گا۔"

(اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۷۸ء)

ایک سو بھارتیوں پر بھاری نوجوان

بریگیڈیئر محمد حیات خان صاحب ہی نے بتایا کہ ایک اور روشن چہرہ میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ میرا حافظہ دھوکا نہیں دیتا تو اس کا نام شمس الاسلام تھا۔ اس کا تعلق اسلامی جمعیت طلبہ سے تھا۔ وہ کھلنا کے قریب پائی گاچھا نامی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس نے ایک رات اپنے ساتھیوں کی مدد سے بھارتی فوج کی پوری کمپنی (لگ بھگ ایک سو افراد) کو ایک لیفٹیننٹ سمیت پکڑ لیا۔ رات بھر اپنے گاؤں میں باندھ کر رکھا اور پھر ہمیں خبر کر دی۔ میرے لیے یہ واقعہ بہت حیران کن تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے یہ عظیم کارنامہ کیسے انجام دیا، تو اس نے بتایا کہ "یہ لوگ ایک گن بوٹ جنگی کشتی میں اسلحہ لئے میمن سنگھ کی طرف جا رہے تھے کہ پاک فوج کی گولہ باری سے ان کی گن بوٹ ڈوب گئی۔ یہ واپس سرحد کی جانب بھاگے اور جب ہمارے گاؤں کے قریب سے گزرے تو ہم نے انہیں چائے پینے کے لئے مدعو کیا۔ یہ ہمارے جھانسے میں آ گئے۔ ہم نے ایک گھر میں انہیں بٹھایا اور پھر اپنے ہتھیار سنبھال کر للکارا: "خبردار! حرکت نہ کرنا! تم چاروں طرف سے گھرے ہو، اوندھے لیٹ جاؤ اور ہتھیار پھینک دو۔" انہوں نے ہمارے حکم کی تعمیل کی۔ ہم نے ان کی مشکیں کس لیں اور پھر آپ کو اطلاع دے دی۔"

میں نے شمس الاسلام سے کہا: "آپ نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا اس کا بدلہ تو ہم نہیں دے سکتے، پھر بھی اگر آپ کی کوئی خدمت کر سکیں تو بتائیے"!

وہ مسکرا کر کہنے لگا: "بریگیڈیئر صاحب، مجھے کسی صلے کی حاجت نہیں، تاہم اگر آپ مُصر ہیں تو ایک پستول عنایت فرما دیجئے"۔

"میں نے ایک پستول دے دیا"

(ایضاً)

اپنے محسنوں کی ناقدری

بریگیڈیئر محمد حیات خان صاحب نے کہا،

بدقسمتی سے ہم وہ قوم ہیں جو اپنے محسنوں کو بھلا دیتی ہے۔ جب پاکستان ٹوٹ رہا تھا تو مجھے اپنے ان ساتھیوں کا بے طرح خیال آیا۔ میں نے ان کے زخموں پر پھاہا رکھتے ہوئے کہا تھا "مشرقی پاکستان پر عوامی لیگ اور ہندو کا غلبہ ہو گیا تو کیا، مغربی پاکستان کے دروازے آپ کے لئے کھلے ہیں جو کچھ یہاں آپ سے چھینا گیا ہے وہاں آپ کو مل جائے گا۔ مغربی پاکستان میں آپ کے کروڑوں بھائی آغوش محبت وا کئے آپ کے منتظر ہیں۔" مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ہم نے ان سے غلط وعدے کئے تھے۔ یہاں ہماری قوم کو ایسے ناخدا مل گئے تھے جو ہمارے ساتھ ان کا نام بھی تاریخ کے اوراق سے مٹانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ہمارے سیاستدان سوچ رہے تھے کہ ان لوگوں کا گوشۂ گمنامی میں چلے جانا ہی بہتر ہے اس لئے کہ ان کا تذکرہ زندہ رہنے میں انہیں اپنی موت کا خطرہ تھا۔

البدر اور الشمس کے چند ایسے نوجوان جو جنگی قیدی بن گئے تھے اور مجھے جانتے تھے، رہائی کے بعد یہاں آئے تو مجھ سے ملے، لیکن میں ان کے لئے کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا کیونکہ میں خود ان افسروں میں سے تھا۔ جنہیں سرزمین وطن پر قدم رکھتے ہی فوج سے نکال دیا گیا تھا میں نے انہیں تسلی دی کہ وہ امید کا دامن تھامے رکھیں۔ اللہ کے دین کی خاطر انہوں نے جو قربانیاں دی ہیں وہ یقیناً رائیگاں نہیں جائیں گی۔ میں نے چند اعلیٰ افسروں سے بات کی جنرل رحیم سے ملا اور ان سے کہا کہ وہ ان نوجوانوں کے لئے کچھ کریں۔ جنرل صاحب ان جوانوں کے روشن کارناموں سے اچھی طرح آگاہ تھے، مگر ہر طرف عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ذرائع ابلاغ ان کا کردار مسخ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ میری کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ میں لوگوں کے دروازوں پر دستک دیتے دیتے تھک گیا بالعموم یہی جواب ملتا: "چھوڑو میاں، گڑے مردے مت اکھاڑو" نیا پاکستان" بن گیا ہے، اب نئی باتیں کرو" میں صدمے سے چور دل لے کر واپس چلا آتا۔۔۔۔ مگر میں ان کو نہیں بھلا سکا، بھلانا چاہوں بھی تو نہیں بھلا سکتا۔ میں ان شہیدوں کو کیسے فراموش کر دوں جن کی قبروں پر میں نے اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی۔ جن کے جوان جذبوں کی خوشبو سے آج بھی میرا دل مہک رہا ہے، ان جان فروشوں کو کیسے بھول جاؤں۔ جنہوں نے اپنے نظریے پر دنیا کی ساری خوشیاں نچھاور کر دیں۔ اسلام کے سچے سپاہی بن کر دنیا کو بتا دیا کہ مسلمان

سپاہی آج بھی دنیا کی عزیز ترین متاع ہے۔

بریگیڈیر محمد حیات خان صاحب (ریٹائرڈ) نے ایم۔ رحمٰن (کھلنا) کے بارے میں بتایا،

" وہ میرے سیکٹر میں تھے۔ میں نے انہیں چند ساتھیوں کے ہمراہ کچھ پرانے ہتھیار دے کر کھلنا کے قریب ایک دفاعی پوسٹ پر متعین کر رکھا تھا۔ ان کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ سندربن کے زیریں علاقے سے آنے والی بھارتی کشتیوں اور گن بوٹوں کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ انہوں نے نہ صرف یہ فریضہ انجام دیا۔ بلکہ جرأت اور بہادری کی نئی مثالیں قائم کیں۔ البدر کے اس دستے نے جس کی کمان ایم رحمٰن کر رہے تھے۔ اپنی سرگرمیاں محض دفاع تک محدود نہ رکھیں، بلکہ وہ حملہ آور بھی ہوتا رہا۔ اس نے ہندوستان کی ریگولر فوج کے افسران تک کو جنگی قیدی بنایا۔

۱۶ دسمبر کو ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالے گئے اور لڑائی بند ہو گئی لیکن البدر کی یہ مختصر سی ٹولی ۱۷ دسمبر کی صبح بھی دشمن سے نبرد آزما تھی!

(ایضاً)

معوذؓ و معاذؓ کا پیرو

میجر ریاض حسین (محوز البدر) نے اپنے تذکرے میں ان خیالات کا اظہار کیا۔

چند دن بعد شیرپور میں اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوانوں پر مشتمل ایک منظم گروہ تیار کیا گیا جس کا نام "البدر" تجویز ہوا۔ سینکڑوں نوجوان ایک دوسرے سے بڑھ کر اس کام میں شامل ہونے کے آرزو مند تھے۔ ان کے اس جذبے کو دیکھ کر چناؤ میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی۔ ایک لڑکے کو اس کی کمسنی کی وجہ سے روکنا چاہا تو کچھ ایسا منظر پیش آیا جیسے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہو۔ میں نے کہا، "بیٹا، تم ابھی چھوٹے ہو، اس لئے تمہیں البدر میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ سن کر لڑکا اپنی ایڑیاں اونچی کر کے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور معصومیت سے بولا: "اب تو بڑا ہو گیا ہوں جناب۔"

میں اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا اور میری آنکھیں بھر آئیں۔ کہا: "بیٹا، میں نے غلط کہا تھا، تم چھوٹے نہیں ہو، تم کبھی چھوٹے نہ تھے جو تمہیں چھوٹا کہتا ہے غلط کہتا ہے۔ چھوٹا ہونا بظاہر کمزوری کی

علامت ہے مگر مومن کبھی کمزور نہیں ہوتا۔"ہم نے اس کمسن لڑکے کو البدر میں شامل کرلیا۔

شیرپور کی البدر بٹالین نے اپنی مثالی کارکردگی سے سب کو متاثر کیا۔ یہاں تک کہ اس کی اہمیت اعلیٰ فوجی حکام پر بھی عیاں ہوگئی۔ وہ اسے پورے صوبے میں منظم کرنے کے متعلق سوچنے لگے جنرل نیازی . . . بذات خود تشریف لائے اور البدر کی اعلیٰ کارکردگی پر ہمیں مبارکباد دی۔

چند دن بعد جمال پور سب ڈویژن میں ہم نے مزید دو بٹالین منظم کیں۔ جذبۂ جہاد سے سرشار، البدر نے کیا کیا کارنامے سر انجام دیئے۔ یہ ایک طویل داستان ہے، صرف اتنا کہوں گا کہ البدر کے ہوتے پوری سب ڈویژن میں کسی تخریب کار یا ہندوستانی ایجنٹ کا گھس کر من مانی کارروائی کرنا محال تھا اور ہمیں جمال پور کی البدر پر اتنا اعتماد تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ "ہندوستان کو چیلنج کرتے ہیں کہ جمال پور سب ڈویژن میں تخریب کار بھیجے۔"

رفتہ رفتہ البدر ہر ضلع میں منظم ہوگئی۔ یہاں تک کہ صوبے بھر میں وجود میں آگئی۔ ان میں سے اکثر نوجوان بلاتنخواہ عسکری فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ بھاری تعداد کالجوں کے اسلامی ذہن رکھنے والے طلبہ اور مدارس میں پڑھنے والوں کی تھی۔ فوجی حکام، طلبہ کو البدر میں شامل کرنے سے پس وپیش کرتے کہ ان کی تعلیم میں حرج نہ ہو، لیکن طلبہ کا موقف یہ تھا کہ ہمارا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے اگر پاکستان ہی نہ رہا تو ہماری تعلیم بیکار رہے۔

میں پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ البدر کی اکثریت بلاتنخواہ فرائض سر انجام دے رہی تھی اس کے باوجود کسی موقع پر انہوں نے فرائض سے کوتاہی نہیں برتی۔ ایسے ہی دو سگے بھائی شیرپور کی بٹالین میں تھے، ان میں سے ایک، ایک جھڑپ میں شہید ہوگیا۔ دوسرے بھائی کو چھٹی دی گئی تاکہ اس کے جنازے میں شامل ہوسکے۔ وہ جنازہ پڑھنے کے بعد فوراً اپنی بٹالین میں شامل ہوگیا۔ اس کے کمانڈر نے پوچھا: "چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی کیوں آگئے؟" اس نے جواب دیا: جس فرض کی تکمیل کے لئے میرے بھائی نے جان قربان کی، وہ میرے گھر میں بیٹھ رہنے سے مکمل نہیں ہوسکتا۔ اب اس کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔ اس عظیم فرض کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہنا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔"

البدر کے شیر دل آٹھ ماہ تک قوم اور ملک کی بقا کے لئے پاکستانی فوجی بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑتے رہے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ مسلمان خواہ بنگالی ہو یا سندھی، پنجابی ہو یا پٹھان حق کے لئے

ایک جسم و جان بن کر لڑتا ہے۔ ان میں سے سینکڑوں نے اپنے فوجی بھائیوں کے ساتھ اپنی جان قربان کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ ان کے دلوں میں جہاد کا جذبہ آج بھی اسی طرح موجزن ہے جیسے چودہ سو سال پہلے مسلمانوں میں تھا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد البدر پر کیا گزری اور کیا کیا مظالم ڈھائے گئے۔ ان پر دنیا کی ہر انصاف پسند آنکھ پُرنم ہے۔ لیکن البدر کو مٹا کر انہیں شکست نہیں دی جا سکتی۔ سچائی پر مرمٹنا کبھی شکست نہیں کہلاتا۔ انہوں نے سچائی پر قربان ہو کر ایسی عظیم الشان فتح حاصل کی ہے۔

ان شیر دل نوجوانوں کی صورتیں میری نگاہ میں گھوم رہی ہیں اور میں سوچ رہا ہوں البدر میں یہ جذبہ کیسے پیدا ہوا اور اسی سوچ کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان نوجوان اس جذبے سے سرشار کیوں نہیں۔ ان سوالات کا جواب میں قارئینِ کرام پر چھوڑتا ہوں۔

مصعب بن عمیرؓ کے نقشِ قدم پر

میجر ریاض حسین نے لکھا ان کے ایک رفیق فوجی افسر نے البدر کے ایک مجاہد سے اپنی گفتگو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ جب بھارتی ایجنٹوں کی سرکوبی اور بھارتی فوج کا مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ اس دوران میں البدر کے ایک مجاہد نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اس نوجوان نے مجھے آکر کہا،

"جناب میرے بڑے بھائی کو گرفتار کرنے کا حکم دیں"۔

تذبذب کے عالم میں اُس اجنبی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "کیوں"؟

نوجوان نے جواب دیا "اس کا ہندوستانی افواج اور باغی عناصر سے رابطہ ہے"۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا"؟ میں نے پوچھا۔

"وہ اکثر سرحد پار کر کے ہندوستانی چوکیوں پر جاتا ہے اور انہیں پاک فوج کی نقل و حرکت کی خبریں دیتا ہے۔ کل رات وہ ہندوستان میں تین دن گزارنے کے بعد واپس آیا ہے"۔

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کوئی شخص اپنے سگے بھائی کے جاسوسی جیسے سنگین

جرم سے پردہ اٹھا سکتا ہے۔ میں نوجوان کے ملی جذبے سے انتہائی متاثر ہوا اور اسے کہا "تمہیں معلوم ہے جاسوسی کا جرم ثابت ہونے کے بعد تمہارے بھائی کو کیا سزا مل سکتی ہے؟"

"جی ہاں، مجھے علم ہے، غداری کی سزا موت ہے"۔ نوجوان نے جواب دیا۔

میں نے نوجوان کا مزید امتحان لیتے ہوئے کہا "اگر تمہارے بھائی کو سزائے موت ہو جائے، تو تمہیں افسوس نہیں ہو گا؟"

"جناب، بھائی کی موت کا دکھ کسے نہیں ہوتا۔ لیکن ایک غدار جو میرے تیرہ کروڑ مسلمان بہن بھائیوں سے غداری کر رہا ہو، اس کا مر جانا ہی بہتر ہے جو ناسور پورے جسم کے لئے خطرے کا باعث بن جائے، کیا اسے کاٹ دینا بہتر نہیں؟"

"کیا تمہارے بھائی کی موت پر تمہارے والدین کو دکھ نہ ہو گا؟"

"میرے والد کو فوت ہوئے تین برس بیت چکے ہیں۔ کاش! وہ زندہ ہوتے، ان کی موجودگی میں میرا بھائی کبھی یہ روش اختیار نہ کرتا۔ میں اپنی ضعیف ماں کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی سالمیت پر وہ اپنے بیٹے کو کبھی ترجیح نہیں دے گی"۔

میں نے کہا "اچھا تو آج ہی فوجی دستہ بھیج کر اسے گرفتار کر لوں گا"۔

"جی نہیں، ایک غیر مسلح آدمی کو گرفتار کرنے کے لئے فوجی دستے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف آپ کی اجازت درکار ہے۔ میں اپنے دوستوں کی مدد سے اسے گرفتار کر کے کل صبح آپ کے سامنے پیش کر دوں گا"۔

میں نے اپنی نشست سے اٹھ کر البدر نوجوان کو گلے لگا لیا۔

یہ نوجوان جو ملک و ملت کی خاطر اپنے سگے بھائی کو خود اپنے ہاتھوں قانون کے حوالے کر رہا تھا۔ مشرقی پاکستان میں ضلع مومن شاہی کے سرحدی علاقے کا رہنے والا تھا اور جمال پور سب ڈویژن کے ایک چھوٹے سے قصبے میں زیر تعلیم تھا۔ وہ ایک ہونہار طالب علم ہونے کے علاوہ ایک فرض شناس پاکستانی اور بلند کردار شہری تھا۔

شام کے وقت میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا تھا اور اس نوجوان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں گونج رہا تھا خصوصاً اس نوجوان کے آخری جملے نے تو میرے جذبات میں ہلچل مچا دی تھی :ایک غیر مسلح آدمی کو گرفتار کرنے کے لئے فوجی دستے کی ضرورت نہیں مجھے صرف آپ کی اجازت درکار ہے ۔میں اپنے دوستوں کی مدد سے اسے گرفتار کر کے کل آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔"

میں سوچ رہا تھا اس نوجوان کے دوست کون ہیں جن پر اسے اتنا اعتماد ہے ۔ایسے عظیم کردار انسان کے دوست بھی یقیناً بلند کردار ہوں گے ۔تو کیا یہ نوجوان کسی ایسی مالا کا موتی ہے جس کا ہر موتی اپنی چمک میں ثانی نہیں رکھتا۔ اگر ایسا ہے تو اس سے اور اس کے قابل اعتماد ساتھیوں سے سینکڑوں ایسے کام لئے جا سکتے ہیں جو فوجی دستے کے بغیر بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکیں۔ یہ خیال آتے ہی ہمارے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔

البدر کی عید الفطر

ڈھاکہ کے اشرف الزمان ۱۹۷۱ء کی عید الفطر کے موقع پر اپنے جذبات و احساسات کا یوں اظہار کرتے ہیں ۔

" نیکیوں کا موسم بہار متحدہ پاکستان کا آخری رمضان المبارک اپنی رحمتوں کے نزول کے بعد چلا گیا۔ لاکھوں ستارے جو رمضان المبارک کے آخری دن کا سورج غروب ہونے کے بعد آسمان پر اپنی جگمگاہٹ سے چراغاں کئے ہوئے تھے ۔ یکے بعد دیگرے اوجھل ہوتے ہوئے یکم شوال کے مہمان کے آنے کی خبر دے رہے تھے ۔

یکم شوال کا آفتاب عالمتاب مشرق سے طلوع ہو کر نیند کے ماتوں کو اپنی آمد کی خبر دے رہا تھا۔ جاگو دنیا کے مسلمانو جاگو ! جاگو پاکستانی جاگو !عید کی مسرتیں تمہارے دروازے پر حاضر ہیں" دنیا بھر کے مسلمان اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد کا یہ آواز بلند ورد کرتے ہوئے چاروں طرف سے عید گاہوں کی جانب کھنچے آتے ہیں اور ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دیتے ہیں۔ مگر مشرقی پاکستان میں عید کی مسرتوں پر خوف کے سائے غالب تھے ۔ دشمن اس روز مسرت کو یوم آہ و بکا میں تبدیل کر دینے کی سازش کئے ہوئے تھا۔ اس نے اس روز پورے مشرقی پاکستان میں

نماز عید کے اجتماعات پر مہلک ہتھیاروں سے حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ سازش کا علم ہونے پر اسلام دوست عوام نے اس انسانیت سوز حملے کا مقابلہ کرنے اور اپنی مدد کے لئے ایمانی قوت سے سرشار البدر کے جوانوں کو پکارا اور البدر نے ہنگامی حالت کا اعلان کرتے ہوئے تمام رضاکاروں کو کیمپ میں بلا لیا اور پھر وہ لوگ اس عہد کے ساتھ کہ مشرقی پاکستان کے ہر علاقے میں نماز عید ادا کی جائے گی اور عید کی مسرتوں کا اظہار ہوگا۔ اپنے آرام کو تج کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔

ڈھاکہ کی مرکزی مسجد بیت المکرم، پلٹن میدان اور دوسرے نماز عید کے اجتماعات کے چاروں جانب چاق و چوبند مسلح البدر کسی بھی صورت حال سے نپٹنے کے لئے مستعد کھڑے تھے یہ ایک عجیب روح پرور منظر تھا۔ لوگ نماز عید میں شامل ہوئے اور خوشی خوشی اپنے گھروں کو لوٹے جب سب لوگ جا چکے۔ تب البدر کے مجاہدین اپنے ہتھیاروں کو پہلو میں رکھے دوگانہ ادا کرنے کے لئے قبلہ رو کھڑے ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر یہ لوگ خدا کے حضور میں دست بدعا تھے کہ ؛ "اے اللہ پاکستان کی حفاظت فرما" اور پھر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ یہ منظر بڑا جذباتی منظر تھا۔ ان کے پاس نئے کپڑے تھے نہ نئے جوتے، وہ اپنے گھر، والدین، بہن بھائی، اور عزیز و اقارب سب سے دور تھے، لیکن انہیں کوئی شکایت تھی نہ احساس محرومی مجھے آج بھی یاد ہیں وہ تمتماتے ہوئے چہرے عزیز، نورالامین، عبداللہ یوسف اور بشیر دوسرے۔ یہ روح پرور جذباتی منظر آج بھی میں اپنے شیشہ دل میں دیکھ لیتا ہوں اور پھر فکر و خیال کی دنیا میں کھو جاتا ہوں کہ میرے وہ ساتھی وہ عزیز جنہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا آج کہاں ہیں !

اس دن ـــــ جی ہاں اسی عید کے دن ! ـــــ البدر کے دستے دشمن کے خفیہ اڈوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے۔ مختلف سیکٹروں میں ان کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ بھارت کے بہت سے ایجنٹ پکڑے گئے اور ان کے قبضے سے بہت سے ہتھیار برآمد کئے گئے۔ یہ تھی البدر کی عید ـ !!

اور یہی تھی البدر کے نزدیک حقیقی عید۔ خوشی کا ایک عظیم مگر اداس دن ۔ !

(ہمقدم ، اپریل ۱۹۷۳ء)

متحدہ پاکستان میں مولانا مودودیؒ سے

مشرقی پاکستانی طلبہ کی آخری ملاقات

اکتوبر ۱۹۷۱ء کے پہلے ہفتے میں اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان کے ارکان کا ایک وفد جمعیت کے بیسویں سالانہ اجتماع (ملتان) میں شرکت کے لئے آیا۔ وفد کے شرکاء مولانا مودودیؒ سے ملاقات کے لئے لاہور بھی گئے۔ اس ملاقات کی روداد بیان کرتے ہوئے وفد کے ارکان نے بتایا۔

"رات کے ساڑھے نو بج رہے ہوں گے کہ ہم ۵۔ اے ذیلدار پارک پہنچے، مولانائے محترمؒ کو اطلاع ہوئی تو وہ علالت و نقاہت کے باوجود خود برآمدے تک تشریف لائے اور ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔

ہم نے عرض کیا، مولانا! ہم واپس میدانِ جہاد کو جا رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم آپ کی دعاؤں کے سائے میں مشرقی پاکستان پہنچیں"۔ جہاں ہندوستان نے اپنے حواریوں اور مسلح افواج کے ذریعے Undeclared جنگ مسلط کر رکھی ہے۔

مولاناؒ نے فرمایا: "اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو"۔ پھر فرمایا "جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ اس ابتلاء اور سالمیتِ پاکستان کی جنگ کے وقت میں، میں بھی آپ کے درمیان محاذ پر ہوتا، لیکن عمر کے اس حصے میں جسمانی کمزوری نے مجھے درماندہ کر کے رکھ دیا ہے"۔

ہم نے مولاناؒ کو زیادہ تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے آرام کا خیال کر کے ہم اجازت لے کر اٹھنے لگے تو مولاناؒ نے فرمایا: "صبح تشریف لائیے گا۔ پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی"۔۔۔ ہم اگلے روز صبح حاضر ہوئے تو مشرقی پاکستان کی صورتِ حال پر گفتگو کرتے ہوئے۔

مولانائے محترمؒ نے فرمایا: "یہ بات پہلے روز سے طے تھی کہ جغرافیائی اعتبار سے اتنی دور پاکستان کے دوسرے حصے کو صرف اور صرف اسلام کے رشتے سے جوڑ کر رکھا جا سکتا ہے، لیکن اول روز سے کسی حکمران نے اس رشتہ کو مضبوط بنانے کی فکر نہ کی، بلکہ ہر برسرِ اقتدار آنے والی حکومت نے اس رشتہ کو کمزور سے کمزور تر کرنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کی۔ ملک کی سیاسی جماعتوں نے بھی الا ماشاءاللہ، اس رشتہ کو کمزور

کرنے میں بقدرِ توفیق حصہ لیا اور اب ملک کے دونوں حصوں میں سوشلزم اور نیشنلزم کی علمبردار دو جماعتوں نے جھوٹے وعدوں کے بل بوتے پر انتخابات میں اکثریت حاصل کی ہے۔ انتخابات کے ان نتائج نے پاکستان کو متحد و مضبوط رکھنے والے اس رشتے پر کاری ضرب لگائی ہے۔ پھر رہی سہی کسر صدر یحییٰ خان کے اندھے آرمی ایکشن نے پوری کر دی ہے حالات جس رخ پر جارہے ہیں ان میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ بھارت کھلم کھلا مشرقی پاکستان پر جارحیت کر گزرے اور اس کی پشت پر روس کی فوجی امداد اور امریکہ و یورپ کی پشت پناہی ہوگی۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اندیشہ ہے کہ دشمن مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے کاٹ ڈالنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ویسے بھی مغربی ذرائع ابلاغ پاکستان کے کیس کو پوری طرح مسخ کرنے میں مصروف ہیں۔ ادھر کمیونسٹ گوریلے مشرقی پاکستان میں بھرپور تخریبی کارروائیوں میں لگے ہوئے ہیں"۔

پھر مولاناؒ نے مزید فرمایا ——

"مشرقی پاکستان میں اس عرصے میں اس قدر نقصان ہو چکا ہے کہ اگر یہ حصہ علیحدگی کے سانحے سے بچ بھی گیا تو آئندہ پچاس برس تک نہ سنبھل سکے گا۔ باہمی اعتماد کی فضا بحال کرنے کے لئے ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ بشرطیکہ ملک کی باگ ڈور محب وطن اور سیاسی بصیرت رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں آئے۔ بصورتِ دیگر یہ المیہ مسلم تاریخ میں اندلس (اسپین) کے المیے سے کم درد فرسا نہ ہوگا"۔

پاک آرمی کے ساتھ اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں کا "البدر" کی صورت میں وطن کے دفاع سالمیت کے لئے تعاون کا ذکر آیا، تو مولاناؒ کے چہرے پر گہرے تفکر کے آثار نمایاں ہو گئے۔

فرمانے لگے "ایک بات ہمیشہ یاد رکھئے، فوج زیادہ دیر تک کسی پر اعتماد نہیں کیا کرتی، یہ اس کی نفسیات ہے کہ اندرونِ ملک جو قوت اس کے ساتھ تعاون کرتی ہے مشکل وقت گزرنے کے بعد یہ سب سے پہلے اسی پر حملہ آور ہوتی ہے" اس سلسلے میں مولاناؒ نے اخوان المسلمون کی مثال بھی دی کہ کس طرح مصر میں بادشاہت کا خاتمہ کرنے کے لئے جنرل نجیب اور کرنل جمال عبدالناصر نے الاخوان المسلمون کا تعاون حاصل

کیا اور کامیابی کے بعد کس طرح جمال عبدالناصر نے اخوان المسلمون ہی کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد مولاناؒ نے نصیحت فرمائی کہ "جس وقت بھی وہاں حکومت آپ سے ہتھیار واپس مانگے تو ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر واپس کر دیجئے گا۔"

ملاقات کے آخر میں ہم نے مولاناؒ سے البدر کے کارکنوں کے لئے پیغام کی درخواست کی تو مولاناؒ نے فرمایا:

"باطل کے سامنے سر نہ جھکائیے، حق کی آواز کو صرف سربلند ہی نہ کیجئے، بلکہ عملاً اپنی زندگیوں کو بھی اس کے مطابق ڈھالئے۔ آپ پر بڑی نازک ذمہ داری آن پڑی ہے۔ کسی سے زیادتی نہ کیجئے، لوگوں کی عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیجئے۔ یاد رکھیئے! اصل طاقت ہتھیار میں نہیں، بلکہ ایمان، حکمت اور تنظیم میں ہے۔ پاکستان کا وجود، بقا اور استحکام بھی انہی تین اصولوں سے عبارت ہے اور پاکستان کو بچانے کی کوشش کرنے والے خدا کے بندوں کو بھی یہی اصول مدِنظر رکھنے ہوں گے۔"

مولانا نے محترمؒ لمحہ بھر کے لئے رکے اور پھر ہمارے چہروں پر ایک بھرپور نگاہِ شفقت ڈالتے ہوئے فرمایا:

"مجھے اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن اپنے حقیقی بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں جمعیت کے کسی کارکن کی بھی تکلیف یا شہادت کی خبر کا اثر بڑی دیر تک میرے ذہن اور اعصاب پر رہتا ہے، لیکن آپ فریضہ اقامتِ دین کی جس راہ پر گامزن ہیں، شہادت ہجرت اور عُسرت تو اس راہ کے سنگِ میل ہیں۔ ایسی کسی صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے تو عزیمت کی راہ کو نہ چھوڑیئے اور حق کے پرچم کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دیجئے۔"

ہم نے مولاناؒ سے دعا کی درخواست کی، مولاناؒ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے .... اس دعا کی تاثیر، کیفیت اور حلاوت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یوں لگا جیسے سکینت ہمارے دلوں پر نازل ہو رہی ہو ——

البدر نے دو بھارتی جہاز مار گرائے

مایوس کر دینے والے حالات میں البدر نے جو زریں کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ ان میں البدر کے دو کیڈٹوں نے چاٹگام میں طیارہ شکن توپ کے ذریعے بھارت کے دو جنگی طیاروں کو مار گرایا۔ اس پر شہر میں لوگوں نے جلوس نکالا اور البدر زندہ باد کے نعرے لگائے۔ یہ دونوں کارکن طیارہ شکن گن کے گنر تھے اس واقعہ کے بعد پاک بحریہ نے البدر کو دو گن بوٹ دیں تاکہ بندرگاہ کے نواح میں وہ بھارتی فضائیہ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے میں پاک نیوی کی معاونت کر سکیں۔

خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا

عبدالرحمان (چاٹگانگ) روایت کرتے ہیں: "ایک روز اینٹی ایئر کرافٹ گن کا کیمپ میں رابطہ ٹوٹ گیا جنگ جاری تھی۔ مجھے کنکشن لائن چیک کرنے بھیجا گیا۔ اسی دوران بھارتی فضائیہ نے حملہ کر دیا ہوائی جہاز ۳۰ ایم ایم مشین گنوں کے برسٹ مارتے ہوئے میرے سر سے گزرے۔ اسے اللہ کا خاص فضل ہی کہنا چاہیئے کہ میرے جسم پر خراش تک نہ آئی۔ جہاز ایک بار پھر پلٹ کر آئے، لیکن اتنی دیر میں میں کنکشن بحال کر چکا تھا نیچی پرواز کرتے ہوئے انہوں نے پھر برسٹ مارا۔ گولیاں میرے اردگرد زمین میں گھس گئیں، لیکن میرا بال بیکا نہ ہوا۔ میں اس کرشمۂ قدرت پر بے ساختہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔

اسی طرح ایک بار اور معجزہ رونما ہوا۔ ہماری کمانڈ پوسٹ سے صرف دس گز کے فاصلے پر ۳۷ ایم ایم گن نصب تھی۔ بھارتیوں کو ہماری پوسٹ (نمبر ۴) کی سن گن ملی تو اطمینان کے لئے منہ اندھیرے اس مقام پر روشنی والا بم پھینکا جس سے اردگرد کا سارا ماحول روشنی میں نہا گیا۔ دن نکلتے ہی سات بمبار طیارے مغربی افق سے نمودار ہوئے اور ہزار ہزار پونڈ کے دو بم پوسٹ پر گرائے، دور دور تک عمارتوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ دیواریں گر گئیں، چھتیں اڑ گئیں، گرد کے بادل اٹھ پڑے یوں محسوس ہوا زلزلہ آ گیا ہے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا کوئی جانی نقصان نہ ہوا، ورنہ اتنے فاصلے سے اگر دستی بم بھی پھینکا جاتا تو ہمارے ٹکڑے ٹکڑے اڑ جاتے۔

مجھے تربیت دینے سے انکار کر دیا

محمد ابوالحسن اقبال (رنگ پور) نے بتایا "میں ان دنوں آٹھویں جماعت کا طالب علم اور جمعیت

کا رفیق تھا، البدر کی تشکیل ہوئی تو میں بھی ذوقِ جہاد سے سرشار کشاں کشاں البدر کیمپ میں پہنچ گیا اور اپنی خدمات دفاعِ وطن کے لئے پیش کیں۔ ڈیوٹی انچارج حوالدار نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا: "چلو بیٹا یہاں سے بھاگ جاؤ"۔ میں نے کہا جناب میں البدر میں بھرتی ہونے کے لئے آیا ہوں، بھاگ کیسے جاؤں؟ حوالدار نے کہا: "تم ابھی بچے ہو۔ دشمنوں سے نپٹنے کے لئے ہمیں جوان مرد اور صحت مند افراد چاہییں۔ تمہاری تو جسمانی صحت یونہی سی ہے۔" میں نے کہا: "جناب میدانِ جنگ میں جذبے اور حوصلے لڑتے ہیں ہوتی تازہ لاشیں یا عمریں نہیں"۔ لیکن وہ پھر بھی نہ مانا۔ تب میں نے حوالدار کے سامنے فی البدیہہ جہاد کی فضیلت اور وطن سے محبت کے موضوع پر ایک جذباتی تقریر کر ڈالی۔ حوالدار میری جانب حیرت سے تکے جا رہا تھا۔ میں نے تقریر ختم کی تو اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور تربیت کے لئے چن لیا۔ ان دنوں ہمارے ہاں لیفٹیننٹ الطاف حسین، میجر افضل حسین اور کرنل مستفیض ہوا کرتے تھے۔

بھارتی فضائیہ کا بھارتی بحریہ پر حملہ

احمد الرحمان (کھلنا) نے امدادِ غیبی کا یہ واقعہ بیان کیا:

"کھلنا کی حفاظت کے لئے شہر کی تین اطراف کو پاک فوج نے دفاعی اعتبار سے نہایت مضبوط بنا لیا تھا، جب کہ چوتھی جانب دریا بہتا تھا۔ اس جانب کو محفوظ سمجھتے ہوئے البدر کو متعین کر دیا گیا جن کے پاس ہلکے ہتھیار تھے۔ یہ ۴ دسمبر کا دن تھا کہ کوئی دس بجے کے قریب کھلنا کی اس جانب دریا کے راستے ہندوستانی بحریہ کی گن بوٹیں گھس آئیں اور آتے ہی کھلنا کی بندرگاہ پر گولہ باری شروع کر دی، چونکہ کھلنا شپ یارڈ کو پاک نیوی نے یکم دسمبر کو ہی خالی کر دیا۔ اس لئے اس جانب سے جوابی کارروائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے اس حملہ کو روکنے کی تمام تر ذمہ داری البدر پر آن پڑی تو سب اور آگ کی اس بھرپور جنگ میں جدید مشینی اسلحہ کے مقابلے میں البدر کے مجاہد صرف اللہ کے بھروسے پر تکبیر کہتے اپنی رائفلوں کا رُخ اس جانب کئے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال سے ہمارے ساتھیوں میں اضطراب تو ضرور پیدا ہوا، لیکن کوئی فرد اپنی جگہ سے ہٹا نہیں۔

اسی اثناء میں ہندوستانی فضائیہ کے دو بمبار طیارے نمودار ہوئے، چونکہ پاک فضائیہ ان دنوں

تباہ ہو جانے کے باعث بالکل بے بس ہو چکی تھی۔ اس لئے ان طیاروں کو دیکھ کر پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن قدرت کا ارادہ ہی کچھ اور تھا۔ بالکل غیر متوقع طور پر، نہ معلوم کس غلط فہمی کی بناء پر بھارتی بمبار طیاروں نے ان گن بوٹس پر بمباری شروع کر دی۔ اُدھر گن بوٹس نے اپنے تحفظ کی خاطر فائر کا رخ ہماری طرف سے موڑ کر ان بمبار طیاروں کی جانب کر لیا۔ اپنی ہی فضائیہ کے ہاتھوں بھارتی گن بوٹس غرق ہو گئیں اور جو غرق ہونے سے بچیں وہ واپس بھاگ گئیں۔

(محور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء)

سر سے گزرتی گولیوں نے ریڈیو کے پرخچے اڑا دیئے

ڈھاکہ اسلامی جمعیت طلبہ کے ابو نصر فاروقی نے بتایا:

۷ اپریل ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ کے عوامی لیگی غنڈوں نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ مجھے ہر قیمت پر گرفتار کر لیا جائے۔

ان دنوں میں ایک اچھوتا خیال سوجھا کہ عربی بنگلہ ڈکشنری مرتب کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ایک ساتھی کے گھر بیٹھ کر اس کام کا آغاز کر دیا۔ چند دنوں بعد بازار جا رہا تھا، ابھی آدھا راستہ طے کیا تھا، ایک شناسا نے بتایا کہ مکتی باہنی شکاری کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔۔۔۔۔ اسی گوشۂ عافیت میں جانے کے لئے واپس مڑا ہی تھا کہ ایک دوست نے بتایا کہ تم دو طرف سے مکتی باہنی کے گھیرے میں ہو۔ میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ کئے بغیر مطمئن انداز میں ایک قریبی گھر میں گھس گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس محلے کے قریب جماعت اسلامی کے ایک کارکن کے گھروں سے شعلے بلند ہو رہے ہیں اس گھر کے قریب مجھے جمعیت کی مجلس شوریٰ کے رکن آن کر ملے اور کہا کہ ہم دونوں صبح صبح ڈھاکے روانہ ہوں گے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ انہیں یہاں کوئی پہچانتا نہ تھا جب کہ مجھے پہچاننے والے خاصی تعداد میں موجود تھے، چنانچہ وہ سیدھے راستے سے ڈھاکہ کو نکل گئے اور میں چور راستوں سے ہوتا ہوا شہر سے باہر نکلا۔ شہر کے سرے پر مجھے کالج کا ایک کلاس فیلو مل گیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ کچھ دیر ٹھہرو۔ منہ اندھیرے باہر نکلنا تمہیں مشکوک بنا سکتا ہے۔ چنانچہ

میں اس کی کشتی میں رک گیا۔ کشتی میں بیٹھا ہی تھا کہ باہر شور سا سنائی دیا۔ رفتہ رفتہ یہ شور نزدیک ہوتا گیا۔ میں نے اپنے آپ کو اوجھل کرتے ہوئے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا مکتی باہنی کے غنڈے چند نوجوانوں کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے اور انہیں مارتے پیٹتے شہر سے باہر لے جا رہے تھے۔ چند گھنٹوں بعد ہی معلوم ہوا کہ مکتی باہنی نے ان سب کو شہید کر دیا ہے۔ شہید ہونے والوں کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ خاصا دن چڑھ آیا تو میں درست کی کشتی سے باہر نکلا حاجی گنج بازار اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے نماز ظہر ادا کی۔ سلام بھائی بھی وہاں مل گئے۔ پھر ہم دونوں ڈھاکہ جانے کے لئے موٹر لانچ میں بیٹھے ڈھاکہ پہنچے تو مکمل طور پر ویرانی کا نقشہ پیش نظر تھا۔ لوگ نقل مکانی کر گئے تھے یا گھروں میں بند پڑے رہتے تھے۔ ہم سیدھے جمعیت کے صوبائی دفتر ۱۵ پرانا پلٹن پہنچے۔ وہاں سے باشابو میں ایک ساتھی کے پاس رہائش اختیار کی۔

ایک دن میں . . . بدھوں کے مندر سے سونے کا ایک بت چوری ہو گیا۔ بدھوں کی شکایت پر آرمی حرکت میں آگئی جس شخص پر چوری کا شبہ ظاہر کیا گیا تھا وہ اسی محلہ اور ہمارے دفتر کے بالکل ملحق مکان میں رہتا تھا۔ آرمی والوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ یہ مغرب کا وقت تھا۔ ہم جائے نماز پر بیٹھے آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے والی میز پر چھوٹا سا ریڈیو پڑا ہوا تھا کہ اچانک گولیوں کی ایک باڑھ ہمارے سروں پر سے گزرتی ہوئی ریڈیو کے پرخچے اڑا گئی اور مکان کی دیوار چھلنی ہو گئی۔ خیریت گزری کہ ہم بچ گئے۔ چور فرار ہو گیا، لیکن پورے محلہ پر تباہی نازل ہو گئی۔

"میں سرمایہ داروں جاگیرداروں کو قتل کر دوں گا"

احمد الرحمان (کھلنا) نے بیان کیا:

• عید الفطر کے روز نماز پڑھنے کے بعد میں رکشا میں جمعیت کے دفتر جا رہا تھا کہ اچانک راستہ میں ایک نوجوان نظر پڑا جو اپنے ملحدانہ اشتراکی نظریات میں نہایت پختہ اور ایک تربیت یافتہ گوریلا تھا۔ میں اسے گذشتہ دو تین برس سے خوب جانتا تھا۔ میں نے رکشا رکوا کر اس کا نام لے کر آواز دی تو اس کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن میں نے ایک شخص کی مدد سے

اسے پکڑ لیا اور رکشا میں بٹھا کر جمعیت کے دفتر لے آیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا لیکن چند گھنٹے بعد ہی اس کی رہائی کے لئے کوششیں ہونے لگیں۔ امن کمیٹی اور ڈپٹی کمشنر تک کی سفارش آئی، مگر میرا اصرار تھا کہ رہائی کا حتمی فیصلہ پوری تحقیق و تفتیش کے بعد کیا جائے گا۔ اس سے پہلے کسی قیمت پر نہیں۔

رات کے وقت میں نے دو ساتھیوں کو بھیجا کہ وہ پوچھ گچھ کریں اور بیانات حاصل کر کے رپورٹ دیں۔ ہمارا پوچھ گچھ کا انداز کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ پہلے انتہائی نرم لب و لہجہ اور ہمدردانہ انداز میں سوال کرتے۔ اگر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اخفا سے کام لے رہا ہے تو پھر انجام کا خوف دلا کر بات اگلوانے کی کوشش کرتے۔

اس ملزم سے سب سے پہلا سوال پوچھا گیا کہ "تم اشتراکی نظریات سے کس طرح متأثر ہوئے؟"

اس نے جواب دیا، "میں جماعت نہم میں تھا کہ ایک روز میں نے اپنے محلہ کی مسجد کے مولوی صاحب سے پوچھا کہ یہ امیری غریبی کا فرق کیوں اور کیسے ہے؟ آخر ہم سب مسلمان ہیں۔ ایک خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ پھر یہ حالت کیوں ہے کہ بعض لوگ بہت امیر اور بعض بہت ہی غریب ہیں؟"

میری بات سنتے ہی مولوی صاحب نے کہا کہ "تم کمیونسٹ ہو گئے ہو اس لئے تمہیں بات سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" اس نے سلسلۂ جواب جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے ذہن پر ان کا یہ فقرہ نقش ہو گیا اور میں نے محسوس کیا کہ شاید کمیونسٹ ہی اس معاملے میں سوچ سکتے ہیں۔ اتفاق سے دو ہی روز بعد ایک رسالہ نظر پڑا جو نکسلائٹ (Nexalite) شائع کرتے تھے۔ اس میں ایک خیالی تصویر تھی کہ گیارہ بارہ برس کا ایک لڑکا پستول تھامے کھڑا تھا اور ایک جاگیردار کی لاش اس کے قریب پڑی تھی۔ بچہ لاش کو دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ تصویر کے نیچے یہ فقرا لکھا ہوا تھا: "ظالم جاگیردار پر غریب کسان کے بیٹے کی فتح"۔ یہ تصویر دیکھ کر میرے ذہن میں خیال کی جو لہر اٹھی وہ یہ تھی کہ اگر میرے ہاتھ میں پستول آجائے تو میں کئی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو ڈھیر کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد میرے تجسس، جوش اور جنون میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں میٹرک تک اشتراکی لٹریچر پڑھتا رہا۔ میٹرک کے بعد

نکسلائٹ کیمونسٹ تحریک سے باقاعدہ رابطہ قائم کیا اوران کے دو خفیہ اڈوں پر رہ کر عملی تربیت اور فکری رہنمائی حاصل کی۔

پھر قدرے توقف کے بعد کہنے لگا "مجھے سزا دینے سے پہلے صرف یہ بتا دیجئے کہ کیا اسلام کے پاس کوئی معاشی نظام ہے۔ کیا وہ سماج میں امیر و غریب کا فرق دور کرنے کا بھی کوئی پروگرام اپنے دامن میں رکھتا ہے؟ اور یہ کہ وہ پروگرام کیسے نافذ ہو سکتا ہے؟ بس یہی میری آخری خواہش ہے اس کے بعد جو کچھ آپ کا جی چاہے کر لیجئے۔"

اسی رات اجتماع ارکان میں یہ رپورٹ پیش ہوئی۔ بیشتر ارکان کی رائے یہ تھی کہ "وہ دھوکہ دے رہا ہے تاکہ ہمارے دل پسیج جائیں۔ ہم اسے خوب جانتے ہیں۔ وہ کٹر کیمونسٹ ہے اور کسی طور ٹھیک نہیں ہو سکتا" لیکن مجھے ان سے اختلاف تھا۔ میں نے کہا "اس کی بیان کردہ کہانی جھوٹ سہی مگر یہ ان ہونی ہرگز نہیں۔ ذہنوں میں ابھرنے والے سوالات کا جواب نہ ملے یا غلط ملے تو سوچ کا دھارا غلط رُخ پر بھی بہہ سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں اتمام حُجت کے لئے اس کے سوال کا جواب دینا چاہیئے" چند ساتھیوں نے میری بات کی تائید کی اور بالآخر یہی طے پایا کہ اس سے گفتگو کی جائے چنانچہ دوسری رات دو ساتھیوں کو اس کے کمرے میں بھیجا گیا جنہوں نے بڑے ٹھنڈے اور مدلل انداز میں روشنی ڈالی اور بنگال کے مخصوص معاشی حالات کا حل پیش کیا۔ یہ گفتگو سننے کے بعد اس کا ردِ عمل حیرت انگیز تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رونے لگا۔ پھر ہچکی بندھ گئی۔ اس نے کہا "بس ایک مرتبہ مجھے موقع دیجئے کہ میں ایک مسلمان کی طرح زندگی گزار سکوں، زندگی میں پہلی بار حق مجھ پر واضح ہوا ہے۔ اگر مجھے موقع دیا جائے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسلام اور پاکستان کے لئے کام کروں گا"

ہم نے اس کی بات پہ اعتبار کرتے ہوئے اسے رہا کر دیا۔ پانچویں روز جب وہ رہا ہو کر اپنے گھر پہنچا تو اس کے گھر والے اس کی نماز جنازہ پڑھ چکے تھے

وہ نوجوان دو روز بعد سحری کے وقت اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ ہمارے کیمپ میں آیا اور اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ تاہم احتیاطاً ہم نے اسے چند آزمائشی ذمہ داریاں سونپیں جب وہ اعتماد پر پورا اترا تو پھر اسے آپریشنز پر بھی ساتھ لے گئے اور اس بات سے ہم سب کو بے حد خوشی ہوئی کہ اس نے پوری ایمان داری اور لگن کے ساتھ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ پیش آنے تک ہمارا مکمل ساتھ دیا۔

(محمود، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۰ء)

سقوط
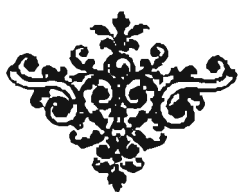
حکم ملا "پیچھے ہٹ جاؤ"

کامران (شیرپور) نے بتایا: "۲۸ر نومبر کے بعد کمال پور سے ہمارا تعلق نہ رہا۔ ۳ر دسمبر کو کیپٹن احسان صدیقی کی کمان میں پاک فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ کمال پور کے بعد بخشی گنج میں دو دن جنگ ہوئی، وہاں میجر ایوب خان کمان کر رہے تھے۔ وہ آخر دم تک لڑے اور شہید ہو گئے۔

۵ر دسمبر کو ہندوستان نے یہ علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اب ہم لوگ جنگی پوسٹوں سے نکل کر درختوں اور کھیتوں میں چھپ کر گوریلا کارروائی کرنے لگے۔ ظاہر ہے اس صورت حال میں یہ کوئی مؤثر کارروائی نہ تھی، لہٰذا کرنل سلطان احمد صاحب نے ہمیں پچھلی پوسٹوں پر واپس لوٹنے کو کہا اور ۷ر دسمبر کو ہم جمال پور آ گئے۔ ۸ دسمبر کو ہم نے جمالپور کے چاروں طرف پوزیشن لے لی۔ یہاں پاک فوج کی پانچ بٹالین اور البدر کی تین کمپنیاں تھیں۔

۸ر دسمبر کو پاک آرمی آفیسرز کی میٹنگ ہوئی۔ البدر کی طرف سے میں نے شرکت کی۔ یہاں فیصلہ ہوا کہ گوریلا جنگ کرتے ہوئے واپس وہیں پہنچا جائے۔ جہاں سے پیچھے ہٹے ہیں۔

بھارت کے فضائی حملے خوفناک شدت اختیار کر گئے تھے، جن سے ہمارا بہت نقصان ہو رہا تھا۔ اس طرح کے ایک حملے میں البدر کیڈٹ عبدالصمد اور دو ساتھی شہید

ہو گئے. تاہم ۱۰، دسمبر کی رات تک ہم نے جمال پور کا دفاع کیا، مگر ۱۱، دسمبر کی رات کو حکم ملا کہ پیچھے ہٹ جاؤ۔"

سخت سردی کی وجہ سے میں بیمار ہو گیا تھا. نقل و حرکت میرے لئے مشکل تھی، چنانچہ جمال پور ہی میں رک گیا. شہر سے پاک فوج چلی گئی اور ہندوستانی فوج آ گئی. البدر کے رضاکار گوریلا جنگ کے لئے شہر چھوڑ کر بکھر گئے اور میں شہر میں اکیلا رہ گیا۔

یہاں ۱۱، دسمبر کو صبح دس بجے پاک فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ البدر کے پانچ مجاہد بھارتی فوج نے گرفتار کر لئے اور ان میں سے تین ساتھی کسی نہ کسی طرح فرار ہو کر مجھ سے آ ملے۔

،ہمیں ہتھیار ڈالنے کی ذلت قبول نہیں

اشرف الزمان (ڈھاکہ) نے ۱۶، دسمبر کو ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے سے پہلے کے لمحوں کو بیان کرتے ہوئے بتایا،

سقوط ڈھاکہ سے کچھ دن پہلے البدر کے مجاہد میمن سنگھ، چاند پور اور کومیلا وغیرہ میں بھارتی فوج سے اگلے محاذوں پر براہ راست لڑ رہے تھے کہ پاک فوج انہیں اطلاع دیئے بغیر پیچھے کا علاقہ خالی کر کے ڈھاکہ میں جمع ہو گئی۔ اس صورتِ حال کا اندازہ ہوا تو ہمارے کچھ مجاہد تو رسد نہ ہونے کے باوجود آخر دم تک لڑے، لیکن بہت سے ڈھاکہ پہنچ گئے۔

پاک فوج ڈھاکہ کے گرد و نواح میں بھارتی فوج سے برسرِ پیکار تھی۔ ہم تقریباً آٹھ نو سو البدری مجاہد کیمپ میں مقیم تھے۔ جنگ کے دوران میں ہمارا کیمپ پاک فوج کے ہیڈ کوارٹر کے قریب منتقل کر دیا گیا تھا۔

کیمپ میں ہمارے شب و روز بہت مصروف گزرتے تھے کہ خبریں سننے کے لئے بھی وقت نہ ملتا تھا۔

۱۶، دسمبر کی صبح کا واقعہ ہے۔ ۱۰ بجے کا عمل ہو گا۔ میں نے حسبِ معمول دو تین مقامات کے آپریشن کا پروگرام بنایا اور کیمپ سے روانہ ہونے کو تھا کہ مشرقی پاکستان جمعیت کے

ناظم اور ڈھاکہ جمعیت کے ناظم نیز مصطفےٰ شوکت عمران (انچارج شعبہ اطلاعات) اور ایک دو اور ساتھی گاڑی میں آ گئے اور کہنے لگے: "رات ہم نے وائس آف امریکہ اور بی بی سی سے سنا ہے کہ پاک فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ آؤ آرمی ہیڈ کوارٹر سے اصل صورت حال معلوم کریں۔"

میں نے جواب دیا: "میرے پاس وقت نہیں، کیونکہ ایک دو اہم کام کرنے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے پاک فوج کے ہتھیار ڈالنے کی خبر محض پروپیگنڈہ ہے۔"

میرا اندازہ یہی تھا، لیکن وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ آرمی ہیڈ کوارٹر لے گئے۔ یہاں پہلے کرنل حجازی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا: "بہتر یہ ہے کہ آپ لوگ بریگیڈیئر بشیر صاحب سے مل لیں۔"

بریگیڈیئر صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ پاک فوج اور ہمارے درمیان رابطہ قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے کہا: "رات ۸ بجے تک صحیح صورت معلوم ہوگی۔"

اس پر مصطفےٰ شوکت عمران نے پوچھا: "اگر آپ خود سرنڈر کر رہے ہیں تو ہمارے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا: "آپ لوگ سول ڈریس پہن کر عام آبادی میں گھل مل جائیں، یا باوردی ہمارے ساتھ ہتھیار ڈال دیں۔ پھر جو کچھ ہمارے ساتھ ہوگا وہی آپ کے ساتھ بھی ہوگا۔ لیکن میری ذاتی خواہش ہے کہ آپ لوگوں کو ہمارے ساتھ تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔"

ہم یہ بات بالکل نہ سمجھ پائے کہ پاکستانی فوج ہندوستانی کافروں کے سامنے ہتھیار ڈال رہی ہے۔ عمران نے کہا: "البدر کا ایک فرد بھی اس ذلت کے لئے تیار نہیں، آپ کم از کم اب تو ہمیں ہتھیار دے دیں، وہ ہتھیار جو آپ دشمن کو دے رہے ہیں۔ ہمارے حوالے کر دیں ہم لڑیں گے۔"

بریگیڈیئر صاحب کچھ دیر خاموش رہے، پھر کہنے لگے: "ہماری حیثیت ہی کیا ہے؟ ہم نہ آرڈر دے سکتے ہیں نہ ہتھیار، جو اوپر سے حکم ہوتا ہے ہمیں اس کی بہر صورت تعمیل کرنا پڑتی ہے۔"

بر سن کر ہم وہاں سے چلے آئے۔ بریگیڈیر صاحب کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کوئی اہم واقعہ ضرور ہونے والا ہے۔ ملٹری ہیڈ کوارٹر سے ہم اپنے کیمپ میں پہنچے اور ساتھیوں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ جہاں تک ممکن تھا ٹیلی فون کے ذریعے اپنی پوسٹوں کو اطلاع دی اور ہدایت کی۔ وہ فوراً سول ڈریس پہن کر روپوش ہو جائیں۔

یہ ہدایات دے کر میں خرم جاہ مراد صاحب (سابق ناظمِ اعلیٰ) کی کار میں کئی ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے نکلا۔ ان ساتھیوں میں سے اسد الزمان آخر تک میرے ساتھ رہے۔ اسد الزماں پلاٹون کمانڈر تھے اور جمعیت کے امیدوار رکنیت ہم دھان منڈی میں پبلک سروس کمیشن کے دفتر پہنچے۔ ہمارے پاس اس وقت صرف دو سوٹ کیس تھے۔ انہیں دفتر کے ایک چپڑاسی کے حوالے کیا اور شہر کا جائزہ لینے کے لئے مختلف مقامات پر گھومتے رہے۔

اس رات نو بجے ٹیلی فون کے تمام رابطے ختم ہو چکے تھے۔ ممکن ہے یہ تاریں پاک فوج نے یا مکتی باہنی نے کاٹ دی ہوں۔

آنسوؤں کا سیلاب اور سسکیوں کا طوفان

محمد منصور (چٹاگانگ) نے بیان کیا۔ ہم چٹاگانگ سے دس میل دور سیکٹر پر ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے کہ ۱۵ دسمبر کی رات وائس آف امریکہ سے ہم نے سنا کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ہمارے صوبیدار نے ایک گالی دے کر کہا کہ ہم سرنڈر نہیں کر سکتے۔ یہ من گھڑت خبر ہے۔ صبح وائرلیس پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا گیا جواب ملا: "ہمیں براہِ راست کوئی اطلاع نہیں ملی، لہٰذا جنگ جاری رکھو!"

دن کے ایک بجے تک لڑائی ہوتی رہی۔ ساڑھے بارہ بجے بھارت کی طرف سے فائر آنا بند ہو گیا۔ تو ہم بھی خاموش ہو گئے۔

۱۶ دسمبر کو ابو سرور (رکن جمعیت، چٹاگانگ) سے پہنچے۔ انہوں نے البدر کے تمام

مجاہدین کو اکٹھا کیا۔ ہم کوئی پچاس کے قریب تھے۔ پوچھا: کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟
ایک چھوٹے سے ساتھی نے کہا: کئی دن سے بھوکے ہیں۔ کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ البتہ
پینے کو پانی بہت ملا۔"

سردار نے ہنس کر کہا: "آپ کو صرف پیٹ کی فکر ہے"۔

مجھے ان کی ہنسی بڑی مردہ سی لگی۔ میرا ماتھا ان کے انداز گفتگو سے ٹھنکا چنانچہ میں
نے پوچھا: مہربانی کر کے صاف صاف بتائیے کیا حالات ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا: "حالت ایسی بری بھی نہیں"۔ پھر تمام مجاہدین کو چاٹگام چلنے
کا حکم دیا۔

ہم چاٹگام پہنچے۔ چھاؤنی کے علاوہ شہر میں البدر کے دو کیمپ فوراً ختم کر دیئے
گئے تھے۔ البتہ شہر میں جماعت اسلامی کے دفتر کے گرد خندق کھود کر دو مورچے لگا دیئے
گئے تھے، تاکہ دشمن کے ایجنٹوں کو یہ تاثر ملے کہ یہاں آخر دم تک مقابلہ ہوگا۔ البتہ باقی
ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ چھاؤنی چلیں۔ اس طرح چھاؤنی میں ہم سات سو البدر اور
سات ہزار فوجی اکٹھے ہو گئے تھے۔

وہاں پاک آرمی کے نوجوان کیپٹن نے اپنے افسران کی ہدایات کو دہراتے ہوئے
پہلے ہتھیار رکھنے کو کہا، لیکن تھوڑی دیر بعد کہا کہ جتنا جتنا اٹھا سکو اٹھا لو، اور کم از کم ایک
ایک پیٹی ہتھیار لے کر ایئرپورٹ پہنچ جاؤ!"

وہاں پہنچے تو البدر کے رضاکاروں سے کہا گیا کہ اگر اپنے اپنے گھر جا سکو، تو چلے جاؤ،
یہ ممکن نہ ہو تو یہیں رہو۔

میں نے پوچھا: "یہاں سے ہم لوگ کہاں جائیں؟" کیپٹن کے پاس اس سوال کا کوئی
جواب نہ تھا۔ مگر آنسوؤں کا سیلاب اور دھاڑوں سسکیوں کا طوفان تھا اور ہم۔

"ہم ہتھیار ڈالتے ہیں" کرنل نے کہا

ابو عاطر (چیلاہاٹی، رنگ پور) نے بتایا کہ ۳ دسمبر سے پہلے اس محاذ پر بھارتی فوج

سے کھلم کھلا جنگ ہوتی رہی، لیکن جب روز جنگ کا اعلان ہوا۔ بلا جواز اور بغیر کسی جھڑپ کے پاک فوج نے چیلا ہاٹی کو چھوڑ دیا اور تحصیل نیلفا باڑی سے بھی اپنی فوجیں نکال لیں۔ اور پسپا ہوکر دس میل پیچھے مزار گنج میں پڑاؤ ڈالا۔ یہ سب کچھ اچانک اور بلا مشورہ کیا گیا۔

حسب سابق محاذ جنگ کی جانب البدر چار میل آگئے تھے۔ گو ہمارا یہ دستہ پاک فوج کے تحت ہی تھا۔

نئی صورت حال سے البدر کی طرح پاک فوج کے جوان بھی سخت غمگین اور ناراض تھے وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ بلا وجہ اپنا علاقہ کیوں چھوڑا جا رہا ہے۔

بھارتی فوج پاکستان کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کی پہلی صف کا مقابلہ البدر نے دو روز تک مورچہ بند ہو کر کیا۔ البدر کے پاس صرف خود کار رائفلیں تھیں۔

لڑائی کی شدت بڑھ گئی تو پاک آرمی نے بہت پیچھے توپوں سے گولہ باری شروع کی اور البدر کو پیچھے ہٹ جانے کا پیغام بھیجا اور ہم پیچھے ہٹ کر ڈوسر تھانہ (Dosar) آگئے اور اسی اثنا میں محاذ پر خاموشی چھا گئی۔

سات روز تک ہمارے درمیان کوئی لڑائی نہ ہوئی صرف بھارتی فوج کے ہیلی کاپٹر کبھی کبھی چکر لگا کر چلے جاتے، ہماری رائفلیں ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ ہم اب بھی پاک فوج سے تین میل آگے خان ساماں (Khansaman) کے مقام پر مورچہ بند تھے۔

آٹھویں روز بھارتی فوج نے ہیلی کاپٹروں اور ٹینکوں سے البدر کے مورچوں پر حملہ کیا۔ اس وقت البدر کیمپ میں صرف ۹۵ کیڈٹ موجود تھے۔ ایک گھنٹے تک زبردست جنگ ہوتی رہی۔ درختوں کے جھنڈ کی وجہ سے دشمن ہماری قوت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکا اور وہ پیش قدمی میں ہچکچاتا رہا۔

ہمارے پیچھے سے پاک آرمی کے ٹینکوں نے فائر کھول دیا، بڑے پیمانے پر لڑائی شروع ہوگئی جو چوبیس گھنٹے جاری رہی اور بھارتی فوج تازہ ترین کمک آنے کے باوجود پسپا ہوگئی، لیکن پاک آرمی نے پیش قدمی نہیں کی، البتہ سپلائی لائن بحال رکھی، ہمیں بھی اسلحہ فراہم کیا گیا۔

اس موقع پر پنجاب رجمنٹ کا سپاہی لبشارت بڑی بے جگری سے لڑا۔ اس نے دشمن کے دو ٹینک، اینٹی ٹینک جائنا گن سے تباہ کیے، لیکن پھر ایک ٹینک کا گولہ لگنے سے شہید ہو گیا۔ اس کے ساتھ تین رضاکار اور سات البدر شہید ہوئے۔

اگلے روز بارہ بجے پھر جنگ شروع ہوئی، تو پاک آرمی نے بلاجواز پسپائی اختیار کی۔ وہ سات میل پیچھے ہٹ گئے۔

البدر چار میل آگے بھارتی فوج کے سامنے تھے۔ پاک آرمی نے تین روز بعد اور پیچھے ہٹ کر درروانی ریلوے اسٹیشن پر پڑاؤ ڈالا اور اگلے روز کرنل صاحب نے البدر کمانڈر کو بلا کر کہا: "اب تم اپنا بچاؤ خود کرو، ہم ہتھیار ڈال رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر کسی جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ایک جیپ پر سفید جھنڈا لہراتے ہوئے دشمن کی صفوں کی طرف چلے گئے۔

اب پاک فوج آگے تھی اور البدر پیچھے رہ گئے تھے۔

پاک فوج کے آفیسرز ہیلی کاپٹرز کے ذریعے ڈھاکہ روانہ ہو گئے اور ہم البدر بکھر گئے یا ہجرت کر گئے۔

تم چودہ سو سالہ تاریخ کے غدار ہو

کیپٹن عبدالکریم (چیاگانگ) نے بتایا کہ ۱۶ دسمبر کی صبح میں نے سلیم اللہ البدر کیڈٹ کو بتایا کہ پاکستانی فوج ہتھیار ڈال رہی ہے، تو اُس نے ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے مذاق سمجھ رہا تھا، مگر جب میں نے اسے بتایا کہ مذاق نہیں حقیقت ہے تو اس پر قیامت گزر گئی اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں اور شدتِ غم سے لڑکھڑا گیا۔ میں نے اسے سہارا دیا تو اس نے میرے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

میں نے اسے بتایا کہ مشرقی پاکستان میں لڑنے والی فوج تو یہ نہیں چاہتی تھی، مگر اسے ایسا کرنے کا حکم دیا گیا۔

یہ سنا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا: "کس نے

یہ حکم دیا ہے ؟"

میں نے کہا: غالباً یحییٰ خان کا حکم ہے۔"

سلیم اللہ گرجا "یحییٰ خان کا حکم ماننے والو! کیا تمہیں قائد اعظمؒ کا یہ حکم یاد نہیں کہ:

"اگر کبھی پاکستان کی حفاظت کے لئے تمہیں جنگ کرنا پڑے تو پہاڑوں میں لڑنا، جنگلوں میں لڑنا۔ دریاؤں میں لڑنا، میدانوں میں لڑنا، آخر دم تک لڑنا اور کسی صورت بھی دشمن کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا۔"

میں خاموش تھا اور سلیم اللہ کی جذبات سے بھرائی ہوئی آواز گونج رہی تھی:

"او ظالمو! دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے والو! تم صرف پاکستان سے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام سے غداری کر رہے ہو۔ تم اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ سے غداری کر رہے ہو۔ اسلام کے اس قلعے کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کے بجائے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دینے والو! تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھاؤ گے ؟"

سلیم اللہ واپس جانے کے لئے مڑا تو میں نے اسے روکتے ہوئے آہستہ سے کہا: "اب جب کہ فوج ہتھیار ڈال رہی ہے۔ البدر کا لڑتے رہنا عقل مندی نہیں ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ آپ .... !"

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ سلیم اللہ نے مجھے زور سے ایک دھکا دیتے ہوئے کہا "خاموش! دیکھو! سلطان ٹیپو کہہ رہا ہے: شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے!" پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ مجھے آج تک علم نہیں ہو سکا کہ وہ کس حال میں ہے۔

آسام کے جنگلوں سے گوریلا جنگ کا پروگرام

احمد الرحمان (کھلنا) نے اپنے مقام کی صورت سے آگاہ کیا: ۱۴، دسمبر کو بھارتی افواج جیسور کو تاراج کرتی ہوئی تیزی سے کھلنا کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ جیسور سے پاک افواج کا ایک بڑا حصہ کھلنا آگیا تھا، لیکن کھلنا سے سمندر کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔

جیسور سے آنے والے ہمارے البدر ساتھیوں نے بتایا کہ گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی اور ہم حسب سابق اگلے مورچوں میں تھے کہ پیچھے سے کوئی فوری آرڈر آ جانے کے سبب یا کسی حکمت عملی کے باعث ہمیں اطلاع دیئے بغیر پاک فوج نے آہستہ آہستہ جیسور کو چھوڑ دیا۔ ہمارے بیشتر ساتھی مورچوں ہی میں بھارتی فوج اور مکتی باہنی کے ظلم و تشدد کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ان میں سے گنتی کے چند مجاہد ہی جان بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ جو چھپ چھپا کر کھلنا آ گئے۔

یہ حالات معلوم کر کے ہمیں دلی صدمہ پہنچا، مگر جنگیں تو ہوتی ہی صدمات سہنے کے لئے ہیں۔ پھر اگر کمان بھی درست نہ ہو تو ایسے المیئے مقدر بن جاتے ہیں۔

۱۶ دسمبر کو ہمیں ہتھیار ڈالنے کا سگنل موصول ہوا۔ مگر ہمارے کمانڈر بریگیڈیر محمد حیات خان اس کے لئے تیار نہ تھے۔ تاہم انہوں نے ہمیں اطلاع دے دی کہ صورت حال تشویشناک ہے۔ آپ چاہیں تو ہمارے ساتھ چلیں۔ دوسری صورت میں اپنی منزلِ متعین کرنے کی ذمہ داری آپ پر ہو گی۔

تھوڑی دیر بعد اجتماع ہوا جس میں گیارہ ارکان نے شرکت کی۔ ان میں ۹ کھلنا کے اور ۲ جیسور کے تھے۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ لڑتے ہوئے شہید ہو جائیں۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ اپنی انفرادی قوت کو بچا لیا جائے تاکہ تحریک اسلامی کا کام جاری رکھا جا سکے۔

دوسری تجویز کثرت رائے سے منظور ہوئی اس کے بعد ہم نے ساتھیوں کو ضرورت کے مطابق رقوم مہیا کیں۔ اور ان سے کہا کہ وہ جہاں چاہیں روپوش ہو جائیں۔ اس کے بعد ہم نے زبردستی اپنے کارکنان سے کھلنا خالی کرا لیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس اسکیم پر بھی غور جاری رکھا کہ آسام کے جنگلات میں روپوش ہو کر دیر تک بھارتی افواج کا ناک میں دم کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات زیر بحث آئی تو پاکستان آرمی کے دو میجروں نے فوراً آگے بڑھ کر کہا کہ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔ پھر فوجی نقطۂ نظر سے خوراک، ادویات، ہلکے ہتھیاروں اور دستی بموں کی ایک فہرست بنا لی گئی اور ایک سو جاں نثار ساتھیوں کو بھی چن لیا گیا جو صحت کے اعتبار سے مضبوط تھے، مگر عین وقت پر پھر اس منصوبہ کو منسوخ کر دیا گیا۔

۷۔ دسمبر کی صبح ۱۰ بجے بھارتی افواج کھلنا میں داخل ہوگئیں۔ اس وقت بھی پاکستانی آفیسرز ہتھیار ڈالنے میں پس وپیش سے کام لیتے رہے، مگر کب تک ؟

تم نہیں لڑنا چاہتے تو مورچے ہمارے حوالے کر دو

عبدالسلام (راجشاہی) نے بتایا کہ راج شاہی میں ۹ ، دسمبر کو فوج نے سرنڈر کیا۔ ۱۸ دسمبر ۷۱ء کو ہم لوگ راج شاہی سے تیس میل دور "ناٹور" بریگیڈ ہیڈ کوارٹر چلے گئے تھے۔ تقریباً ساٹھ کارکن میرے ساتھ تھے۔ یہ سب نارتھ بنگال کے مختلف علاقوں سے آئے تھے۔ ان میں راجشاہی کے تیس ساتھی بھی تھے۔

بگرہ، بوگرہ ڈسٹرکٹ کو ۸۔ دسمبر سے پہلے فوج نے خالی کر دیا تھا، چنانچہ یہاں سے ہمارے چیدہ چیدہ کارکن اور البدر کے مختلف عہدوں کے مجاہد ناٹور پہنچے۔ یہ نارتھ بنگال کا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تھا۔ ناٹور میں ہم آٹھ البدر تھے۔ عبدالقیوم، فاروق الرحمٰن، غلام علی میاں ابوالہاشم، عزیزالدین، عبدالجبار، قربان اصغر اور میں۔

بیسور ۲ ۔دسمبر کو ہمارے ہاتھ سے نکل چکا تھا، لیکن ۱۶ ۔دسمبر کو ڈھاکہ کے زوال تک مکتی باہنی اور انڈین فوج کا راجشاہی شہر پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔ ڈھاکہ کے زوال کے بعد ہم فوج سے معلوم کرتے کہ تم تو ہتھیار نہیں ڈالوگے تو وہ کہتے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چنانچہ ہمیں یقین تھا کہ راجشاہی محفوظ رہے گا۔ وہاں کا ریڈیو اسٹیشن بھی تقریباً ہمارے کنٹرول میں تھا۔ ہم نے فوج سے کہہ رکھا تھا کہ اگر تم (لڑنا چاہو تو مورچے ہمارے حوالے کر دینا۔

۱۸۔ دسمبر کو کمانڈر نے کہا ہم آرمی کو ناٹور شفٹ کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس وقت بھی ہمیں یہ نہیں بتایا کہ وہ سرنڈر کرنے جا رہے ہیں۔ ہم نے اسے فوج کی حکمت عملی سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ ناٹور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۹۔ دسمبر ۷۱ء کی صبح ہم نے دیکھا کہ چھاؤنی کے چاروں طرف بھارتی فوج اور مکتی فوج نے پوزیشنیں لے رکھی ہیں۔ اس وقت کرنل صاحب نے بتایا کہ ہم ہتھیار ڈال رہے ہیں۔

ہم نے کہا کہ ہم جو ساٹھ افراد ہیں کہاں جائیں گے؟ اس مرحلہ پر ہم اپنا اسلحہ بھی نہیں چھپاسکتے مناسب ہے کہ ایک فوجی تنظیم ہونے کی حیثیت سے ہمیں بھی فوج کے ساتھ رکھا جائے"۔ مگر بھارتیوں نے کہا کہ ہم کسی بھی بنگالی رضاکار کو گرفتار نہیں کریں گے۔ ان سے مکتی باہنی نمٹے گی۔غرض ۱/۲ ۸ بجے صبح باقاعدہ ہتھیار ڈال دیئے گئے اور ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔یوں لگا تھا جیسے پوری دنیا کے شیطان ہماری حالت دیکھ کر قہقہے لگا رہے ہوں۔

آپ چاہیں تو مجھے مار دیں

ابوالنصر فاروقی (ڈھاکہ) کے مطابق دھان منڈی کیمپ کے انچارج شاہد بھائی تھے۔ ۱۵ دسمبر کو رات گئے خواجہ خیرالدین صاحب کا فون آیا کہ "پاک فوج سرنڈر کا فیصلہ کر رہی ہے آپ کا کیا خیال ہے؟"

شاہد بھائی نے جواب دیا: فوج سرنڈر کر سکتی ہے، شاہد ہتھیار نہیں ڈالے گا"۔

فون کے ذریعے ہمارا یہ آخری رابطہ تھا۔ لعدازاں بھارتی گوریلا بریگیڈ نے فون کے تمام تار کاٹ دیئے۔ ہم نے فوراً دو گاڑیاں تیار کیں۔ ان پر لاؤڈ سپیکر نصب کئے اور لوگوں کا مورال بلند کرنے کے لئے شہر کا گشت شروع کر دیا۔ ہم نعرے بلند کرتے اور جذبات میں ڈوبی مختصر تقریریں کرتے، لوگوں کو یقین دلاتے ہم دشمن کو ملیامیٹ کر کے رہیں گے۔

مختلف مقامات پر لوگوں نے ہمارے نعروں کا جواب ویسے ہی جوش و خروش سے دیا۔ ہم نے رات ڈھائی بجے تک شہر کی تقریباً تمام اہم شاہراہوں کا چکر لگایا۔ آخیر میں محمد پور فزیکل ایجوکیشن سنٹر پہنچے۔ جہاں البدر کے ساتھی جمع ہو چکے تھے۔ یہاں ہم نے ایک گروپ تشکیل دیا اور اسے جمعیت کے دفتر ۱۵ پرانا پلٹن، خرم جاہ مراد کے گھر اور البدر ایجوکیشن سنٹر جا کر حالات کا جائزہ لینے کا کام سونپا۔

وہ لوگ چلے گئے تو دوسرے تمام ساتھیوں کو مختلف مقامات پر منتقل کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں دوبارہ محمد پور پہنچا۔ وہاں حالات ناگفتہ بہ تھے۔ رات آنکھوں میں کٹی

فوج نے نہ تو کیمپ سے رابطہ قائم کیا اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں
دوسرے دن ہم روکھا سوکھا ناشتہ تقسیم کر رہے تھے کہ جمعیت کے رکن بھائی الیف
ایم کمال آئے اور بتایا کہ مصطفےٰ شوکت عمران کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔ انہی سے یہ بھی
معلوم ہوا کہ جنگ بندی ہو گئی ہے"۔ یہ تھی ہمارے لئے ۱۶ دسمبر کی منحوس خبر!
ذرا دیر بعد سادہ کپڑوں میں ملبوس پاک فوج کے ایک میجر آئے اور بولے "سرنڈر

ہو چکا ہے، آپ لوگ جہاں مناسب سمجھیں چلے جائیں"۔
ہمارے ساتھیوں کو اس سانحے کا یقین نہیں آ رہا تھا کئی جوشیلے ساتھی بھڑک
اٹھے، اس پر فوجی آفیسر نے کہا "آپ چاہیں تو مجھے مار سکتے ہیں، لیکن میں تو حکم کی تعمیل میں
آپ کو ہتھیار ڈالنے اور جان بچانے کا مشورہ دینے آیا ہوں"۔
اس لمحے ہمارے دلوں میں جو جذبات موجزن تھے۔ انہیں زبان بیان کرنے سے

عاجز ہے۔
دشمن اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ڈھاکہ کے نواح میں پہنچ چکا تھا، لیکن ابھی تک شہر
میں داخل نہیں ہوا تھا۔

اسیری

قید میں بادل ہمارے اوپر سایہ کر دیتا

عبدالرحمان رجا گانگ بھارتی فوج کے ہاتھوں گرفتاری اور بعد میں بیتے ہوئے دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگے جس دن پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا، چٹاگانگ پوری طرح بھارتی فوج کے گھیرے میں تھا۔ ہم حالات سے آگاہ ہوئے تو فیصلہ کیا جو ساتھی پاک آرمی کے ساتھ جانا چاہتا ہے وہ ادھر چلا جائے اور جو روپوش ہونے کا فیصلہ کئے ہوئے ہے، وہ فلاں جگہ پر پہنچ جائے۔"

اس فیصلے کے مطابق میں نے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ روپوش ہو جانے کا ارادہ کیا، لیکن ہماری یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ پہلے مرحلے ہی میں ہمارا ایک ساتھی بھارتی فوج کے ہتھے چڑھ گیا اور ان حالات کا اندازہ کر کے ہم پاک آرمی کے کیمپ میں چلے گئے۔ بہت سے ساتھیوں نے اس کے باوجود ادھر اُدھر بکھر جانے کا پروگرام بنایا۔

پاک آرمی کے کیمپ سے سب فوجیوں کو ایک بھارتی مال بردار بحری جہاز میں سوار کیا گیا اور ہمیں جہاز کی نچلی منزل کے ایک کمرے میں ٹھونس دیا گیا۔ یہ کمرہ بہت ہی تنگ و تاریک تھا۔ ہم لوگ تین دن اور تین راتیں اس میں بے جان لاشوں کی طرح پڑے رہے ایک ہی جانب پڑا رہنے کے سبب ٹانگیں بے جان ہو کر سوج گئیں۔ فراغت کے لئے بھی کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔

تین دن اسی حالت میں گزرے۔ چوتھے دن بعد ایک بھارتی بندرگاہ پر اتارا گیا اور ریل گاڑی میں سوار ہونے کے لئے کہا گیا اور گاڑی میں سوار کرنے سے پہلے حکم ہوا، کھانے پینے سے فارغ ہو جاؤ، آئندہ دو تین دن کچھ نہیں ملے گا۔ یہ حکم سنانے کے بعد سولہ سولہ افراد کو پینے کے پانی کے لئے ایک ایک فوجی تھرماس دیا گیا۔ اس میں پانی کی مقدار دس گلاس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے ساتھ پولیتھین کے لفافے میں بند روٹی دی گئی۔ لفافہ کھولا تو عجیب قسم کی بدبو دماغ کو چڑھ گئی۔ یہ سڑی ہوئی روٹی دیکھنے کو بھی دل نہ چاہتا تھا، لہذا لفافہ پھینک دیا۔ صرف ایک تھرماس پانی پر اگلے تین روز گزارا گیا۔

جہاز کی کوٹھڑی کی طرح ریل گاڑی کی یہ بوگی بھی بالکل چھوٹی سی تھی۔ بھوک پیاس کی تکلیف حبس اور گھٹن کے باعث سخت تکلیف ہوئی۔ بہرحال چھ دن سخت ذہنی کوفت اور بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کرتے ہوئے رات دو بجے بہار کے جنگی کیمپ پہنچے اور وہاں جا کر جلی ہوئی چائے کی شکل دیکھی۔ ہم لوگ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکے تھے۔

قید کے دوران ہمیں کئی مرتبہ لالچ دیا گیا کہ ہم ان کے من گھڑت فوجی جرائم کے سلسلے میں ان کے تیار کئے ہوئے بیان پر دستخط کر دیں۔ مگر ہم مسلسل انکار کرتے رہے۔ ہمارا موقف یہی رہا کہ ہم پاکستانی ہیں، بنگلہ دیشی نہیں۔"

کیمپ سے میں نے تسنیم عالم منظر (ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان) کو خط لکھا۔

انہوں نے جواب میں دو خطوط بھیجے جس سے خرم جاہ مراد صاحب اور چند دوسرے ساتھیوں کے کیمپوں کا پتہ مل گیا۔

ابن حسن (بعد میں، سیکرٹری جنرل، اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان سیشن ۷۸-۱۹۷۷ء) بھی ہمارے ہمراہ قید تھے۔ وقت گزارنے کے لئے ہم نے قیدیوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے اور قرآن پاک کی تعلیم دینے کا پروگرام بنایا اور خدا کے فضل سے چھ سو سے زیادہ افراد کو پڑھنا لکھنا سکھایا اور روزانہ درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔

بھارتی محافظ تلاشی کے بہانے ہمیں طرح طرح سے پریشان کرتے۔ باہر دھوپ میں گھنٹوں "اٹن شن" کھڑا کر کے ذہنی و جسمانی تکلیف دینے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب

وہ یہ حرکت کرتے، اکثر آسمان پر بادل نمودار ہوتا اور ہمارے اوپر سایہ کر دیتا۔ اس بات پر ہماری طرح شاید بھارتی بھی متعجب ہوتے ہوں گے، چنانچہ انہوں نے دھوپ میں کھڑا رکھنے کا سلسلہ ختم کر دیا، لیکن ایک نئی طرز ستم ایجاد کی۔ رات کے وقت پانچ پانچ اینٹوں جتنی چوڑی جگہ میں ایک ایک آدمی کو ٹھونس دیا جاتا، پنکھا بند کر دیا جاتا اور سونے کا حکم دیا جاتا یہ اور بھی سخت تکلیف تھی، لیکن اللہ پاک نے اس معاملے میں بھی خاص فضل فرمایا۔ رات کے وقت بارش ہوجاتی، ہمیں کچھ نہ کچھ سکون میسر آجاتا۔

ایک رات ہماری کوٹھڑی میں سانپ گھس آیا، لیکن اس نے کسی کو کاٹا نہیں، البتہ "سانپ سانپ" کا اس قدر شور اٹھا کہ بھارتیوں کو یہ ظلم بھی ختم کرنا پڑا اور ہم کھلے آسمان تلے سونے لگے۔

ہمارے دو ساتھی بھوک سے شہید ہو گئے

محمد کمال (فرید پور) کہتے ہیں: جنگ شروع ہونے کے چند روز بعد جیسور پر بھارتی فوج نے قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۴ دسمبر کو فرید پور پر دباؤ بڑھا، تو پاک فوج نے گھیرے میں آجانے کے سبب ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا اور پاک فوج کے افسروں نے ہم سے کہا کہ اگر آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو اپنے نام لکھوا دیں۔ جیسور سے چالیس البدر آکر ہمارے ساتھ شامل ہو چکے تھے۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ بمشکل سات ساتھیوں نے مغربی پاکستان چلنے کی خواہش کا اظہار کیا، باقی ساتھی اِدھر اُدھر نکل گئے۔

ہتھیار ڈالنے کے غم میں کسی نے بھی دوپہر اور شام کا کھانا نہیں کھایا۔ تاہم اب ہمیں رخت سفر باندھنا تھا، چنانچہ رات دس بجے ہمارا مارچ شروع ہوا اور ہم جنگل کی طرف روانہ ہوگئے۔ بھارتی فوج ہماری نگران تھی، ہم سات البدر نے پاک فوج کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پاک آرمی کے ایک کیپٹن نے کہا: "تم بنگالی لوگ شاید ہمارے ساتھ مغربی پاکستان

نہ جاسکو۔ ہمارے پاس کچھ رقم ہے لے کر چلے جاؤ۔"

ہم اسکول کے طالب علم تھے، سوچا موجودہ صورت حال میں ہم کیا کر سکیں گے، پھر بھی ہم میں سے تین ساتھیوں نے روپوش ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اُن میں دو سگے بھائی تھے۔

انڈین آرمی نے قیدیوں کے نام لکھے، تو بریگیڈیئر صاحب نے ہمارے بارے میں لکھوایا کہ یہ ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز سے متعلق ہیں ہماری کم عمری پر بھارتیوں نے حیرانی کا اظہار کیا، لیکن ہمارے نام لکھ لئے۔

دو دن تک جنگل میں پیدل مارچ ہوتا رہا۔ ایک جگہ مقامی ہندوؤں نے اچانک حملہ کر دیا۔ صورتِ حال خاصی نازک تھی، لیکن ہم نے حوصلہ برقرار رکھا۔ اس جگہ صرف ایک مندر تھا جس میں ہم پناہ لے سکتے تھے، چنانچہ ہم لوگ اس میں داخل ہوگئے اور حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے لگے۔ ان لوگوں کو ہمارے نزدیک آنے کی جرأت نہ ہوئی، البتہ مندر کے اردگرد گرنیڈ پھینکتے رہے۔ اس پریشانی سے نجات ملی، تو پھر دشت نوردی شروع ہوئی اور دوروز کے تکلیف دہ سفر کے بعد ہمیں ریل گاڑی میں بٹھایا گیا اور کوئی بیس بائیس میل دور ایک میدان میں اتار دیا گیا۔

۲۲ دسمبر تک ہمیں وہیں رکھا گیا۔ ہم نے سادہ کپڑے اتار دیئے تھے اور فوجی وردیاں پہن لی تھیں، ۲۲ دسمبر کی رات گاڑی پر سوار کیا گیا اور صبح کے تقریباً ۴ بجے کلکتہ کے قریب اتارا گیا۔ یہاں بھارتی فوجیوں نے ہماری گنتی سکے مار مار کر کی۔ کھانے کا وقت ہوا تو دو دو چمچ چاول اور ایک ایک چمچ دال کا راشن ملا۔

رات دس بجے پھر گاڑی میں سوار کیا گیا اور جس ڈبے میں صرف آٹھ آدمیوں کی نشستیں تھیں۔ ان میں ۳۶، ۳۶ افراد کو ٹھونسا گیا۔ ساری رات ہم جانوروں سے بدتر حالت میں گرفتار رہے۔ صبح آٹھ بجے گاڑی روانہ ہوئی اور تین دن سفر جاری رہا۔ اس عرصے میں ہمیں کھانے پینے کی کوئی چیز نہ دی گئی۔ ڈبوں کی ٹنکیاں بھی پانی سے خالی تھیں، ہمیں ایک ریلوے سٹیشن پر اتارا گیا اور پانی پینے کی اجازت ملی اس سفر میں ہمیں

کس قدر تکلیف برداشت کرنی پڑی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ہمارے دو ساتھی بھوکے پیاسے شہید ہو گئے۔

۲۸ دسمبر کو آگرہ پہنچے۔ وہاں گاڑی سے اترنے کے بعد حکم ملا: "نیچے دیکھتے ہوئے چلو۔" اگر کوئی سر اٹھاتا تو سر پر لاٹھی لگتی۔ اسی حالت میں چلتے ہوئے جیل پہنچے اور وہاں پھر اسی انداز سے گنتی ہوئی کہ نام پکارنے سے پہلے ڈنڈا رسید کیا جاتا۔

ملٹری پولیس کے ایک جوان نے کہا، بھئی انہیں کیوں مارتے ہو؟ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ گنتی کے بعد ہمیں چھوٹی چھوٹی بیرکوں میں بھر دیا گیا۔ یہاں بھی صورتحال وہی تھی، جس بیرک میں مشکل سے تیس آدمیوں کی گنجائش تھی، سو سو آدمیوں کو ٹھونس دیا گیا تھا۔ مزید ستم یہ کہ شدید سردی کے دنوں میں سولہ روز تک کوئی کپڑا نہیں دیا گیا۔ پھر بوری نما ایک ایک کمبل ملا اور ایک ایک پرانی ٹھنڈی قمیض اور بوسیدہ گندی پتلون سب کے حصے میں آئی۔

چار ماہ بعد آگرہ جیل سے آگرہ کیمپ میں منتقل کر دیا گیا اور پریشانیاں کچھ کم ہوئیں۔

میری انگلی کا ناخن پلاس سے کھینچ کر الگ کر دیا

محمد معصوم الزماں (ڈھاکہ) نے روداد اسیری بیان کرتے ہوئے بتایا: "میں سقوط مشرقی پاکستان کے وقت ڈھاکہ تھا۔ پروگرام یہ بنایا تھا کہ سلہٹ کی جانب ہجرت کر جاؤں گا۔ لیکن اس سلسلے میں ابھی عملی طور پر کچھ نہ کیا تھا کہ مشکلات نے آن گھیرا۔ ۱۶ دسمبر کو اپنے ایک دوست کے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں جمعیت کے ایک کارکن ملے جو محمد جہانگیر کمپنی کمانڈر البدر کی شہادت پر بہت ہی زیادہ دل گرفتہ تھے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ان کے ہمراہ دھان منڈی جاؤں، ان کی پریشانی کا اندازہ کر کے میں نے یہ مان لیا، لیکن ان کے گھر پہنچا ہی تھا کہ کسی نے میرا نام لے کر پکارا اور باہر آنے کو کہا۔ میں باہر آیا تو وہ کہنے لگا۔ "تم مومن شاہی کے رہنے والے ہو اور تمہارا تعلق جمعیت سے ہے۔" بات ختم ہوتے ہی اُس نے مجھے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔

اسی دن صبح مصطفےٰ شوکت عمران نے مجھے سفر خرچ کے لئے ایک سو روپے دیئے تھے۔ اس ظالم نے وہ بھی چھین لئے، میری گھڑی اتار لی اور سویٹر لے لیا۔ یہاں تک کہ بین اور عینک سے بھی محروم کر دیا۔ پھر گردن سے پکڑ کر مجھے ایک گھر میں لے گیا اور وہاں جا کر لاتوں اور گھونسوں کے بجائے لاٹھی سے مارنا شروع کر دیا۔ گھر میں ایک خاتون نے اس کو اس تشدد سے منع کیا تو وہ رک گیا، لیکن ذرا دیر بعد باہر سے چار عوامی لیگیوں کو لے آیا اور میرے سامنے ہی وہ میرے بارے میں مشورے کرنے لگے۔

ایک نے کہا: "اس کو چھوڑ دیں"۔

دوسرا بولا: "یہ گوریلا لگتا ہے، رات کو ہم پر حملہ کر کے انتقام لے گا"۔

تیسرے نے رائے دی: "اس کو مکتی باہنی کے تفتیشی کیمپ میں لے چلتے ہیں"۔

چوتھے کی رائے تھی: "یہ بات مناسب نہیں، وہ اسے مار دیں گے، کیا فائدہ؟"

وہ آدمی جس نے مجھے پکڑا تھا کہنے لگا: "اس کو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ یہ ضرور البدر سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈھاکے میں البدر کے تیس کیمپ ہیں، یہ انہیں اطلاع دے گا۔ تو وہ ضرور گڑبڑ کریں گے"۔

اس گفتگو کے بعد وہ مجھے مکتی باہنی کے "لیڈیز کلب ڈھاکہ" سنٹر میں لے گئے اور آم کے درخت کے نیچے کھڑا کر کے پٹائی شروع کر دی، میری جرابیں، جوتے، قمیض اور پتلون اتار لی پھر ایک گندی سی خون آلود لنگی باندھنے کو دی۔

دو گھنٹے بعد مجھے ایک جیپ میں بٹھایا، آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور ایک پولیس سٹیشن لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ وہاں ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا: "تم نے میٹرک میں کتنے نمبر لئے تھے؟"

میں نے کہا: "فرسٹ ڈویژن"۔

اس پر وہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: "یہ ضرور البدر کا ہے۔ اس سے بہت کچھ پتہ مل جائے گا"۔

وہ لوگ یہی باتیں کر رہے تھے کہ پولیس اسٹیشن کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان شروع

ہو گیا"۔ ایک اور البدر پکڑا گیا!"

حوالات کے جس کمرے میں مجھے بند کیا گیا تھا اُسی میں جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما اور نہایت باوقار قائد عبدالخالق صاحب بھی بند تھے۔

اعلان کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورتیں، بچے اور راہ گیر آ کر پوچھتے "کون سا البدر ہے؟" وہ میری طرف اشارہ کرتے اور آنے والے مجھے یوں دیکھنے لگتے۔ جیسے چڑیا گھر میں بند جانوروں کو دیکھا جاتا ہے۔

اُس رات پولیس نے بھی میری پٹائی کی، ایک موٹی سی رسّی کو دوہرا کر کے میری پشت پر اس زور سے مارا جاتا کہ میں تکلیف سے بلبلا اٹھتا۔ یوں لگتا جیسے میرا دل منہ سے باہر آجائے گا، رسی کی ضربوں سے میری پشت سے لہو بہنے لگا۔

وہ سوال کرتے: "تمہارے لیڈر کہاں چھپے ہوئے ہیں؟"

یہ خدا کا شکر تھا کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کدھر ہیں، اس لئے میں مسلسل یہ کہتا: "مجھے معلوم نہیں"۔

رات کے پچھلے پہر انہوں نے میرے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کا ناخن ایک پلاس کے ساتھ کھینچ کر الگ کر دیا، جس سے لہو بہتا رہا۔ کافی خون بہنے کے بعد میری ہی تدبیر سے وہ رکا اور جم گیا۔

یہ ظلم کرنے کے بعد وہ بولے: "اب سو جاؤ صبح پوچھیں گے"۔

اگلے روز صبح دس بجے پھر تفتیش شروع ہوئی۔ پوچھا گیا: "البدر کے تیس کیمپ کہاں کہاں ہیں؟ البدر نے اسلحہ کہاں کہاں چھپایا ہوا ہے؟ البدر کے پاس کون کون سا اسلحہ ہے؟"

یہ سوال کرنے اور ساتھ ہی ساتھ میری گردن اور میرے پیٹ پر سلگتے ہوئے سگریٹوں کے ساتھ داغ لگائے جاتے، میری گردن اور پیٹ پر آبلے پڑ گئے۔

ان ظالموں نے میرے سامنے مولانا عبدالخالق صاحب کے جسم کو بلیڈوں سے زخمی کر کے، ان پر نمک چھڑکا۔

گرفتاری سے چوتھے روز ایک پولیس انسپکٹر نے مجھے کہا "تم جیل جاؤ گے یا اسپیشل برانچ میں رہنا پسند کرو گے؟"
میں نے فوراً کہا "جیل میں"۔
اس پر اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ دوسرا پولیس آفیسر کہنے لگا "بچہ ہے اسے اور نہ مارو اور جیل بھیج دو"۔
پھر رسیوں سے جکڑ کر مجھے ٹرک میں ڈالا اور جیل لے گئے۔
وہاں پہنچا تو پہلا منظر ہی بڑا خوفناک تھا۔ پاکستان ملیشیا کے یعقوب صاحب کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور ان کی مسلسل پٹائی ہو رہی تھی۔ جب میں ان کے قریب سے گزرا تو ایک مکتی باہنی نے ان سے کہا "منہ کھولو!" انہوں نے منہ کھولا تو دوسرے نے ان کی باچھیں چیر کر انہیں نیچے گرا لیا، تیسرے نے اپنی پتلون کے بٹن کھولے اور ان کے منہ میں پیشاب کر دیا۔
اس تشدد سے یعقوب صاحب بے ہوش ہو گئے۔ اب ظالموں نے ان کے ناک پر مکے مارنے شروع کر دیئے کہ مکر کر رہا ہے۔ ان کی ناک سے لہو بہہ رہا تھا۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
جیل سپرنٹنڈنٹ نے یہ حالت دیکھی تو مکتی باہنی سے کہا کہ وہ جیل سے باہر چلے جائیں۔
یعقوب صاحب کو ہوش آیا تو انہوں نے سورۂ یاسین کا وہ نسخہ مجھے دے دیا جو ان کی جیب میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک عید کارڈ بھی تھا جو مغربی پاکستان سے آیا تھا اسی رات وہ جنگی قیدی بن کر ہندوستان چلے گئے۔
دوسرے دن مجھے جیل میں بچوں والے حصے میں بھیج دیا گیا اور چکی چلانے کی مشقت میرے ذمے لگائی گئی۔ میرا دایاں ہاتھ ایک انگلی کا ناخن اکھڑنے سے کسی کام کا نہ تھا اس لئے صرف بائیں ہاتھ سے کام کرتا۔
یہاں چاندپور کے رہنے والے جمعیت کے ایک کارکن، عبدالمتین سے ملاقات ہوئی وہ بھی میری طرح قیدی تھے اور ان کی داستان بھی بڑی روح فرسا تھی۔

تین مہینے اسی عالم میں گزر گئے۔

ایک روز میں زمین پر بیٹھا انگلی سے کچھ لکھ رہا تھا۔ اچانک سپرنٹنڈنٹ جیل وہاں آ گیا اور مجھ سے کہنے لگا "تم لکھنے پڑھنے کا کام کرو گے ؟"

میں نے کہا "ہاں !" اس پر انہوں نے مجھے لکھنے کا کام دے دیا۔ یہ کام قیدیوں کے کوائف درج کرنا تھا۔

اسی جیل میں مسلم لیگ کے رہنما فضل القادر چودھری بھی قید تھے۔ وہ مجھے "پرنس آف جیل" کہا کرتے تھے۔ جماعت اسلامی کے عباس علی خان اور مسلم لیگ کے خواجہ خیرالدین بھی اسی جیل میں تھے۔ میں دس ماہ وہاں رہا۔ اس کے بعد ضمانت پر رہا ہو گیا۔

دوسری گرفتاری

۲۴ رجون ۱۹۷۳ء کو ہم منتشر ساتھی ایک جگہ جمع ہوئے۔ میں جمعیت کے دستور کی نقل تیار کر رہا تھا۔ دوسرے ساتھی ارکان کے ناموں کی فہرست تیار کرنے میں مصروف تھے تاکہ انتخاب کرایا جا سکے۔ ہم نے بیلٹ بھی تیار کر رکھے تھے۔ یہ کام تاج محل روڈ، محمد پور (ڈھاکہ) میں ہو رہا تھا۔

کام کرتے کرتے میں تھوڑی دیر کے لئے باہر آیا۔ خیال تھا۔ دھوبی کی دکان سے کپڑے لے آؤں۔ کپڑے لے کر لوٹا تو کمرے کے سامنے ایک جیپ کھڑی تھی، جیپ جس نے خبردار کیا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ پلٹ کر چلنے لگا تو زور سے آواز آئی: "وہ گیا۔ پکڑو اسے !" اور اسی لمحے ایک غنڈہ دوڑتا ہوا آیا اور گردن سے پکڑ کر مجھے نیچے گرا لیا۔ کچھ اور غنڈے بھی آ گئے اور مجھے گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لے گئے۔

وہاں پر ایک شخص آٹومیٹک رائفل تانے کھڑا تھا اور دوں کے ہاتھوں میں بھی پستول تھے۔

ان لوگوں کا گروپ لیڈر، شیخ مجیب الرحمٰن کا بیٹا شیخ کمال تھا۔ وہ کہنے لگا: "تم سب کو ختم کر دیا جائے گا"۔ اسی طرح ڈراتے دھمکاتے ہوئے ہمیں چھاترو لیگ کے دفتر

لے گئے۔

میرے بارے میں انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ پہلے جیل جا چکا ہوں۔ اس لئے "تجربہ کار" فرد ہونے کی وجہ سے زیادہ بُرے سلوک کا مستحق قرار پایا۔ شیخ کمال نے کہا: "اس کی آنکھیں موٹی موٹی ہیں۔ یہ یقیناً ذہین اور خطرناک شخص ہے۔ اس کو لٹا دو!"

یہ کہنے کی دیر تھی کہ ایک غنڈے نے زور سے ڈنڈا میرے گھٹنے پر دے مارا۔ تکلیف سے بُرا حال ہو گیا۔ اندازہ ہوا یہ لوگ ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گے، لیکن خوش قسمتی سے کسی طرح پولیس کو خبر ہو گئی۔ اس کی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی وہاں پہنچ گئی اور ہمیں اپنے قبضے میں لے لیا۔

شیخ کمال نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ رِنگ لیڈر ہے۔ اس کا خاص طور سے خیال رکھا جائے!"

پولیس ہمیں تھانے لے گئی۔ راستے میں ہم نے کہا: "ہم طالب علم ہیں۔ شیخ کمال نے ہمیں یونہی پکڑ لیا ہے۔"

پولیس والوں نے تسلی دی کہ اگر تم لوگ بے گناہ ہوئے تو رہا کر دیئے جاؤ گے، پولیس کئی دن تفتیش کرتی رہی اور جب ان کے ہاتھ کچھ نہ لگا تو ایک کہانی تیار کر کے پریس کو دے دی گئی۔ اخبارات نے جلی سرخیوں سے یہ خبر شائع کی: "مسلم بنگلہ موومنٹ" کے خطرناک گوریلے گرفتار کر لئے گئے۔ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش ناکام بنا دی گئی۔ چاٹگام کی پہاڑیوں سے اسلحہ کے انبار پکڑ لئے گئے۔"

اس خبر میں میرا نام نمایاں طور پر دے دیا گیا۔

اگلے دن یہ خبر ریڈیو سے بھی نشر کی گئی۔ گویا سرکاری ذرائع ابلاغ نے چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا دیا۔

اب ہمیں اسپیشل پولیس برانچ لے جایا گیا۔ وہاں ایک تفتیشی آفیسر نے مجھے پہچان لیا۔ وہ ہمارے قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا۔

اس نے کہا: "یہ لڑکا تو بڑے اچھے کریکٹر کا مالک ہے۔ مکتی باہنی والوں نے

اسے یونہی پھانس لیا ہے"۔ اس نے دوسرے لڑکوں سے بھی زیادہ سوالات نہ کیے اور شاید اس کی ہمدردی تھی کہ جب ہمیں عدالت میں لے جانے لگے، تو میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہ تھی۔

راستے میں میں نے سوچا چھلانگ لگا کر فرار ہو جاؤں، مگر فوراً یہ خیال ہوا کہ اس طرح دوسرے ساتھیوں پر افتاد پڑے گی۔

باہر ہمارے ساتھی یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ حالانکہ اب معاملہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہماری گرفتاری کے بعد تمام ارکان نے اپنے نام بدل لئے اور ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ ہمارا مقدمہ شروع ہوا تو نہایت دلچسپ بات یہ دیکھنے میں آئی کہ عدالت کے سامنے وہ معاملہ سرے سے رکھا ہی نہ گیا جس کی خبریں دنیا جہان کے پریس کو دے دی گئی تھیں۔ ہمیں البدر سے متعلق ہونے کے الزام میں مختلف لوگوں کے قتل کیسوں میں پھانسنے کی کوشش کی گئی، مگر قتل کے مقدمے میں جس طرح کی مضبوط گواہی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ پیش نہ کی جا سکی اور یوں ہم مارچ ۱۹۷۴ء میں جیل سے رہا ہو گئے۔

والدہ نے کفن کا ٹکڑا دیا ۔۔۔

محمد نعیم الرحمان (چٹاگانگ) نے بتایا:

جب ہمارے دیہات پر افواج پاکستان نے ایکشن کیا تو میں اپنی والدہ اور بہنوں کے ہلا دینے والے آنسو نہیں بھلا سکتا۔ میری والدہ نے ممتا کے پیار کا واسطہ دے کر مجھے کہا: "ٹھیک ہے کہ تم اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن ہو اور تمہارا اصرار کہ ہم یہاں رہیں لیکن ہم اب یہاں نہیں رہ سکتے۔ اس لئے خدارا تم بھی ہمارے ساتھ سرحد کے اس پار جانے والے قافلے کے ہمراہ چلو"۔ ——— میں نے کہا: "میں ملک کی حفاظت کے لئے اس دشمن سے لڑوں گا جس نے اپنے ہی محافظوں کو اس ایکشن پر آمادہ کیا ہے"۔ اس پر میری والدہ نے مجھے سسکیاں بھرتے ہوئے آخری نشانی کے طور پر کفن کا ٹکڑا دیا۔

اور پھر اسی روز شام دھندلکوں میں آنسوؤں کی رم جھم میں میری والدہ اور میری بہنیں چلی گئیں۔ میں اپنے البدر ساتھیوں کے ہمراہ پاکستان کی تنصیبات کی حفاظت اور بھارت نواز تخریب کاروں سے مقابلہ کے لئے آپریشنز پر جاتا رہا۔

جب سقوطِ مشرقی پاکستان ہوگیا، تو کئی لوگوں کو دیکھا کہ وہ خوشیاں مناتے ہوئے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دوسری جانب محبِ وطن افراد اپنے ہی وطن میں ذلت و رسوائی کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ گلی گلی میں ان کے لہو کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ مکتی باہنی والوں کے لئے ہوٹل خالی تھے اور دوسری جانب وہ اردو بولنے والوں کی عورتوں پر شیطانی عذاب بن کر لوٹتے پڑے جا رہے تھے۔

میں جنوری ۷۲ء کے آخری دنوں میں روپوش ہوتا ہوا اپنے ماموں کے گھر میں منتقل ہو گیا۔ یہ لمحے قیامت تک نہ بھولیں گے۔ ان دنوں کی تکلیف اور کرب کا اظہار ممکن نہیں۔ اگر ہمارا خدا پر ایمان نہ ہوتا اور ہمیں تحریک اسلامی نے تربیتِ دین نہ دی ہوتی، تو ہمارا ایمان یقیناً ڈگمگا جاتا۔ ۲۹ جنوری کو نمازِ مغرب پڑھ کر دعا مانگ رہا تھا، مجھے احساس ہوا کہ کوئی دشمن مجھے دیکھ رہا ہے، لیکن جب میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اس لئے میں نے اسے ایک واہمہ سمجھا۔

اگلے روز صبح نماز فجر کے بعد میں قرآن مجید سے سورۃ عنکبوت کی تلاوت کر رہا تھا کہ چھ غنڈے دروازے کو دھکا دے کر اس گھر میں گھس آئے، عجیب اتفاق تھا کہ اس روز گھر میں میرے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ وہ لوگ مجھے گھسیٹتے ہوئے باہر لائے اور ایک جیپ میں ڈال کر نظام پور کالج کے ہوسٹل میں لے گئے اور اسٹوڈنٹس یونین کے دفتر میں الٹا لٹکا کر مارنا شروع کر دیا۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو ان کی ظالمانہ ضربوں سے محفوظ رہا ہو۔

اس کے بعد ایک لڑکے نے کاغذ قلم لیا اور دوسرے لڑکوں نے بید کی چھڑیوں سے مار مار کر مجھ سے البدر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی وہ مجھ سے پوچھتے کہ طاہر اور قاسم کہاں ہیں؟ یہ بتانا میرے لئے ناممکن تھا۔ میں یہ طے کر چکا تھا کہ

مر جاؤں گا، لیکن اپنے ان نہایت عزیز ساتھیوں کا اتہ پتہ نہیں دوں گا۔ پس وہ مجھے اس طرح مارتے چلے گئے جیسے کسان اپنی زمین میں ہل چلاتے وقت بیلوں کو مارتا ہے۔ اگلے لمحے انہوں نے سلگتے ہوئے سگریٹ کے ساتھ میرے سینے کو داغا، گردن پر سگریٹ بجھایا، کان کی لو کو دیا سلائی کی آنچ دی۔ اس پر میں چیخا بھی اور تڑپا بھی۔ ان کا تشدد جوں جوں بڑھتا چلا جاتا، اسی طرح میرا ایمان پختہ ہوتا چلا جاتا۔

یہ تکلیف دیکھ کر ان میں سے ایک لڑکے کا دل پسیج گیا اور اس نے دہیں پر بے اختیار کہا: "آفرین ہے اس تنظیم پر جس نے تم ایسے کارکن تیار کئے جو مرنے پر تو تیار ہیں مگر اپنا عہد قربان کرنے کو تیار نہیں ــــــ" اسی دوران میں وہاں پولیس آ گئی اور مجھے تھانے لے گئی مگر اس سے پہلے تشدد کرنے والے غنڈوں نے گھڑی اتار لی تھی اور نقدی چھین لی تھی۔

پولیس نے میرے خلاف آگ لگانے اور قتل کے مقدمات قائم کئے۔ جب مجھے چٹا گانگ جیل میں منتقل کیا جا رہا تھا تو اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ سخت سردی تھی۔ جب صحن میں پہنچا تو اپنے بہت سے ساتھیوں کو وہاں دیکھا۔ مگر کسی نے مجھ سے اور نہ میں نے کسی سے سلام کیا اور نہ کسی کو آواز دی۔ خدشہ تھا کہ کہیں اس طرح بہت سے افراد کی ایک دوسرے سے وابستگی کے حوالے سے افتاد نہ آن پڑے۔ بس چلتے چلتے خاموش اشاروں ہی اشاروں سے ہم آپس میں اپنی حالت زار بیان کر سکے اور سلام پہنچا سکے۔ جیل میں آٹھ سو افراد کی گنجائش تھی، مگر اس میں دو ہزار سے زائد قیدی موجود تھے۔ لیٹنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس لئے رات قرآن پاک کی تلاوت کرتے کرتے کاٹی۔ بعد میں جو گزری اس کا تذکرہ میں نہیں کرنا چاہتا۔

بہر حال یہ خدا کا احسان تھا کہ اس نے آزمائش کی گھڑیاں مختصر کر دیں اور جون ۱۹۷۲ء کے آخری ہفتے میں رہائی ہو گئی۔

وہ اٹھائیس دن تک اوندھے منہ سوتا رہا

انیس العالم (چٹاگانگ) نے روداد اسیری بیان کرتے ہوئے کہا:

۵ اکتوبر کو میں نے البدر کی تربیت حاصل کی اور اگلے روز رانگا ماٹی کے جنگلات میں جانے کی ڈیوٹی سنبھالی۔ یہاں پر بھارتی ایجنٹوں کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ اب میدان عمل میں اپنی نظروں سے جہاد و انقلاب تاریخ کو جنم لیتے دیکھا۔ یہ ایمان افروز لمحے میری زندگی کا حاصل ہیں۔ آخرکار بھارت نے کھلا حملہ کیا اور پاکستانی افواج سپلائی لائن کے ٹوٹنے، ناساعد حالات اور غلط حکمت عملی کے باعث سمٹنا شروع ہوئیں اس وقت بریگیڈیئر عطا محمد صاحب نے البدر کی پوری کمپنی کو رانگا ماٹی سے طلب کر لیا۔

۱۶ دسمبر کی صبح ہمیں مارشل لاء حکام نے کہا: "آپ جہاں جانا چاہیں جا سکتے ہیں" اس وقت میں اور ایک ساتھی دریائے کرنا فلی کو پار کر گئے۔ اس دوران میں محسوس ہوا کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ آدھ گھنٹے بعد یہ چیز حقیقت بن گئی اور ہم گرفتار کر لئے گئے۔ ہمیں ایک ہندو کی جیل نما حویلی میں لے جایا گیا۔ جہاں کم از کم چالیس البدر مجاہدین قید تھے۔ جن میں سے اسی رات اٹھارہ کو گولی مار دی گئی۔ ہم نے اگلے تین روز تفتیش و تشدد میں گزارے۔ ان لمحوں میں بنگلہ دیش پولیس نے حویلی پر چھاپہ مارا اور ہمیں قبضے میں لے کر چٹاگانگ سنٹرل جیل پہنچا دیا۔

جیل میں ہمارے بہت سے قیدی ساتھی موجود تھے۔ یہ سب کے سب اسلام اور پاکستان سے محبت کی سزا کا سمبل بنے ہوئے تھے۔ اس رات پھر عوامی لیگی جیل میں دندناتے ہوئے آئے اور پندرہ مزید البدر مجاہدوں کو لے جا کر گولی مار دی۔ ان پندرہ میں سولھواں میں بھی تھا مجھے کم عمر ہونے کے باعث صرف تشدد اور اذیتیں دینے کے لئے رکھ چھوڑا۔ اس زندگی پر میں شہادت کو ترجیح دیتا ہوں، تشدد بھی ایسا تھا کہ پورے اٹھائیس دن تک میں زمین پر اوندھے منہ لیٹا رہا۔ میری پوری کمر پشت اور رانیں، ان گنت زخموں اور سگریٹ کے داغوں سے پیپ رس رہی تھی۔ جب زخم ذرا مندمل ہوتے تو میں نے کھڑا ہونے کی کوشش کی، مگر چکرا کر گر پڑا۔ اسی روز مجھے جیل سے

باہر نکال دیا گیا۔ میں بڑی منت سماجت کرکے دو راہ گیروں کی مدد سے اپنے گھر پہنچا لیکن اسی روز میرے حقیقی بڑے بھائی نے جو عوامی لیگ کا رکن تھا مجھے دوبارہ پولیس کے حوالے کرکے جیل میں پہنچا دیا۔ اس دن میری نظر میں حقیقی رشتے کا آخری تقدس بھی ختم ہو گیا۔

جیل کی جس بیرک میں چالیس قیدیوں کی گنجائش تھی، اس میں پانچ پانچ سو قیدی رکھے گئے تھے۔ ہم نہ بیٹھ سکتے تھے اور نہ سو سکتے تھے۔ دن میں ایک وقت کھانا ملتا تھا۔ علاج کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اس لئے روزانہ اوسطاً دو قیدی مر رہے تھے۔ ہیضہ، نمونیہ، اور جلد کی بیماریاں عام تھیں۔ کچھ ان بیماریوں اور کچھ تشدد کے نتیجے میں، بہت سے مسلم پاکستانی شہادت کی منزل پر پہنچ گئے۔

میں نے چاٹگانگ کی جیل میں سات سو پندرہ دن کی اسیری کاٹی۔ اس عرصہ میں کچھ کتب کا بھی مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کے جو حصے یاد تھے، انہیں بار بار دہرایا۔ پھر یہ معمول بن گیا کہ ایک ایک سورۃ کا سینکڑوں مرتبہ ورد کرکے روحانی سکون تلاش کیا۔ بعد میں مقدمہ چلا اور استغاثہ کے پاس کوئی ثبوت نہ ہونے کے سبب رہائی مل گئی۔

مگر کون سی رہائی؟ ۔ میں ایک جیل سے نکلا تو دوسری جیل موجود تھی۔ معاشرے پر جبر و ظلم کی حکومت میں سانس لینا دوبھر تھا۔ لوگ طعنے دیتے اور کہتے: جاؤ اپنے پاکستان میں ___ تم بنگالی نہیں، پنجابیوں کے دلال ہو'' ہمارے دوست یا تو شہید ہو چکے تھے یا پھر نقل مکانی کر چکے تھے۔ اس لئے دلاسا دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ بڑا بھائی جتنا پہلے دشمن تھا۔ اتنا اب بھی مخالف تھا۔ اس لئے میں سوچا کہ خودکشی کرلوں۔ ایک روز دریائے کرنافلی کے پل پر پہنچا تاکہ زندگی کا خاتمہ کرلوں، مگر پھر قرآن پاک کی آیات آوازۂ ہدایت بن کر ذہن میں گونجیں اور میں نصب العین کی خدمت دعوائی انقلاب کے کارکن کے طور پر مگن ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مشرق و مغرب کے اتحاد میں اسلامی انقلاب کا جو خواب ہم نے دیکھا تھا وہ خود قوم نے پریشان کر دیا، لیکن ہم تو امید کے پیامی، التقویٰ کے نقیب اور انسانوں میں رحمت اللعالمین ؐ کی محبت کے پیامبر ہیں۔

ہجرت
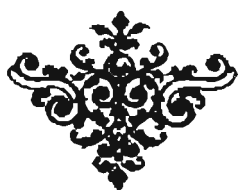
ایک غیبی آواز آئی.... اور میں فرار ہو گیا

اشرف الزمان (ڈھاکہ) صلاح الدین ایوبی کمپنی کمانڈر البدر نے، مکتی باہنی کے ہاتھوں اپنی گرفتاری اور آزادی کے واقعات کی رونگٹے کھڑے کرنے والی روداد سناتے ہوتے بتایا کہ ڈھاکہ میں میرے پچاس ساٹھ رشتہ دار تھے، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان میں کسی سے میری واقفیت نہ تھی۔

یونیورسٹی کا معاملہ یہ تھا کہ اس کا قریب قریب ہر فرد جانتا تھا کہ یہ البدر والے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ساتھی جا رہے تھے اور بالکل اس طرح مل رہے تھے کہ وہ پھر کبھی نہ ملیں گے۔ بچھڑنے والے ساتھی برستی آنکھوں سے رخصت کر رہے تھے۔ اسی دوران میں انوار الحق، عبداللہ اور عبدالصمد آگئے۔ اُن کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ رشتہ دار مخالف نظریات رکھنے کے باعث خون کے پیاسے تھے، کہنے لگے "اشرف! کدھر جائیں؟ کوئی ٹھکانا نظر نہیں آتا۔

میں نے جواب دیا" بھائی! اگر کسی قابل ہوتا تو آپ کو ضرور سہارا دیتا، لیکن میں بھی آپ کا ساتھی ہوں، ایسی کشتی کا سوار جس کے ملاحوں کے پاس پتوار نہ ہوں۔"

اس جواب پر میرے جری اور سرفروش ساتھی یہ کہہ کر چلے گئے" ہم ہتھیار نہیں ڈالیں

گے آخری دم تک لڑیں گے یا شہید ہو جائیں گے۔ خدا حافظ۔"

وہ تینوں ساتھی چلے گئے اور اس کے بعد ان کے بارے میں کچھ علم نہ ہوا کہ کہاں ہیں۔

وہ رات ہم نے انگلش روڈ پر ایک تحریکی ساتھی کے ہاں گزاری۔ اگلے روز صبح ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے ساتھی اسد کے ہمراہ کسی اور ٹھکانے کی تلاش میں نکلا اور چھ سات میل دور ایک دوسرے دوست کے ہاں رہنے کا بندوبست کیا۔

ہم اپنا سامان واپس لینے دفتر پہنچے، لیکن جس شخص کے پاس ہم سوٹ کیس رکھوا آئے تھے۔ اس نے واپس دینے سے انکار کر دیا، یہی نہیں، بلکہ مکتی باہنی کے لوگوں کو بلا لایا۔ ہم سے پوچھ گچھ کی گئی، تو ہم نے کہا کہ ہم طالب علم ہیں۔ انھوں نے سوال کیا: "البدر؟"

ہم نے "ہاں یا نہ" میں جواب دینے کی بجائے کہا: "مسافر"۔

انھوں نے اسد کو ایک دو تھپڑ مارے اور اس کے دو سو روپے چھین لینے پر اکتفا کیا۔

پھر مکتی باہنی کا دوسرا گروپ آیا۔ دفتر کے چپڑاسی نے کہا: "میں نے ان دونوں کو البدر کے نزدیکی کیمپ میں دیکھا تھا۔"

جنرل فرمان علی کا مجھے دیا ہوا شناختی کارڈ بھی انھیں تلاشی میں مل گیا تھا، جس سے زیادہ شبہ ہوا۔ چنانچہ وہ ہمیں البدر کے ایک کیمپ میں لے گئے، لیکن وہاں دوستوں نے ہمارے خلاف گواہی دینے سے انکار کر دیا اور یوں ہمیں چھوڑ دیا گیا۔

اب ہم سائیکل رکشا پر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے، لیکن مصیبت ابھی کہاں ٹلی تھی؟ میرپور روڈ پر پہنچے تو پیچھے سے مکتی باہنی کی کار آتی دکھائی دی۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا اور ہم پھر پکڑ لیے گئے۔

یہ منشی گنج کا مکتی باہنی گروپ تھا۔ جب میں رضاکار انچارج تھا تو ایک مرتبہ یہاں آپریشن کے لیے ایک سو رضاکار بھیجے گئے تھے۔ ان میں سے ایک رضاکار اس وقت مکتی باہنی میں شامل تھا۔ اس نے میری تلاشی لی اور وہ ڈائری اس کے ہاتھ لگ گئی جس میں اس

آپریشن کا پروگرام درج تھا۔ اب انہیں پورا یقین ہوگیا کہ واقعی ہم "خطرناک" لوگ ہیں۔ ہم سے سب کچھ چھین لیا گیا۔ میرے پاس البدر فنڈ کے چار ہزار روپے تھے۔ دلاور نامی غنڈے نے وہ بھی چھین لئے۔ یہ واقعہ سترہ دسمبر کو گیارہ بارہ بجے پیش آیا۔
اب ہمیں کار میں بٹھا کر شہر کا گشت کروایا گیا۔ راستے میں وہ جگہ جگہ لوگوں کو فخر سے بتاتے رہے کہ "یہ البدر کمانڈر ہے، ہم نے اسے پکڑا ہے"۔ عصر کے وقت مجھے نیو پل پر لے گئے یہاں اسد کو مار پیٹ کر دوسری جگہ لے گئے اور میں تنہا رہ گیا۔ پھر مجھے ٹارچر کیا گیا (مارا پیٹا گیا) اس سے پہلے مجھے کوئی اذیت نہ دی تھی۔ ٹارچر کے بعد ریلوے لائن کے قریب ایک گنجان آباد علاقے میں جو ان کا اڈا تھا۔ جان سے مار ڈالنے کے لئے لے گئے۔ وہاں مجھے ایک جلاد کے سامنے کھڑا کر دیا گیا اور معلومات حاصل کرنے کے لئے سوالات شروع کر دیئے۔

میں نے راز کی کوئی بات نہ بتائی۔ جلاد روسی رائفل سے مجھے نشانہ بنانے کے لئے نشست لینے لگا۔ بے شمار تماشائی نظارہ کر رہے تھے۔ بظاہر موت اور میرے درمیان چند لمحے رہ گئے تھے، لیکن خدا کے فضل نے عجیب صورت میں میری دستگیری کی۔ انہیں میں سے ایک نے جسے وہ حق صاحب کہہ کر پکارتے تھے، میرا کندھا پکڑ کر پوچھا "کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

میں نے کہا "ہاں"! پوچھا "کتنے بچے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "ایک لڑکی ہے" یہ سنتے ہی حق نے جلاد سے کہا: "اسے مت مارو" اس کا ایک ساتھی رقم کا واحد مالک بننا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے رقم کے بارے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ اسی نے رقم لی تھی اور فلاں جگہ اینٹ کے نیچے چھپا دی تھی"۔

ان میں اس بات پر خاصا جھگڑا ہوا۔ وہ مجھے گالیاں بھی دیتے اور کہتے کہ خود بھی مرے گا اور ہمیں بھی مروائے گا۔
مکر جانے والے شخص کی اس کے ساتھیوں نے خوب پٹائی کی۔ آخر وہ مان گیا کہ

رقم اسی نے لی تھی۔ اس دوران میں میری ڈائری سے انگریزی اور بنگلہ کی تحریریں پڑھی گئیں جن میں پاکستان کے حامی اور غدار معروف افراد کی فہرست تھی۔ سوٹ کیس میں اسٹین گن کی گولیاں اور ہینڈ گرنیڈ بھی تھے۔ اہم سرکاری عہدیداروں سے ملاقاتوں کا تذکرہ بھی درج تھا۔

یہ باتیں ان کے لیے زلزلے سے کم نہ تھیں۔ انھوں نے پروگرام بنایا کہ مجھے گولی مار دی جائے اور پھر سحری کے وقت جگہ کا تعین بھی ہو گیا۔ وہی حق جس نے پہلے مجھے بچایا تھا۔ اب خود کہتا تھا کہ "یہ مار دینے ہی کے قابل ہے"۔ یہ باتیں ساتھ والے کمرے میں ہو رہی تھیں اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ مرنا تو ہے ہی، بہتر یہ ہے کہ دو چار کو ختم کر کے مروں! میں نے کسی ایک سے اسٹین گن چھیننے کا منصوبہ ذہن میں بنایا۔ خوف قطعاً نہ تھا۔ پھر ایک اور بات ذہن میں آئی کہ ڈھاکہ میں البدر کے تین کمپنی کمانڈروں میں سے دو شہید ہو گئے ہیں اور شاید مجھ تیسرے کی قسمت میں بھی شہادت ہے۔ اس خیال سے دل بالکل مطمئن ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جمعیت کے ایک اور ساتھی کو گھونسوں کی بوچھاڑ اور گالیوں کے طوفان میں گھیرے ہوئے میرے کمرے میں لے آئے۔ یہ بات ۱۸ دسمبر کی ہے۔

اُس وقت نہ تو میری آنکھیں بندھی ہوئی تھیں اور نہ ہی ہاتھ، اس لیے میں کسی ایک سے اسٹین گن چھیننے کے لئے اٹھا اس پر نگرانی کرنے والے نے کہا؟ فرار ہونا چاہتے ہو اور ساتھ ہی دوسروں کو بلا کر میری اور میرے ساتھی کی آنکھیں اور ہاتھ باندھ دیئے۔

ہم نے اسی حالت میں نماز عشاء پڑھی۔ ہمارے ہاتھ پیچھے کی طرف تھے اور وہ مجھے مار دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اسی بات پر اُن میں اختلاف ہو گیا۔ بالآخر حق نے کہا: اچھا اس کے ساتھ جو جی چاہے کرنا، لیکن ابھی کچھ نہ کرو۔ اس سے قیمتی معلومات اگلوا کر اس کا قصہ تمام کریں گے۔

حق نقیر پور میں رہتا تھا اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی، کار میں بٹھایا اور مکان کی غلام گردشوں سے گزارتا ہوا اوپر والی منزل پر لے گیا۔

اب تک تو مکتی باہنی کے نوجوانوں ہی سے پالا پڑا تھا، لیکن حق کے گھر میں ذرا پختہ عمر

کے لوگوں سے واسطہ پڑا جو ظالم بھی تھے اور تجربہ کار بھی۔

میری مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ کہا گیا کہ ہر سوال کا جواب صحیح صحیح دینا، ورنہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ پھر کیا حشر ہوگا"۔

مجھ سے اسلحہ، نقدی اور زیورات وغیرہ کے بارے میں بھی پوچھا گیا، مگر میں نے انہیں صحیح طور پر سب کچھ نہ بتایا۔

کہنے لگے "سچ بولو ورنہ بازو کاٹ دیں گے اور آنکھیں نکال دیں گے، لیکن جب یہ دھمکی بھی کارگر ثابت نہ ہوئی، تو انہوں نے مجھے چت لٹا دیا۔ پانچ چھ آدمیوں نے میرے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے پکڑ لیے اور ایک شخص میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور میری ایک آنکھ پر انگلی کے ساتھ دباؤ ڈالا۔ اگر میں زور سے ہاتھ چھڑا کر اسے دھکا نہ دیتا تو وہ ظالم یقیناً میری آنکھیں نکال لیتا۔ جب وہ میری مزاحمت کے نتیجے میں دور جا گرا تو یہ کہہ کر مجھے چھوڑ دیا گیا کہ" اس کم بخت میں بہت طاقت ہے۔ اسے ابھی نہیں کل ماریں گے"۔

اگلے دن یعنی ۱۹ دسمبر کو مجھے ناشتہ دیا اور کہا" کھا پی کر مرو!" پھر مجھے شہر میں گھمایا اور لوگوں کو بتایا کہ یہ البدر کا کمانڈر ہے، ہم نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔

گشت کے بعد مجھے پھر وہیں لے آئے۔ مجھ سے کہنے لگے" اسلحہ کے ذخیرے کی نشاندہی کر دو تو تمہیں چھوڑ دیں گے"۔ میرا سامان، گھڑی، چشمہ حتیٰ کہ جوتا بھی لے لیا۔ میں نے ٹیرون کی پتلون پہن رکھی تھی۔ ایک نے اسے چھو کر کہا" اس پتلون کو کیا کریں"؟

دوسرے نے جواب دیا" کل مرے گا تو لے لینا"۔ ہم بندھے ہوئے تھے۔ پھر بھی کمرے کے دروازے پر دو پہرہ دار ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ رات ہو گئی تھی اور چار بجے سحری کے وقت گولی سے اڑانے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ میں سو گیا اور رات کے تقریباً دو ڈھائی بجے میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک صاف راستہ میرے سامنے ہے اور ایک غیبی آواز اس راستے سے نکل جانے کی ہدایت کر رہی ہے۔ سامنے کوئی شخص نہیں تھا، بلکہ صرف آواز تھی۔ تین دفعہ ایسے ہوا تو آنکھ کھل گئی، یقین ہو گیا کہ یہ خدا کی طرف سے اشارہ ہے۔ اب میں نے زور لگا کر اپنے

ہاتھ آزاد کرا لیئے، پھر آنکھوں کی پٹی بھی کھول لی اور اپنے ساتھی کو آزاد کیا۔
پہرہ دار اس وقت سو رہے تھے۔ اب تو خدا کی مدد کا عین الیقین ہو گیا۔ چپکے سے اٹھا اور اٹھ کر آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ میرے بعد میرا ساتھی بھی نکل گیا۔ اپنے اس مقتل سے نکل کر ہم دونوں نے پوری طاقت سے بھاگنا شروع کر دیا اور کوئی ایک میل دور مشرقی پاکستان جمعیت کے ایک سابق ناظم کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے ساڑھے تین بجے کا عمل ہو گا۔

چار بجے میری موت کا وقت مقرر کیا گیا تھا، لیکن اب میں ان کی دسترس سے باہر تھا۔ خدا نے مجھے موت کے منہ سے بچا لیا تھا۔ راستے میں بھی ہمیں کوئی نہیں ملا۔ راستہ خواب میں نظر آنے والے راستے ہی کی طرح صاف تھا۔ ساتھی نے الگ راہ لی۔
۲۰ دسمبر کو میں بھیس بدل کر ڈھاکہ میں فرید آباد اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں چلا گیا۔ ۲ جنوری ۷۲ء تک یہیں رہا۔
ڈھاکہ میں مشہور ہو گیا تھا کہ اشرف مارا گیا ہے۔ اس کا بڑا بھائی روپوش ہو گیا ہے۔ اخبارات نے میرا فوٹو بھی چھاپ دیا جو اصل میں مصطفیٰ شوکت عمران کا تھا۔
یہاں سے دیہات میں ایک رشتہ دار کے ہاں چلا گیا اور پھر ۸ جنوری کو اپنے گاؤں پہنچا۔ ایک ہفتہ یہاں رہا جہاں خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔
۱۵ جنوری کو معلوم ہوا کہ ۱۲ جنوری کے اخبارات میں میری تصویر اور تلاش میں مدد دینے کی اپیل شائع ہوئی ہے۔ لکھا ہوا تھا کہ اس کو پکڑنے والے کے لئے دس ہزار روپے انعام ہو گا۔ اسی روز میں اپنے ایک اور عزیز کے ہاں چلا گیا اور اسی طرح ٹھہرتے ٹھہرتے ۱۹ مارچ کو ضلع میمن سنگھ میں کالی گنج اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں جا پہنچا۔ ۲۶ مارچ تک مختلف جگہوں پر رہا۔ خبر آئی کہ ہمارے مکانات ضبط کر لئے گئے ہیں اور گھر والوں پر ظلم و تشدد شروع ہو گیا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کو جان سے مارنے کے لئے گرفتار کیا گیا، مگر وہ بھی فرار ہو گیا۔

۲۶ مارچ کو اس سرزمین کو خیرباد کہا اور کلکتہ میں ایک واقف کار کے ہاں قیام کیا۔

یہاں میری ملاقات ایک نیک دل مسلمان حافظ احمد صاحب سے ہوئی۔ وہ مختلف سوالات کر کے مجھے آزماتے رہے اور جب مطمئن ہو گئے، تو پھر انہوں نے میری بہت مدد کی۔

وہاں سے دہلی گیا۔ پھر واپس پٹنہ اور اس طرح بہار کے راستے وراٹ نگر دنیپال کے دوسرے بڑے شہر پہنچا۔ یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ بھی میری طرح اجنبی تھے۔ ۱۹/ اپریل کو ہم کھٹمنڈو پہنچے۔ پاکستانی سفارت خانے کو اطلاع دی تسنیم عالم منظر (ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان) کو بھی خطوط لکھے۔

ابتدا میں رہائش کا انتظام سفارت خانے نے کیا اور ہمیں ۶۰ روپے ماہوار بھی ملتے رہے، لیکن جلد ہی یہ انتظام نہ جانے کیوں ختم کر دیا گیا۔ ہم دس بارہ افراد اب ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگے ہیں ہمارے سابق ناظم اعلیٰ اور آٹھ دس ساتھی بعد میں پہنچے۔ ہم نے شارٹ ہینڈ، ٹائپ رائٹنگ اور دوسرے فنون سیکھنے شروع کر دیئے۔

جب میں آیا تو ہمارے ساتھی چھوٹی موٹی تجارت کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ہم نے یہاں اجتماعات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ مجموعی طور پر سفارت خانے نے ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ ہمارے دو تین ساتھی ذاتی خرچ پر پاکستان پہنچنا چاہتے تھے، لیکن انہیں اجازت نہ دی۔

۳۱/ اکتوبر کو ہم تین ساتھی پاکستان روانہ ہونے کے لئے رنگون پہنچے اور اسی روز وہاں سے کراچی کے لئے پرواز پکڑی اور یکم نومبر کو کراچی پہنچ گئے۔

نیپال پہنچنے پر معلوم ہوا کہ میری وہ ڈائری جوان کے قبضے میں آگئی تھی، اسے قسط وار بنگلہ دیش اور انڈیا کے کئی اخبارات میں "جلاد کی ڈائری" کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ دراصل یہ وہ ڈائری تھی جس میں میں مداخلت کاروں، دشمن کے ایجنٹوں اور بھارتی فوجیوں کے خلاف کارروائی کی پلاننگ اور کارروائی کے نتائج وغیرہ درج کرتا تھا۔

کیمپ سے نکلتے وقت میں نے ایک ساتھی کو تاکید کی تھی کہ وہ میری اس ڈائری کو میرے سوٹ کیس سے نکال کر ضائع کر دیں مگر شاید وہ بھول گئے تھے۔

مغربی پاکستان کی زمین پر قدم رکھا تو

کامران (شیرپور) نے ہجرت کے لمحے بیان کرتے ہوتے کہا: "مجھے پوری طرح علم نہ تھا کہ ہتھیار ڈال دیئے گئے ہیں، البتہ فائرنگ کی آواز ختم ہوگئی تھی اور اس سے شک ہوتا تھا کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے۔ بس اکا دکا فائر ہوتے جس سے اس اندیشے کو تقویت ملتی کہ ہندوستانی فوج ایک ایک کرکے محب وطن پاکستانیوں کو ختم کر رہی ہے۔

ہم سارا دن چھپے رہے۔ شام کے وقت اس خیال سے باہر نکلے کہ حالات کا اندازہ کریں لیکن گھر سے نکلتے ہی ہندوستانی فوج نے ہم چار ساتھیوں کو گرفتار کرلیا۔ ہم نے کہا۔ "ہم دیہاتی ہیں۔ بس یوں ہی ادھر آنکلے ہیں۔" پہلے تو ہماری بات پر کسی نے دھیان نہ دیا لیکن پھر پانچ چھ گھنٹے بعد رہا کر دیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اُس وقت وہاں مکتی باہنی کا کوئی فرد موجود نہ تھا۔

شہر سے کوئی چار میل دور ہمارے ایک استاد محترم کا گھر تھا۔ ہندوستانی فوج کے ہتھے سے رہائی پاکر وہاں چلے گئے۔ استاد صاحب نے بخوشی ہمیں پناہ دی اور جب کچھ اطمینان حاصل ہوا، تو اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنے نکلے۔ معلوم ہوا مقبول احمد، فرید الدین اور مزید تقریباً ۵۸ البدر شہید کر دیئے گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان سب کو بہت اذیت ناک طریقے سے شہید کیا گیا۔

استاد صاحب کے گھر ہم لوگ تین دن رہے۔ آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچا گیا تو تینوں ساتھیوں نے کہا۔ ہم لوگ تو اب اپنے اپنے گھر جائیں گے۔ چنانچہ وہ چلے گئے اور میں ڈھاکہ چلا گیا۔ وہاں مجھے بہت سے لوگ جانتے تھے، خطرہ تھا کوئی پہچان نہ لے لیکن خدا کی مہربانی شامل حال رہی، میں وہاں ۲۰ دن ایک گھر میں چھپا رہا اور پھر ۱۱ جنوری کو چاٹگانگ روانہ ہوگیا۔

یہ روداد آگے بڑھانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کے بارے میں چند باتیں بتا دوں۔ ہم دو بھائی تھے، بڑے بھائی صاحب ملازمت کرتے تھے اور

میں پڑھتا تھا۔ ایک چھوٹی بہن تھی۔ والد صاحب جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ سقوط کے بعد وہ کچھ عرصہ روپوش رہے، مگر گرفتار کر لئے گئے۔ انہی دنوں والدہ محترمہ پر بیماری کا زبردست حملہ ہوا اور بالآخر ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت صرف چھوٹی بہن ان کے پاس تھی، وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں، لیکن میں اتنی دور تھا کہ بیماری میں ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک نہ دے سکتا تھا۔ ان کا سرتاج اور جیون ساتھی قید خانے میں تھا۔ بڑا بچہ مالی طور پر تباہ حال تھا۔ معلوم ہوا والدہ صاحبہ نے سسک سسک اور تڑپ تڑپ کر جان دی۔

انتقال فرمانے سے کچھ دن پہلے والدہ صاحبہ نے رازداراانہ پیغام بھیجا کہ "بیٹا سی۔ آئی۔ ڈی کے خونخوار درندے تیری تلاش میں گھر کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں یہاں نہ آنا۔"

چٹاگانگ میں کسمپرسی کے عالم میں ۸ ماہ گزارے اور اس پریشانی کے زمانے میں بھی جمعیت کے بکھرے ہوئے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

خواہش تو یہ تھی کہ اسی دیش میں رہ کر حالات سازگار ہونے کا انتظار کروں، لیکن جب اس طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی، تو سرحد عبور کر کے ہندوستان چلا گیا اور وہاں ایک ماہ گزار کر چند دوستوں کے ساتھ نیپال کی سرحد عبور کی۔ چھ ماہ کھٹمنڈو میں رہا اور وہاں سے پھر بھارت کے راستے پاکستان میں داخل ہو گیا۔

جب تھرپارکر کے علاقے سے مغربی پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا، تو یہاں کی زبان اور کلچر سے ناآشنا ہونے کے باوجود یوں لگا جیسے اپنی ماں کی گود میں آگیا ہوں۔

جیسے پوری کائنات کے کیڑے سمٹ آئے ہوں

ابونصر فاروقی (ڈھاکہ) کے لمحات ہجرت اس طرح ہیں: ۱۶ دسمبر کو جب پاک فوج نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا، تو جمعیت کے قائدین نے البدر کے کمانڈوں کو یہ اجازت دے دی کہ وہ اپنے اپنے طور پر بچاؤ کریں۔ ہدایات لے کر میں شہر کے اندر چلا گیا۔ راستے میں مجاہد فورس کے رضاکاروں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے روک لیا۔ میں نے ان سے کہا کہ "آپ اب کیسی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔"

وہ بولے "تم مکتی باہنی کے آدمی معلوم ہوتے ہو، ابھی تمہیں اس افواہ سازی کا مزا چکھاتے ہیں!"

میں نے سمجھایا: "بھائی، یہ افسوسناک صورت حال واقعی پیدا ہو چکی ہے۔ آپ غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں"۔

یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک مجاہد نے رائفل کی نالی میرے سینے پر رکھ دی، وہ تو خیریت گزری کہ اسی دوران پاک فوج کی ایک گاڑی ادھر آنکلی۔ انہوں نے ہم لوگوں کو دیکھا تو بلند آواز سے کہا "ہم گرفتار ہو کر جا رہے ہیں۔ تم لوگ روپوش ہو جاؤ"!

یہ سن کر رضاکاروں نے مجھے چھوڑ دیا اور خود بہت عجلت سے ایک طرف بھاگ گئے میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کہاں جاؤں۔ بالآخر کوتوالی تھانہ جانے کا ارادہ کیا جہاں مدرسۂ عربیہ کے چند طالب علم پولیس میں بھرتی ہو کر ڈیوٹی پر تھے۔ وہاں پہنچا تو محسوس ہوا وہ بوریا بستر باندھنے کی فکر میں ہیں۔ دریافت کرنے پر ایک صاحب بولے بھئی! یہ ہمارا تبادلہ کر رہے ہیں، اگر ہو سکے تو کسی افسر سے سفارش کر کے تبادلہ رکوا دو۔ ہم ڈھاکہ سے باہر نہیں جانا چاہتے۔ یہ سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ ہولناک انقلاب کو وہ بھولے بھالے ابھی تک ٹرانسفر ہی سمجھ رہے تھے۔ سرنڈر کے ذمہ دار اپنی پولیس کو بھی صحیح صورتحال سے آگاہ نہ کر سکے تھے۔ یہاں سے مایوس ہو کر میں ٹپراٹولی کی جامع مسجد پہنچا۔ اس مسجد کے امام صاحب تو عوامی لیگ کے حامی تھے، لیکن یہ تبلیغی جماعت کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ جس وقت میں اندر داخل ہوا، تبلیغی جماعت کے ایک قائد کہہ رہے تھے: "بھائیو اور دوستو! جہاد کا وقت آگیا ہے۔ اب اس کے لئے ہمیں تیار ہونا چاہیئے۔ بہت نفع ہو گا"۔

اندازہ ہوا کہ یہ لوگ بھی حالات سے بے خبر ہیں۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ نماز اسی مسجد میں ادا کی اور مسجد کے امام صاحب سے حال دل کہا۔ رات ان کے ہاں گزاری۔ خیال تھا چند دن اطمینان سے رہ سکوں گا، لیکن فجر کی نماز ادا کی ہی تھی کہ ایک لڑکے نے میری طرف دیکھے بغیر ایک جانب منہ کر کے کہا "بھائی! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تمام ساتھی بیت المکرم

کی اور وضو کر کے نماز فجر پڑھی۔ پھر امام مسجد صاحب کے پاس گیا۔ جن کا نام مولانا مرتضیٰ احمد تھا اور وہ کچھ اردو جانتے تھے۔ انہوں نے میری داستان غم سنی تو دل گرفتہ ہوتے اور فوراً مجھے اپنے گھر میں چھپا دیا۔ مجھ سے رقم لے کر محفوظ کر دی۔

مونگ ڈو کی یونین کونسل کا چیئرمین مسلمان تھا۔ ہم دونوں مناسب وقت پر اس سے ملنے گئے۔ اس نے کھانا کھلایا۔ پھر بڑے غور سے تمام گفتگو سنی اور مشورہ دیا کہ میں فوراً" امیگریشن والوں سے رابطہ قائم کروں اور بتاؤں کہ" ابھی ابھی لٹا پٹا ہجرت کر کے یہاں پہنچا ہوں" اس کے مشورے کے مطابق امیگریشن آفس پہنچا۔ رپورٹ درج کرائی۔ آفیسرز نے سوموار کو دوبارہ آنے کے لئے کہا۔

تین روپے پاس تھے اس سے تسنیم عالم منظر مرحوم کو مرکز جمعیت کراچی ٹیلی گرام دیا۔ لوگوں نے کہا کہ "یہ لوگ تمہیں گرفتار کر لیں گے۔ پرسوں اس دفتر نہ جانا۔ ہم مقامی مسلمان تمہاری ضمانت کا بندوبست کرتے ہیں۔"

یہ سب غیبی امداد تھی کہ امیگریشن افسر نے میری ضمانت کا بندوبست کر لیا اور پروانہ ضمانت پر بری

میں کچھ لکھا مجھ سے بھی دستخط کرا لئے، پھر کہا "بیٹا! اب تمہاری ضمانت ہو گئی ہے، روزانہ اس دفتر میں آ کر حاضری لگا دیا کرو۔" میں واحد شخص تھا جو گرفتار نہ ہوا۔ ورنہ اس جانب آنے والے تمام افراد کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔

جیسا کہ بتا چکا ہوں یہاں جو تین طبقے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں ان میں سب سے زیادہ فعال مسلمان ہیں اور اسی مسلم سپاہ آزادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے کمانڈر نے رات کو مجھے کہا کہ "تم ہماری سپاہ آزادی میں شامل ہو جاؤ، ہم تمہارے گزارے کے لئے اپنی جانب سے تمہیں زمین دیں گے۔"

یہاں کے مسلمان جوڈو کراٹے کے ماہر ہیں۔ لڑکیوں کو بھی اس کی تربیت دی جاتی ہے

(مرکزی مسجد) میں ہیں وہاں چلے جاؤ"۔ اور میں اس طرف روانہ ہو گیا۔

یہ ۱۷ دسمبر کا واقعہ ہے۔ سارا ڈھاکہ فائرنگ کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ ہر طرف لہو کی بارش اور گولیوں کی آتش نوائی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے بارود کے ڈھیر کو آگ لگ گئی ہو۔

راستے بھر میں اردو بولنے والوں کو سنگینوں میں پروتے ہوئے دیکھ کر ذہن ماؤف ہو گیا۔ بہت سے ہندو اس قتل و غارت گری میں پیش پیش تھے اور یوں سنگینیں چلا رہے تھے جیسے کھیل کھیل رہے ہوں۔

بھارتی فوج کی گاڑیاں ڈھاکہ چھاؤنی کی طرف قطار در قطار جا رہی تھیں۔ خون کے آنسو رلا دینے والے یہ واقعات دیکھتا ہوا جب بیت المکرم پہنچا تو تمام ساتھی وہاں سے جا چکے تھے۔ مجبوراً وہاں سے اپنے بھائی کے ہاں پہنچا اور ۲۵ دسمبر تک وہیں روپوش رہا۔ ۲۵ دسمبر کو اخبارات میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھا۔ دینک بنگلہ میں اشتہار تھا کہ "اس نام کے طالب علم کو پکڑ لو"۔ یہ اشتہار دیکھ کر اکھوڑہ جنکشن کی طرف چلا گیا جو اگرتلہ کے قریب ہے اور وہاں سے برہمن باڑیا، پھر سلہٹ شائستہ گنج سے ہوتا ہوا مکمنڈ دیپور پہنچا اور وہیں رہنا شروع کر دیا۔

میرا منصوبہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح بنگلہ دیش ہی میں رہوں گا۔ اسی اثنا میں عیدالاضحیٰ آگئی۔ گھر جانے کو دل بہت مچلا۔ لیکن مصلحت کا تقاضا تھا کہ اس خیال کو ذہن سے نکال دوں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور دوبارہ برہمن باڑیا چلا آیا۔ اپریل ۱۹۷۲ء میں جب چاٹگانگ اکھوڑہ ریلوے لائن بحال ہوئی تو چاٹگانگ آگیا۔ اسی مہینے کرنا فلی پیپر مل میں مقامی اور غیر مقامی کے مسئلہ پر بنگلہ دیش میں زبردست جھگڑا ہوا۔ مزدوروں نے بیدردی سے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں جو مادہ پرستانہ طبقاتی کشمکش کا فطری نتیجہ تھا۔ اس مہینہ میں نے یہیں پر قیام کیا۔

میں نے طے کیا کہ ہندوستان جانے کے بجائے برما جانا چاہیئے، لیکن زبان سے ناواقفیت ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کسی سے واقفیت بھی نہ تھی تاہم میں نے سفر کی تیاری شروع کر دی اور غیب سے امید کی ہلکی سی روشنی بھی دکھائی دی۔ میرے

ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہاں لڑکے کم اور لڑکیاں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔

جولائی کے آخر میں میں اکیاب چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر پاکستانی قونصل خانے سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے تعاون کیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد میں پاکستان پہنچ گیا۔

میں ٹورسٹ گائیڈ بن گیا

نجم الثاقب (مومن شاہی) کہتے ہیں: "۴ دسمبر کو بھارتی فضائیہ کے بمبار طیاروں نے مومن شاہی شہر پر خوفناک بمباری شروع کی۔ یہ سلسلہ بلا روک ٹوک ۷ دسمبر تک جاری رہا۔ روزانہ بھارتی بمبار دن کے اجالے میں آتے اور ہزاروں پونڈ وزنی بم پھینک کر چلے جاتے۔ اسی دوران میں بھارتی بری فوج نے سرحد عبور کر کے مومن شاہی کی جانب پیشقدمی شروع کر دی تھی۔

پاک فوج کے دستے شہر کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ البدر کو شہر کے ایک سمت مکمل سیکٹر سونپا گیا جو دریا کی جانب تھا۔

۷ دسمبر کی رات کے ۹ بجے سگنل ملا، "تیار ہو جاؤ" ہم نے اپنی رائفلیں چیک کیں صف بندی کا جائزہ لیا اور دشمن کی نقل و حرکت کا اندازہ کرنے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

اسی حالت میں کوئی پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ پاک آرمی کے ٹرک حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیئے اور فوج کے پیادہ دستے شہر کی پچھلی جانب جاتے ہوئے نظر آئے۔ آرمی . . . سگنل نے ہمیں بتایا کہ ہمیں فوراً واپسی اور مومن شاہی چھوڑنے کا آرڈر ملا ہے۔"

اس صورت حال میں ہم سٹ پٹا کے رہ گئے۔ رات ساڑھے نو بجے کرنل امیر محمد خان ہمارے کیمپ میں آئے۔ وہ البدر کے امور کے انچارج تھے۔ انہوں نے آتے ہی تمام صورتحال بتائی اور کہا: "تم چاہو تو ہمارے ساتھ ڈھاکہ کی جانب چلو، لیکن اگر اپنی مرضی سے کہیں اور جانا چاہو، تو اپنے ہتھیاروں سمیت کسی بھی جگہ جا سکتے ہو۔"

ہم نے کہا: "ہم آپ کے ساتھ جائیں گے"، انہوں نے کہا: "ٹھیک ہے اور ہم اسی رات

ایک دوست کی والدہ برمی تھیں۔ اسے میرے ارادے کا علم ہوا تو نہایت شفقت سے پیش آیا۔ ایک سمگلر کے ذریعے برما بھیجنے کی بات کی اور اس نے مجھے برما پہنچا دیا۔ اس سفر کی روئیداد بھی خاصی دلخراش ہے۔ قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں، بلکہ برما میں داخل ہو کر پریشانیوں کا خاتمہ نہ ہوا۔ کرنسی تبدیل کرانے میں سخت مشکل پیش آئی۔ شام تک گھومتے رہے کسی نے مدد نہ کی۔ پاکستان اور برما کی چوکی "نکناف" پر پہنچا تو وہاں ابھی تک پاکستان کا ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے پوری کائنات کپڑے کے اس ٹکڑے میں سمٹ آئی ہو۔ یہاں نماز عصر ادا کرتے وقت پانی نہ ملا تو کھارے پانی سے ہونٹ پھٹ گئے۔ مغرب کے بعد ایک مچھیرے سے ملے جو بنگلہ زبان جانتا تھا۔ اس نے رات کے کھانے کی دعوت دی، رات اسی کے گھر آرام کیا۔

برما میں ان دنوں تین گروپ سرگرم عمل تھے۔ ایک مسلم تحریک آزادی کا، دوسرا مونگ تحریک آزادی کے لئے اور تیسرا اس علاقے میں اشتراکی سٹیٹ قائم کرنے کا خواہاں تھا۔

ہمیں مونگ ڈو ضلع پہنچنا تھا اور اپنے گائیڈ سے یہ بات طے ہوگئی تھی کہ وہاں پہنچا دے گا، مگر اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا اور عین راستے میں چھوڑ کر کھسک گیا۔

راستے میں شدت سے پیاس لگی تو ایک آدمی سے پانی مانگا۔ اس نے پوچھا کس پارٹی کے ہو؟ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جائیں کہا: اب تو سب عوامی لیگی ہیں۔ تو اس نے پانی دینے سے انکار کر دیا۔ آگے چل کر کچھ اور لوگ ملے۔ انہوں نے بھی پانی دینے سے پہلے پارٹی کا نام پوچھا۔ میں نے جواب دیا۔ ایک ہی پارٹی ہے "مسلم پارٹی"۔ یہ سن کر انہوں نے خوب خاطر مدارت کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس علاقے کے لوگ عرصہ دراز سے "قائد اعظم" اور مسلم لیگ کے پرستار چلے آرہے ہیں۔

میں مغرب تک مونگ ڈو جانے کے لئے کشتی کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آئی۔ بستی بہت دور تھی۔ گھپ اندھیرا اور پانی کی پراسرار چمک۔ بالکل الف لیلوی ماحول لگ رہا تھا۔ پہاڑوں کی عجیب دغریب ہیبت تھی۔ ایک بار غالباً شیر کے دھاڑنے کی آواز بھی

آئی۔ بڑے بڑے پرندے عجیب آوازیں نکالتے ہوئے سر کے اوپر سے گزرتے جا رہے تھے۔ سانپوں کی سرسراہٹ بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اسی جگہ کھڑے کھڑے رات کے نو بج گئے۔ تب ایک کشتی آئی۔ اسے آواز دی تو کشتی والوں نے پوچھا "کہاں جاؤ گے؟" اردو میں جواب دیا۔ "مونگ ڈو جاؤں گا"۔ اس وقت میرا حلیہ بھی عجیب فقیرانہ تھا لنگی اور بنیان زیب تن تھا۔ خطرہ تھا کہ لے جانے سے انکار نہ کردے لیکن اس نے کشتی میں بٹھا لیا۔

ابھی تک وہی پُر ہیبت، پراسرار، طلسماتی اور خوفناک ماحول تھا چمکتا ہوا پانی اور خوفناک آوازیں، رات کے تقریباً دو بجے یونہی اونگھ سی آئی تھی کہ کسی نے ٹھوکر مار کر جگایا اور ٹوٹی پھوٹی اردو اور برمی میں کچھ کہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ البتہ اس کے اشاروں سے اندازہ ہوا کہ وہ رقم مانگ رہے ہیں۔ میں نے کہا "کچھ نہیں ہے"۔ انہوں نے میرا بیگ چھین کر تلاشی لی۔ اس میں کچھ نہ ملا۔ میں نے رقم اپنے زیر جامہ میں چھپا رکھی تھی۔ وہ مایوس ہو کر مجھے کشتی کے کنارے پر لے گئے۔ ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ ایک کہہ رہا ہے "کیا مصیبت بٹھالی ہے"۔ دوسرے نے کہا "اسے یہاں اتار چھوڑتے ہیں"۔ پہلے نے کہا "مر جائے گا"۔ دوسرے نے جواب دیا "ہماری جان تو اس مصیبت سے چھوٹ جائے گی"۔ یہ کہہ کر اس نے ارادہ کیا کہ مجھے دریا میں پھینک دیا جائے، لیکن جیسے ہی وہ آگے بڑھا دوسرے نے کہا "خوامخواہ ایک جان ضائع کر رہے ہو"۔

یہ سن کر وہ رک گیا تھوڑی دیر بعد سحری ہو گئی۔ اب شہر جگنو کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ میں خوش ہوا کہ اپنی منزل پر پہنچ گیا لیکن کشتی جیسے ہی ساحل کی طرف بڑھی کسی نے ٹارچ سے روشنی ڈالی جو میرے منہ پر پڑی۔ ملاحوں نے دھکا دے کر مجھے کشتی کے پچھلے حصے میں سرکا دیا۔ خطرہ ٹل گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ امیگریشن والا تھا۔

فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی میں نے شہر میں قدم رکھا۔ کنارے پر کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ کپڑے لت پت ہو گئے تھے۔ مسجد کی جانب لپکا۔ اُن دونوں میں سے ایک میرے ہمراہ تھا۔ مسجد میں جا کر میں نے بیس برمی روپے اُسے دیئے اور وہ چلا گیا۔ اب اطمینان سے کیچڑ صاف

ڈھاکہ کی جانب پیدل روانہ ہو گئے۔ ہم سب بہت دل گرفتہ تھے۔ یہاں تک کہ پاک آرمی کے جوان بھی ہمارے ساتھ آنسو بہا رہے تھے، وہ حیران تھے کہ انہیں واپس آنے اور شہر کو کھلا چھوڑ دینے کا کیوں آرڈر ملا ہے؟ سب جوان ایسے بددل تھے کہ کسی نے بھی کھانا نہ کھایا۔ کوئی کسی سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں کر رہا تھا۔

اگلے دن بھی ہم پیدل چلتے رہے۔ رات کے وقت تنگائل (Tangail) پہنچے، وہاں جا کر دیکھا کہ دوسری سمتوں سے بھی پاک آرمی کے دستے ڈھاکہ جا رہے ہیں۔ یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ بھارتی فوج بلا روک ٹوک ڈھاکہ کی جانب بڑھ رہی ہے اور اس وقت وہ ہم سے صرف پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ تاہم رات بھر پیدل سفر جاری رہا اور اگلے روز ہم ڈھاکہ کے قریبی شہر مرزا پور پہنچ گئے۔ وہاں سواری ملی اور ڈھاکہ چھاؤنی کے البدر کیمپ پہنچ گئے۔

سولہ دسمبر کو اطلاع ملی کہ "ہتھیار ڈالے جا رہے ہیں"۔ ہمارے سب ساتھی شدتِ غم میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اسی اثنا میں آرمی افسروں نے کہا: "آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ ہتھیار ڈالیں"۔ لیکن ہم نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان کے ناظم نے افسرانِ بالا کو کہا: "ہم نے اسلامی نظریۂ حیات کے نفاذ کے لئے حاصل کردہ ریاست پاکستان کے دفاع کے لئے ہتھیار اٹھائے تھے۔ اب ہمارے اہلِ اقتدار کی غداری کے نتیجے میں یہ خطہ دشمن کے قبضے میں جا رہا ہے۔ ہم آخری سانس تک کوششیں کریں گے کہ یہ المیہ رونما نہ ہو۔ آپ بھی گوریلا جدوجہد کرنے کے لئے اپنے آپ کو چھپا لیں"۔

آرمی کی طرف سے جواب ملا: "ہم ڈسپلن کے پابند ہیں"۔ اس کے بعد ہمارے کیمپ سے تمام البدری ایک دوسرے کو گلے ملتے ہوئے انجان راہوں کی جانب چل دیئے

میں یکم جنوری تک ڈھاکے میں رہا۔ پھر موٹر لانچ کے ذریعے فرید پور آ گیا اور وہاں سے سراج گنج، دیناج پور چلا گیا۔ پھر ۱۰ فروری کو دیناج پور سے پیدل چلتا ہوا ہندوستان کی سرحد پار کر گیا۔ چار مہینے بھارت میں گزارے۔ وہاں سے نیپال پہنچا۔ کھٹمنڈو میں ہمارے

اور بھی ساتھی ہجرت کر کے آچکے تھے۔

میں ساڑھے نو ماہ تک ٹورسٹ گائیڈ کے طور پر کام کر کے گزارا کرنے کے لئے معاوضہ لیتا رہا۔ ہم اپنی تنخواہیں مشترکہ خرچ کرتے تھے۔ بعد ازاں ہندوستان سے ہوتا ہوا راجستھان کے بارڈر سے پاکستان میں داخل ہوا۔

ہماری کشتی بھٹکتی ہوئی کھلے سمندر میں نکل آئی

محمد منصور (چٹاگانگ) نے بتایا: جب ہتھیار ڈالنے کے حکم کی وضاحت مانگنے پر مقامی کیپٹن ہمارے سوال کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا تو میں نے اپنے حلقے عیدگاہ کے البدر ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور ان سے پوچھا: "ساتھیو! اب تم کہاں جاؤ گے؟" انہوں نے کہا "ہم یہیں رہیں گے۔" میں نے کہا "مکتی باہنی والے آپ کو شہید کر دیں گے۔" وہ کہنے لگے: "ماں باپ کے سامنے شہید ہونا اچھا ہے۔" باقی ساتھی منتشر ہو گئے۔

میں ساتھیوں کو لے کر چاٹگام شہر آیا اور ایک بورڈنگ میں ٹھہرا کر ساحل کی طرف نکل گیا۔ وہاں اتفاق سے موہش کھالی کا ایک جاننے والا کشتی والا مل گیا۔ اس سے گھر لے جانے کو کہا۔ وہ بولا: "آپ داڑھی مونڈھ دیں تو ممکن ہے۔ اس داڑھی کے ساتھ نہ لے جاسکوں گا۔" اس کی یہ بات بہت بری لگی، لیکن خاموش رہا اور واپس آکر بورڈنگ میں سو گیا۔

۱۷ دسمبر صبح ایئرپورٹ پر گیا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا، پورے چاٹگام میں پھرا مگر کوئی سپاہی یا البدر کیڈٹ نہ ملا۔ آخر ایک ناریل کے درخت کے نیچے اپنا اسلحہ پھینک دیا اور بورڈنگ آکر اپنے ساتھی کارکنوں کو جگایا، نماز پڑھی، ناشتہ کیا، اختصار سے ایک لنگی اور کرتہ لیا اور وردی اتار پھینکی۔

انیس الاسلام نے کہا: "آپ کو لوگ جانتے ہیں۔ اس لئے آپ یہاں سے فوراً چلے جائیے۔" چنانچہ اس سے اتفاق کرتے ہوئے میں نے چاٹگام سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ساتھیوں سے کہا: "میرے رہنے سے تم بھی ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ مجھے تو یہ لوگ شاید آج ہی شہید کر دیں تم لوگ زندہ رہو تاکہ کچھ دن اور اللہ کی عبادت کر سکو۔"

میرے پاس ۱۲۰ روپے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو چالیس چالیس روپے دیئے۔ چالیس روپے خود رکھے۔ ہم بھرائی ہوئی آوازوں اور روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ مجھے یقین تھا کہ میں آج یقیناً شہید ہو جاؤں گا۔

۹ بجے صبح میں دوبارہ گھاٹ پر پہنچا۔ اتفاق سے وہی کشتی والا مل گیا اور اس نے پھر داڑھی کا ذکر چھیڑا۔ میں نے کہا: "داڑھی تو نہیں کاٹوں گا اور اس نے یہ کہہ کر کہ اگر کوئی پکڑ لے گا، تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ پھر مجھے کشتی میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ایک بجے دن کشتی گھاٹ سے الگ ہوئی۔ ایک عوامی لیگی بھی ساتھ تھا۔

موہش کھالی کی سمت ہماری کشتی ایک میل ہی بڑھی ہوگی کہ مکتی باہنی نے دو فائر کئے اور آواز دی کہ ادھر آؤ۔ ملاح نے بے چون وچرا کشتی کا رخ موڑ دیا اور ہم ساحل پر پہنچ گئے ـــــ انہوں نے پوچھا: "کوئی البدر یا مجاہد ہے؟" ـــــ کشتی والے نے کہا "نہیں کوئی نہیں"۔ پھر انہوں نے جے بنگلہ کے نعرے لگوائے، سب نے لگائے، مگر میں خاموش رہا۔ اسے خدا کی خاص رحمت ہی کہنا چاہیئے کہ وہ میری طرف متوجہ نہ ہوئے۔ وہاں سے تین میل بڑھے تھے کہ مازل گھاٹ کے قریب ایک اور ٹولے نے آلیا اور وہی سوال دہرایا: "کوئی البدر رضاکار ہے؟"

ملاح تو خاموش رہا، لیکن عوامی لیگی نے کہہ دیا "ایک البدر ہے" ـــــ یہ سننا تھا کہ وہ مجھ پر جھپٹ پڑے اور ہاتھ پکڑ کر کشتی سے باہر کھینچنے لگے۔ میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا: "زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں"۔ انہوں نے مجھے کشتی سے اتار لیا۔ میں نے دیکھا ساحل پر بہت سے مجاہدوں کی مشکیں بندھی ہوئی تھیں اور انہیں اذیت پہنچائی جا رہی تھی۔ وہ مجھے بھی اس طرف لے گئے۔ مجھے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا، لیکن اتفاق سے وہاں میرے گاؤں کا ایک مکتی باہنی موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو پوچھا: "تم ادھر کہاں؟"

میں نے کہا: "گھر واپس جا رہا تھا کہ یہ مجھے البدر کہہ کر کشتی سے اتار لائے ہیں"۔

اس پر میرے محلے والا دوسروں سے جھگڑ پڑا۔ کہنے لگا: "میں نے ایک سال آزادی

کے لیئے جنگ کی ہے، اگر تم اسے مارنا چاہتے ہو تو پہلے مجھے مارو"۔ خاصے جھگڑے کے بعد اُس نے مجھے چھڑا دیا اور رات ۲ بجے کے قریب میں گھر پہنچا۔ ابا نے بتایا کہ مکتی باہنی تمہاری تلاش میں کئی مرتبہ یہاں کے چکر لگا چکی ہے۔ تمہارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ تم ڈاکٹر نورالعین کے پاس چلے جاؤ۔ یہ ڈاکٹر جزیرے کی عوامی لیگ کا سیکرٹری تھا۔ والد صاحب نے اسے آرمی ایکشن کے دوران ایک ہفتہ اپنے مکان پر بچا رکھا تھا۔ ابا کی ہدایت کے مطابق میں نے جا کر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ صبح ۴ بجے کا عمل تھا وہ پستول لے کر نکلا۔ میں نے تعارف کرایا اور پناہ چاہی۔ اُس احسان فراموش نے جواب دیا کہ فوراً میرے سامنے سے چلے جاؤ۔ دوسری مرتبہ دیکھا تو مار ڈالوں گا"۔ میں نے کہا؟ "یہ ہے احسان کا بدلہ" اور پہاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ ایک ہفتہ درختوں کے پتے کھا کر گزارہ کیا اور خدا جانے کب تک اس طرح گزارا کرنا پڑتا لیکن حسن اتفاق سے اپنے ایک بڈھے ملازم سے ملاقات ہو گئی اور وہ کچھ کھانا، کرنہ اور سگریٹ کے پیکٹ دے گیا۔ ہمارے کچھ ساتھیوں کو پاک آرمی سے سگریٹ پینے کی عادت ملی، اکیس دن پھر پتے کھا کر گزارے، اکیس دن بعد وہی ملازم اور میرا چھوٹا بھائی اپنے ساتھ کھانا کمبل اور لنگی لے کر آئے۔ کمبل سستا سا تھا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں ہمارا گھر بھی تو نہیں لوٹ لیا گیا کہ یہ انتہائی سستا کمبل بھیجا گیا ہے، بھائی سے پوچھا، تو اس نے جواب نہ دیا۔ شکل سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اصلی حالات چھپانے کی کوشش کر رہا ہے واضح رہے کہ والد صاحب کا کاکس بازار اور موہش کھالی کے درمیان آمد و رفت کے لیئے کشتیاں چلانے کا کاروبار تھا جس سے معقول آمدنی ہوتی تھی۔ بھائی نے ایک سو روپے دیئے اور کہا کہ آئندہ رات ایک لانچ لامار بگٹولی (ایک گھاٹ کا نام) پر آئے گی۔ اس میں سوار ہو جانا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے لانچ آئی، تو میں سوار ہو جاؤں گا۔ اگرچہ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ لانچ کہاں لے جائے گی اور میرا مستقبل کیا ہو گا، لیکن والد صاحب کا حکم ماننے کے سوا چارہ نہ تھا۔

یہ لانچ ناپسندیدہ لوگوں کی تھی اور والد صاحب نے کرائے پر حاصل کی تھی۔ مقررہ وقت پر وہ پہنچ گئی۔ موہش کھالی کے رہنے والے دو محبِ وطن پہلے سے سوار تھے۔ میں بھی ان

کے ساتھ بیٹھ گیا اور نامعلوم منزل کی طرف ہمارا سفر شروع ہوا۔

ملاح اپنی مرضی سے کشتی کھے رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سوکھے پتے کی طرح پانی پر بہہ رہے ہیں۔ یونہی بہتے بہتے ہم جن جیرۃ نامی جزیرے پر پہنچ گئے جس کے ناریل بہت مشہور ہیں۔ اس جزیرے کے باشندے تحریک اسلامی کے حامی تھے لیکن اب حالات بدلے ہوئے نظر آئے۔ ہم کچھ دیر رک کر آگے روانہ ہو گئے۔

یہ جنوری کی آٹھ تاریخ تھی۔ اس علاقے میں حالات بظاہر پرسکون تھے اور اسی بنا پر ہم خیال کر رہے تھے کہ کوئی حادثہ پیش نہ آئے گا لیکن جزیرے کے ساحل سے کچھ ہی دور گئے تھے کہ مکتی باہنی والوں کی ایک کشتی نے تعاقب شروع کر دیا اور سورج غروب ہونے تک برابر ہمارا پیچھا کرتی رہی، ہمارے ملاحوں نے رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مکتی باہنی سے تو جان بچالی لیکن بھٹک کر گہرے سمندر کی طرف آ گئے۔ کسی کو سمت کا اندازہ نہ تھا۔ اندازاً ہی شمال کی طرف لانچ موڑ دی اور دس بارہ گھنٹے بے سوچے سمجھے سفر کرتے رہے۔ جب سورج کی روشنی اچھی طرح پھیلی تو پتہ چلا برما میں مچھیروں کی ایک بستی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ وہاں سے روانہ ہو کر رات ایک گاؤں میں اترے۔ جس کی ساری آبادی مسلمان تھی۔ خوش قسمتی سے چند ایک جاننے والے بھی مل گئے۔

انہوں نے خوش آمدید کہا۔ کھانا کھلایا اور ٹھہرنے کے لئے جگہ دی ہم خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے غیب سے مدد فرمائی لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ صبح کو معلوم ہوا یہاں دو متوازی حکومتیں ہیں۔ ایک برما کی، دوسری کمیونسٹوں کی، اب جو بھی ہمیں دیکھے گا۔ پکڑ لے گا بہر حال دن وہاں گزارا۔ پہاڑ کے قریب واقع ایک مسجد کے امام نے مشورہ دیا کہ اپنے سفارت خانے کو خط لکھو، چنانچہ میں نے البدر کمانڈر کی حیثیت سے انہیں خط لکھا۔ جواباً سفارت خانے والوں نے کہا کہ فوراً دفتر آ جاؤ، ورنہ پکڑے جاؤ گے اور تیسرے دن ہم کشتی لے کر اکیاب چلے گئے۔

دن کے ۱۲ بجے وہاں پہنچے۔ کسی ذریعے سے اکیاب کی جامع مسجد کے امام صاحب کو ہمارے آنے کی اطلاع پہنچ چکی تھی، وہ بھی تشریف لے آئے اور ہمیں پاکستان آفس لے

گئے، مگر دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ برما کے امیگریشن والوں نے سفارت خانے کی حدود میں داخل ہو کر ہمیں گرفتار کر لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔

سفارت خانے کی حدود سے پکڑنے پر پاکستانی قونصل نے سخت احتجاج کیا اور بالآخر ہمیں رہا کرانے میں کامیاب ہوگئے اور رہائی کے بعد پاکستانیوں کے کیمپ میں بھیج دیا۔ وہاں اس وقت ۴۰ فوجی مقیم تھے۔ سب بے اختیار گلے ملے اور حال احوال معلوم کئے۔ تین دن بعد ڈھاکہ سے فرار ہو کر ایک کرنل وہاں پہنچے انہوں نے ہم تینوں کو بلا کر تسلی دی کہا "اگر مشرقی پاکستان سے ایک کروڑ مسلمان بھی آئیں گے تو ہم انہیں مغربی پاکستان بھیجنے کا انتظام کریں گے"۔

کرنل صاحب کی یہ بات سن کر ہم نے مشرقی پاکستان کے ساتھیوں کو بلانے کے لئے خطوط روانہ کئے، لیکن چند روز بعد ہی فوجی اس کیمپ سے چلے گئے اور ایک ہفتہ بعد ہمیں برما گورنمنٹ کے حوالے کر دیا گیا جس نے سب کو جیل میں ڈال دیا۔

برما کے افسروں نے کہا بے شک تم لوگ بڑی قربانیاں دے کر آئے ہو، مگر ہم کیا کریں۔ پاکستانی سفارت خانہ تمہیں قبول نہیں کرتا۔ اس لئے ملکی قانون کے مطابق تمہیں قید کر رہے ہیں۔ یہ سترہ جنوری کی بات ہے۔ دوسرے دن ہم نے کھانا پینا بند کر دیا اور کہا کہ کیا ہم چور ہیں جو ہمیں جیل میں اس طرح رکھا ہے۔

یہ صورت حال پیدا ہوئی تو دو تین برمی آفیسر آئے اور کھانا کھانے پر اصرار کیا۔ ایک امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کا چیف آفیسر بھی آیا۔ اس نے بہت سمجھایا، مگر ہم کھانا کھانے سے برابر انکار کرتے رہے۔ بالآخر ضلع کا سب سے بڑا افسر (ہمارے ڈپٹی کمشنر کے برابر) آیا، وہ بدھ مذہب کا پیرو تھا اور اس نے پاکستان سے میٹرک کیا تھا۔ ہمارے حالات سننے کے بعد کہنے لگا۔ میں رنگون میں پاکستانی سفارت خانے سے بات کروں گا۔ آپ کھانا کھا لیں اور اس نے حسب وعدہ پاکستانی سفارت خانے سے بہت بحث و مباحثہ کیا، چنانچہ سفارت خانے نے ہماری ذمہ داری لے لی اور ۱۸ جنوری کو جیل میں سفارت خانے کی طرف سے کھانا ملا۔ اس کے بعد ہم نے دیگر سہولتوں کے لئے سفارت خانے کو لکھا

جو ہمیں مل گئیں، البتہ ضابطے کی کارروائی کے طول پکڑنے کی وجہ سے پورا ایک ہفتہ مزید جیل کاٹنا پڑی۔

قید کے دوران "اکیاب" کے مسلمانوں نے ہماری رہائی کے لئے ایک ایکشن کمیٹی بنائی۔ وہ کہتے تھے کہ ایک لاکھ روپیہ کی ضمانت بھی دینی پڑے گی، تو ہم دیں گے۔ یہ ہمدردی واقعی مثالی اور قابل قدر تھی۔

رہائی کے بعد سفارت خانے نے ہمیں ایک ہوٹل میں رکھا۔ اس ایک مہینہ میں برمی مسلمانوں نے ہماری بہت خدمت کی۔ میرے پاس جوتے نہ تھے اور یہاں جوتے شناختی کارڈ پر ملتے تھے۔ ایک برمی نے اپنے کارڈ پر میرے لئے جوتے خریدے۔ پورا عرصہ روزانہ بے شمار لوگ ملنے آتے۔

ایک مہینے بعد ہمیں پھر کیمپ لے جایا گیا۔ لوگوں نے کھلے دل سے ہمارا استقبال کیا۔ کیمپ میں ہم سے ملنے کے لئے کئی مسلمان نیچے آجاتے۔ اسی طرح کی کوشش میں ایک روز میٹرک کے دو طالب علم گرفتار کرلئے گئے جنہیں ۲۴ گھنٹے قید رکھا گیا۔

یکم اپریل کو ہم اکیاب سے رنگون روانہ کردیئے گئے۔ اگرچہ ہماری روانگی پوشیدہ رکھی گئی تھی، لیکن اس کے باوجود الوداعی سلام کہنے کے لئے سینکڑوں اکیابی مسلمان آن پہنچے۔ ہم کلاس کے ایک طالب علم نے جس کا نام رشید تھا رو رو کر اپنا حال برا کرلیا۔ ان ساتھیوں کی اس محبت کو جو محض خدا کے لئے تھی، دیکھ کر ہم تمام تکلیفیں بھول گئے۔

رنگون پہنچنے پر مسلمانوں نے ہمیں شہر کی سیر کرائی۔ پھر وہاں سے بنکاک اور بنکاک سے کراچی پہنچے۔

عمران بھائی جیپ چلاتے رہے اور.....

فدائے اسلام ڈھاکہ نے بتایا کہ رات بھر فائرنگ ہوتی رہی، بھارتی گوریلا فوجی راکٹ لانچر پھینک پھینک کر تباہی مچا رہے تھے۔ صبح البدر کیمپ میں ہمارے کمانڈر میجر صاحب نے بتایا فائر بندی ہوگئی، لیکن ایک دوسرے آفیسر نے کہا: "فائر بندی نہیں ہوئی، مگر

سرنڈر ہو گیا ہے"۔

یہ سن کر وہاں موجود ہم میں سے ہر شخص سناٹے میں آ گیا۔ البدر کے کیڈٹ جوش بھری آواز میں بولے" ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے، جان دے دیں گے، ایک ایک کر کے کٹ مریں گے، لیکن ہتھیار نہیں ڈالیں گے"۔ جس آفیسر نے ہتھیار ڈالنے کی خبر سنائی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، ادھر ہمارے ایک ساتھی ایک دوسرے سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگے۔

ڈیڑھ بجے ہمارے انچارج آرمی آفیسر نے کہا" دیکھیں ہماری مجبوری ہے، ہم مجبور ہیں ہم پابند ہیں، آپ جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تھی اور پھر لڑ کر دشمن کو شکست دی تھی، آپ لوگوں کو ہماری گرفتاری اور ہتھیار ڈالنے کے باوجود یہاں رہنا ہے، لڑنا ہے، کام کرنا ہے، اس لئے خدا کے لئے اپنی جان کو اس اعلیٰ مقصد کے لئے بچا کر رکھیے"۔

یہ سن کر ہم سب مرکزی دفتر اسلامی جمعیت طلبہ پندرہ پرانا پلٹن پہنچنے کے لئے تیار ہوئے۔ اتنے میں ایک کھلی جیپ چلاتے ہوئے مصطفےٰ شوکت عمران وہاں آ گئے اور ہم سے کہا۔ آپ سب میرے ساتھ چلیے۔ ہم تو پہلے ہی تیار تھے۔ فوراً جیپ میں سوار ہو گئے۔ عمران بھائی خود جیپ ڈرائیو کر رہے تھے، اُن کے ایک ہاتھ میں حفاظت کے لئے بھرا ہوا ریوالور اور دوسرے میں اسٹیئرنگ تھا۔ ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ جیپ کو حادثہ پیش آیا جس میں شوکت عمران کے ماتھے پر چوٹ آئی اور خون بہہ نکلا، لیکن اس کے باوجود وہ بہت ہوشمندی اور بہادری سے جیپ چلاتے رہے، ان کے لہو کے چھینٹے سڑک پر گر رہے تھے اور انہوں نے ہمیں حفاظت سے محمد پور البدر کیمپ پہنچا دیا۔ کچھ دیر کیمپ میں ٹھہر کر میں دھان منڈی اپنے بھائی کے گھر آیا، وہ عوامی لیگ کے حامی تھے۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ البدر تنخواہ نہیں لیتے تھے۔

میں اپنی یہ حالت رحمٰن بھائی پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا، حالات کا اندازہ کر کے انہوں نے ساتھ چلنے کے لئے کہا اور ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ راستے میں مکتی باہنی کی ایک گاڑی

نظر آئی۔ ہم نے بلا جھجک اُسے ہاتھ کا اشارہ دے کر کھڑا کیا اور سوار ہو کر نارائن گنج پہنچ گئے۔ اسی طرح مکتی باہنی کی کشتی میں سوار ہو کر چاند پور گئے۔ ہمارا خیال تھا وہاں ہم لوگ محفوظ رہیں گے۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی بھارتی فوج نے پکڑ لیا۔ ہم نے بتایا کہ ہم اسٹوڈنٹ ہیں اور اپنے گاؤں جا رہے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ تھوڑا فاصلہ طے کر کے میں چاند پور کے بازار میں پہنچا تو وہاں ایک البدر مجاہد کو بانس کے ساتھ بندھا ہوا شہید پایا۔ اس ساتھی کے جسم کو بلیڈوں سے زخمی کر کے نمک چھڑکا گیا تھا اور اس کے ڈھلکے ہوئے سر کے قریب ہی ایک گتے پر مارکر سے لکھا ہوا تھا "غدار کا انجام"۔۔۔ افسوس کہ غداروں نے ایک محبِ وطن جیالے کو شہید کر کے حب الوطنی اپنے لیئے خاص کر لی۔

میں دو دن میں پچیس میل پیدل چلنے کے بعد اپنی ہمشیرہ کے گاؤں پہنچ گیا۔ ہمشیرہ نے بتایا کہ ہمارے رشتے کا ایک بھائی جو مکتی باہنی بھی ہے۔ تمہیں تلاش کر رہا تھا ادھر والد صاحب کا پیغام ملا کہ تمہاری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے ہیں۔ یہ پیغام سن کر میں دیناج پور پہنچا اور وہاں سے کلکتہ ہوتا ہوا نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو چلا گیا یہ سفر میں نے ایک مزدور کی حیثیت سے سڑکوں پر پتھر کوٹ کوٹ کر عمارات کی تعمیر کے لئے سیمنٹ گارا اٹھا اٹھا کر طے کیا۔ حالانکہ میں ڈھاکہ میڈیکل کالج میں سال چہارم کا طالب علم تھا۔ وہاں پہنچ کر بھی یہی حالت رہی۔ نیپال میں چھ ماہ گزارنے کے بعد ہندوستان کی سرحد پار کر کے لاہور آ گیا۔ سید مودودیؒ سے ملاقات نے سفر کی تمام تکلیفیں بھلا دیں۔

اتنا تشدد کیا کہ ہم میں سکت نہ رہی

ایم اسلام (راجشاہی یونیورسٹی) نے ہجرت کی داستانِ الم سناتے ہوئے بتایا:

۱۶ دسمبر کو صبح ۸ بجے راجشاہی میں متعین پاک فوج نے حکم کے مطابق ہتھیار ڈال دیئے البتہ چھاؤنی کا کنٹرول بھارتی فوج نے اُس روز نہ لیا۔ اس لئے ہم وہیں رہے۔ رات سوئے بھی ہم وہیں۔ دوسرے دن ہمارے چالیس ساتھی کپڑے بدل کر چھاؤنی سے نکل گئے۔ ہمارا ارادہ آخری سانس تک وہیں رہنے کا تھا، لیکن فوج کی طرف سے

مشورہ ملا کہ آپ لوگ بھی یہاں سے چلے جائیں، چنانچہ ہم بھی لباس تبدیل کر کے دو دو کی ٹولیوں میں روپوش ہونے لگے۔

چھاؤنی سے نکلنے کے بعد ساتھیوں کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں کہاں گئے البتہ میرا ساتھی متین الدین جو راجشاہی یونیورسٹی کا طالب علم اور البدر پلاٹون کمانڈر تھا ایک جگہ مل گیا اور ہم دونوں نے نیپال کی طرف نکل جانے کا پروگرام بنایا اور فجر کی نماز پڑھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سفر سخت اعصاب شکن تھا۔ نہ راستے کا علم تھا نہ منزل کا۔ تقریباً پینتیس میل پیدل چل کر ۲۰ ر دسمبر کو مغرب کے وقت ہم دریائے پدما کے راشٹا گھاٹ پر پہنچے۔ یہ سفر ہم نے اپنے آپ کو اجنبی اور دیہاتی ظاہر کر کے کیا۔ راستے میں مکتی باہنی کے بہت سے غنڈے ملے، لیکن انہوں نے ہمیں اپنا ساتھی خیال کر کے کچھ نہ کہا اور ہم راشٹا گھاٹ پہنچ کر کشتی میں سوار ہو گئے۔ خیال تھا آگے بھی خیر خیریت رہے گی، لیکن کچھ دیر بعد ہی مکتی باہنی کی پانچ پٹرولنگ کشتیوں نے ہمیں آلیا۔ ایک کشتی میں راجشاہی یونیورسٹی کا ایک عوامی لیگی طالب علم بھی تھا۔ اس نے ہمیں پہچان لیا اور ہمیں کشتی سے پکڑ کر اپنی کشتی میں لے گیا۔

متین الدین کی جیب میں ریوالور کے علاوہ پانچ سو روپے بھی تھے۔ میرے پاس بھی چار سو کے نوٹ تھے۔ جو انہوں نے چھین لئے۔

ہارڈنج برج کے نیچے ان کا کیمپ تھا، وہ ہمیں وہاں لے گئے اور دو دن برابر مارتے پیٹتے رہے — — — — — — — — — — — انہوں نے ہم پر جس قدر تشدد کیا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ میں کئی گھنٹے بیہوش رہا۔

اس دوران میں مکتی باہنی نے اپنا سنٹر "البشوردی تھانہ" منتقل کیا اور وہ ہمیں بھی بیل گاڑی میں ڈال کر وہاں لے گئے اور حوالات میں بند کر دیا اور پھر گویا ہمیں بھول ہی گئے۔ نہ کھانا دیا نہ پانی۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی میری حالت اس قدر خراب تھی کہ مجھے اپنے زندہ بچنے کی توقع نہ تھی، یقین تھا اسی حالت میں ہلاک ہو جائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا

اور راجشاہی یونیورسٹی کے دو طالب علم ہمارے مددگار بن گئے۔ انہوں نے چوری چھپے ہمیں کچھ دودھ پلایا اور ڈاکٹر کو بلا کر مجھے انجکشن بھی لگوایا، لیکن ان کی یہ ہمدردی بس ایک آدھ دن ہی سہارا بن سکی۔ کمانڈر کو اس کا علم ہوا تو اس نے راجشاہی بھیج دینے کا فیصلہ کیا اور اسی دن راجشاہی جانے والی ٹرین کے ایک ڈبے میں ہمیں بند کر دیا۔ کوئی گارڈ وغیرہ بھی ہمارے ساتھ نہیں گیا۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ ہم میں اتنی سکت بھی نہیں کہ حرکت ہی کر سکیں۔

اندازاً ۲۵ر دسمبر ۱۷ء کو ہم راجشاہی پہنچے اور ٹرین سے اتر کر بہاری کالونی کی طرف کھسک گئے اب مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنی قوت اس وقت کس طرح آ گئی تھی۔ بہاری کالونی سے سب بہاری ۱۸ر دسمبر کو ہی بھاگ چکے تھے، بس گنے چنے چند آدمی چوری چھپے رہ رہے تھے اور اتفاق سے ان میں میرے گاؤں کا ایک جاننے والا بھی تھا۔ یہ شخص رکشا ڈرائیور تھا اس نے مدد کرنے کا وعدہ کیا اور اپنے وعدے کے مطابق مجھے متین الدین کے گاؤں پہنچا دیا جو وہاں سے بیس میل دور تھا۔

متین الدین کے گھر والوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ کھانا کھلایا اور آرام کرنے کے لئے بستر فراہم کئے، لیکن ابھی ہم نے کمر بھی سیدھی نہ کی تھی کہ مکان پر مکتی باہنی نے فائرنگ شروع کر دی، نہ جانے انہیں ہماری آمد کی اطلاع کس طرح مل گئی تھی۔ یہ صورت حال دیکھی تو گھر والوں نے ہمیں پچھلی طرف سے نکال دیا اور ہم پانچ چھ میل دور متین الدین کے ایک اور رشتہ دار کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچنے کے بعد یہ افسوس ناک خبر ملی کہ متین کے بڑے بھائی کو مکتی باہنی والوں نے شہید کر دیا۔

ہم وہاں دو دن چھپے رہے، بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ یقین تھا کہ مکتی باہنی یہاں بھی حملہ آور ہو گی اور ہم مارے جائیں گے، لیکن اللہ کی مہربانی سے ایسے حالات میں بھی ہمارا حوصلہ برقرار تھا۔ . . ہم برابر یہ سوچ رہے تھے کہ بچاؤ کی کیا صورت ہو سکتی ہے اللہ کی شان دیکھئے جلد ہی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ ایک محب وطن بنگالی مسلمان نے بیس روپے کے عوض وہاں سے نکال لے جانے کا وعدہ کیا اور ہم مزدوروں کا حلیہ

بنا کر اس کے ساتھ نکل گئے۔

وہاں سے تیس میل دور میری ہمشیرہ کا گاؤں تھا۔ مزدور نے مجھے وہاں پہنچا دیا۔ میں وہاں گیارہ دن چھپا رہا۔ ایک ہمدرد اور خدا ترس ڈاکٹر رات کے وقت آکر مرہم پٹی کرتا تھا۔ گیارہ روز علاج کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ۲۲ جنوری ۱۹۷۲ء کی رات ایک سمگلر کی کشتی پر بھارت میں داخل ہو گیا۔ جہاں ایک ماہ، مالدہ میں گزار کر نیپال کا رخ کیا اور پھر اپنے وطن پاکستان پہنچ گیا۔

والدین نے صبر جمیل کر لیا

چٹاگانگ سے البدر کے ضلعی کمانڈر ابو ظفر، ڈیڑھ سال کے نازک لمحوں کو بیان کرتے ہیں کہ ۱۴ دسمبر کی رات میں البدر کیمپ میں تھا۔ فجر کے وقت اٹھا تو ایک ساتھی مجھے ایک طرف لے گئے اور رازداری کے انداز میں کہنے لگے "معلوم ہوا ہے پاک آرمی ہتھیار ڈالنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ مناسب ہو گا کہ ہم مفصل حالات معلوم کریں" میں نے اس بات سے اتفاق کیا اور ہم دونوں جمعیت کے دفتر پہنچ گئے۔ نماز فجر وہیں ادا کی۔ اس وقت تک ہمارے کئی ذمہ دار ساتھی بھی آگئے تھے انہوں نے بھی اس افواہ کی تصدیق کی اور ہم سب اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے۔ کچھ ساتھیوں کی رائے تھی کہ ہم جہاد کرتے کرتے شہید ہو جائیں، کسی صورت میں بھی ہتھیار نہ ڈالیں۔ مگر زیادہ ساتھیوں کی یہ رائے تھی کہ "ہمیں اپنے سر پلیٹ میں رکھ کر دشمن کے حوالے نہیں کرنے چاہئیں، بلکہ خوب سوچ سمجھ کر ایسا پروگرام بنانا چاہیے کہ دشمن کے خلاف جنگ جاری رکھی جاسکے۔ یہ بات معقول تھی، چنانچہ یہی طریق عمل اختیار کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔

اس فیصلے کے بعد ہم نے جمعیت کے دفتر کا سارا ریکارڈ نذر آتش کر دیا اور تمام البدر کیڈٹس کو ہیڈ کوارٹر میں بلا کر ان سے کہا: "آپ سب لباس تبدیل کر کے ظہر تک مختلف سمتوں میں چلے جائیں اور کوشش کریں کہ دشمن کے ہاتھ آپ تک نہ پہنچ پائیں۔ سب ساتھیوں کو پچاس پچاس روپے زادِ سفر کے طور پر دیئے گئے۔ اس دوران میں

بھارتی طیارے مسلسل بمباری کرتے رہے۔

یہ ایک عجیب ماتمی اجلاس لگ رہا تھا۔ تقریباً ایک ہزار ساتھی اداس کھڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شاید یہ آخری ملاقات ہے۔ رخصت سے قبل سب نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگی اور پھر دو دو چار چار کی ٹولیوں میں رخصت ہونے لگے۔ ہم چار ساتھیوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اکٹھے رہیں گے لیکن ہمارے سامنے ابھی تک منزل نہ تھی۔ آخر میں ایک ساتھی نے کہا: "آپ سب ہمارے گھر کاکسس بازار چلیں۔ وہاں کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیا جائے گا۔"

اس پر اتفاق ہو گیا اور ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ پندرہ دسمبر کی رات تھی اور خاصی ڈراؤنی۔ اب بھارتی طیارے شدت سے بمباری کر رہے تھے۔ محسوس ہوتا تھا صحیح سلامت منزل پر نہ پہنچ سکیں گے، چنانچہ جب بہت زیادہ خطرہ محسوس ہوا تو مشورہ کر کے عوامی لیگ کے ایک حامی محمد احسان کے گھر چلے گئے۔ انہوں نے دیکھا تو بہت حیران ہوئے کہنے لگے۔ "میں تو ہرگز تمہارا دشمن نہیں ہوں، لیکن اور لوگ تمہارے یہاں آنے سے آگاہ ہوں گے، تو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، تاہم اب تو کھانا کھا کر آرام کرو، صبح کوئی تدبیر سوچیں گے۔"

احسان صاحب کی یہ بات سن کر سخت پریشان ہوئے، سوچا یہاں سے چلے جائیں، لیکن اس وقت گھر سے باہر قدم نکالنا جان سے ہاتھ دھونے کے برابر تھا۔ مجبوراً وہیں رک گئے۔

صبح ہوئی تو ہماری مخبری ہو چکی تھی۔ ہم ناشتے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ مکتی باہنی کے رضاکار ہمیں گرفتار کرنے پہنچ گئے اور چاٹگام ریڈیو سے ہمارے نام لے لے کر ہمیں گرفتار کر لینے کی خبریں نشر ہونے لگیں۔

ہم نے سنا کہ باہر احسان صاحب کا مکتی باہنی والوں کے ساتھ سخت جھگڑا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے مکان کی تلاشی دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ جب یہ سلسلہ زیادہ سنگین ہو گیا تو انہوں نے ہم سے کہا۔ "آپ پچھلے دروازے سے نکل جائیں"۔ ہم نے اس مشورے پر

مکمل کیا اور پھولواڑے سے نکل گئے، لیکن یہ کوئی ایسی بات تو نہ تھی کہ ہمیں اطمینان حاصل ہو جاتا، خطرہ تو بدستور ہمارے تعاقب میں تھا۔ احسان کے گھر سے نکل کر ہم ایک خالی مکان میں چلے گئے، اس کا ہندو مالک ہندوستان بھاگ گیا ہوا تھا۔ سارا دن اسی خالی گھر میں چھپے رہے اور جب رات ہوئی تو اپنے ایک ساتھی کے گھر چلے گئے اور اسے اللہ کی خاص عنایت ہی سمجھنا چاہیئے کہ اس ساتھی نے بہت اپنایت کا برتاؤ کیا۔ یہاں تک کہ بھیس بدلوا کر ہمیں چاٹگانگ سے پندرہ میل پیچھے ندی پار کرا کے کاکس بازار کی بس میں سوار کرا دیا اور ہم دوپہر کے وقت بخیریت تمام اپنی منزل پر پہنچ گئے اور اسی دن - - - - - - - - ایک ٹیکسی کرائے پر لے کر دس میل دور ایک گاؤں میں چلے گئے۔ وہاں جماعت اسلامی کے ایک کارکن رہتے تھے۔ وہی ہمارے میزبان بنے۔ انہوں نے اپنے گھر کا پچھلا کمرہ ہمارے لئے مخصوص کر دیا۔ یہاں ہم نے ۲۹ دن قیام کیا۔ سارا دن چھوٹے سے کمرے میں چھپے رہتے۔ ذرا دیر کے لئے رات کے وقت ہوا خوری کے لئے باہر نکلتے۔ گھر والوں کو بھی سخت پریشانی لاحق تھی۔ اس پر ہم نے ہی فیصلہ کیا کہ اب اگلی منزل کی طرف روانہ ہونا چاہیئے، لیکن ہمارے میزبان کی والدہ نے بڑے اصرار سے روکا۔ یہ تجویز ہوئی کہ گھر میں ایک گڑھا کھودا جائے، جس کے اوپر گھاس پھوس ڈال دیا جائے۔ ہوا اور روشنی اس سے اندر جائے گی اور ہم محفوظ طریقے پر اس گڑھے میں دن رات گزارا کریں گے۔ باہر یہ بات مشہور کر دی جائے گی کہ ہم لوگ چلے گئے ہیں کسی کو شک بھی نہ گزرے گا۔

جب یہ بات ہو رہی تھی تو ان کا ایک پوتا گھر میں آیا۔ وہ بس کلینر تھا۔ اس نے یہ باتیں سن کر کہا "دادی اماں میں ان کو برما بھجوا دیتا ہوں۔ یہاں یہ کب تک چھپے رہیں گے"، اس کی بات معقول تھی اس لئے مان لی گئی۔ ہم نے ملاحوں اور مچھیروں کا بھیس بدلا۔ ایک کشتی پر سوار ہوئے اور ٹیکناف سے ہوتے ہوتے برما پہنچ گئے۔

یہاں آئے ڈیڑھ ماہ گزرا تھا کہ ایک ساتھی نے اطلاع دی کہ میرے گاؤں میں والد صاحب کو یہ خبر ملی تھی کہ میں مارا گیا ہوں۔ اس لئے میرا چہلم بھی کر لیا گیا ہے

یہ خبر سن کر میں نے ایک خط والد صاحب کے نام لکھا، مگر اس پر اپنا اتا پتا درج نہیں کیا۔ صرف یہ تحریر کیا کہ "میں زندہ ہوں، آپ مطمئن رہیں"۔

والدہ صاحبہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ مسلسل روتی رہنے کی وجہ سے اُن کی آنکھیں خراب ہوگئیں۔ یہ خبریں سن کر دل اُچاٹ ہوگیا اور دس ماہ برما گزارنے کے بعد والدین سے ملنے کی ٹھانی۔

برما سے واپس کاکس بازار پہنچا، اپنا نام تبدیل کیا۔ ایک ہفتہ یہاں رہ کر اپنے ساتھیوں کی خیریت معلوم کی۔ جن جن ساتھیوں سے رابطہ ہوسکا۔ ان کو اپنی خیریت سے مطلع کیا اور جب اپنے گاؤں جانے کے لیے خلیج بنگال کے راستے ایک بادبانی کشتی پر بیٹھ کر روانہ ہوا تو راستے میں بادبان پھٹ گیا۔ کشتی ڈوبتے ڈوبتے بچی بڑی مشکل سے اسے ساحل کے قریب لایا گیا اور پچاس میل پیدل چل کر رات کو دو بجے کے قریب گھر جا پہنچا۔ سب سے ملاقات کی اور ایک گھنٹہ گھر میں گزار کر ڈھاکے کے لئے نکل کھڑا ہوا، کیونکہ یہاں میرا گرفتار ہونا ایک طرح یقینی تھا۔

یہ عرصہ ڈیڑھ سال پر محیط ہے۔ یہ سارا زمانہ ایک خوفناک خواب لگتا ہے، مگر اس خواب نے زندگی اور بندگی کی حقیقت مجھ پر آشکارا کر دی ہے۔

پہلے میرے بڑے اور پھر چھوٹے بھائی کو شہید کردیا

عبدالسلام (راجشاہی) یونیورسٹی کہتے ہیں کہ ہمارے آپریشن سے مکتی باہنی والے سخت نقصان اٹھا رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جنگ کے آخری دنوں میں مکتی باہنی کے حوصلے ٹوٹتے جا رہے ہیں، کیونکہ بھارتی سپاہی خود آگے بڑھنے کے بجائے مکتی باہنی کو آگے بھیج دیتے تھے اور ادھر پاکستانی فوج اور البدر ان پر کاری ضربیں لگا رہی تھیں۔

مکتی باہنی کے سرکردہ لیڈروں نے مجھے مارنے کا منصوبہ بنایا۔ اتنے میں پاکستانی افواج نے ہتھیار ڈال دیئے، میں ایک ساتھی کے ہمراہ دریائے پدما کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ ہماری کشتی بھارتی سرحد میں داخل ہونے والی تھی کہ مخالف سمت سے دو کشتیاں آتی

نظر آئیں، فرار کے تمام راستے بند تھے۔ میں نے اپنا چہرہ بڑی کامیابی سے چھپا رکھا تھا، لیکن جب کشتیاں قریب سے گزریں تو مکتی باہنی کے ایک کارکن نے مجھے پہچان لیا اور ہم دونوں کو گرفتار کر لیا۔

کشتی سے اتارنے کے بعد خونخوار درندوں نے ہم پر ایک طرح کا عذاب نازل کر دیا کپڑے اتار دیئے گئے اور ننگی پیٹھ پر بلیڈ سے تین زخم لگائے۔ دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں کیلیں ٹھونک دیں اور گرا کر پاؤں کے تلووں پر شدید ضربیں لگائیں۔

دو دن اور رات انہی عذاب میں گزر رہے، پھر چند ہندو لڑکوں نے ہمیں ختم کر دینے کا فیصلہ کیا، لیکن مکتی باہنی کے دو مسلمان کارکنوں نے فوری طور پر ایسا کرنے کی مخالفت کی، چنانچہ رات کے وقت ہم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

ادھر میں کڑی آزمائش سے گزر رہا تھا اور دوسری طرف ہمارے گھر پر قیامت ٹوٹ چکی تھی۔ مکتی باہنی کا ایک گروہ ہمارے گھر پہنچا اور دو بڑے بھائیوں کو گرفتار کر لیا۔ پہلی رات ان سے وہ میرے متعلق پوچھتے رہے، لیکن انہیں تو کچھ خبر ہی نہ تھی، پھر دھمکی دی۔ کل تک عبدالسلام کو ہماری خدمت میں پیش نہ کیا تو تمہیں جان سے مار ڈالیں گے اور پھر صبح کا انتظار کئے بغیر ایک بھائی کو بیدردی سے قتل کر دیا۔

میں چھپتا چھپاتا اپنے گاؤں پہنچا۔ کئی روز سے کچھ نہ کھایا تھا۔ والدہ نے جلد جلد کھانا تیار کیا، مگر اسی وقت اطلاع ملی کہ مکتی باہنی کے غنڈے پکڑنے کے لئے آ رہے ہیں چنانچہ اسی حالت میں کھانا کھائے بغیر عقب سے کودا اور ایک دوسرے گاؤں میں پناہ لی۔ مکتی باہنی کے کارکنوں نے گھر کا محاصرہ کر لیا اور تلاشی لی اور جب مجھ کو نہ پایا، تو غصے سے بے قابو ہو گئے۔

گھر میں میرا چھوٹا بھائی تھا جو چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا، اُسے یہ بھیڑیئے اپنے ساتھ لے گئے اور اُس کے جسم کو کاٹ ڈالا اور شہید کر دیا۔

یہ اندوہناک خبر پہنچی تو مجھے جینے کی کوئی حسرت باقی نہ رہی، مگر خدا سے تعلق نے ایک بار پھر حوصلہ دیا اور چھپ چھپا کر بھارت کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔

کھیتوں کی رکھوالی، تعلیم اور تنظیم

ابوالحسن اقبال (رنگ پور) نے اپنے ہی وطن میں غریب الوطنی کے تلخ ایام کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا: "۴ دسمبر کو پاک فوج نے جنی پور ہاٹ (رنگ پور) کی جانب پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ ہمیں بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ میرے ساتھ خالد صاحب تھے۔ وہ ایک مہینہ قبل گھر سے اجازت لئے بغیر البدر میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے والد صاحب پریشانی میں ہمارے کیمپ میں آتے اور مجھ سے اپنے بیٹے کے بارے میں دریافت کیا۔ کیمپ انچارج سے معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی اسٹین گن لے کر باہر گیا ہے۔ میں نے ان کو کہا کہ اب وہ خالد کے بارے میں بالکل کسی سے بات نہ کریں، کیونکہ مکتی باہنی کے لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ آپ کا بیٹا البدر میں ہے تو وہ آپ کو بھی مار دیں گے۔

پندرہ دسمبر کی رات خالد صاحب واپس آ گئے۔ اگرچہ ہماری عمر اتنی زیادہ نہ تھی، لیکن اتنا فہم ضرور تھا کہ ہمیں اندھے انتقام میں دشمن کے ہاتھوں خواہ مخواہ جان نہیں گنوا دینی چاہیئے۔ اس لئے اسی رات خالی ہاتھ اور خالی جیب، ہم دونوں انجان راستوں کی طرف چل نکلے۔ افراتفری کا عالم تھا۔ بھارتی فوجی بستیوں کو روندتے ہوئے ڈھاکے کی جانب جا رہے تھے۔ مکتی باہنی کے غنڈے محب وطن افراد کا قتل عام کر رہے تھے۔ ہم سہمے ہوئے دعاؤں کے سہارے چل رہے تھے۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہمارے قریبی گاؤں میں مکتی باہنی نے امن کمیٹی کے سربراہ اور ۵۳ محب وطن افراد کو زندہ جلا دیا ہے۔ اس روز ہم اپنے ایک جانے پہچانے بزرگ کے ہاں پہنچے، لیکن اسی لمحے ان کو بھی گھبراہٹ لاحق ہو گئی۔ اس لئے اُن سے کچھ رقم لے کر نکلے، تو چالیس میل دور جا کر ایک گاؤں کی ایک مسجد میں دو دن کے لئے رک گئے۔ یہاں پر ایک چودھری کے کھیتوں کی رکھوالی کے عوض صرف دو وقت کی روٹی پر ملازمت اختیار کر لی۔ اس دوران میں خالد سے الگ راہ لی۔ کیونکہ ہمیں خطرہ ہو گیا تھا۔ اگر دونوں پکڑے گئے تو اکٹھے مارے جائیں گے۔

پڑھنے اور گھر جانے کو بہت جی چاہتا تھا، مگر جانا موت کو دعوت دینے کے

برابر تھا اور دوسری جانب اسکول کا سرٹیفکیٹ بھی نہ تھا اس لیئے یہ سوچا کہ کسی دوسری جگہ ملازمت کی جائے، پیسہ پیسہ کر کے رقم بھی اکٹھی کی اور اس دوران میں کتابیں بھی پڑھیں۔ اس کوشش میں قریبی قصبے میں کپڑے استری کرنے کی دکان پر ملازم ہو گیا اور اسکول کی کلاس نہم میں ٹیسٹ دینے پر داخل ہو گیا۔ سقوط کے وقت میں کالج میں سال اول کا طالب علم تھا، اگلے سال میٹرک فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ یہاں پر جمعیت تو نہیں تھی دین کا نام موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ البتہ بھائی چارے کی بنیاد پر ایک تنظیم قائم کی۔ بعد میں یہ لوگ تحریک اسلامی کے رکن بنے، اور چار سال بعد میں اپنے گھرانے کی پوزیشن میں ہوا۔

جنگل کے کیڑے کاٹ رہے تھے اور دشمن سر پر تھا

رکن الاسلام دجال پور، بتاتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد میں ڈھاکہ سے نکلا اور آٹھ میل دور اپنی ہمشیرہ کے گھر پہنچا۔ جہاں میرے بہنوئی مکتی باہنی کے فعال لیڈر تھے۔ ہمشیرہ نے مشورہ دیا کہ میں چلا جاؤں۔ اب کچھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اس دوران چلتے چلتے مجھے گمان گزرا کہ مکتی باہنی والے میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ اس لئے رات کے وقت بھاگتے بھاگتے ایک دریائی جنگل کے بیچوں بیچ گھس گیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں پانی لبالب بھرا ہوا تھا، میں بلا خوف و خطر اس میں اتر گیا۔ یہ خوش قسمتی تھی کہ کوئی میرے تعاقب میں وہاں نہ پہنچا۔ آدھ گھنٹہ اس یخ بستہ، کیچڑ آلود گڑھے میں رہنے کے بعد نکلا اور نسبتاً دوسرے خشک گڑھے میں جا بیٹھا، ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا وہاں چھوٹے چھوٹے کیڑوں مکوڑوں نے میرے جسم پر حملہ کر دیا اور اگلے ہی لمحے جنگل کے اس حصے میں کچھ لوگوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ رات حشرات الارض کے سنگ گزری، صبح ہوئی تو خطرہ ٹل گیا تھا، مگر میرا جسم کیڑوں کی ستم رانی کے سبب خون آلود اور سوجا ہوا تھا اور میں بخار میں پھنک رہا تھا۔ ان کیڑوں کے کاٹنے کے داغ آج تک میرے جسم پر موجود ہیں۔

صبح بھوک نے ستایا تو وہاں موجود جڑی بوٹیوں کے کڑوے کسیلے اور بدذائقہ پتوں کو چباتا رہا۔ معلوم نہیں کس جڑی بوٹی میں ان کیڑوں کے زہر کا تریاق تھا کہ عصر کے وقت تک میری طبیعت ہشاش بشاش ہو چکی تھی۔ میں نے اس جنگل میں روشنی اور انسانی آواز سے محروم آٹھ روز گزارے۔ یہی گھاس پھونس میرے لئے من وسلویٰ سے کم نہ تھے۔ تب اندازہ ہوا کہ یہ گھاس، یہ پتے اور گڑھوں میں کھڑا پانی بھی خدا کی نعمتوں اور نشانیوں میں سے ہیں۔

بہرکیف نویں روز جنگل سے نکلا اور رنگ پور کی جانب روانہ ہوا۔ داڑھی بڑھ چکی تھی، کپڑے پھٹ چکے تھے، فقیروں کا سا حلیہ آپ سے آپ بن چکا تھا۔ یہاں دو دن رہا، پھر بوگرہ کی جانب چل نکلا۔ یہاں تبلیغی جماعت کے قافلے میں شریک ہو کر چالیس روزہ تبلیغ کی چلے کے دوران میں ایک شریف النفس انسان نے مجھے اپنے کھانے میں شریک کر لیا۔ یہاں سے فرید پور آیا۔ چالیس روز بعد ایک سائیکل رکشا والے سے ملاقات کی ہفتہ بھر اس سے ایک وقت کی روٹی کا معاوضہ لیا۔ یہ اس کا احسان تھا کہ مجھ پر اعتبار کر کے رکشا چلانے کی اجازت دے دی۔ پھر اسی ملازمت کے دوران میں مجھے البدر کے پانچ ساتھیوں کا سراغ ملا، ہم آپس میں ملتے رہے، قرآن کے اجتماعی مطالعے کا حلقہ قائم کیا۔ پانچ ماہ تک اکٹھے رہے اور اللہ تعالیٰ ہمیں روشنی دیتا رہا۔

تذکرۂ شہدا

شہید محمد عبدالمالک[1]

ایوب خان کے دس سالہ آمرانہ دورِ حکومت کے خلاف ملک بھر کے دین پسند طلبہ کی منظم تحریک کے دوران میں اسلامی بنیادوں پر نظامِ تعلیم کی تشکیلِ جدید کا مطالبہ اپنی وسعت اور شدت کے اعتبار سے ایک ایسے بنیادی مطالبہ کی شکل اختیار کر گیا تھا جسے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو برسرِ اقتدار آنے والے نئے فوجی آمر یحییٰ خان کے لئے نظر انداز کرنا مشکل ہوگیا۔ چنانچہ طلبہ کے دباؤ کے سامنے جھکتے ہوئے نئی حکومت کو از سرِ نو تعلیمی پالیسی تشکیل دینے کا اعلان کرنا پڑا اور بالآخر مرکز کی جانب سے ۳ جولائی ۱۹۶۹ء کو ایئر مارشل نور خان نے نئی تعلیمی پالیسی پیش کر دی جس میں قیامِ پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ اس بات کا کھل کر اعتراف کیا گیا تھا کہ ــــــ "پاکستان کا نظامِ تعلیم قومی اور دینی بنیادوں پر ہی استوار کیا جانا چاہیئے ــــــ" یہ تجویز بالخصوص مشرقی پاکستان کی ہندو نواز اور اشتراکی لابی پر بجلی بن کر گری اور ان گروہوں نے فی الفور ــــــ "پاکستان کا نظامِ تعلیم لادینی ہونا چاہیئے" کا مطالبہ فضا میں اچھال دیا۔ ابتداً یہ مطالبہ اخباری بیانات اور مضامین تک محدود رہا، لیکن پھر اس بحث کو ایک متعین رُخ دینے کے لئے "نیپا" (National Institute of Public Administration) کی ڈھاکہ شاخ نے ۲ر اگست کو "نظامِ تعلیم دینی یا لادینی؟" پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا۔ جس میں مختلف

---

[1] محمد عبدالمالک کی شہادت ۱۹۷۱ء سے ڈیڑھ سال قبل ہوئی تھی چونکہ اسی مقصد کے لئے یہ شہادت ہوئی تھی، جس مقصد کے لئے "البدر" نے قربانیاں پیش کیں۔ اس حوالے سے عبدالمالک، ان شہیدانِ محبت کے امام اور قائد کے طور پر ابھرتے ہیں۔

مکاتب فکر کے دانشوروں اور طلبہ نمائندوں کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ جمعیت کی نمائندگی اسلامی جمعیت طلبہ ڈھاکہ کے ناظم محمد عبدالمالک نے کی (ان کی تقریر کا مکمل متن آخر میں ضمیمے کے طور پر دیا جا رہا ہے) سیمینار کے اختتام پر جب قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو بڑی اکثریت نے "نظام تعلیم دینی ہونا چاہیئے" کے حق میں رائے دی۔ یہ قرارداد درحقیقت محمد عبدالمالک کی کوششوں کا ثمر اور پاکستان میں دینی اساس کی علمبردار قوتوں کی فتح تھی" (دی مسلم "لندن جلد ۷ شمارہ ۱)

لادینی قوتوں نے اس قرارداد کی منظوری کو اپنے لئے چیلنج سمجھا اور رائے عامہ کے اس فورم کی قرارداد کا اثر زائل کرنے کے لئے "ڈھاکہ یونیورسٹی سنٹرل اسٹوڈنٹس یونین" نے ۱۲ راگست کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے ٹیچرز اسٹوڈنٹس سنٹر میں اسی موضوع پر مذاکرے کا اعلان کر دیا۔ اس یونین پر اسٹوڈنٹس لیگ اور چھاترو یونین کا قبضہ تھا چنانچہ یونین کے کارپردازان نے ان دو تنظیموں کے علاوہ کسی اور تنظیم کو مدعو نہ کیا جو صریحاً غیر جمہوری حرکت تھی۔ . . . چونکہ ڈھاکہ یونیورسٹی مشرقی پاکستان کی سیاست کے رجحانات کی آئینہ دار سمجھی جاتی تھی اور یہاں کئے جانے والے فیصلے ملکی سیاست پر اثر انداز ہوتے تھے اس لئے محمد عبدالمالک نے ڈھاکہ جمعیت کے تمام کارکنان کو ہدایت کی کہ وہ یونین کے اس پروگرام میں بہرصورت شریک ہوں۔ تاکہ وہاں اپنا موقف ریکارڈ کرا سکیں۔

۱۲ راگست کی صبح ۹ بجے مذاکرے کا آغاز ہوا۔ ہال میں ایک بڑی تعداد بائیں بازو کے حامی مزدوروں اور سیاسی کارکنوں کی بھی موجود تھی، جنہیں "بطور خاص" مدعو کیا گیا تھا۔ کارروائی کے آغاز پر سیکرٹری نے اعلان کیا کہ آج کے اس مذاکرے سے صرف چھاترو یونین اور اسٹوڈنٹس لیگ کے نمائندے خطاب کریں گے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کو دعوت خطاب نہیں دی جائے گی (ہفت روزہ "ہالی ڈے" ڈھاکہ ۲۷ راگست ۱۹۶۹ء) عبدالمالک جو اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ کھڑے ہو کر صدر جلسہ سے مخاطب ہوئے اور کہا: "جناب صدر! یہ مذاکرہ کسی تنظیم کا نہیں، بلکہ ڈھاکہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کا ہے اس لئے طلبہ کی تمام تنظیموں کو اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت دی جائے یا پھر حاضرین میں سے جو بھی اس موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہے اسے اجازت دی جائے۔

اس پر یونین کے نائب صدر شمس الضحیٰ تڑپ کر اٹھے اور انتہائی جذباتی انداز میں یہ تجویز

رد کرتے ہوئے صدارتی رولنگ دی "ہم ملک میں لادینی نظام تعلیم چاہتے ہیں۔ بنگالی طلبہ اسلامیات کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمیں عربی نہیں چاہیئے"۔ ابھی صدر جلسہ کے الفاظ فضا میں تحلیل نہ ہوئے تھے کہ پچھلی نشستوں پر عربی مدرسہ عالیہ کے ایک طالب علم نے زوردار آواز میں کہا "یہ بات غلط ہے۔۔۔" عبدالمالک فوراً اپنی نشست سے اٹھے تاکہ سٹیج پر جا کر ہنگامہ پرور فضا کو پرسکون کرنے میں مدد دیں۔ سٹیج کی جانب بڑھتے دیکھ کر مخالفین نے انہیں دھکا دے کر گرا دیا۔ یہ دیکھ کر جمعیت کے کارکن سٹیج کی جانب لپکے تو عبدالمالک نے تقریباً چیختے ہوئے حکم دیا "خبردار آپ آگے مت بڑھیں"۔ اس طرح ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ عبدالمالک سنبھل کر کھڑے ہوئے اور یونین کے نائب صدر سے پھر درخواست کی "چونکہ یہ آپ کی تنظیم کا نہیں، یونین کا فنکشن ہے اس لئے آپ دوسروں کو اپنی بات کہنے کا موقع دیں"

عبدالمالک نے مزید کہا "آپ لادینیت کے حق میں دس تقریریں کریں، لیکن دینی نقطہ نظر سے صرف ایک تقریر کا موقع دیں اور پھر قرارداد پر رائے شماری کرالیں"۔ اس پر شمس الضحیٰ پھر چنگھاڑا "یہاں کوئی دین وین نہیں ہے۔ اس ملک میں صرف سیکولرازم کی بات چلے گی یا سوشلزم کی" اس پر عبدالمالک نے بآواز بلند کہا "یہ ہمارے دل کی آواز نہیں ہے۔ اسی اثناء میں سٹیج پر کھڑے ایک طالب علم نے مائک اٹھا کر عبدالمالک کے سر پر دے مارا۔ ہنگامہ شروع ہوگیا۔ اسٹوڈنٹس لیگ اور چھاترو یونین والے ہال سے نکل بھاگے اور عبدالمالک اور تقریباً ۲۰ زخمی کارکن ہال میں کھڑے رہ گئے۔ عبدالمالک کی چھٹی حس نے فوراً خطرہ بھانپ لیا اور ساتھیوں سے کہا "فوراً ہال سے نکل جائیے"۔ ان کا خدشہ درست تھا۔ مخالفین ہال کے باہر والے گیٹ کو تالا لگا رہے تھے۔ تالے کو چھیننے کی کوشش میں جمعیت کے رکن عبدالخالق لہولہان ہو گئے عبدالمالک نے شمس الحق کو پبلک لائبریری کی طرف جانے کی ہدایت کی جو دو تین ساتھیوں کے ہمراہ کرزن ہال کی طرف چلے گئے۔ عبدالمالک ایک ایک کارکن کو ٹیچرز، اسٹوڈنٹس سنٹر سے باہر بھجوانے کے بعد ریس کورس گراؤنڈ کی جانب نکل گئے۔ یہ گراؤنڈ یونیورسٹی سے بالکل متصل ہے وہ ابھی ریس کورس گراؤنڈ پار کرنے نہیں پائے تھے کہ جگن ناتھ ہاسٹل سے ہندو اور اشتراکی طلبہ

دوڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان طلبہ نے لوہے کی سلاخیں اور لاٹھیاں اٹھا رکھی تھیں۔ فاصلہ بہت کم تھا اور عبدالمالک بالکل خالی ہاتھ تھے۔ ان ظالموں نے آتے ہی عبدالمالک پر لاٹھیوں اور سلاخوں کی بارش کر دی۔ عبدالمالک کے سر پر لوہے کی سلاخ سے کاری ضرب آئی اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑے، عبدالمالک کے واحد ساتھی محمد ادریس (ناظم جمعیت طلبہ عربیہ ڈھاکہ) بھی شدید زخمی ہوئے۔ اس حملے کی تصویریں قریب سے گزرتے ہوئے "پاکستان آبزرور" کے فوٹوگرافر نے بنائیں جن میں قاتلوں کے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ عبدالمالک کا خون بہتا رہا اور مارشل لاء شل ہو گیا۔ عبدالمالک کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ ہسپتال کے جس وارڈ میں ان کو لے جایا گیا وہاں کا نگران ڈاکٹر زمانۂ طالب علمی میں اسٹوڈنٹس لیگ کا لیڈر رہ چکا تھا اس نے عبدالمالک کو دیکھا تو حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "LET HIM DIE" (اسے مرنے دو) ("زندگی" لاہور جلد ۸، شمارہ ۹) اور محمد عبدالمالک نے ۱۵ اگست ۱۹۶۹ء کی شام پانچ بج کر پچاس منٹ پر اس دنیائے فانی میں آخری سانس لیا اور اسلامی نظام تعلیم کے حق میں شہادت دیتے ہوئے عالم جاودانی میں جا پہنچے۔

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریری
کہ ایں مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیری

مارشل لاء انتظامیہ نے دو گھنٹے تاخیر سے ان کی شہادت کا اعلان کیا اور جمعیت کے کارکنوں کو نماز جنازہ ادا کرنے کی اجازت نہ دی۔ عبدالمالکؒ کی میت فوجی ایمبولینس میں مسلح فوجی گاڑیوں کے درمیان بوگرہ کی طرف لے جائی جانے لگی تو جمعیت کے سینکڑوں کارکن ان گاڑیوں کے آگے لیٹ گئے اور کہا: "نماز جنازہ پڑھے بغیر ہرگز نہ جانے دیں گے۔" آخر مارشل لاء حکام کو اجازت دینا پڑی نماز جنازہ مولانا سید مصطفٰے المدنیؒ (انہیں بھی ۱۹۷۱ء میں مکتی باہنی نے شہید کر دیا) نے پڑھائی۔ مولاناؒ کی عمر ستر برس سے متجاوز تھی وہ جنازے کے آگے آگے چلتے ہوئے اپنا عصا فضا میں بلند کر کے بھرائی ہوئی آواز میں بار بار کہتے،

"لوگو! دیکھو، تمہارے شہر میں اسلام کا بیٹا شہید ہو گیا۔"
"لوگو! دیکھو، تمہارے شہر میں اسلام کا بیٹا شہید ہو گیا۔"

نماز جنازہ میں ہزاروں شہریوں نے شرکت کی۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، پروفیسر غلام اعظم، خرم جاہ مراد اور مولانا عبدالرحیم اپنی سسکیوں پر قابو نہ پا رہے تھے اور کارکنوں کی حالت دیکھ کر رقت طاری ہوتی تھی

عبدالمالک کی شہادت پر قانون کے حرکت میں نہ آنے پر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے فرمایا۔

"میں یہ بات بالکل بے لاگ طریقہ سے واضح کئے دیتا ہوں کہ جو لوگ پاکستان میں اسلام اور اس کے نظام زندگی کی حمایت کے لئے اٹھے ہیں، انہوں نے اپنا کام نہ پہلے کبھی کسی حکومت کے بھروسے پر کیا ہے، نہ آج وہ خدا کے سوا کسی اور پر بھروسہ رکھتے ہیں حکومت خواہ کچھ کرے انہیں اپنے مقصد کے لئے بہرحال جان و مال کی بازی لگانی ہے اور ہر اس قوت سے لڑ جانا ہے جو یہاں اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام لانا چاہے۔ عبدالمالکؒ کی شہادت اس راہ میں پہلی شہادت تو ہو سکتی ہے، مگر یہ آخری شہادت نہیں ہے۔" (ہفت روزہ "آئین" لاہور۔ ۲۹ راگست ۱۹۶۹ء)

عبدالمالکؒ کی شہادت پاکستان میں اسلام کے نام لیواؤں اور پاکستان کی محبت کے دعویداروں کو ہوا کا رُخ بتلانے کے لئے کافی تھی، لیکن جس طرح ایک فالج زدہ جسم ہر قسم کے احساس سے عاری ہو جاتا ہے اس طرح اسلام اور پاکستان کی محبت کی دعویدار سیاسی جماعتیں گویا سُن ہو کر رہ گئی تھیں۔ عبدالمالکؒ کی شہادت ان کی فکر اور ان کے قلوب میں ارتعاش پیدا نہ کر سکی اور نتیجتہً صرف ڈیڑھ سال بعد وہ خونی طوفان آیا جس نے نہ صرف لاکھوں معصوم اور محبِ وطن لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، بلکہ آدھا پاکستان بھی اس میں ڈوب گیا۔

عبدالمالک شہید کا تعلق[1] مشرقی پاکستان کے ضلع بوگرہ کے ایک گاؤں سے تھا۔ ان کے

---

[1] محمد عبدالمالک کے والد ماجد کا نام محمد علی تھا۔ عبدالمالک ۱۹۴۷ء۔ کھوشیا باڑی تھانہ دھنور (قاضی پور) میں پیدا ہوئے ——— ۱۹۶۱ء میں مڈل کیا۔ ۱۹۶۳ء میں بوگرہ ڈسٹرکٹ ہائی سکول سے میٹرک کیا، بورڈ میں دسویں پوزیشن تھی۔ ۱۹۶۵ء میں گورنمنٹ کالج راجشاہی سے ایف ایس سی، ان میڈیکل چوتھی پوزیشن میں پاس کیا۔

والد گرامی انتقال کر چکے تھے۔ اسکول ہی کے زمانہ میں اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ ہوئے۔ وہ ۱۳ مئی ۱۹۶۶ء کو جمعیت کے امیدوار رکنیت بنے اور ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء کو سید منور حسن صاحب، ناظم اعلیٰ نے ان کی رکنیت منظور کی۔ وہ شہادت کے وقت ڈھاکہ یونیورسٹی میں حیاتیاتی کیمیا (Bio Chemistry) آنرز کے طالب علم اسلامی جمعیت طلبہ ڈھاکہ کے ناظم (President) اور اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کی کل پاکستان مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔

شمس الحق سابق ناظم اسلامی جمعیت طلبہ ڈھاکہ نے عبدالمالک شہید کی زندگی کے چند واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا:

"عبدالمالک شہید کی زندگی کا ہر ہر گوشہ اپنے اندر حیرت انگیز جذبوں کے بے شمار نمونے رکھتا ہے۔ ایک روز بارش کے سبب راستے بری طرح کیچڑ سے اٹے پڑے تھے کہ قطعی غیر متوقع طور پر وہ اچانک میرے گھر پہنچے۔ سلام دعا کے بعد دھیمے لہجے میں معلوم کیا "یہاں جمعیت کے کون کون سے کارکن رہتے ہیں؟" پھر ان کی اور میری پڑھائی کے بارے میں پوچھا، عالی حالت کے بارے میں دریافت کیا۔ کارکنوں کی تحریکی طور پر کیا کیفیت ہے؟ مطالعہ لٹریچر ہم میں سے کون کیا کر رہا ہے؟ ہم لوگ توسیع دعوت کا کام کیسے کر رہے ہیں؟ نمازوں کا کیا حال ہے؟ نوافل کا اہتمام کس قدر کیا جا رہا ہے؟ اعانت کتنے عرصے کے بعد دی جاتی ہے؟" یہ اور ایسے ہی چند سوالات پوچھنے کے بعد کہنے لگے۔ "اب میں اگلے حلقے میں جا رہا ہوں" میں نے پوچھا۔ اچانک آئے اور فوراً چلے گئے۔ یہ کیا بات ہوئی؟ کہنے لگے کل رات خیال آیا کہ بہت دن گزر گئے ہیں کیوں نہ آپ کے ہاں ساتھیوں کی عافیت معلوم کر لی جائے پھر دو دن سے آپ دفتر بھی نہ آئے تھے سوچا کہ خدانخواستہ آپ کی طبیعت خراب ہو۔" میں سوچتا ہی رہ گیا کہ ڈھاکہ جیسے بڑے شہر کا ناظم کس طرح ایک ایک کارکن کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لئے بے تاب ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ابھی رفیق بھی نہیں بنا تھا۔ اسی لئے میں عبدالمالک شہید کو "ڈسپلن" کا ہی نہیں بلکہ "رفاقت" کا ناظم کہتا ہوں۔ ان کے اس رویہ سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ اگلے ہی روز میں نے رفاقت کا فارم پُر کر دیا۔ فارم لینے کے بعد کہنے لگے۔ "اب آپ رفیق بن گئے ہیں۔ پندرہ روز بعد انفرادی رپورٹ پیش کرنا نہ بھولئے گا۔" میں دو روز بعد ہی ایک کاغذ پر اپنی

رپورٹ لکھ کر لے آیا۔ کہنے لگے: "رپورٹ ۱۵ روز بعد ہی لایئے گا۔ البتہ ممکن ہو تو دفتر کا روزانہ ایک چکر لگا لیا کریں"۔ تین ماہ گزرے ہوں گے۔ کہنے لگے "رکنیت کی درخواست دیجئے۔ میں نے کہا "رکنیت کے لیے جس لیاقت اور قابلیت کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں ہے"۔ کہنے لگے "وہ تو آپ میں موجود ہے۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں خلوص مقبول ہے اور اس کی نظر میں یہی اصل معیار ہے"۔ آخر درخواست رکنیت پُر کرائی۔ پندرہ بیس دن کے بعد ناظم اعلیٰ ڈاکٹر محمد کمال دورہ پر آئے تو ان سے میری ملاقات کرائی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد میں رکن بن گیا۔

ایک دن اجتماع ارکان رات دیر گئے تک جاری رہا۔ ہم سب بُری طرح تھکے ہوئے تھے میرا گھر ذرا دور تھا عبدالمالک کہنے لگے "آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں ان کے ہمراہ ڈھاکہ یونیورسٹی ہاسٹل آ گیا اور ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے ان کے بستر پر لیٹ گیا اور وہ کرسی پر بیٹھ کر ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے کیونکہ دوسرے روز ۱ بجے صبح امیدواران رکنیت کا ایک خصوصی اجلاس تھا جس میں انہیں اسلام کی معاشی حکمت عمل پر لیکچر دینا تھا۔ میری آنکھ لگ گئی۔ صبح کی اذان ہوئی تو آنکھ کھل میں یہ دیکھ کر لرز اٹھا کہ عبدالمالک شہید کے چہرے پر کھلی کتاب پڑی ہوئی ہے اور وہ کرسی پر ہی سو رہے ہیں۔ میں نے ان کو اٹھایا اور معافی مانگی وہ کہنے لگے "یہ کون سی بات ہے جس پر آپ اس قدر پریشان ہو گئے ہیں"۔

شمس الحق نے کہا "اسی طرح ایک اور اہم واقعہ یاد آ رہا ہے وہ یہ کہ ڈھاکہ پلٹن میدان میں چودھری محمد علیؒ صاحب کے زیر صدارت نظام اسلام پارٹی کا جلسہ ہونا تھا شہر میں افواہ گرم تھی کہ عوامی لیگی جلسہ کو الٹ دیں گے۔ اس پر عبدالمالک شہید نے جمعیت کے کارکنوں کو طلب کیا اور کہا "ہم نے اس جلسے کو کامیاب کرانے کی کوشش کرنا ہے"۔ چودھری صاحب کی آمد سے کچھ دیر پہلے عوامی لیگیوں اور ہندوؤں نے جلسہ گاہ پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ عبدالمالک آگے بڑھے تو ایک پتھر ان کی پیشانی پر آ لگا اور لہو بہنے لگا۔ لیکن ان کے ہمراہ بہت سے نوجوانوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو غنڈے فرار ہو گئے۔ جلسہ ہوا اور پھر جمعیت کے کارکنوں نے چودھری صاحب کو ان کی رہائش گاہ تک بحفاظت پہنچایا۔ بعد میں میں نے عبدالمالک شہید سے کہا کہ "ہمیں اس پارٹی کے جلسے کو بچانے اور زخمی ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کوئی تحریک اسلامی کا جلسہ تو نہ تھا کہ اس قدر جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے"۔ اس پر انہوں

سے فرمایا "صرف تحریک اسلامی ہی تو اسلام کا کام نہیں کر رہی ہے ، جب کبھی بھی دشمن کسی دینی گروہ کے سامنے رکاوٹ کھڑی کرے تو یہ ہمارا ایمانی تقاضا ہے کہ دشمن کا مقابلہ کریں" اسی طرح ان مذہبی پارٹیوں تک کے جلسوں اور جلوسوں میں بھی اہتمام سے پوری طرح دلچسپی لیتے جو ہمارے خلاف فتوے دیتی تھیں۔ عبدالمالک خود ان جلوسوں میں شریک ہوتے اور ساتھیوں کو بھی شرکت کی ترغیب دیتے (حکم نہیں دیتے تھے بس ترغیب دلاتے تھے) ایک مرتبہ میرے ایسے ہی سوال پر وہ کہنے لگے "بھائی اگر ایسی پارٹیوں کے جلوس بڑے ہوں گے تو دشمن اسلام کی قوت سے مرعوب ہوگا۔ پھر ان جلوسوں میں ہماری شرکت سے آپس میں پیدا ہونے والی بے جا نفرت بھی تو دور ہو گی"۔ عبدالمالک کی اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ تحریک اسلامی کے نعرے یہاں مشرقی پاکستان کی دینی اور محب وطن سیاسی پارٹیوں کے نعرے بن گئے اور ہمارے مطالبے دینی پارٹیوں کے مطالبے بن گئے۔

شمس الحق نے بتایا "عبدالمالک شہید کی معاشی حالت بڑی کمزور تھی۔ چونکہ والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے بہن بھائیوں کی کفالت اور اپنے خرچ کے لئے ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ اس طرح ماہانہ آمدنی نوے روپے ہو جاتی تھی۔ ۶۰ روپے وہ گھر بھیج دیتے اور ۳۰ روپے میں خود گزارا کرتے۔ عموماً پیدل سفر کرتے تھے ایک دفعہ ہمیں کہنے لگے "رکشا پر کم سفر کرنا چاہیئے۔ اس سے جو پیسے بچ جائیں۔ ان کا اچھا کھانا کھا لینا چاہیئے، پھر پیدل سفر کرنے سے صحت بھی اچھی رہتی ہے ، آدمی محنت کا عادی ہو جاتا ہے اور تحریک اسلامی کو ایک ان تھک کارکن ملتا ہے"۔ یہ باتیں وہ بڑے لطیف پیرائے میں بیان کرتے۔

قمرالزمان (مومن شاہی) نے بتایا " فروری ۱۹۶۹ء میں عبدالمالک رات کے پچھلے پہر جمالپور پہنچے۔ سردی شدید تھی اور انہوں نے صرف ململ کا کرتہ اور پاجامہ پہن رکھا تھا اور ایک ہلکی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میرے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر انہیں اچانک خیال آیا کہ دروازہ کھٹکھٹایا تو میرے ہم کمرہ کو زحمت ہو گی اس لئے باہر ہی کھڑے رہے۔ جب میں فجر کے لئے اٹھا تو دروازہ پہ عبدالمالک کو کھڑے پایا۔ میں نے پوچھا کب پہنچے۔ کہنے لگے فلاں گاڑی سے پہنچا ہوں۔ میں نے کہا گاڑی کو آئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ اتنی دیر آپ کہاں رہے۔ وہ جھینپ سے گئے اور کہنے لگے بس یہیں گزارا دیا۔ میں حیران رہ گیا کہ اس سردی میں یہاں کس طرح کھڑے رہے۔ میں نے اصرار کیا کہ ذرا دیر سو لیں مگر وہ نماز فجر پڑھنے کے فوراً بعد واپسی پر مصر تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جس کام کے لئے

آئے ہیں پہلے وہ کرلیں۔ دراصل انہیں جمعیت کے ایک پروگرام میں خطاب کرنا تھا۔ خطاب کے بعد تنگائل کی طرف جانے والی گاڑی کو کارکنوں نے روک لیا تاکہ وہ اسٹیشن پر جانے کی تکلیف سے بچ جائیں۔ لیکن عبدالمالک نے انکار کر دیا اور کہا جہاں اس کا اسٹاپ ہے وہ وہیں جاکر اس میں سوار ہوں گے اور آئندہ اس قسم کی حرکت سے احتراز کیا جائے۔ ان دو واقعات نے عبدالمالک کی عظمت کا نقش میری روح میں پیوست کر دیا۔

مطیع الرحمان نظامی نے بتایا عبدالمالک اپنی غربت کے باعث کپڑے خود دھوتے اور استری سے بے نیاز لباس پہنتے تھے۔ داڑھی کئی کئی ہفتے خط بنوانے کو ترستی۔ ڈھاکہ جمعیت کے ناظم بننے کے بعد بھی ان کی یہی کیفیت رہی۔ کبھی کوئی کارکن ان کی توجہ اس جانب دلاتا تو وہ کہہ دیتے یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ ایک مرتبہ اجتماع ارکان میں یہی مسئلہ سامنے آیا تو انہوں نے وہی جواب دہرا دیا۔ اس پر ایک رکن نے کہا" جناب! یہ آپ کا ذاتی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ڈھاکہ جمعیت کا مسئلہ ہے۔" اس کے بعد عبدالمالک استری کئے ہوئے کپڑے پہننے لگے اور ہفتہ میں ایک مرتبہ خط بھی ضرور بنواتے۔

سید منور حسن (سابق ناظم اعلیٰ) نے عبدالمالک شہید سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ طویل انفرادی ملاقات مجھے اب تک یاد ہے جو کیفیت امیدوار رکنیت انہوں نے مجھ سے کی تھی۔ ڈھاکہ انجینئرنگ یونیورسٹی کا کوئی ہال تھا۔ شاید دو گھنٹہ یہ گفتگو ہوتی رہی۔ غائبانہ طور پر مجھے یہ معلوم تھا کہ عبدالمالک بہت ذہین طلبہ میں سے ہیں اور تحریک و جمعیت کے مستقبل کے لئے قیمتی سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ملاقات اور تبادلۂ خیال سے ان کی ذہانت، مطالعہ کی وسعت اور عملی مسائل میں اسلام سے رہنمائی لینے اور سنت کی پابندی کے شوق کا اندازہ ہوا۔ عبدالمالک اردو بالکل نہ بول سکتے تھے۔ لہٰذا گفتگو انگریزی میں کرتے رہے جس میں مافی الضمیر کی ادائیگی زیادہ مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن مجھے احساس ہوا کہ دل کی زبان سے بول رہے ہیں۔ دل کے تاروں کو چھیڑ رہے ہیں اور دل میں اپنے لئے جگہ بناتے جا رہے ہیں۔ اس قدر مربوط ذہن کم لوگوں کا ہوتا ہے اور اس عمر میں اس طوالت کے ساتھ سنجیدہ اور ٹھوس گفتگو کرنا امر محال ہوتا ہے۔ لیکن عبدالمالک یہ تھکا دینے والا کام کرتے رہے۔"

مطیع الرحمان نظامی (سابق ناظم اعلیٰ) نے عبدالمالک سے اپنی رفاقت کے لمحوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا" عبدالمالک شہید درحقیقت سارا کام ہی تحریک کے لئے کرتے تھے وہ جس طرح محنت کرتے تھے جس طرح مطالعہ کرتے تھے وہ ایک مثالی زندگی تھی۔ ان کی زندگی بہت سادہ تھی اپنے ساتھیوں کے لئے وہ ایثار بھی بہت کرتے۔ بات ایک دو لمحے کی نہیں، ان سے میری روز ہی میل ملاقات ہوتی تھی۔ یونیورسٹی میں ان کی پہلی ملاقات سے لے کر ان کی شہادت تک، ان کی تحریکی زندگی کے تمام مراحل میرے سامنے طے ہوتے۔ اس میں پہلا تجربہ جو ہوا تھا ان کے ذمہ سب سے پہلے اعانت جمع کرنا لگایا جسے انہوں نے بڑی محنت سے اکٹھا کیا اور اس کا ہر ماہ حساب کتاب رکھنا، اخراجات کی تفصیلات رکھنا ایک نمونہ ہوتا تھا۔ جمعیت نے ان سے دو دفعہ متاثرین سیلاب کے ریلیف کا کام لیا۔ ایک دفعہ انہوں نے ڈیڑھ ماہ تک یہ ذمہ داری نبھائی۔ وہ تقریباً ۵۰ کارکنان کو لے کر ڈھاکہ سے دور ایک لیبر ایریا میں جاتے تھے اور رات کو واپس آتے تھے۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ وہ میز پر بیٹھ کر کام کرتے تھے، بلکہ ہر کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک قائد اور عملی کارکن تھے۔ پھر ۱۹۶۹ء کی تحریک جمہوریت کو منظم کرنے میں بھی وہ سرگرم تھے۔ وہ محض سرکلر لکھ کر نہیں بیٹھ رہتے تھے، بلکہ خود گھوم پھر کر نگرانی کرتے اور رہنمائی دیتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ عام طور پر میدان میں کام کرتے ہیں۔ وہ لکھنے پڑھنے یا تحریکی لٹریچر کے مطالعہ کی طرف کم ہی دھیان دیتے ہیں۔ مگر اس معاملے میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے وہ وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا ڈھنگ خوب جانتے تھے اس اعتبار سے میں نے کسی اور کو ان کا ثانی نہیں دیکھا۔

۱۹۶۸ء جمعیت کے ۱۷ویں سالانہ اجتماع میں شرکت کے لئے ڈھاکہ سے کراچی رہے تھے۔ ہوائی جہاز میں اخبارات وغیرہ پڑھنے کے لئے ملتے ہیں تو میں نے دیکھا وہ اس سے بھی نوٹس لے رہے تھے۔ جب تحریک جمہوریت (۶۹-۱۹۶۸ء) چل رہی تھی تو ان ایام میں بھی جب کبھی ہم لائبریری جاتے تو وہ وقت نکال کر نوٹس لے رہے ہوتے تھے۔ اس طریقہ سے ان کی محنت بھی نمونہ تھی اور سرگرمی بھی نمونہ تھی اور ساتھیوں سے برتاؤ بھی اپنی مثال آپ تھا۔

عبدالمالک جب شوریٰ کے اجلاس میں بیٹھتے تو ہر نکتہ پر ذمہ دارانہ گفتگو کرتے اور اپنی

بے لاگ رائے کا حق ادا کر دیتے تھے۔ ایسا نہیں کہ محض بات کرنے کی خاطر بات کرتے تھے، بلکہ پوری تیاری اور سوچ سمجھ کر بات کرتے تھے وہ دستور جمعیت کے اس حلف پر ہمیشہ عمل پیرا رہتے کہ میں ہر معاملے میں جمعیت کے مفاد کو مقدم رکھوں گا۔ کسی معاملے پر رائے دیتے تو سطحی طور سے نہیں بلکہ پورے غور و فکر کے بعد ہی رائے دیتے تھے وہ ہمارے لئے ایک بہترین دماغ تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے، میں نے ان کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھایا، حالانکہ وہ مجھ سے بہت جونیئر تھے۔ ان سے مشورہ کرنے کے بعد مجھے اطمینان سا ہو جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسا کوئی دوسرا فرد میری تحریکی زندگی میں پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔

شہید سید شاہ جمال چودھریؒ

یہ ایک اتفاق ہی ہے کہ عبدالمالک شہید کے بعد جمعیت کا دوسرا شہید بھی ڈھاکہ جمعیت کا ناظم ہی تھا۔

سید جمال چودھری ڈھاکہ جمعیت کی نظامت سے قبل مشرقی پاکستان اسلامی جمعیت طلبہ کے سیکرٹری تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں وہ اسلامک ہسٹری ایم اے فائنل کے طالب علم تھے۔ تحریک اسلامی میں شامل ہونے کی بنا پر ان کے والدین انہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے، لیکن خود ان کی لگن اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ رات کے ڈھائی تین بجے تک کام کرتے رہتے اور فرش پر دری بچھا کر نیند کے چند لمحے گزار دیتے۔ شاہ جمال کا تعلق سلہٹ سے تھا۔ ۲۵ جنوری ۱۹۶۵ء میں امیدوار رکنیت بنے۔ ۱۸ راگست ۱۹۶۵ء کو ان کی رکنیت جمعیت منظور ہوئی۔

۹ اپریل ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان اسلامی جمعیت طلبہ کی صوبائی مجلس شوریٰ کا اجلاس تھا عبدالسلام[1] کو شرکت کی خصوصی دعوت دے کر بلایا گیا تھا۔ اجلاس کے بعد شاہ جمال اور عبدالسلام کوئی ۹ بجے شب جمعیت کے دفتر ۱۵ پرانا پلٹن سے جلسہ کے لئے نکلے اور لاپتہ ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پاک فوج کے ایک فوجی دستے کے قادیانی کمانڈر نے انہیں جمعیت کے دفتر سے نکلتے ہی حراست میں لے لیا۔ وہ جمعیت کے دفتر کے سامنے گھات لگائے بیٹھا تھا ان کو گرفتار کر

[1] وہ بی اے فائنل کے طالب علم، جمعیت کے رکن اور ضلع فریدپور کے ناظم تھے، ۷ مئی ۱۹۶۰ء کو امیدوار رکنیت ہوئے۔ ۴ ستمبر ۱۹۶۹ء کو رکنیت منظور ہوئی۔

لیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد فوجیوں نے ایک اور شخص کو بھی باندھ لیا اور تینوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر انہیں جیپ میں ڈال کر چل دیتے۔ اس تیسرے شخص نے بعد میں بتایا کہ مجھ سے پہلے جن دو آدمیوں کو گرفتار کر رکھا تھا۔ انہوں نے مارشل لاء حکام کی طرف سے جاری کردہ شناختی کارڈ اس آفیسر کو دکھائے اور یہ بھی بتایا کہ ہم امن کمیٹی کے ممبر ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے بارے میں کسی بھی محب وطن لیڈر یا اعلیٰ فوجی افسر سے تصدیق کروالی جائے، مگر وہ نہ مانا۔ قوی اندیشہ یہی تھا کہ ان کو گولی ماردی گئی ہوگی۔

یہ گواہی مل جانے کے بعد جمعیت کے ذمہ دار افراد نے بڑی کوشش کی کہ جنرل ٹکا خان سے ان کی برآمدگی کے آرڈر جاری کروائے جائیں، مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

متعلقہ فوجی آفیسر کی گفتگو اور رویہ سے البتہ یہ اندیشہ یقین میں بدل گیا کہ شاہ جمال اور عبدالسلام بھی راہ حق میں اپنی جان نثار کر چکے ہیں ع "مگر کہاں کہ نہ تربت نہ سنگ تربت ہے"۔

شاہ جمال چودھری سے جمعیت نے بڑی توقعات وابستہ کی تھیں ان کا یوں جدا ہو جانا جمعیت کے لئے بہت بڑا نقصان تھا۔

مطیع الرحمان نظامی (سابق ناظم اعلیٰ) نے لکھا کہ:

شاہ جمال پڑھنے لکھنے میں تو درمیانہ درجہ کے تھے، لیکن ان میں ایک بڑی نمایاں خوبی یہ تھی کہ کوئی فیصلہ ہو جانے کے بعد اس کو نافذ کرنے اور اس پر عمل درآمد کرنے میں جتنی یکسوئی، لگن اور سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ انتظامی معاملات میں سوجھ بوجھ ان میں عبدالمالک سے نسبتاً زیادہ تھی۔ خوشگوار طبیعت کے مالک تھے۔ یہ خوبی عبدالمالک میں بھی تھی، مگر عبدالمالک کے چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ ہوتی تھی جب کہ شاہ جمال زیادہ خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جن لوگوں میں انتظامی صلاحیت زیادہ ہو، ان میں اطاعت کا جذبہ بھی کم ہوتا ہے، لیکن ان میں یہ کمزوری نہ تھی۔ جمال بھائی میرے ساتھ ایک سال تک صوبائی معتمد رہے۔ دوسرے سال ڈھاکہ شہر میں منتقل ہو گئے۔ عبدالمالک شہید کے ماتحت کام کیا۔ ان میں اطاعت کی اسپرٹ بہت تھی۔ ایک دفعہ صوبائی سطح پر کام کرنے کے بعد پھر شہر میں سیٹ ہونا ایک امتحان تھا، مگر وہ اس میں پورا اترے۔ جب وہ معتمد بنائے گئے تو

ڈگری کا امتحان دینے والے تھے مسلسل کام کرنے سے ان کا نتیجہ خراب ہو گیا۔ اس بنا پر پھر ہم نے انہیں ایک مہینہ چھٹی پر رکھا۔ گریجویشن کرنے کے بعد پھر شہر میں سیٹ ہو گئے۔ ان کے معاملات میں کوئی پیچیدگی یا الجھاؤ پیدا نہ ہوتا۔ جمعیت کے مزاج بنانے میں اور تحریکی ساتھیوں پر جان چھڑکنے اور جمعیت کا تحریکی ماحول پیدا کرنے کے لئے نمونے کا کام کر گئے۔ ان کی شہادت جس رات کو ہوئی اس سے پہلے ایک چیز بڑی حیران کن لگتی ہے۔ پتہ نہیں ان کے دل میں یہ احساس کیسے پیدا ہوا کہ ڈھاکہ جمعیت کا اس دن تک سارا حساب کتاب ٹھیک کر گئے۔ عموماً مہینہ ختم ہونے کے بعد ہی حساب کتاب مکمل کیا جاتا ہے۔ چند روپوں کا حساب کرتے ہوئے انہیں ایک دو جگہ صحیح یاد نہ رہا جس پر انہیں انتہائی پریشانی تھی۔ اسی پریشانی کا اظہار میرے سامنے کر رہے تھے۔ کہ "فلاں فلاں کو کچھ پیسہ فلاں فلاں کام کے لئے دیا تھا، انہوں نے تو حساب اس طریقہ سے دیا ہے جو نامکمل ہے تو اس سے میرے اوپر کیا ذمہ داری آتی ہے؟" اپنے بارے میں پریشان تھے۔ اس وقت تو میں نے انہیں اطمینان دلایا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں کچھ اور ہی معاملہ ہونے والا ہے۔ بس اس سے چند گھنٹوں بعد ان کو ایک قادیانی فوجی افسر نے اغوا کر لیا۔ عبدالسلام بھائی ناظم ضلع فرید پور بھی ان کے ہمراہ تھے۔ دونوں شہید کر دیئے گئے۔

سابق ناظم اعلیٰ سید منور حسن صاحب نے شاہ جمال شہید کے بارے میں بتایا: "وہ پستہ قد، کھلتے گندمی رنگ اور دائمی مسکراہٹیں بکھیرنے والے نہایت قیمتی ساتھی تھے، میرے ساتھ انہوں نے مشرقی پاکستان کے بہت دورے کئے۔ میری پہلی ملاقات ان سے سلہٹ میں ہوئی تھی۔ شاہ جمال کو ابتداءً اردو زبان کم سمجھ میں آتی تھی اور بمشکل ہی بول پاتے تھے، لیکن بولنے سے چوکتے بھی نہ تھے، لہٰذا خوب خوب لطیفے کرتے تھے اور سنانے پر خود بھی خوب مزا لیتے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ تسلیم کی خو ان میں بسی ہوئی تھی۔ مجھے کئی مواقع پر یہ تجربہ ہوا کہ وہ بڑی شد و مد سے اور کبھی کبھی نہایت بلند آواز سے اپنا موقف پیش کرتے تھے۔ اصرار بھی کرتے تھے، لیکن جب بات طے ہو جاتی اور سب کسی فیصلہ پر پہنچ جاتے تو فوراً ہتھیار ڈال دیتے اور ہرگز کسی بدمزگی کا اظہار نہ کرتے۔

وہ قرآن پاک کی تلاوت بڑی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ سفر کے دوران میں فجر کے بعد ضرور اس کا اہتمام کرتے اور بہ آوازِ بلند اپنے مخصوص لہجہ میں قرآن پاک پڑھتے۔ شیرینی اور کیفیتِ ایمانی جھلک جھلک جاتی تھی میں اکثر خاموشی سے بیٹھ جاتا تھا اور ان کی تلاوت سننے لگتا تھا۔ مشرقی پاکستان کے دورے میں سفر کبھی تیز رفتار لانچز میں کبھی سست رو گاڑیوں میں طے ہوتا تھا۔ نماز با جماعت ہوتی تھی اور وہ تہبند اور بشرٹ پہنے بیرے اصرار پر اکثر نماز پڑھاتے تھے اور تمام ارکانِ نماز میں اس طرح عدل کرتے تھے کہ نماز کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

غرض بڑی انفرادی خوبیوں اور اجتماعی اوصاف سے متصف تھے۔ میں نے جس وقت یہ خبر سنی کہ شاہ جمال لاپتہ ہیں انہیں پاکستانی فوج کے کچھ لوگ گرفتار کر کے لے گئے ہیں اور پھر کوشش کے باوجود سراغ نہیں مل رہا — تو میرا دل بیٹھ گیا۔ سخت صدمہ اور اضطراب تھا کہ صحیح بات معلوم ہو سکے، لیکن وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ فوج ہی کے افراد نے اس محب وطن اور اسلام کے شیدائی کو شہید کر ڈالا۔ حق مغفرت کرے، بڑا اجیالا ساتھی تھا۔"

شہید شاہ جمال کے بارے میں ان کے قریبی رفیق کارلوران کے ناظم ڈھاکہ جمعیت شمس الحق صاحب نے بتلایا کہ:

" شاہ جمال عبدالمالک شہید کے بعد ڈھاکہ جمعیت کا سب سے قیمتی اثاثہ تھے۔ میں نے تنظیم کو عبدالمالک شہید کے ذریعہ پہچانا اور تنظیمی صلاحیت و تجربہ شاہ جمال چودھری شہید کے ذریعے حاصل کیا۔ ان کی زندگی میں سلیقہ، رکھ رکھاؤ اور ایک قسم کا حسن ترتیب تھا۔ انتہائی غیر معمولی حالات میں بھی اپنی ان خوبیوں کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ شاہ جمال آج کا کام کل پر چھوڑنے کے قائل نہ تھے اور اس اصول کو نبھانے کے لئے اگر انہیں رات کے دو تین بجے تک بھی جاگنا پڑا تو وہ جاگے۔ جس شب وہ لاپتہ ہوتے اسی شب میں نے ان کی میز پر ایک لفافہ پڑا دیکھا، جس میں انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیت المال کا حساب درج کر رکھا تھا کہ کس کو کیا دینا ہے، کس سے کیا لینا ہے، کس کس شعبۂ تنظیم کو اس وقت تک کتنی رقم دی جا چکی ہے وغیرہ۔ اسی لفافہ میں ایک روپیہ اور چند پیسے بھی تھے اور بیت المال میں یہی کچھ باقی تھا۔ شاہ جمال نہ جانے کس احساس کے ساتھ خصوصاً تمام مالی امور کو اتنا صاف صاف لکھ گئے۔ ان کے بعد

مجھے ایک لمحہ بھی یہ سمجھنے میں دقت نہ ہوئی کہ بیت المال کی پوزیشن کیا ہے۔

اس رات شاہ جمال بھائی ناظم ضلع فریدپور عبدالسلام کے ہمراہ دفتر سے باہر نکلے۔ چلنے سے قبل وہ کہنے لگے کہ والدین کو ملے کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ چاہتا ہوں کہ گھر کا ایک چکر لگالوں۔ ہم نے کہا: "آپ گھر سے ہو آیئے۔" وہ ٹھٹکے اور پھر کہنے لگے۔ "اچھا چھوڑیں، اگلے مہینے سہی۔ جب میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا اس وقت جمعیت کے فرائض کا وہ خیال سامنے نہ آیا تھا جو ابھی ابھی ذہن میں آیا ہے، اس لئے بعد میں دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ دفتر سے باہر نکل گئے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ وہ ایک ایسے طویل سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ جہاں سے لوٹ کر وہ ہمارے درمیان

اس مادی دنیا میں پھر کبھی نہیں آئیں گے۔ پاک آرمی کے ایک قادیانی آفیسر نے ان کو دفتر سے نکلتے ہی گرفتار کرلیا اور بعد میں گولی مار کر شہید کر دیا۔ اس بات کا اعتراف بعد میں جنرل ٹکا خان نے دبے الفاظ میں کرلیا تھا۔

شاہ جمال چودھری ہر کارکن سے بڑی محبت کے ساتھ ملتے تھے۔ ایک ایک کارکن کی دیکھ بھال گویا ان کی زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی اور ذمہ داری تھی۔ وہ ساتھیوں سے پروگرام کے تحت بھی ملتے اور بغیر پروگرام کے بھی۔ ان ملاقاتوں میں کارکنوں سے وہ ان کی معاشی حالت کے بارے میں ضرور پوچھتے اور اگر کوئی کارکن کسی نوعیت کی مشکل بیان کر دیتا تو اس کو حل کرنے کے لئے جُت جاتے۔ ہم نے ان کو زندگی بھر غصہ یا ناراضی کے عالم میں نہ دیکھا۔ ایک دفعہ کی بات ہے۔ وہ ناظم تھے اور مصطفیٰ شوکت عمران شہید ان کے ہمراہ معتمد تھے۔ منصوبہ بندی کرنے میں ان دونوں کے درمیان کسی مسئلہ پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ عمران شہید کو کچھ زیادہ ہی اختلاف تھا۔ مگر ہم لوگوں کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ ایک روز شاہ جمال بجھے بجھے سے چہرے کے ساتھ کہنے لگے: "یوں لگتا ہے کہ شاید میں تحریک کا کام ٹھیک سے نہیں کر رہا، اس لئے براہ کرم مجھے نظامت کی ذمہ داری سے رخصت دلانے کا سوچیں۔" میرے پیہم اصرار پر انہوں نے بتایا: "معلوم ہوتا ہے کہ عمران بھائی کو مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے، ہم دونوں دفتر میں آتے ہیں اپنا اپنا کام کرتے ہیں لیکن وہ کچھ کھچے کھچے سے رہتے ہیں۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ کسی ساتھی کو اس صورتحال

کا علم نہیں"۔ میں نے شاہ جمال بھائی کو کہا "آپ مجھے کل تک موقع دیں۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے عمران بھائی دوسرے کمرے میں تھے۔ میں نے جا کر انہیں کہا کل صبح سات بجے آپ میرے ہوسٹل میں ناشتہ کی دعوت قبول کریں"۔ انہوں نے ہاں کر دی پھر شاہ جمال بھائی کے پاس آیا اور انہیں بھی یہی کہا۔ دونوں کو یہی علم تھا کہ ان کو اکیلے بلایا گیا ہے۔ بہرحال ہم تینوں اگلے روز ناشتے پر اکٹھے تھے۔ دونوں نظریں نیچے کئے خاموش آہستہ آہستہ ناشتہ کر رہے تھے۔ میں نے مہر سکوت توڑتے ہوئے عمران بھائی سے کہا "آپ کو شاہ جمال سے کوئی شکایت ہے کیا؟" عمران میرا یہ جملہ سنتے ہی گویا پگھل گئے اور دھیمی سی آواز میں بولے "شمس بھائی میں اپنی بات سے دست بردار ہوتا ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ ناظم صاحب کو میرے رویہ سے تکلیف پہنچی ہے"۔ پھر ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد گھٹی گھٹی آواز میں بولے "شاہ جمال بھائی مجھے معاف کر دیں" اور یہ کہتے ہی ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور روتے روتے شاہ جمال بھائی سے لپٹ گئے۔ دونوں اس قدر روئے کہ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔

شاہ جمال اور عمران دونوں شہید ہو چکے ہیں۔ مگر زندگی کے باقی دنوں میں ان کے تعلقات کو جس قدر مثالی دیکھا۔ اس کا نظارہ کرنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ وہ ایک دوسرے پر گویا جان چھڑکتے تھے۔

چند ماہ بعد جب شاہ جمال چودھری لاپتہ ہو گئے تو ان کی تلاش میں ہماری تو جو حالت ہوتی سو ہوئی لیکن شاہ جمال کے لئے جو شخص فی الحقیقت تڑپ رہا تھا وہ شوکت عمران ہی تھا۔ شہادت کی تصدیق ہونے کے بعد عمران نے کہا "شمس بھائی آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہے جو شاہ جمال کی شکایت کو دور کرنے کا سبب بنے ورنہ میں تو اسی دکھ میں ہلاک ہو جاتا۔"

شہید محمد ادریسؒ

ادریس شہید کا تعلق چرچاندیہ (ضلع نواکھلی[1]) سے تھا۔ وہ ایک اچھے، سادہ، نیک دل کسان گھرانے کے فرد اور قابلِ رشک صحت کے مالک تھے۔ تحریکِ اسلامی کے کارکن تھے

[1] "نواکھلی" اور "نواکھالی" ایک ہی جگہ ہے۔

حالات خراب ہوئے تو ادریس اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پرچم بلند رکھنے کے لئے فینی کیمپ چلے آئے، تاکہ فوجی تربیت حاصل کر کے تحفظِ دین وملت کر سکیں۔ الشمس سے وابستہ ہوئے۔
۶ دسمبر کی رات کو مجیب باہنی نے انہیں گرفتار کر لیا۔ سخت سردی کے عالم میں انہیں مسلسل دو دن بھوکا پیاسا رکھا گیا، تشدد کیا، کپڑے اتار دیئے گئے۔ آخر کار جب ان میں سکت نہ رہی تو ۸، دسمبر کی رات کو انہیں گولی مار دی گئی۔ ان کی عمر ۲۹ سال تھی۔

شہید عبدالخالق میاںؒ

فینی کے قریب کونگا پورا میں پیدا ہوئے۔ فینی کے مدرسہ عالیہ میں دوران تعلیم اسلامی جمعیت طلبہ کے رفیق بنے۔ بڑے بے لوث اور سرگرم کارکن تھے، گرمی سردی تنگی ترشی ہر حال میں منزل کی طرف گامزن رہے، قرآن مجید کا مطالعہ اور درس قرآن ان کا خصوصی میدان کار تھا۔ تربیتی تقریر کے دوران میں کارکن یوں محسوس کرتے جیسے وہ ہر فرد سے شخصی طور پر مخاطب ہوں۔
البدر کی تشکیل کے بعد انہوں نے تربیت مکمل کی۔ اب ان کا درس جہاد پر ہوتا۔ انہیں انسانی جانوں کی حفاظت اور سرکاری املاک کی دیکھ بھال کا کام سونپا گیا۔ جسے انہوں نے بڑی ذمہ داری سے انجام دیا۔ بھارتی فوج کے غلبہ کے بعد یہاں کا البدر کیمپ مکتی باہنی کے نرغے میں آ گیا۔ بہت سے البدر شہید ہو گئے۔ عبدالخالق کسی نہ کسی طریقے سے گھیرا توڑ کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے، راستے میں پناہ لینے کی کوشش کی، مگر ناکامی ہوئی اس لئے سیدھے اپنے گھر پہنچے۔ جہاں مکتی باہنی کے مقامی غنڈوں نے انہیں پکڑ لیا۔ پہلے لاٹھیاں مار مار کر بے ہوش کر دیا اور پھر اسی حالت میں گولی مار کر شہید کر دیا۔ اور گھر کا سارا سامان لوٹ لیا، شہادت کے وقت انیس برس کے تھے۔

شہید عبدالربؒ

دنا بیت پور (ضلع نواکھلی) کو بہت سے شہیدوں کا مسکن ہونے کا شرف حاصل

ہے۔ عبدالرّب اسی گاؤں میں عبدالحلیم کے ہاں پیدا ہوئے۔ قوی ہیکل، سرد قد اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ رائے پور کے مدرسہ عالیہ میں دوران تعلیم، اسلامی جمعیت طلبہ سے متعارف ہوئے۔ علم دین تو وہ پہلے ہی حاصل کر رہے تھے، جمعیت میں شمولیت کے بعد انہیں اسلامی نظام زندگی کے خدوخال سے آگاہی حاصل ہوئی۔

البدر قائم ہوئی تو اس میں شریک ہوئے اور تربیت حاصل کی۔ بھارتی فوج کے سلسلے میں مکتی باہنی نے نواکھلی پر قبضہ کر لیا تو پاک فوج تیزی سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئی۔ نتیجہ یہ کہ کیمپ میں شریک البدر کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ بہت سے البدر کیڈٹوں کی بڑی تعداد شہید ہوگئی۔ البتہ عبدالرب پاک فوج کے ساتھ پیچھے ہٹنے والوں میں شامل تھے، لیکن اس کے بعد آج تک ان کا پتہ نہیں چل سکا۔ نہ وہ بھارت کی قید میں گئے اور نہ بنگلہ دیش ہی میں نظر آئے۔ قیاس یہی ہے کہ پسپائی کے دوران مکتی باہنی کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر اکیس برس تھی۔

شہید نورالاسلامؒ

ٹومچر (ضلع نواکھلی)، ایک دینی درس گاہ کی وجہ سے خاصا مشہور قصبہ ہے۔ جس میں ہزاروں طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ نورالاسلام اسی قصبے میں فرید میاں کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پنڈت باڑی اسکول میں حاصل کی۔ یہاں سے فراغت کے بعد صمد اکیڈمی میں داخل ہوئے۔ بڑے چاق و چوبند نوجوان تھے۔ اکیڈمی کی فٹ بال ٹیم کے کپتان بھی رہے پھولوں کے پودے لگانا ان کا مشغلہ تھا۔ رنگت صاف، قد چھوٹا اور صحت اچھی تھی۔

نوعمری میں جمعیت کے قریب آئے اور فعال کارکن ثابت ہوئے۔ ان کی کوششوں سے قصبہ کے کھلاڑی جمعیت میں شامل ہوئے اور اس طرح یہاں کارکنان کی ایک نہایت فعال ٹیم تحریک اسلامی کو ملی۔ مگر چند ہی ماہ بعد تخریب کاروں نے امن و سکون برباد کر دیا۔ ملک تخریبی سیاست کی لپیٹ میں آ گیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ اس تاریخ ساز مرحلے میں نورالاسلام نے البدر کیڈٹ کے طور پر اپنا فریضہ انجام دیا۔ لکھی ور میں البدر تربیتی کیمپ میں

شریک ہوئے۔ بعدازاں پیادہ پور البدر کیمپ میں منتقل ہو گئے۔ ۴ دسمبر کو مکتی باہنی کے ہاتھوں گرفتار ہو کر، ان کی گولی کا نشانہ بنے۔ شہادت کے وقت ان کی عمر صرف سترہ برس تھی۔

شہید محمد ابو طاہر

مولانا محمد اللہ کے ہاں ضلع نواکھلی کے گاؤں دنایت پور میں پیدا ہوئے، اس سے قبل ان کا گھر چاند پور (ضلع کومیلا) میں تھا۔ طاہر نے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مدرسہ عالیہ رائے پور میں داخلہ لیا۔ ان کا تعلیمی ریکارڈ فرسٹ کلاس رہا۔ اور ہمیشہ وظیفہ پاتے رہے۔

اسکول کے زمانے ہی میں جمعیت کے بہترین کارکن بن گئے۔ جرأت و ہمت ان کی پہچان تھی۔ مارچ میں جب مشرقی پاکستان کا کنٹرول غداروں کے قبضے میں چلا گیا اور مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو اس وقت بھی طاہر اپنے گھر میں نہیں بیٹھے، بلکہ ساتھیوں کی خیر و عافیت معلوم کرنے دن رات چکر لگاتے رہے۔ البدر قائم ہونے سے قبل رضاکار فورس میں شامل ہوئے۔ بعدازاں البدر ٹریننگ کیمپ میں آ گئے۔ نومبر میں ایک آپریشن پر گئے اور مکتی باہنی کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے، لیکن گھنٹہ بھر میں فرار ہو کر نکل آئے اور سیدھے چوموہانی پہنچ گئے۔ یہاں مکتی باہنی کے ایک دوسرے گروپ کے ہاتھوں پکڑے گئے۔ سخت سردی کا موسم تھا۔ برہنہ کر کے انہیں سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ۲ دسمبر کو رائے پور کے مغربی علاقہ میں نہر کے پل پر لے جا کر گولی مار دی گئی اور وہ تڑپتے ہوئے ندی میں جا گرے۔ ندی کا مٹیالا پانی شہید ابو طاہر کے ابلتے ہوئے لہو سے سرخ ہو گیا۔ ان کی نعش نہ مل سکی۔ شہادت کے وقت زندگی کی بیسویں منزل میں تھے۔

شہید ابوالخیر

ضلع نواکھلی کا ایک چھوٹا سا گاؤں لکھی پور کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی گاؤں

سے ایک مفلوک الحال گھرانے میں ابوالخیر نے آنکھ کھولی۔ ان کے والد ایک عالم باعمل تھے۔ ابوالخیر نے کھیلیاکسہ رحمانیہ اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ طویل قامت اور سانولے رنگ کے ابوالخیر شروع ہی سے ذہین تھے۔ انہوں نے اچھے شعر یاد کرنے اور اچھے شعر کہنے کا آغاز مڈل ہی سے کر دیا تھا۔ بچپن میں والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسکول کے زمانہ میں جمعیت کی دعوت سے روشناس ہوئے۔

۱۹۷۱ء میں جب البدر کی تاسیس ہوئی تو اس کے پرجوش مجاہد بن گئے۔ اسی پاداش میں مکتی باہنی نے ان کے والد کو تنگ کرنا شروع کر دیا جس پر وہ بھی البدر کیمپ میں آگئے۔ ابوالخیر کے والد متقی، پرہیزگار اور درویش منش انسان تھے۔ ایک روز دشمن کے چند لوگ دھوکے سے ان کے والد کو باہر لے گئے اور تھوڑی دور جاکر ان کی آنکھیں اور ہاتھ باندھ کر سخت اذیت دی۔ پھر اسی عالم میں انہیں دلال بازار سے بجی نگر لے گئے اور وہاں بے دردی کے ساتھ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ عالم نزع میں ان کی زبان پر صرف "اللہ اللہ" کے الفاظ تھے۔

ابوالخیر دلال بازار کیمپ میں البدر کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ ایک جمعہ کو وہ نماز پڑھنے کے بعد کیمپ میں آئے تو دشمن کے گوریلوں نے دلال بازار پر حملہ کر دیا۔ تقریباً دو گھنٹے تک گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر کار البدر کیڈٹوں کا اسلحہ ختم ہو گیا تو ابوالخیر نے پانی کے ایک تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ کیونکہ اور کوئی راستہ تھا نہیں۔ جونہی غوطہ کھانے کے بعد وہ پانی سے ابھرے تو دشمن نے ان پر فائر کھول دیا۔ ان کا بازو زخمی ہو گیا۔ مکتی باہنی والے جھیل سے باہر نکال کر انہیں مارتے ہوئے بال بازار لے گئے اور وہاں ایک درخت کے ساتھ الٹا لٹکا دیا۔ ان کے سر کے بال کاٹ کر تارکول لگا دیا اور مادر زاد ننگا کر دیا۔ غنڈے ان کا تمسخر اڑاتے اور گھونسے مارتے رہے۔ یہ زخمی مجاہد زیادہ خون بہہ جانے اور صدمے کے سبب جان دے بیٹھے۔ دشمنوں نے ان کی لاش درخت سے اتاری اور گھسیٹتے ہوئے کورالیہ میدان میں لے آئے اور وہاں بہتے ہوئے نالے میں پھینک دیا۔

ابوالخیر شہادت کے وقت بیس سال کے تھے۔ ان کی دو چھوٹی یتیم بہنیں

پیچھے رہ گئیں۔

شہید نور الکریمؒ

ان کا تعلق سات باڑیا گاؤں (نواکھالی) سے تھا۔ معاشی حالت اچھی تھی ہتی گنج اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد بی اے کیا۔ یہ ایک شیریں زبان اور ایک وجیہہ دبلے پتلے نوجوان تھے مثالی اخلاق و کردار کے مالک تھے۔ انہوں نے اسلامی ادب اور کلچر کا گہرا مطالعہ کیا اور اس موضوع پر سیکولر ذہن رکھنے والے افراد سے گفتگو کرتے۔ اچھی کتاب ان کی کمزوری تھی یہی وجہ ہے کہ وہ جمعیت کی دعوت پھیلاتے وقت دلائل اور تمثیلوں کو اس خوبصورتی سے بیان کرتے کہ مشکل سے مشکل مراحل بحث پانی ہو جاتے، وہ البدر کے ابلاغ عامہ گروپ کے رکن بھی تھے۔

۱۹۷۱ء کے آغاز ہی میں پاکستان کے خلاف دشمن تحریک زور دار طریقے سے پھیلنا شروع ہوئی تو اس کا توڑ کرنے کے لیے نور الکریم ہر لمحہ مستعد رہتے۔ اسی جرم پاکیزہ کی پاداش میں انہیں سات دسمبر کی رات مجیب باہنی گرفتار کر کے مکتی گنج لے گئی اور کھجور کے ایک درخت کے ساتھ انہیں ناریل کی رسی سے باندھ کر گولی مار دی۔ اس طرح بائیس سال کا یہ مجاہد کھجور کے ایک سدا بہار درخت کو اپنے لہو کا گواہ بنا کر شہادت کا مرتبہ پا گیا۔

شہید محمد مرشد عالمؒ

مرشد عالم ضلع نواکھلی کے چرکانڑا گاؤں میں ایک متوسط کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام اللہ بخش تھا۔ قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مڈل سکول میں داخلہ لیا۔ مرشد عالم آغاز ہی سے سنجیدہ مزاج، کم گو، اور دھن کے پکے تھے۔

میٹرک میں پہنچے تو مولانا مودودیؒ کی تحریروں سے متاثر ہو کر اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے لئے اپنے مستقبل کو خالص کر لیا۔ ان کی کم گوئی ختم ہو گئی اور انہوں نے اپنے اسکول کے طلبہ کو فریضہ اقامتِ دین کا شعور دینے کے لئے ملاقاتیں اور تقاریر شروع کیں۔

جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو تخریب کار ان کی جان کے دشمن ہوگئے اور انہیں مارنے کے درپے ہوگئے۔ اسی سال مرشد عالم نے میٹرک پاس کر لیا۔ وہ البدر کے فعال کیڈٹ کے طور پر سرگرم عمل تھے کہ ۱۳ نومبر ۱۹۷۱ء (۲۳ رمضان المبارک) کو جب وہ نماز تراویح پڑھنے کے بعد مسجد ہی میں شب بیداری کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ غنڈوں نے اچانک گرفتار کر لیا اور ایک بیابان میں لے گئے۔

دوسرے دن وہاں کے ایک کھیت میں ان کی لاش پڑی تھی جس سے اندازہ ہوا کہ ان کو بندوق کے بٹ مار مار کر پہلے تو زخمی کیا گیا اور بعد میں کسی ترقی پسند غنڈے نے ان کی گردن کاٹ کر جسم سے الگ کر دی۔ شہید کی تدفین ان کے گھر کے قریب مسجد کے پہلو میں کی گئی۔

شہید حافظ محمد محسنؒ

حافظ صاحب ضلع نواکھالی کے گاؤں کائخن پور (تھانہ رائے پور) میں محمد طاہر صاحب کے ہاں پیدا ہوئے۔ والد صاحب نے ان کو بچپن ہی سے قرآن مجید حفظ کے لئے مسجد بھیج دیا۔ ان کے معاشی حالات خاصے کمزور تھے۔ قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد وہ مقامی اسکول میں داخل ہوئے۔ قرأت اور نعت پڑھنے میں انہیں درجۂ کمال حاصل تھا۔

اسکول کے زمانے میں جس روز وہ جمعیت کی دعوت سے متعارف ہوئے اس دن کو وہ ہمیشہ اپنی زندگی کا سب سے قیمتی دن قرار دیا کرتے تھے۔ وہ جمعیت کے پرجوش کارکن تھے۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں دن رات کام کرتے رہے۔ تخریب کاروں نے جب وطن کا امن تہہ و بالا کر دیا تو اپنے دینی فریضہ کی ادائیگی کے لیے ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ رائے پور کے البدر یونٹ میں شامل ہو کر ابتداً رائفل چلانے کی تربیت حاصل کی۔ ان کی رائفل کا نشانہ بہت خوب تھا۔ ایک ماہ بعد جب ان کو مقامی البدر کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ تو انہوں نے اس کا حق ادا کیا۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد دسمبر میں انہیں نذرالاسلام، جو جمعیت کے اچھے شاعر تھے، کے ہمراہ چوہونی سے گرفتار کر لیا گیا۔ وہاں سے غنڈے ان پر تشدد کرتے ہوئے رائے پور لے آئے اور رات کے وقت اسٹین گن کی فائرنگ سے شہید کر دیا۔ ان کی میت ندی میں پھینک دی۔ جو تین روز بعد ایک کنارے سے ملی۔ جب میت کو غسل دیا گیا تو جسم پر گولیوں کے ۱۳ نشانات تھے۔ شہادت کے وقت ان کی عمر چوبیس برس تھی۔

شہید واحد الحق

ان کا تعلق موسیٰ پور (نواکھالی) سے تھا۔ ان کے والد حبیب الرحمٰن ایک عالم دین تھے۔ قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مڈل اسکول میں داخل ہوئے۔ پھر سونا پور مدرسہ عالیہ سے فاضل اور ۱۹۷۱ء میں ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ نرم طبیعت کے مالک تھے اور فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے۔

اسکول کے زمانے میں واحد الحق جمعیت کی دعوت سے متعارف ہوئے اور اسی دوران ان کو اپنے گاؤں میں جمعیت کا نگران مقرر کر دیا گیا۔ ان کی لکھائی بہت خوبصورت تھی اسی حوالے سے دیواروں پر خوش دلی سے فقرے لکھتے۔ دیواری پوسٹر ڈیزائن کرنے اور فقرے تراشنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

شاہباز فورس کی تربیت حاصل کرنے کے دوران انہوں نے ہلالِ احمر کی سرگرمیوں میں خصوصی توجہ دی۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں جب خوفناک طوفان نے تباہی مچائی تو واحد الحق نے دور دراز علاقوں میں جا کر خدمتِ خلق کا کام کیا اور ہلالِ احمر سے تعریفی سند بھی پائی۔ اسی سال ان کی شادی ہوئی۔ جب مارچ میں ہندوستانی ایجنٹوں اور غداروں نے پاکستان کو مشقِ ستم بنانا شروع کیا، تو واحد الحق اپنی سات روز کی نوزائیدہ بچی اور بیمار اہلیہ کو چھوڑ کر شہر آ گئے تاکہ محبِ وطن افراد کے تحفظ کے لئے اقدام کر سکیں۔

۱۹۷۱ء کے اوائل میں جمعیت کے رکن بن گئے اور زیادہ بہتر منصوبہ بندی کے

ساتھ دعوتی و تنظیمی کام آگے بڑھانے لگے۔ ملک کی عمومی صورت حال میں ۱۹۷۱ء سے پہلے کی پاکستانی حکومتوں کے افسانوی ظلم و ستم کی داستانوں کا زہر گھلا ہوا تھا۔ سادہ لوح عوام اپنے لئے خود گڑھا کھود رہے تھے۔ توحید پرست محب وطن افراد اس صورت حال پر بے چین اور مضطرب تھے۔ تخریب کاروں کا خصوصی ہدف اسلامی قلم کاروں کو قتل کرنا تھا اور دوسرا نشانہ ندیوں کے پلوں اور گرڈ اسٹیشنوں کو اڑانا تھا۔ ان ملک دشمن اقدامات کا مقابلہ کرنے کے لئے البدر نے اپنی خدمات پیش کیں، واحد الحق نے پورے خلوص کے ساتھ حب وطن کا مظاہرہ کیا۔ اپنی شہادت سے چند روز قبل اپنے قریبی ساتھی انوار الحق کو کہہ رہے تھے "موت برحق ہے لیکن دعا کرنا کہ میں ثابت قدمی کے ساتھ مقصد دین کے لئے اپنی جان نچھاور کرسکوں"۔

۹ دسمبر کو ہندوستانی فوج اور اس کے ایجنٹوں نے نواکھالی کے چاروں اطراف سے حملہ کر دیا، لیکن ہماری فوج مقابلہ کے بجائے چھاؤنی میں واپس آ گئی۔ اس صورتحال میں البدر کے کیڈٹ بڑی مصیبت میں پھنس چکے تھے۔ لڑنے اور گرفتار ہونے دونوں صورتوں میں موت سامنے تھی۔ گھیرا مسلسل تنگ ہو رہا تھا۔ چند ساتھی . . . . روپوش ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

جب ایمونیشن ختم ہو گیا تو البدر کے کیڈٹوں کو مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج نے چن چن کر شہید کرنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں واحد الحق گرفتار کر لئے گئے۔ ان کی زندگی کے آخری لمحے دردانگیز اور بھیانک تصورات کے عملاً وحشیانہ مظاہرے سے عبارت ہوتے گرفتاری کے بعد انہیں بے انتہا اذیت دی گئی جن کا اظہار الفاظ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ انہیں دسمبر کی سخت ٹھنڈی راتوں کو ننگے بدن کے ساتھ ایک جوہڑ میں کھڑا کیا گیا۔ بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ طرح طرح کا تشدد کر کے ان سے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ناکام کوششیں ہوتی رہیں۔

آخر کار ۱۲ دسمبر کی صبح واحد الحق کو گراؤنڈ میں لایا گیا۔ ان کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ گراؤنڈ میں لا کر ان پر دوبارہ تشدد کیا گیا اور سنگین مار کر شہید کر دیا گیا۔ آخری

وقت ان کی زبان پر کلمہ طیبہ کے الفاظ تھے اور آنکھوں کے سوتے خشک تھے۔ شہید کی عمر ۲۳ برس تھی۔

شہید عبدالاولؒ

عبدالاول، ضلع نواکھالی چرچاند پر میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد فینی کالج میں داخل ہوئے۔ یہیں پر جمعیت سے تعلق قائم ہوا۔ پھر البدر میں شامل ہوگئے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے آخری معرکے میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے عبدالاول گولی لگنے سے زخمی ہوکر گر پڑے۔ انہیں اسی حالت میں ۹ر دسمبر کو گولی مار دی گئی۔ اس وقت عبدالاول کی عمر ۲۳ سال تھی۔

شہید محمود الحقؒ

ضلع نواکھالی کے گاؤں گجارا کاندی میں پیدا ہوئے۔ قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قریبی اسکول میں داخلہ لیا۔ کلاس نہم میں تھے تو جمعیت سے وابستہ ہوگئے۔ اسی "جرم" میں انہیں اسکول سے نکال دیا گیا۔ ان کے والد نے محمود کو دوسرے اسکول میں داخل کرادیا۔ یہاں ذہانت، ملنساری اور اچھے اخلاق کی وجہ سے جلد مقبول ہوگئے۔ میٹرک کر لیا تو فینی کالج میں داخل ہوئے۔ انہوں نے بی کام فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں بڑے پرجوش طریقے سے مہم چلاتے تھے۔ ۱۹۷۰ء کو چاٹگام یونیورسٹی میں چلے گئے۔ ۱۹۷۱ء میں البدر کے ساتھ مل کر ذمہ داریاں ادا کیں۔ ۱۶ر دسمبر ۷۱ء کے بعد محمود الحق نے ایک دوست کے گھر میں پناہ لی۔ تین روز بعد کسی دشمن کو پتہ چل گیا اور وہ انہیں پکڑ کر سرشادی کیمپ میں لے آئے۔ تشدد کرتے رہے، اس دوران محمود نے صرف یہ کہا کہ مجھے آخری مرتبہ میری والدہ کا چہرہ دکھادو، لیکن درندوں نے اس خواہش کو پورا نہ کیا۔ آخر ایک ہندو نسری داس نے گولی ماردی اور بہت گہرے گڑھے میں جہاں پہلے ہی بہت سے شہداء کی نعشیں تھیں پھینک دیا۔ شہادت کے

وقت وہ ۲۵ برس کے جوان تھے۔

شہید ابوالکلام

ابوالکلام شولاکھالی (نواکھالی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد تاج الاسلام متوسط درجے کے کسان تھے۔ ابوالکلام صاحب کا بچپن گھومنے پھرنے میں گزرا، لیکن جب فینی کالج میں داخلہ لیا تو یہ شریر اور تیز طرار نوعمر، اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہوا اور نہایت سنجیدہ اور خدا کے دین کا انتھک مجاہد بن گیا۔ ان میں تحریر و تقریر کی صلاحیتیں خدا نے بدرجہ اتم اکٹھی کر دی تھیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے انہیں گہرا شغف تھا۔
۱۹۷۱ء میں البدر سے منسلک ہوئے۔ ۸ دسمبر کو انہیں قاضی بازار سے دشمن نے پکڑ لیا اور وہاں ایک لوہار کی دکان پر لے جا کر، گرم لوہے سے ان کے جسم کو داغا، نتیجتاً ان کا جسم جگہ جگہ سے پھٹ گیا اور لہو بہنے لگا۔ قریب ہی مکتی گنج میں ایک درخت سے الٹا لٹکا دیا اور اسی عالم میں وہ ۹ دسمبر کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

شہید محمد اسماعیلؒ

ٹومچر (نواکھالی) نے کئی شہدا کو جنم دیا۔ ان میں ایک محمد اسماعیل بھی تھے۔ ان کے والد مولانا حفیظ اللہ ٹومچر میں مدرس تھے۔ اسماعیل کا قد لمبا اور صحت کمزور تھی۔ میٹرک کے دوران جمعیت کے کارکن بن گئے۔ سال اول میں تھے کہ - - - - - البدر میں شامل ہوتے اور مختلف محاذوں پر دادِ شجاعت دی۔ دسمبر میں جب دشمن کو غلبہ حاصل ہوا تو انہیں گرفتار کر کے آمونڈھی پہنچایا گیا اور یہیں پر انہیں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔
اس وقت محمد اسماعیل ۱۸ سال کے تھے۔

شہید ابوطاہر انصاریؒ

بانس کالی تھانہ کے دینی مدرسے میں فاضل کے طالب علم تھے۔ ملکی حالات خراب ہوتے

تو مدرسہ چھوڑ کر جمعیت کے دفتر میں چلے آئے، نوعمر تھے۔ البدر میں شمولیت کی خواہش کا اظہار کیا تو ناظم جمعیت نے ان کو ٹالنا چاہا، لیکن وہ مُصر رہے۔

ناظم نے ان کے اصرار کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا: "اچھا تو آپ دفتر ہی میں ڈیوٹی دیں"۔ کہنے لگے "میں غازی کہلانا یا شہید بننا چاہتا ہوں"۔ اس دور کا معاذ شاہ جلال کے ہمراہ ہر محاذ پر ڈٹا رہا۔ اسی کی کمان میں ایک مہم پر گئے ہوئے تھے کہ بھارتی فضائیہ کے حملے سے شہید ہو گئے۔

شہید نور الزمانؒ

سال دوم کے طالب علم اور جمعیت کے رفیق تھے۔ پٹسوری ان کا گھر تھا۔ شہادت سے صرف دو روز قبل ایک ساتھی کے ہاتھ والد کو خط بھیجا کہ "ہم اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں۔ دعا فرمائیں کہ شہادت کی موت نصیب ہو۔ یہ وہ موت ہے جس کی تمنا خالد بن ولیدؓ جیسے جلیل القدر جرنیل نے کی تھی"۔ نور الزمان کی یہ تمنا پوری ہو گئی۔ شاہ جلال کے ہمراہ چٹاگانگ بندرگاہ پر فریضہ انجام دے رہے تھے کہ بھارتی فضائیہ کے حملہ میں شہید ہو گئے۔

شہید احسان الحقؒ

احسان الحق کا تعلق میٹھا چھوڑا (ضلع چاٹگام) سے تھا۔ مدرسہ عالیہ فینی سے کامل کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۹ء میں جونیئر ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا۔ جمعیت کی کالج لائبریری کے انچارج اور امیدوار رکنیت تھے۔ معاشی اعتبار سے اچھے گھرانے کے چشم و چراغ تھے، مگر زندگی محنت اور سادگی سے عبارت تھی۔ ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم میں تحریک اسلامی کے امیدواروں کے حق میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں جب ٹکا خان نے آپریشن شروع کیا تو اس کے احکام کے مطابق پاک فوج کے جوان پیش قدمی کرتے وقت جہاں مکتی باہنی کے ٹھکانوں کو روندتے چلے گئے۔ وہیں بلا امتیاز بنگالیوں کے مکانات نذر آتش کرتے گئے۔ ان میں احسان الحق کا گھر بھی تھا۔ شعلوں میں گھرے ہوتے مکان سے احسان اپنے بہن بھائیوں

کے ہمراہ باہر نکلے تو ایک "بہادر فوج" کی سٹین گن سے آگ برسنے لگی۔ احسان موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ یہ ۱۸ اپریل ۱۹۷۱ء کا دن تھا۔

شہید احسان الحق عربی، انگریزی اور اردو پر یکساں دسترس رکھتے تھے اور اپنے کالج کی یونین کے پہلے منتخب صدر بھی تھے۔

شہید سید محمد معیز الدینؒ

سید محمد معیز الدین کا تعلق ضلع چٹاگانگ کی تحصیل ہاتھ زاری سے تھا۔ والدین کے پہلوٹھی کے بیٹے تھے۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن تھی۔ ۴ سال کی عمر میں مقامی مکتب سے تعلیم کا آغاز کیا۔ ۱۲ جولائی ۱۹۵۵ء کو گیبریلٹ مفیض الاسلام مدرسہ میں داخلہ لیا۔ اکتوبر ۶۷ء میں اسی مدرسہ سے ادیب پاس کر کے جامعہ طبیہ محمدیہ میں عالم سال اول میں داخلہ لیا۔ اسی جامعہ میں فاضل کے طالب علم تھے کہ شہادت پا گئے۔ شہادت کے وقت ان کی عمر ۲۲ برس کی تھی۔ اچھا قد اور کھلی رنگت کے حامل تھے۔ تقریر و تحریر میں یکتا اور فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے۔

۱۹۶۹ء میں جامعہ طبیہ کے ایک کارکن نے جمعیت کی دعوت دی۔ دعوت کو سمجھا اور دل کی گہرائیوں سے قبول کر لیا اور پھر اس پیغام کو عام کرنے کے لئے بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔ مختلف سکولوں اور مساجد میں جاتے اور بڑے موثر پیرایہ میں دعوت پیش کرتے۔ البدر بنی تو یہ اس کی سرگرمیوں میں بھی نمایاں تھے۔ ۸ دسمبر کو فیٹک چھڑی کے مقام پر مکتی باہنی کے غنڈوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

محمد ساجد الرحمان شہیدؒ، محمد لولو الرحمانؒ

۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ساجد الرحمان کچھ دیر کے لئے اپنے گھر آئے اور اپنے بھائی (لولو الرحمان) کی معیت میں واپس البدر کیمپ جانے لگے تو اتنی دیر میں البدر کا دستہ آگے روانہ ہو چکا تھا دونوں بھائی ساتھیوں سے جا ملنے کے لئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھے تو راہ میں مکتی باہنی نے ان کو

پکڑ لیا اور بڑے دردناک طریقے سے شہید کر دیا۔

ساجد الرحمان ۴۸ء میں اور ان کے بڑے بھائی لولو الرحمان ۴۵ء میں محبوب الرحمان صاحب کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ضلع کومیلا تحصیل مراد نگر کے گاؤں "راجہ چاپی تلا" سے تھا۔ ساجد نے نرشینگدی ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور شہادت کے وقت وہ میٹرک کے طالب علم تھے۔ شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور آٹھویں جماعت کے زمانہ ہی سے نظمیں کہنے لگے تھے۔ جن کا موضوع بالعموم جہاد، شہادت، ایثار و قربانی اور بہادری ہوتا تھا۔ اسی دوران وہ جمعیت کی دعوت سے متعارف ہوئے۔ اور پھر تو گویا ان کا جینا مرنا جمعیت کے لئے ہو گیا۔ تنظیمی کاموں میں بڑھ چڑھ کر اپنے بڑے بھائی اور جمعیت کے ذمہ دار افراد کا ہاتھ بٹاتے۔ یوں تو یہ دونوں بھائی تھے۔ مگر اس قدر مثالی تعلق تھا کہ خدا نے ان کو آخری سانسوں تک کی مشترکہ رفاقت نصیب کی۔

شہید لولو الرحمان نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور بڑی بہن سے حاصل کی۔ بعد ازاں فتح پور مدرسہ میں پڑھتے رہے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۷ء تک نوشینگدی ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی اور میٹرک پاس کیا، بعد میں آئی کام (۱۹۶۹ء) پاس کیا اور پھر بی کام (۱۹۷۱ء) میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ سانولے رنگ اور ہلکے پھلکے جسم کے برق رفتار اور چاق و چوبند نوجوان تھے مختلف اسکولوں اور دیہات میں جمعیت کے یونٹ قائم کئے جن میں اہم مقامات نوشینگدی رائے پورہ، کالی گنج اور شعیب پور ہیں۔

لولو شہید کو ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر، ۱۹۷۰ء کے خوفناک طوفان سے متاثرہ علاقوں میں امدادی کام کے لئے بھیجا گیا۔ واپس آئے تو بڑے دردناک مناظر کا نقشہ کھینچا۔ بیان کرتے وقت خود بھی آبدیدہ ہو جاتے۔ اسلامی نظام تعلیم کے بارے میں وہ بڑا واضح ذہن رکھتے تھے اور اجتماعات میں اس پر بڑی مدلل اور مربوط گفتگو کرتے۔ جب فرخا بیراج کے مسئلہ پر جمعیت نے تحریک چلائی تو شہید نے اس میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۱ء کی سالمیت پاکستان کی جنگ میں تو وہ اپنے علاقے کی ایک نمایاں شخصیت بن کر ابھرے جمعیت سے ان کا

تعلق رفاقت کا تھا۔

ابراہیم شہیدؒ

اسلامی جمعیت طلبہ کے امیدوار رکنیت اور گورنمنٹ کالج نواکھالی اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر تھے۔ ابراہیم ابھی اسکول کے طالب علم تھے۔ ایک روز سرراہ ابوناصر سے کہنے لگے کہ آپ لوگ ہر وقت کس کام میں لگے رہتے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی تو بتائیں۔ میں بھی یہ کام کرنا چاہتا ہوں"۔ یہ سرراہ تعارف انہیں صراط مستقیم پر گامزن کر گیا اور اسی راستے پر چلتے چلتے دسمبر میں منزل شہادت پر پہنچ گئے۔

شہید الیاس احمدؒ

۱۹۶۵ء میں اپنے سکول کے استاد عبدالاول کی تحریک پر دعوت اسلامی سے متعارف ہوئے۔ ابتداً اجتماعات میں تعارف کرانے سے بھی شرماتے تھے، لیکن آگے چل کر وہ شعلہ بیان مقرر بنے۔ سامعین کے دلوں کی دھڑکنوں تک کو وہ اپنے الفاظ میں سمو کر تقریر کو دو آتشہ بنا دیتے۔ امانت جمع کرنے میں بھی انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ایک روز اثنائے گفتگو میں ایک ساتھی نے کہا: "مزہ تو جب ہے کہ آدمی اسلامی انقلاب کی جدوجہد کا تذکرہ اپنے لہو کی سرخی سے لکھے" الیاس جھٹ بول اٹھے: "ان شاء اللہ ایک روز ہم لکھیں گے"۔

اور الیاس نے اپنا یہ وعدہ پورا کر دکھایا اور ۱۸ دسمبر کو دریائے کرنافلی کے پل پر شہید کر دیئے گئے۔

شہید محمد تاج الاسلامؒ

محمد تاج الاسلام (مقام آدرش) تحصیل فرید گنج ضلع کومیلا، فرید گنج کے اسلامک سنٹر میں پڑھتے تھے۔ صحت مند اور پھرتیلے جسم کے مالک تھے اور ایک اچھے کھلاڑی تھے۔ مدرسہ لطیف گنج میں جمعیت کے ایک اجتماع میں شریک ہوئے جس سے متاثر ہو کر جمعیت میں شامل ہو گئے۔

بعد میں جمعیت کے رفیق بنے اور تحصیل فرید گنج کے ناظم رہے۔ ۷۰ء میں سید مودودیؒ کے پلٹن میدان ڈھاکہ میں جس جلسہ عام پر عوامی لیگی غنڈوں نے حملہ کیا تھا۔ اس میں تاج الاسلام کو بھی بہت سی چوٹیں آئی تھیں۔ اور وہ ایک ماہ تک ڈھاکہ ہسپتال میں زیر علاج رہے تھے ۷۱ء میں وہ البدر میں شامل ہو گئے اور عسکری تربیت حاصل کی۔ ۲۴ نومبر ۱۹۷۱ء ۴ رشوال کو وہ ایک معرکہ میں بھارتی فوج سے نبرد آزما تھے کہ بھارتی فضائیہ نے حملہ کر دیا۔ ایک گولی سینے میں اتر کر جام شہادت سے سرشار کر گئی۔ شہادت سے چند روز قبل مکتی باہنی نے ان کا گھر جلا دیا تھا اور سامان لوٹ لیا تھا۔

شہید محمد عبدالحقؒ

محمد عبدالحق کا تعلق آدرش تحصیل فرید گنج کے غریب گھرانے سے تھا۔ ان کے والد محمد عبدالرحمان صاحب نے انہیں لطیف گنج مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ ابھی داخل کے درجہ میں تھے کہ جمعیت میں شامل ہو گئے۔ بعد ازاں لطیف گنج یونٹ کے سیکرٹری رہے اکبڈی کے اچھے کھلاڑی تھے۔ اسلامی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے سبب عوامی لیگی غنڈوں کے ہاتھوں دو مرتبہ شدید مار برداشت کر چکے تھے۔ ملکی حالات دگرگوں ہوتے تو عبدالحق پہلے رضاکار فورس اور پھر البدر میں شامل ہو گئے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو نرائن گنج سے آتے ہوئے لاپتہ ہو گئے۔ ۱۹۸۴ء تک ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اغلب یہی ہے کہ وہ شہید کر دیئے گئے ہوں گے۔ ان کا گھر بھی مکتی باہنی کی دست برد سے نہ بچ سکا اور اسے لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔

شہید محمد سراجؒ

محمد سراج (کیاٹنا، تحصیل کسوا ضلع کومیلا) نے اپنے گاؤں کے سکول سے پرائمری جماعت پاس کی۔ پھر بی اے بی ہائی سکول سے پہلی پوزیشن میں میٹرک کیا۔ . . . . چاند پور کالج میں انٹر سائنس کے طالب علم تھے۔ معاشی اعتبار سے خستہ حال گھرانے سے تعلق تھا۔ کالج میں

پہنچتے ہی محمد سراج جمعیت کے قریب آئے اور رفیق بنے۔ ۱۷ء میں سال دوم میں پڑھتے تھے کہ ملکی حالات خراب ہوگئے "البدر" کا یہ جیالا ۲۴ر اکتوبر کی شب شر پسندوں کا تعاقب کرتے ہوئے دشمن کی جوابی فائرنگ سے شدید زخمی ہوا اور چند گھنٹوں کے بعد جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

شہید لطف الرحمٰنؒ

جمعیت کا نہایت فعال کارکن اور رفیق لطف الرحمٰن، جمال پور کالج میں سال دوم سائنس کا طالب علم تھا۔ جمال پور پر بھارتی فوج کا قبضہ ہوا تو وہ وہاں سے نکل کر اپنے دوسرے ساتھیوں سے جا ملنے کے لئے روانہ ہوا۔ راستے میں ہی تھا کہ اس کے کالج کے دو لڑکوں نے پہچان لیا اور پکڑ کر کشاں کشاں مکتی باہنی کی قتل گاہ میں لے گئے۔ جہاں دوسرے روز انتہائی بے رحمی کے ساتھ اسے سنگینیں مار مار کر شہید کر دیا گیا۔

شہید انوار حسینؒ

انوار حسین ۱۴ سال کی عمر میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ وہ نرشینگدی ماڈل سکول کے طالب علم تھے۔ اپنے والد جناب تفضل حسین کی توجہ پر جمعیت میں شامل ہوتے۔ چند ہی ماہ بعد ۱۹۷۱ء کا خونیں معرکہ شروع ہوگیا۔ وہ رضاکار فورس میں شامل ہوگئے۔ جب "البدر" منظم ہوئی تو اس کے فعال مجاہد کہلائے۔ دسمبر کے وسط میں جب پاکستانی فوج نرشینگدی سے پسپا ہوگئی تو انوار حسین اپنے والدین کو لے کر کشتی کے ذریعہ بدیامارا" جا رہے تھے کہ راستے میں مکتی باہنی کے غنڈوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر ساری رات مقامی سکول میں مجبور ماں کے سامنے انسانیت سوز تشدد کرتے رہے اور پھر خنجر مار کر تڑپتے ہوئے جسم کو دریائے سیگھنا کی خونی لہروں کے سپرد کر دیا۔ سراپا احتجاج ماں کی مار مار کر ہڈیاں توڑ ڈالیں آج بھی ان ٹوٹی ہڈیوں سے ممتا کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ غنڈوں نے ان کے گھر کا چراغ ہی گل نہیں

کیا گھر بھی لوٹ کر ویران کر دیا۔

امین الاسلام شہیدؒ

جمال پور کے سب سے زیادہ فعال اور عسکری اعتبار سے نہایت ذہین امین الاسلام کا مادھوپور سے تعلق تھا جمعیت کے رفیق اور البدر کے کمپنی کمانڈر تھے۔ ۱۴ دسمبر کو ڈھاکہ کی جانب مارچ کرنے والے دستے میں شامل تھے۔ میرپور پہنچے تو مکتی باہنی سے ٹکراؤ ہو گیا اور اس معرکہ میں جام شہادت نوش کیا۔

شہید عبدالرزاقؒ

کمال پور کا سقوط ہوا تو البدر کے مجاہدین کا ایک گروپ بخشی گنج سے ہوتا ہوا جمال پور پہنچا۔ کمال پور کے محاذ پر میجر محمد ایوب شہید ہوئے تھے۔ بھارتی مسلح افواج تیزی سے پیشقدمی کر رہی تھی۔ دریائے برہم پتر کے اس پار سے ان کی توپوں کے گولے آ کر پھٹ رہے تھے۔ بھارتی افواج ہیلی کاپٹروں سے بھی اتر رہی تھیں۔

یہاں سے البدر ڈھاکہ کی جانب واپس آ رہے تھے اور اسی واپسی میں تنگائل سے کچھ فاصلہ پر دو روز تک لڑتے رہے۔ یہاں آ کر پاک آرمی نے انہیں کہا: "تم لوگ ہمارے ساتھ چلو اور اگر یہ منظور نہیں تو اپنے بچاؤ کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔"

البدر کے . . . ایک گروپ نے روپوش ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ اسی گروپ میں عبدالرزاق بھی تھے۔ وہ بائیس برس کے نوجوان اور نالیتا باڑی جمعیت کے بہترین کارکن تھے۔ البدر سے جدا ہونے کے بعد وہ مکتی باہنی کے ہتھے چڑھ گئے۔ کئی ماہ بعد پتہ چلا کہ انہیں نالیتا باڑی کے باہر درختوں کے ایک جھنڈ میں شہید کرنے کا باقاعدہ "جشن" برپا کیا گیا جس میں مکتی باہنی کے غنڈوں نے تشدد کا ہر طریقہ آزماتے ہوئے اس گریل نوجوان کو شہید کر دیا۔

شہید اسماعیل حسینؒ

شہید اسماعیل حسین بالیاکمور (تحصیل کمارکھلی) کے رہنے والے تھے۔ عالیہ مدرسہ کشتیا سے

فاضل پاس کرنے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس سال آخر کے طالب علم تھے۔ ۶۵ء میں جمعیت کے کارکن اور ۱۷ء میں رکن بنے۔ ایوب کالونی ڈھاکہ کے نگران تھے۔ تحریک اسلامی کے معروف نوجوان شاعر تھے۔ ان کے تین مجموعے بونر تھان رہبر، اور آل نو تابرکیتن اڑ سے شائع ہو چکے ہیں۔ نثر میں ان کا موضوع تاریخ اور سیاسیات تھے۔

البدر کے ایک بیدار مغز مجاہد تھے۔ بنگالیوں اور بہاریوں کے درمیان امن سے متعلق ایک مشن پر گئے کہ بہاریوں نے شہید کر دیا۔

شہید محمد نور الایمانؒ

محمد نور الایمان پابھٹی (تحصیل کمار کھلی) میں پیدا ہوئے۔ وہ بیک وقت مدرسہ عالیہ کشتیا میں کامل کے طالب علم اور گورنمنٹ کالج کشتیا میں بی اے کے طالب علم تھے۔ جمعیت میں شامل ہوئے اور رفیق بنے ۸ دسمبر ۱۷ء کو بھارتی فضائیہ کے حملوں کے بعد کشتیا چھوڑ کر ناٹور چلے گئے وہاں سے الم ڈھانگا ہوتے ہوئے بیبہ پہنچے۔ جہاں ایک شناسا نے دھوکے سے مکتی باہنی کے حوالے کر دیا۔ مگر وہ رات کے وقت جس کمرے میں محبوس تھے اس کی کھڑکی توڑ کر فرار ہو گئے پھر ان کا علم نہیں ہو سکا۔ غالب امکان یہی ہے کہ وہ کسی اور جگہ شہید کر دیئے گئے ہوں گے۔

پروفیسر رفیع الدین شہیدؒ

جمعیت کے سابق رکن اور اسلامک ریسرچ اکیڈیمی ڈھاکہ شاخ کے ریسرچ اسکالر تھے جب آرمی ایکشن شروع ہوا تو ایک روز گھر کے لئے سودا سلف لینے جا رہے تھے کہ بہاریوں کے ایک گروہ نے ان کو میرپور (ڈھاکہ) میں محض بنگالی ہونے کے جرم میں پکڑ کر قتل کر دیا اور لاش کنوئیں میں پھینک دی۔ شہید رفیع الدین تحریک اسلامی کا انتہائی قیمتی اثاثہ تھے۔

شہید حافظ محمد یونسؒ

محمد یونس، حفیظ الرحمان صاحب (کالی گنج) کے ہاں اگست ۴۹ء میں پیدا ہوئے۔

ابتداً والد صاحب سے قرآن پاک پڑھا۔ پھر بازالیہ (تحصیل کا پاتیا) کے مدرسے سے دس پارے حفظ کئے اور مصطفےٰ گنج مدرسہ سے پورا قرآن پاک حفظ کیا۔ کمار دی مدرسہ سے داخل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۹ء میں جمعیت میں شامل ہوئے۔ جمعیت کے رفیق تھے۔ جہاد کے دوران والدہ سے کہا کرتے تھے۔ امی سب سے افضل موت شہادت کی موت ہے۔ آپ میرے لئے اس کی دعا کیا کریں۔ ۱۸ دسمبر کو وہ اس رتبہ بلند سے سرفراز ہو گئے۔ مکتی باہنی کے ہاتھوں شہادت پائی۔

شہید ابو ظفر

شہید ابو ظفر مولانا محمد سراج الحق صاحب کے ہاں ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھر ضلع چاٹگام کی تحصیل رانگونیا کے گاؤں گھاٹ بیک میں تھا۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم دینی مدرسہ میں حاصل کی اور چھوٹی عمر میں ہی قرآن مجید کے دس پارے حفظ کر لئے۔ ۱۹۶۰ء میں پرائمری سکول کا امتحان وظیفہ کے ساتھ پاس کیا اور رانگونیا کالجیٹ ہائی سکول سے ۱۹۶۵ء میں اوّل پوزیشن لے کر میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اسی سال کالج میں داخلہ لیا۔ مگر گھریلو معاشی حالات کے سبب کچھ عرصہ کے لئے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس لئے ۱۹۷۰ء میں ڈگری کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۶۸ء میں وہ کالج یونین کی انتخابی مہم کے دوران جمعیت سے متعارف ہوئے اور پھر گویا اپنی تمام صلاحیتیں اس کی نذر کر دیں، چنانچہ دو ماہ بعد ہی انہیں کالج یونٹ کا ناظم مقرر کر دیا گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد انہیں جمعیت کا ناظم بنا دیا گیا۔ تحصیل میں اشتراکیت نواز گروہ کا خاصا کام تھا، لیکن اس کے باوجود ابو ظفر کی مسلسل جد وجہد کے نتیجہ میں یہاں خاطر خواہ تعداد میں جمعیت کے حلقے قائم ہو گئے۔ مگر کالج یونین پر بدستور چھاترو لیونین (بھاشانی گروپ) کا قبضہ رہا۔ جس کی اساس غیر اسلامی ثقافتی پراپیگنڈے پر تھی۔ ابو ظفر نے اس کے توڑ کے لئے ایک ذیلی تنظیم بنائی جس کا نام "کشور شبھا" (یعنی نوجوان سوسائٹی) تھا جس کے فرائض میں اسلامی ثقافتی سرگرمیوں کو منظم کرنا اور ضرورت پڑنے پر دشمن کی غنڈہ گردی کا جواب دینا

تھا۔ ابوظفر نے جمعیت میں رفاہ عامہ کا شعبہ بھی قائم کیا جو مہموں کی صورت میں مستحق، اپاہج اور بیمار لوگوں کی مدد کو پہنچتا۔ یہ سب کچھ ایک فرد کی مقامی حکمت عملی تھی جو اپنے نتائج کے اعتبار سے مؤثر اور کامیاب رہی۔ وہ اگرچہ کالج یونین کے ممبر نہ تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے طلبہ کے مسائل کو حل کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس حوالے سے وہ طلبہ میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے موقع پر انہوں نے انتخابی مہم میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۱ء کا سلگتا ہوا سال آیا۔ قوم کو شعلوں کی لپیٹ سے نکالنے کے لئے جمعیت کے پرعزم کارکنوں کی ٹیم میدان میں اتری اور اقتدار پرستوں اور قوم پرستوں سے معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ سالمیتِ پاکستان کی اس جنگ اور حفاظت دین کے اس معرکے میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے انہوں نے اپنے ہاں البدر کی تنظیم قائم کی۔ انہی دنوں ایک روز گھر میں کھانا کھاتے ہوئے ان کی بھائیوں سے تلخ کلامی ہوگئی۔ جو عوامی لیگ کے پرجوش حامی تھے۔ نتیجتہً ابوظفر نے یہ کہہ کر گھر سے رشتہ توڑ لیا کہ "میرا بھائی ہونے کے لئے ایمان کا رشتہ ہونا ضروری ہے"

۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وہ بھارتی فضائیہ کے وحشیانہ حملے کے خلاف تحریک اسلامی کے زیر اہتمام ایک جلوس میں شریک ہوئے۔ جلوس ابھی کوئی بیس گز کا فاصلہ طے کر پایا ہوگا کہ بھارتی فضائیہ کے روسی ساخت کے مِگ طیاروں نے اندھا دھند بم اور گولیاں برسانا شروع کر دیں بم کے دھماکے سے بازار کی دکانیں ہوا میں اچھلیں اور زمین پر آگریں جن کے نیچے دب کر دس دیگر شہریوں کے ساتھ ابوظفر بھی شہید ہوگئے۔ ان کی شہادت کی خبر ان کے والد کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی اور والدہ ہمیشہ کے لئے دل کی مریضہ بن کر رہ گئی ہیں۔

ابوظفر خلیق، ملنسار اور مجسمہ ذہانت تھے۔ وہ سائنس کے نمایاں طالب علم، ایک اچھے مقرر اور ایک ابھرتے ہوئے اسکالر تھے، ان کی ذات سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ان کے لئے شہادت سے سرفراز ہونا لکھا تھا۔

شہید حافظ وحید الزمانؒ

ان کے بارے میں شمس صاحب نے بتایا کہ:

"وحید الزمان ضلع فرید پور کے رہنے والے تھے ۔قرآن پاک حفظ کرنے میں معمول سے زیادہ عرصہ لگ گیا۔ اس لیے پرائمری پاس بھی نہیں کر سکے۔ گھر کے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ دینی مدرسہ کی تعلیم حاصل کرنے کا بھی کوئی خاص مصرف دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس لیے انہوں نے میرے پاس رہ کر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے ان کو اپنے پاس رکھ لیا۔ ذہین طالب علم ثابت ہوتے۔ ان کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ انہوں نے میرے پاس ایک ہی سال پڑھنے کے بعد میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ حالانکہ اکثر دبیشتر وہ ہمارے ساتھ جمعیت کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے بعد خود ہی انٹر کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلے کا سوچ رہے تھے کہ گھر کے حالات نے ملازمت کے حق میں فیصلہ دیا۔ سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے، وہ ڈیوٹی سے واپس آکر شام کے وقت جمعیت کے کاموں میں پورا پورا ہاتھ بٹاتے۔

۱۹۶۹ء کی بات ہے ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کا پلٹن میدان میں جلسہ ہونا تھا۔ صدارت جناب نور الامین کو کرنا تھی۔ مگر عوامی لیگی جن کا اس جلسہ سے کوئی تعلق نہ تھا اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ صدارت کی کرسی پر نور الامین نہیں بیٹھیں گے، شیخ مجیب کی تصویر رکھی جائے گی، (شیخ مجیب ان دنوں جیل میں تھے) چنانچہ تلاوت کے دوران ہی میں ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا۔ میں سٹیج کے پاس کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ عوامی لیگی غنڈوں نے جلسہ گاہ میں لگے ہوئے بینروں کو نذر آتش کر دیا۔ ان میں کلمہ طیبہ کے بینر بھی تھے۔ ایک گروپ سٹیج پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھا اور ایک غنڈے نے آتے ہی میرے سر پر ڈنڈا مارا۔ قریب ہی حافظ صاحب کھڑے تھے۔ انہوں نے غنڈوں سے ہی ڈنڈا چھینا اور ان پر پل پڑے۔ غنڈوں کو سٹیج چھوڑ کر چلے جانے ہی میں عافیت نظر آئی۔

وحید الزمان باقاعدہ البدر میں نہ تھے۔ مگر دشمن کی سرگرمیوں کی خبریں لا کر دینے میں انہوں نے کمال ذہانت اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد ایک روز وہ ملازمت پر جا رہے تھے کہ صدر گھاٹ سے مکتی باہنی نے ان کو گرفتار کر لیا اور سر بازار تشدد کرنے کے بعد گولی مار کر شہید کر دیا اور میت نہر میں پھینک دی۔"

شہید محمد حسین احمدؒ

ضلع نواکھالی کا گاؤں جگن بادھو ہے۔ یہاں مولانا عبدالرب کے ہاں محمد حسین احمد پیدا ہوئے۔ کم گو، بااخلاق ہونہار اور عملی نوجوان تھے۔ ان کے والد مدرسہ قادریہ کے بانی تھے۔ قرآن پاک کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسلامیہ مدرسہ نواکھالی میں داخل ہوئے۔ یہ دوسرے سال کے طالب علم تھے کہ ان کی شادی ہوگئی۔ اسی عرصہ میں اسلامی جمعیت طلبہ میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۷۱ء میں حالات خراب ہوئے تو محمد حسین سر پر کفن باندھ کر البدر میں شامل ہوگئے۔ ۵ر دسمبر کو ٹولیرسے گرفتار ہوئے۔ ان کو ناریل کے درخت کے ساتھ باندھ کر گولی ماری گئی۔ اس وقت محمد حسین ۲۴ برس کے تھے۔

شہید غلام مولاؒ

غلام مولا، چر درویش (نواکھالی) میں نورالاسلام کے ہاں پیدا ہوئے۔ پرائمری اسکول ہی سے جمعیت کے اجتماعات میں شریک ہوتے رہے اور مڈل اسکول میں جاکر باقاعدہ جمعیت میں شمولیت اختیار کی۔ کالج میں پہنچے تو البدر کے ساتھ وابستہ ہوئے۔

۲۷ رمضان (۱۷ نومبر ۱۹۷۱ء) کی رات کو نماز تراویح کے بعد گھر میں آئے تو ان کی والدہ نے بڑی بے چینی میں کسی نادیدہ خطرے کو بھانپتے ہوئے کہا: "بیٹا! آج رات گھر میں نہ سونا مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے"۔ مگر دلیر بیٹے نے اسے والدہ کا واہمہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ اور یہ کہہ کر کہ "موت کا ایک دن مقرر ہے"۔ حسب معمول برآمدے میں سو گئے۔ رات کے دو بجے کچھ سائے دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہوئے اور سنگینوں کی نوک سے غلام مولا کو اٹھا کر باہر لے آئے۔ تھوڑی دور جاکر تین سنگینیں غلام مولا کے پیٹ میں گھونپ دیں۔ چاروں اطراف میں اس نوعمر جسم کا لہو پھیل گیا۔ علی الصبح کھیتوں کے بیچ میں ان کی میت ملی۔ اس وقت ان کی عمر صرف سولہ برس تھی۔

شہید داؤد احمدؒ

داؤد احمد چڑ ہیڑو (نواکھالی) کے ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد جمال حق دیوان علاقے کی بااثر شخصیت تھے۔ داؤد شروع ہی سے کمزور طلبہ کی مالی مدد کرنے میں قابلِ رشک مزاج کے حامل تھے۔ درمیانہ قد کا یہ نوجوان اپنی ذہانت کی بدولت اپنے ساتھیوں میں ہر دلعزیز تھا۔ دینی مدرسہ کی تعلیم کے بعد داؤد کالج میں پہنچے اور پہلے روز ہی اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں دو مرتبہ ان پر عوامی لیگی غنڈوں نے تشدد کیا، لیکن وہ دعوتِ حق کا کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۱ء میں انہیں راستے پور جمعیت کا انچارج نشر و اشاعت مقرر کیا گیا۔ چند ماہ بعد البدر میں شامل ہو کر عسکری تربیت حاصل کی تاکہ ملک کو مجیب کے غنڈوں سے بچایا جا سکے۔ ۱۸ نومبر کو چوموہانی سے واپس آ رہے تھے کہ مکتی باہنی نے گولی مار کر شہید کر دیا۔ اس وقت وہ ۱۸ برس کے تھے۔

شہید ابو طاہرؒ

ابو طاہر کا تعلق موضع ایاز پور (نواکھالی) سے تھا۔ ان کے والد مفیض الحق ایک عالمِ دین اور تحریکِ اسلامی کے فعال کارکن تھے۔ ابو طاہر بی اے کے طالب علم اور اسلامی جمعیت طلبہ کے رفیق تھے۔ ملک کی آزادی برقرار رکھنے اور غداروں کی شورش دبانے کے لئے البدر کا قیام عمل میں آیا تو فرض کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے طاہر اس میں شامل ہو گئے۔ ہندو فوج اور غدار فورس نے جب دلال بازار کیمپ کو قبضے میں لیا تو ابو طاہر اپنے والد کے ہمراہ دوسرے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ایک ہندو دکاندار نے ان دونوں کو روک لیا اور مجیب کے غنڈوں کے حوالے کر دیا۔ یہیں پر ان کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ اس وقت ابو طاہر کی عمر اکیس سال تھی۔

شہید صدیق احمدؒ

ندیرپور (نواکھلی) میں ایک عام کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے پر کاشت کاری شروع کی اور تحریکِ اسلامی کے کارکن بنے۔

۱۹۷۱ء میں جب ملک کی بدبختی کا دور شروع ہوا تو صدیق احمد رضا البدر میں شامل ہوگئے اور تربیت حاصل کرکے بھور مارکیٹ میں چلے آئے۔ ۱۹ راگست کو وہ دشمن کے ساتھ ایک جھڑپ میں زخمی ہوگئے۔ دوست ان کو اٹھا کر فینی ہسپتال لارہے تھے کہ دشمن نے راستے ہی میں انہیں زخمی حالت میں چھین لیا اور فینی کے قریب سے گزرنے والی ندی پر لے جاکر ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دیا۔ اس ندی میں بہت سے شہیدوں کا لہو شامل ہے، بہت سی لعشیں اس کے پیٹ میں محفوظ ہیں، روزِ محشر ندی کا پانی گواہی دے گا کہ اس میں یقیناً البدر کے لاتعداد شہیدوں کا لہو ایک پکار، ایک استغاثہ اور سعادت کی ایک گواہی بن جائے گا۔

حافظ نور الزمانؒ

آشادیہ (نواکھالی) میں سید احمد کے ہاں نور الزماں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی بچپن ہی میں انتقال کرگئے۔ نور الزماں نے چھتی گنج میں حافظ امیر حسین سے قرآن مجید حفظ کیا۔ بعد از اں سوناگاچھی مدرسہ میں داخل ہوئے تو اسلامی جمعیت طلبہ سے متعارف ہوئے مدرسہ میں جمعیت طلبہ عربیہ کے صدر رہے۔ ۱۹۶۹ء میں ان کی شادی ہوئی تھی۔

۱۹۷۱ء میں البدر میں شامل ہوئے اور کچھ عرصہ کے لئے کومیلا متعین رہے۔ پھر وہاں سے میلونیہ (فینی) آگئے۔ ۶ دسمبر کو مانگ جادی پہنچے۔ یہاں مکتی باہنی کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تخریب کار ساری رات ان پر تشدد کرتے رہے۔ سخت سرد رات تھی۔ صبح جب یہ لوگ انہیں

میسر ہاٹ لے کر جانے لگے تو انہوں نے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔ ظالموں نے اس پر اکتفا نہ کیا، بلکہ ان کی میت کو درخت سے لٹکا کر ان کے چہرے کو مسخ کیا گیا۔ شہادت کے وقت حافظ صاحب کی عمر ۲۸ سال تھی اور وہ ایک بچی کے باپ تھے۔

شہید محمد مصطفےٰ ارح

محمد مصطفےٰ چھلونیا (نواکھالی) کے ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نوعمری ہی میں عملی زندگی میں قدم رکھا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے پرجوش معاون تھے اور ہر مشکل میں مالی اور عملی مدد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے۔ البدر میں شامل ہو کر فینی کے ٹریننگ کیمپ میں تربیت مکمل کی۔ ستمبر میں ایک روز فاضلیہ پور کیمپ کے ساتھیوں کے لئے سودا سلف لے کر جا رہے تھے کہ راستے میں مکتی باہنی کے غنڈوں نے ان کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ یہ زمین پر گر پڑے۔ اسی اثنا میں پاک آرمی کے ایک گشتی قافلے کا وہاں گزر ہوا تو انہیں اٹھا کر ہسپتال لے گیا، مگر دو گھنٹے بعد اکیس سال کی عمر میں محمد مصطفےٰ شہادت کے رتبے پر فائز ہو گئے۔

شہید مصطفےٰ کمالؒ

مصطفےٰ کمال کی پیدائش پوربی چھلونیا (نواکھالی) میں ہوئی۔ شاکر ہائی اسکول سے میٹرک کے دوران میں اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ ہو گئے۔ بعد ازاں دشمن کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے فینی البدر کیمپ چلے آئے، تاکہ تاریخ میں ان کا نام ابا ہیچ "محبِ وطنوں" کی طرح ذلت آمیز غلامی کی صورت میں نہ لکھا جائے۔ تربیت حاصل کرنے کے بعد انہیں کاجلیہ میں متعین کیا گیا۔ یہیں ایک آپریشن پر روانہ ہوئے۔ راستے میں دشمن سے مڈبھیڑ ہو گئی، گولی لگی تو گر پڑے۔ اسی لڑائی کے دوران دشمن نے شدید زخمی حالت میں قریبی ندی میں گرا کر بہا دیا۔ جب اس لڑائی میں مکتی باہنی کو شکست ہو گئی تو ساتھیوں نے مل کر ان کی میت ندی سے نکال لی اور سولہ سالہ شہید کی میت کو دیہات کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

شہید احمد کریمؒ

یہ دولت کاندی (نواکھلی) کے رہنے والے تھے۔ بڑے دین دار آدمی تھے جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ جب ملک سکون نے کروٹ لی تو احمد کریم فینی گئے اور رضاکار فورس میں شامل ہوگئے۔ ایمان اور ملک کو بچانے کے لئے بندوق چلانے کی تربیت حاصل کی۔ کمانڈر کے طور پر موتی گنج کیمپ میں آئے۔ سارا عرصہ داد شجاعت دیتے رہے۔ تنظیم اور منصوبہ سازی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ تخریبی کارروائیوں کے جواب کے لئے انہوں نے قابل رشک منصوبے بنائے اور کامیابی حاصل کی، لیکن جب اقتدار ہی شکست کھا گیا تو احمد کریم بھی اپنے کیمپ سے گرفتار ہوئے۔ اللہ کا یہ سپاہی فائرنگ اسکواڈ کے سامنے لایا گیا۔ چند لمحوں بعد شہادت نے ان کے ہونٹ چوم لئے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۹ سال تھی۔ الشمس کے معروف کمانڈر تھے۔

شہید روح الامینؒ

روح الامین نومجر (نواکھالی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا مولانا اشرف علی، نومجر دینی مدرسہ کے بانی و پرنسپل تھے۔ روح الامین صحت مند اور توانا جسم رکھنے والے تھے۔ مڈل سکول میں پہنچے تو جمعیت کے کارکن بنے۔ جلسے جلوسوں میں نعرے لگوانا ان کی اہم دلچسپیوں کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۷۱ء میں البدر میں شامل ہوئے۔ نکمی پور کیمپ سے تربیت حاصل کرنے کے بعد پیادہ پور کیمپ میں خدمات انجام دیں۔ اس کیمپ پر دشمن نے کئی حملے کئے اور ہمیشہ شکست کھائی۔ آخر جب ہندوستانی فوج پاکستان میں گھس آئی، تو البدر کیڈٹ ناکافی اور فرسودہ اسلحہ کے سبب غیر مؤثر ہوگئے۔ اس وقت مجاہدین اِدھر اُدھر بکھرنا شروع ہوئے روح الامین کو مجیب باہنی نے گرفتار کرلیا اور آسوندھی کیمپ لے جایا گیا۔ ۸، دسمبر کو دیگر آٹھ البدر مجاہدوں کے ہمراہ ایک قطار میں کھڑا کرکے انہیں اسٹین گن کی باڑ مار کر بھون دیا۔ اس وقت روح الامین اٹھارہ برس کے تھے۔

شہید پروفیسر خلیل اللہ ؒ

خلیل اللہ صاحب ڈھاکہ کے ایک مقام زرسندی میں پیدا ہوئے۔ اسلامی انقلاب کے اس مجاہد کی زندگی ایک ایسے پھول کی مانند تھی جس کی خوشبو ہر سعید روح کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

جمعیت کے ساتھی کبھی گھبرا جاتے تو سکون کی تلاش میں اپنے محترم بھائی پروفیسر خلیل اللہ کے پاس چلے جاتے جو اپنی اثر انگیز مسکراہٹ کے ساتھ موقع محل کے مطابق قرآنی آیت حدیث رسول مقبولؐ یا علامہ اقبال کے کسی شعر کا بنگلہ میں مفہوم بیان کر کے ساری پریشانیاں دھو ڈالتے۔ سب کو چائے پلاتے اور ہلکے پھلکے انداز میں تحریک اسلامی کے مراحل کے کسی نہ کسی پہلو کو اور نکھار دیتے۔ نہایت خوش اخلاق اور دل کش شخصیت کے مالک تھے۔ جب ساتھی ان سے جدا ہوتے تو دل سے تمام بوجھ اتر چکے ہوتے اور خلیل اللہ کا نقش دل پر پہلے سے زیادہ گہرا ہو جاتا۔

خلیل اللہ جمعیت کے سابق رکن تھے۔ مدرسہ عالیہ اور پھر ڈھاکہ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ ان کی فجر کی اذان اس قدر پرسوز ہوتی تھی کہ نیند کے ماروں کو نماز پڑھ کر ہی قرار آتا تھا مجال نہیں تھی کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کی آواز کان میں پڑ جاتے اور کارکن نماز کے لئے اٹھ کھڑا نہ ہو۔ قرآن پاک صحیح تلفظ کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرتے۔

خلیل اللہ صاحب نے ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ کامل کا امتحان پاس کیا اور پھر ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ علوم سیاسیات میں داخلہ لے لیا اور سلیم اللہ ہال میں رہنے لگے۔
یہیں ان کے قلب سلیم نے دعوت حق کو قبول کیا۔ اب ان کی زندگی کا رخ متعین ہو چکا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سے انہوں نے ایم اے سیاسیات کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی فطری ذہانت اور فہم و فراست کے جوہر کھلنے لگے۔ خلیل صاحب نے اسلامی انقلاب کو اپنی زندگی کا اصل مقصد بنانے کا عزم صمیم کیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد جمعیت کے رکن بن گئے۔

جو کام بھی ان کے سپرد کیا جاتا۔ پورے انہماک اور کامل یکسوئی کے ساتھ ایک ذمہ دار

فرد کی حیثیت سے کرتے ۔ وہ کارکنوں کو نصیحت کرنے والے قائد کے طور پر نہیں، بلکہ اپنے عمل سے دوسروں کو عمل پر آمادہ کرنے والی شخصیت تھے ۔

گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود یونیورسٹی کے تحریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتے اور اکثر اول آتے۔ انہوں نے سونے کے کئی تمغے بھی حاصل کئے ۔ ہمہ جہت اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ تعلیمی زندگی سے فارغ ہوئے تو ترسندی کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے اور بہت جلد عمدہ اخلاق شگفتہ اور حسن کارکردگی کے باعث طلبہ اور عوام میں مقبول ہو گئے ۔ یہ بات جہاں تحریک اسلامی کے کارکنان کے لئے قابل تقلید تھی، وہاں دشمنوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ تحریک کے لوگ ان کو اپنے قریب دیکھنا چاہتے تھے، مگر دشمن ان کو نظروں سے اوجھل کرنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں جب تحریک اسلامی کو افراد کار کی ضرورت پڑی تو سب سے پہلے جس فرد نے اپنی ملازمت کو چھوڑ کر اس پکار پر لبیک کہا۔ وہ خلیل شہید ہی تھے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء میں وہ ترسندی کے علاقے سے گرفتار کئے گئے ۔ دشمن ان کو ذہنی و جسمانی اذیت میں مبتلا دیکھ کر اپنی تسکین نفس کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ان کے گلے میں جوتوں کا ہار پہنا کر بازار میں گھمایا گیا، ان پر پتھراؤ کیا گیا، حتیٰ کہ سگریٹ سے جسم کو داغا گیا۔ سنگینوں سے کچوکے دیئے گئے ۔ مطالبہ ایک ہی تھا کہ جے بنگلہ کا نعرہ لگاؤ۔ مگر اس کے جواب میں ہر بار "اللہ اکبر" کے سوا کچھ اور بلند نہ ہوا۔ حق کے اس پرستار نے جب حق سے سرمو انحراف نہ کیا تو کم ظرف دشمن نے جھنجھلا کر سینے میں سنگین اتار دی۔ اللہ کا خلیل اللہ کے دربار میں حاضر ہو چکا تھا۔ روح القدوس بھائی بھی ان کے ساتھ ہی شہید کئے گئے۔

خلیل اللہ کی شہادت سے تحریک اسلامی ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گئی۔ جو قوموں کو حیات نو بخشا کرتی ہیں تاہم وہ اپنے لہو سے تاریخ کے صفحات پر جو واقعہ رقم کر گئے ۔ وہ داستان عزیمت کا ایک روشن باب ہے جس سے آنے والی نسلیں رہنمائی حاصل کرتی رہیں گی۔

شہید سلطان محمود

ٹوپر کے علاقے میں وڈیوڑہ کے مقام پر سلطان محمود نے جنم لیا۔ دینی مدرسہ میں تعلیم کے دوران جمعیت کے رفیق بنے ۔ البدر میں شامل ہو کر میر گنج کیمپ میں تربیت

حامل کی بہت سے محاذوں پر داد شجاعت دی۔ سانحۂ سقوط کے بعد مکتی باہنی نے انہیں گرفتار کرتے ہی گولی مار کر شہید کر دیا۔ شہادت کے وقت وہ سترہ سال کے تھے۔

شہید عبدالمتین رح

عبدالمتین نے ضلع نواکھلی کے گاؤں چھینی گنج میں پرورش پائی۔ آپ کے والد کا نام حافظ عبدالحلیم تھا۔ ابتدائی تعلیم دینی مدارس میں حاصل کی۔ نرم طبیعت اور قابلِ رشک صحت کے حامل اس نوجوان کو اللہ تعالیٰ نے آرٹ کا اچھا ذوق بھی عطا فرمایا تھا۔ ابتدائی طبی امداد کے بارے میں ذاتی دلچسپی سے معلومات حاصل کیں تاکہ وہ دہاں آنے والی آفاتِ سماوی میں خدمتِ خلق کا فریضہ انجام دے سکیں۔

۱۹۶۸ء میں اسلامی جمعیت طلبہ سے متعارف ہوئے اور پھر سرفروشوں کی طرح اسلامی انقلاب کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ دعوتِ اسلامی کے شعور نے ان کے دل و دماغ میں ہل چل مچا دی تھی۔ اس لئے وہ انسانی نجات کے لئے صرف اسلام ہی کو صراطِ مستقیم سمجھتے ہوئے مصروفِ عمل ہو گئے۔

۱۹۷۱ء میں عبدالمتین البدر سے منسلک ہوئے اور تربیت حاصل کرنے کے بعد بھوریات کیمپ پر متعین ہوئے۔ ایک روز کیمپ کے تمام کیڈٹ اپنے کاموں میں مصروف تھے کہ قریب سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ سب لوگ پوزیشنیں لے کر بیٹھ گئے۔ عبدالمتین چیتے کی طرح چھلانگ لگا کر کیمپ کی چھت پر چڑھ گئے۔ ان کی بندوق جاگ اٹھی اور مجیب باہنی کے ساتھ باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ کافی دیر تک دونوں اطراف سے فائرنگ ہوتی رہی۔ کوئی بھی فریق شکست تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ مجیب باہنی نے کیمپ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اسی دوران میں ایک سنسناتی ہوئی گولی عبدالمتین کے سر میں لگی اور وہ بے ساختہ کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے گر پڑے اور دوسرے لمحے ان کا اس دنیا سے رشتہ کٹ چکا تھا۔ شہادت کے وقت ان کی عمر بائیس سال تھی۔

عبدالمتین قرآن مجید کے بڑے اچھے قاری اور شاعر تھے۔ ان کی ایک کتاب "ہدایۃ"

کے نام سے زیرِ تصنیف تھی۔ غریبوں کی مدد کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ شہادت سے ایک دن قبل انہوں نے اپنے سے متعلقہ تمام مالی حسابات کی تفصیل لکھ کر اپنی ڈائری میں رکھ دی تھی جو شہادت کے بعد ملی۔

شہید نظام الدینؒ

صوفی بہاؤ الدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کا گھر ڈانٹ پور دیناج پور (رائے پور) میں تھا۔ ان کا گھرانہ علم دین کی خدمت میں معروف تھا۔ والد مسجد کے امام تھے۔ تنگ دست تھے، مگر بڑے قانع اور صابر وشاکر۔ نظام الدین سانولے رنگ اور درمیانے بدن کے نوجوان تھے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ بعد ازاں قصبہ ٹونگی کے دینی مدرسے سے فراغت پائی اور پھر رائے پور کے مدرسہ عالیہ میں داخل ہوئے۔

بچپن ہی سے جمعیت کے اجتماعات میں شریک ہوتے رہے جس کے نتیجہ میں حق کو پہچانا اور جمعیت کے کارکن بن گئے۔ بلاخوف بات کہنا ان پر ختم تھا۔ اشاعتِ اسلام کے کام میں ہر وقت مصروف رہتے۔ علیحدگی پسند طلبہ ان کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتے رہے، مگر وہ ان دھمکیوں کی پرواہ کئے بغیر سراپا تحریک بنے رہے۔ بعد ازاں البدر میں شامل ہوئے۔

۱۸ نومبر کو وہ رائے پور منڈی کے بس اسٹاپ پر کھڑے تھے کہ مکتی باہنی کے چند افراد نے گھیرے میں لے لیا اور سر پر بوتل مار کر زخمی کر دیا۔ خون بہنے لگا۔ نظام الدین اسی عالم میں اپنے گھر کی طرف لپکے، لیکن غنڈوں نے دوبارہ پکڑ لیا اور پیٹ میں چھری گھونپ دی اور میت کو ایک نالے میں پھینک دیا۔ شہادت کے وقت وہ بائیس برس کے تھے۔

شہید روح الامینؒ

شہید روح الامین کا تعلق نواکھلی کے ایک کسان گھرانے سے تھا۔ منگل کاندی اسکول سے میٹرک کیا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں فعال ہونے کے باوجود تعلیم میں ہمیشہ پوزیشن اچھی رہی۔ علاوہ ازیں بچپن ہی سے ان میں دینی رجحان، نماز سے گہرا تعلق اور اخلاقی

قدروں کی پاسداری تھی۔ دعوتِ دین کے کاموں میں پیش پیش رہتے۔

فینی کالج میں داخلہ لیا تو جمعیت سے تعلق قائم ہوا اور کارکن بنے۔ ۱۹۷۱ء میں اسلام دشمن قوتوں کی سرگرمیوں نے زور پکڑا تو اسلامی قوتوں کے لیے کام کرنا مشکل ہوگیا ہندوستان سے آنے والے شرپسندوں سے مقابلہ کے لئے البدر قائم ہوئی تو روح الامین نے پورے عزم و جوش کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔ روح الامین کی جسمانی صحت بہت زیادہ اچھی نہ تھی۔ دوستوں نے روکا بھی کہ وہ البدر کی سخت جان مشقت سے فی الحال الگ رہیں اور مورچے کے پیچھے جمعیت کے کاموں میں حصہ لیں۔ گھر والوں کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر انہوں نے البدر ٹریننگ پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مختلف کیمپوں میں خدمات انجام دیں۔ بھارتی فوجوں نے پیش قدمی شروع کی اور پاک فوج پیچھے ہٹنے لگی۔ تو البدر کے پاس حفاظتی اسلحہ بھی ختم ہوگیا۔

روح الامین بھور ہاٹ سے گرفتار کرلیے گئے۔ تین دن تک کالی باڑی میں محبوس رکھے گئے۔ اس دوران ان پر تشدد ہوتا رہا۔ پھر کالی باڑی سے دوبارہ بھور ہاٹ میں منتقل کردیئے گئے۔ جہاں نام نہاد عوامی عدالت نے سترہ افراد کو گولی مارنے کا حکم دیا جن میں روح الامین کے علاوہ عبدالمنان، شفیق العالم اور محمد عرفان شامل تھے۔

گولی مارنے سے پہلے نورالامین سے ان کی آخری خواہش پوچھی گئی تو انہوں نے کہا: "خدا سے ملنا" چند لمحے بعد ایک گولی ان کا سینہ چھلنی کرچکی تھی اور وہ اپنے رب سے جا ملے تھے۔

شہید عبدالخالق

عبدالخالق، ٹنگا گاؤں (فینی) کے کسان گھرانے میں پیدا ہوئے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی اور عالم کا امتحان اول پوزیشن میں پاس کیا۔ بہت ملنسار اور معاملہ فہم نوجوان تھے۔ اسی لئے طالب علم ہونے کے باوجود وہ گاؤں کی پنچائت کے ممبر تھے۔ سماجی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے فعال کارکن تھے اور معاشرے کو اسلام کے سماجی، عدالتی، معاشی نظام سے روشناس کرانے اور اسلامی انقلاب لانے کی جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ارادے کے پکے اور سراپا عمل تھے۔ اسلامی انقلاب کے حامیوں اور بنگلہ قوم پرست تحریک کے درمیان معرکہ خیر و شر شروع ہوا تو عبدالخالق البدر میں شامل ہو گئے۔ تربیت مکمل کرنے کے بعد کالدو کیمپ میں متعین ہوئے۔ مختلف آپریشنز میں بے مثال جرأت کا مظاہرہ کیا۔

ہندوستانی فوجیں مشرقی پاکستان میں داخل ہوئیں تو ان کا پہلا نشانہ رضا کاروں کے کیمپ بنے اور سب سے زیادہ مصیبت کا سامنا ان ہی کو کرنا پڑا۔

سات دسمبر کو مجیب باہنی نے عبدالخالق کو گرفتار کر لیا اور نواب پور کیمپ میں لے گئے اور وہاں ۸۔ دسمبر کو ظلم و تشدد آزمانے کے بعد شہید کر دیا۔ شہادت کے وقت ان کی عمر ۲۴ سال تھی۔

شہید ابوالکلام محمد منیر الزماںؒ

منیر الزماں، ٹوبچر (ضلع نواکھلی) میں پیدا ہوئے۔ مقامی اسکول میں تعلیم پائی، ٹیچر ٹریننگ انسٹیٹیوٹ سے تربیت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۰ء میں مقامی اسکول میں استاد مقرر ہوئے۔ اسکول کے زمانے میں وہ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مقامی چیئرمین تھے لیکن جمعیت کے افراد سے مختلف اجتماعی تحریکوں پر جب گفتگو کا موقع ملا تو جمعیت کی دعوت کو قبول کیا اور اس میں شامل ہو گئے۔ ان کا مشغلہ مچھلیاں پکڑنا تھا۔

معرکۂ حق و باطل شروع ہوا تو اسکول سے چھٹی لے کر البدر میں شامل ہو گئے۔ بکھی بعد سے اپنے والد صاحب کو جو خط بھیجا اس میں لکھا۔

" خدا نے جہاد میں شرکت کی سعادت بخشی ہے اس لئے اگر میں اس میں کام آ جاؤں اور آپ کا ردنے کو جی چاہے تو آنسو نہ بہانا، آہ و زاری نہ کرنا۔ زندگی کا وجود ہی خدا کے دین کے لئے جنگ میں ہے اور شہادت کا رتبہ اس کی معراج ہے۔"

بھارتی فوج کے اعلانِ جنگ کے بعد پاک فوج چھاؤنی کی طرف ہٹنا شروع ہوئی تو البدر کیمپ دشمن کے نرغے میں آگیا اور انہوں نے منیر الزمان کو بھی گرفتار کرلیا پہلے انہیں اور ان کے والد کو بری طرح زدوکوب کیا اور پھر کیمپ کے قریب ہی مسجد کے سامنے باپ بیٹے دونوں کو گولی مار کر شہید کر دیا۔

شہید شمس الدینؒ

شمس الدین ضلع نواکھلی کے گاؤں باخر یہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی عبدالرب کے معاشی حالات ٹھیک نہ تھے۔ شمس الدین نے ابتدائی تعلیم سوناگاچھی کے مدرسہ میں حاصل کی اور عالم کی ڈگری لی۔ اس وقت وہ اسلامی جمعیت طلبہ کے رفیق تھے۔

۱۹۷۱ء میں جب لادین عناصر کی جانب سے ملک و مذہب کے خلاف پراپیگنڈہ اور مسلح اقدام شروع ہوا تو شمس الدین جنہیں تعلیم ختم کئے چھ ماہ اور شادی ہوئے سات ماہ گزرے تھے، انہوں نے گھر کی زندگی پر جہاد کے لمحوں کو سعادت جانا ابتدا میں رضاکار فورس میں اور پھر البدر میں شامل ہوگئے اور مختلف محاذوں پر پوری ذمہ داری سے فرائض انجام دیتے رہے۔

سوناگاچھی کیمپ پر قیام کے دوران میں ایک رات کو دشمن کے ہاتھوں وہ گرفتار ہوگئے اور تشدد کا نشانہ بنے۔ ایک دن مکتی باہنی کا ایک آدمی ان کے والد کے پاس آیا، کہا کہ اگر آپ اتنی رقم کا بندوبست کر دیں، تو ہم شمس الدین کو چھوڑ دیں گے غریب باپ نے قرض لے کر اور اپنی مختصر سی جائیداد فروخت کرکے دو روز بعد رقم مذکورہ آدمی کو پہنچا دی۔ شمس الدین جب گھر پہنچے تو ان کے جسم پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ دس روز بعد ان کی حالت قدرے سنبھلی اور اگلے دن اپنی بیوی کو یہ کہہ کر پھر کیمپ میں چلے گئے کہ "میرے ساتھی کیمپ میں ہیں اور میں گھر میں رہوں، یہ نہیں ہوسکتا۔" بیوی نے بہت روکا، مگر نہیں مانے اور چلے گئے۔ اسے سوءِ اتفاق جانئے کہ دو ماہ بعد پھر گرفتار کر لئے گئے۔ دس دسمبر کو مکتی باہنی نے گولی مار دی۔ اس وقت ان کی عمر پچیس برس تھی۔

شہید بدیع الزمانؒ

بدیع الزمان کا تعلق اودھ مارا (ضلع نوا کھلی) سے تھا، وہ میاں حارث کے گھر پیدا ہوئے۔ سرسبزی و شادابی کے اس خطے میں . . . . . انہوں نے بچپن کا معصوم زمانہ گزارا۔ حیدر گنج ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران ہی وہ اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہوئے۔

اسلام کی عظمت اور سالمیت پاکستان کے تحفظ کے لئے پہلے رضاکاروں اور بعد میں راۓ پور البدر کیمپ سے وابستہ ہوئے۔ اس کیمپ کی حالت بڑی دگرگوں تھی۔ کیمپ کے کیڈٹ جان کی بازی لگا رہے تھے۔ مگر گولہ بارود ناقص اور ناکافی تھا۔ جب کہ دوسری جانب مکتی باہنی کے پاس اعلیٰ درجے کا خودکار اور دور مار ہلکا اسلحہ تھا۔ ایک روز کیمپ پر دشمن نے قبضہ کر لیا۔ وہیں پر بدیع الزمان کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا اور ان کی میت غائب کر دی۔ بدیع الزمان شہادت کے وقت انیس سال کے تھے۔

شہید شاہ عالم چودھریؒ

شاہ عالم سوناپور (نواکھلی) میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد صاحب کا اور کچھ عرصہ بعد والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی نے ان کی پرورش کی۔ مقامی مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈھاکہ چلے آئے۔ میٹرک کے امتحان میں ریاضی میں اوّل آنے پر انہیں خصوصی انعام بھی ملا۔

ڈھاکہ میں دوران تعلیم اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہو گئے اور اسلامی تاریخ و ادب کے مطالعہ کو اپنا معمول بنا لیا۔ وسیع اور گہرے مطالعے کے بعد انہوں نے عملی میدان میں کام شروع کر دیا۔ جب علیحدگی پسندوں نے لڑائی شروع کی تو یہ البدر کے کارکن کے طور پر کام کرنے لگے۔

اسی دوران ان کی بھاوج نے انہیں گھر بلایا اور کہا کہ تم ان دنوں گھر رہو،

ڈھاکہ نہ جاؤ"۔ اس پر شاہ عالم نے کہا" بھابی! آپ نے مجھے ماں بن کر پالا ہے۔ اس لئے میں احترام میں خاموش ہوں۔ اگر مجھے کوئی دوسرا یہ کہتا کہ تم جمعیت اور البدر چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤ تو میں اسے گولی سے اڑا دیتا۔ اس لئے آپ مجھے مجبور نہ کریں، کیونکہ پاکستان ہوگا تو ہم ہوں گے، ورنہ ہماری زندگی غلامی میں گزرے گی، مجھے جانے دیں۔ ہم ان شاء اللہ اسلامی انقلاب کے ذریعے اس ملک کو متحد رکھ سکتے ہیں"۔ اس پر ان کی بھابی نے روکنا مناسب نہ جانا اور پرنم آنکھوں کے ساتھ دعا دیتے ہوئے رخصت کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد انہیں رائے پور البدر کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ سقوط مشرقی پاکستان کے وقت مکتی باہنی نے کیمپ پر حملہ بول دیا اور اکیس سالہ شاہ عالم چودھری گولی لگنے سے شہید ہوگئے۔ ان کی قبر رائے پور مسجد کے بائیں جانب موجود ہے۔

شہید محمد الیاس رح

احمد پور (نواکھلی) میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ہمقدم تھے۔ جلوسوں میں سب سے آگے نعرے لگانے، دعوتی اور اطلاعاتی پوسٹر خود تیار کر کے نمایاں جگہوں پر چسپاں کرنے والے الیاس کو کون نہیں جانتا تھا۔

تعلیم مکمل کئے انہیں ابھی دو سال گزرے تھے اور ایک سال قبل شادی ہوئی تھی جونہی وطن نے پکارا، الیاس گھر بار چھوڑ کر، البدر کیمپ میں چلے آئے۔ تربیت حاصل کرنے کے بعد بھنارشی کیمپ میں آکر فرائض کی انجام دہی شروع کی۔ ۷ دسمبر کو وہ قاضی بازار میں دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ اور ان کے ایمان کا امتحان شروع ہو گیا۔ احمد پور تک راستے میں ان پر لاٹھیاں برسائی جاتی رہیں اور لاٹھیوں کی ضربوں ہی سے ان کو شہید کر دیا گیا۔ ان کی قبر احمد پور میں ان کے گھر کے سامنے موجود ہے۔ شہید پچیس سال کے تھے۔

شہید شاہ عالم رح

شاہ عالم کے والد کا نام منیر الزمان تھا اور وہ کاپخن پور (نواکھلی) کے رہنے

والے تھے۔ان کی معاشی حالت کمزور تھی۔شاہ عالم کا قد لمبا، رنگ صاف اور صحت اچھی تھی۔

مڈل سکول ہی کے زمانہ میں اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہوگئے۔جب شاہ عالم کلاس نہم میں تھے تو ۱۹۷۱ء کا المیہ رونما ہوا اور وہ راتے پور البدر میں شامل ہوگئے وہاں تربیت حاصل کی۔دوسری جانب مجیب باہنی کے مخبر ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔تربیت حاصل کرنے کے دو ماہ بعد مکتی باہنی نے دس افراد پر مشتمل البدر کے ایک گروپ پر حملہ کر دیا۔یہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ یہ لوگ سنبھل نہ سکے اور ہزیمت اٹھائی۔اس میں شاہ عالم پکڑے گئے۔ ۱۷ سالہ شاہ عالم بے پناہ تشدد کے دوران بے ہوش ہوگئے۔اس اثنا میں انہیں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

شہید محمد یوسفؒ

ضلع نواکھلی کے گاؤں کالی چر میں پیدا ہوئے۔ٹو چر مڈل اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔مڈل کلاس میں داخلہ لیتے ہی وہ جمعیت کے رفیق بن گئے۔محمد یوسف میٹرک کے بعد کالج پہنچے تو حالات خراب ہو چکے تھے۔جمعیت نے یوسف کو تنظیمی کام سونپ دیا۔ وہ عوام کے تحفظ کے لئے مسلح جدوجہد میں شریک نہیں تھے،لیکن مکتی باہنی کے نزدیک ہر وہ فرد مجرم تھا جو پاکستان سے محبت اور دینی ذوق رکھتا تھا۔اسی حوالے سے انہوں نے محمد یوسف کو اسوندی باڑی میں گولی مار کر شہید کر دیا۔شہادت کے وقت ان کی عمر بیس برس کی تھی۔

شہید مخلص الرحمٰنؒ

تونگی پورہ (نواکھلی) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں میٹرک کرنے کے بعد فینی کالج میں داخل ہوئے۔کمزور معاشی حالت کے پیشِ نظر وہ بڑی مشکل سے تعلیم کا سلسلہ قائم کئے ہوئے تھے۔غربت نے چاروں طرف سے ان کو گھیر رکھا تھا۔مگر اس کے

باوجود وہ اسلام پر بہت ساری کتابیں خرید تے یا ادھار لاکر مطالعہ کرتے۔ مولانا مودودیؒ کی کتابوں نے ان کے دل کی دنیا روشن کردی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے رفیق تھے۔ فینی کالج کی یونین میں نائب صدر منتخب ہوتے۔ وہ بڑے اچھے مقرر اور تعلیمی لحاظ سے نمایاں تھے۔

جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو انہوں نے فینی کیمپ میں فوجی تربیت حاصل کی اور کالی راہ کیمپ میں پلاٹون کمانڈر مقرر ہوئے۔ دسمبر میں جب رضاکاروں کے کیمپ تباہ ہونا شروع ہوئے تو البدر کے بہت سارے کیڈٹ شہید ہوگئے۔ اسی اثناء میں مخلص الرحمٰن کسی نہ کسی طرح اپنے کیمپ سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور اپنے سسرال کے ہاں پہنچ گئے، لیکن مکتی باہنی نے وہاں ان کو پکڑلیا اور ان پر تشدد کرتے ہوئے کیمپ میں لے آئے۔ ان کے جسم کو بلیڈوں سے کاٹ کاٹ کر نمک چھڑکا اور ۸ دسمبر کو انہیں گولی مار کر شہید کر دیا۔ اس طرح بااخلاق، باکردار، نرم طبیعت کا مالک مخلص الرحمٰن پچیس برس کی عمر میں حیاتِ ابدی پا گیا۔

شہید کمال الدینؒ

کمال الدین، شوجاپور (نواکھلی) میں ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے جو معاشی لحاظ سے کمزور تھا۔ کمال الدین بچپن ہی سے بڑے ہوشیار اور تیز و طرار تھے۔ ایک مرتبہ درخت پر چڑھے، ٹہنی ٹوٹی تو گرتے ہی ان کا بازو بھی ٹوٹ گیا۔ اس طرح ایک بار ناریل کے درخت پر چڑھنے کی کوشش میں اپنی انگلی کٹوا بیٹھے۔ کمال نے دینی مدرسہ میں قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ پھر سوناگاجی ہائی اسکول میں داخل ہوگئے۔ اب ان کی تیزی و ہوشیاری کا رُخ کتب کے مطالعہ کی طرف ہوگیا۔ اسی دوران وہ اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہوگئے۔ کمال نے بڑی شگفتہ طبیعت پائی تھی، اکثر کہا کرتے: "اگر ہم لوگ اسلام کی باتوں پر عمل نہیں کریں گے تو خدا اور رسولؐ کی ان تعلیمات کو بھلا ہندوؤں نے لے کر چلنا ہے؟"

۲۵ جون ۱۹۷۱ء کی رات وہ سو رہے تھے کہ مکتی باہنی کے چند غنڈوں نے ان کے گھر کو گھیرے میں لے لیا اور زبردستی گھر میں گھس گئے ۔ کمال الدین اور ان کے والد محترم منیر احمد کو گرفتار کر کے آنکھوں پر پٹی باندھ دی ۔ سوسس گیٹ کے سامنے لے جا کر غنڈوں نے دونوں باپ بیٹے پر گولی چلا دی ۔ باپ اور بیٹا نے ایک ہی رسی میں بندھے تڑپتے تڑپتے جان دے دی ۔ ظالموں نے دونوں کی لاشیں ندی میں ڈال دیں جو بہاؤ کی نذر ہو گئیں ۔ کمال الدینؒ صرف چودہ سال کی عمر میں شہادت پائی ۔

شہید خورشید عالمؒ

خورشید عالم موضع محمد پور (نواکھلی) میں پیدا ہوئے ۔ دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی ۔ اسی عرصہ میں اسلامی جمعیت طلبہ کے فعال کارکن بنے ۔ بعد ازاں مڈل اسکول میں استاد اور گاؤں کی مسجد میں پیش امام کی ذمہ داریاں نبھائیں ۔

۱۹۷۱ء میں انہوں نے اسلام کی دعوت پہنچانے اور وطن سے محبت کے جذبوں کو ابھارنے کے لئے گھر گھر جا کر لوگوں کو حکمت کے ساتھ سمجھانا شروع کیا ۔ وہ اس سلیقے کے ساتھ یہ خدمت سرانجام دے رہے تھے کہ غداروں کو ان کی یہ روش ایک آنکھ نہ بھائی ۔ چنانچہ انہیں ۱۵ راگست کو گھر سے اغوا کر کے نواب پور لے جایا گیا ۔ غنڈے راستے میں مارتے جاتے اور کہتے "کہو جے بنگلہ" مگر وہ پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کرتے رہے ۔ اس پر وہ طیش میں آ گئے ۔ پھر دو ظالم جلادوں منیر احمد اور سراج نے ان کی شہ رگ کاٹ دی اور لاش کے ٹکڑے کر کے ندی میں بہا دیئے ۔ ان کا گھر لوٹ کر جلا دیا گیا ۔ خورشید کی عمر اس وقت ۲۹ برس تھی ۔

شہید حنیف محمدؒ

حنیف محمد ، ضلع نواکھلی کے گاؤں چرکا کرٹیا میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد علی احمد ایک معمولی کسان تھے ۔ خاندان کی مالی حالت کمزور تھی ، لیکن ان کے والد ہر صورت

میں اپنے بیٹے کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ میٹرک کے بعد وہ فینی کالج میں داخل ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ سے امتحان میں پورے بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد یہیں بی اے میں داخلہ لیا۔ سال سوم میں تھے کہ اسلامی جمعیت طلبہ میں تن من دھن سے شمولیت اختیار کی اور سچی لگن کے ساتھ اس جھنڈے کو لہراتے ہوئے آگے بڑھے۔

۱۹۷۱ء میں جب مجیب کے غنڈے اسلام اور پاکستان دوست افراد کو پکڑ پکڑ کر ذبح کر رہے تھے اور چاروں طرف خوف و دہشت کی فضا تھی۔ اس سمے حنیف نے آگے بڑھ کر البدر میں شمولیت اختیار کی۔ تربیت کے بعد چیراشد ہاٹ کیمپ میں خدمات انجام دیں۔ پھر کچھ عرصہ لوماتی کیمپ میں بھی رہے۔ البدر اور رضا کاروں کے پاس اسلحہ کی شدید کمی تھی۔ ان کے کیمپ کو مکتی باہنی نے گھیرے میں لے کر اکثر لوگوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ حنیف کو گرفتار کر لیا گیا۔ غنڈوں نے کافی عرصہ ان پر تشدد جاری رکھا۔ بالآخر ۵ دسمبر کو انہیں شہید کر دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر چوبیس برس تھی

شہید کریم الحقؒ، شہید نور الحقؒ

ضلع نواکھلی کے گاؤں چرگنیش میں پیدا ہوئے۔ ان کے کسان گھرانے پر غربت اور افلاس سایہ فگن تھے۔ بچپن میں کریم الحق آوارہ سوسائٹی کا شکار ہوئے، لیکن یہ خدا کا احسان تھا کہ جلد سنبھل گئے۔ میٹرک میں پہنچے تو مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں نے ان کی زندگی کو انقلاب سے معمور کر دیا۔

۱۹۷۱ء میں البدر کے ساتھ مل کر میدانِ عمل میں اترے۔ سوناگاچی کیمپ پر مکتی باہنی کے اچانک حملہ میں کریم الحق اور دوسرے بھائی نور الحق گرفتار کر لئے گئے رات کا وقت تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر گولی مار دی گئی۔ کریم الحق گولی لگنے سے موقع پر شہید ہو گئے، لیکن نور الحق کو جو گولی لگی اس سے انہیں زیادہ مہلک اور گہرا زخم نہ آیا تھا۔ اس لئے نور الحق نے دشمن کے کھسکتے ہی بندھے

ہوئے ہاتھوں کے ساتھ، اپنی کمر سے بندھے ہوئے کریم الحق شہید کی لاش کو اپنے پیٹ کے بل رینگ رینگ کر آبادی کی طرف سفر شروع کیا۔ خون رس رہا تھا اور نقاہت بڑھ رہی تھی۔ آخر کار دو گھنٹے کی مشقت کے بعد نورالحق شہید بھائی کی میت سمیت ایک گھر کے دروازے تک جا پہنچے۔ رینگنے سے اس کا چہرہ اور سینہ بھی زخمی ہو چکا تھا۔ صبح ہوتے ہی دشمن کو پتہ چل گیا کہ نورالحق زندہ ہے۔ اس پر فوری طور پر ان کو دوبارہ پکڑ لیا گیا، کریم الحق کی نعش کو باہر پھینکا اور نورالحق کو چھیتوری باڑی میں لے گئے۔ وہاں پر کہا کہ جے بنگلہ کا نعرہ لگاؤ۔ نورالحق نے کہا۔ کریم الحق نے بھی مرتے وقت پاکستان زندہ باد کہا تھا میں بھی پاکستان زندہ باد کہتا ہوں۔ اس پر ۱۶ برس کے نوجوان صحت مند نورالحق کو گولی مار دی گئی۔ یوں جمعیت کے دو مثالی کارکن شہادت پا گئے۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔

شہید کمال الدینؒ

نذیر پور (ضلع نواکھلی) میں کمال الدین پیدا ہوئے۔ نواب پور ہائی سکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد چاٹگام سٹی کالج سے آئی کام پاس کیا اور بی۔ کام میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۷ء میں اسلامی جمعیت طلبہ میں شمولیت اختیار کی۔ اس پر ان کے سرپرست بھائی اور بھاوج نے زور دیا کہ وہ جمعیت چھوڑ دیں، مگر کمال نہ مانے جب بہت زیادہ دباؤ ڈالا تو کمال الدین نے گھر چھوڑ دیا اور ٹیوشن پڑھا کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں انہیں کالج کے چند کلاس فیلو طلبہ نے کہا کہ وہ پاکستان کا چیمپئن بننے کی کوشش نہ کریں لیکن یہ تحریک اسلامی کا راستہ چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے۔ اس پر کالج ہی میں ان لڑکوں نے کمال کی پٹائی شروع کر دی۔ جواب میں کمال نے کہا: "میں تمہیں دعا ہی دے سکتا ہوں کہ اس زیادتی کے نتیجہ میں میرا اسلام اور پاکستان پر ایمان اور زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔" یہ سن کر ان لڑکوں نے ان کا اور زیادہ مذاق اڑایا۔

بعد میں جب بھارتی مداخلت کاروں نے پاکستان کا جھنڈا گرانے کے لئے مسلح حملے شروع کر دیئے تو کمال الدین نے بھی البدر میں شامل ہو کر عسکری تربیت حاصل کی اور

بھور بازار پر متعین ہوئے۔ یہاں انہوں نے بے پناہ جرأت کا ثبوت دیا۔ کچھ عرصہ کے لیئے فینی میں بھی رہے۔ آخر ۶ دسمبر کو مجیب باہنی نے انہیں دھلیہ سے گرفتار کر لیا اور نواب پور لے گئے۔ یہاں انہیں سکول میں لے جا کر اتنا مارا کہ دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور سوجن و تکلیف کے باعث بے ہوش ہوگئے۔ پھر انہیں زمین پر گھسیٹتے ہوئے فینی ندی کے کنارے لے گئے۔ ابھی ان میں جان باقی تھی۔ اس لیئے جب ایک ظالم نے ان کی آنکھ نکالی تو تڑپ اٹھے، اگلے لمحے انہیں گولی مارے بغیر، اسی حالت میں ندی کی خونی لہروں کے سپرد کر دیا۔ شہادت کے وقت کمال الدین ۲۴ برس کے بھرپور جوان تھے۔

شہید مجیب الرحمٰنؒ

مجیب الرحمٰن ڈھاکہ یونیورسٹی سے البدر کے کارکن تھے۔ اس بیس سالہ مجاہد نے پاکستان کے تحفظ کی جنگ میں دل و جان سے حصہ لیا۔ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالے، تو وہ لا ستہ پاکر اپنے آبائی گاؤں مداری پور (ضلع فرید پور) چلے آئے، چونکہ پاکستان کے ساتھ محبت کا "جرم" ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ مکتی باہنی نے ان کے گھر پر حملہ کیا اور انہیں گرفتار کر کے ان کے دونوں گال چیر دیئے۔ پھر ان کے کان اکھیڑے اور ایک کھلی جیپ میں انہیں کھڑا ہونے پر مجبور کیا گیا اور اس حالت میں پورے شہر میں گھمایا گیا اور انہیں بالکل بھوکا اور پیاسا رکھا گیا۔ کچھ دیر بعد چاول کے مرمرے کھانے کے لئے دیئے گئے جو کٹے ہوئے رخساروں سے باہر نکل جاتے۔ یہ عمل وحشیوں کے لئے قہقہہ بار تھا رات ہوئی تو ان کے زخموں پر نمک چھڑک دیا گیا۔ اس سارے عمل کے دوران ظالموں کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ جئے بنگلہ کا نعرہ لگاؤ، لیکن مجیب کے تو جیسے ہونٹ سل گئے تھے۔ رات گئے مداری پور کے چند بھلے لوگوں نے اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا۔ ظالموں نے اس احتجاج کا جواب یہ دیا کہ مظلوم کی کنپٹی پر بندوق رکھ کر فائر داغ دیا اور مجیب الرحمٰن نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اذیت سے نجات پالی!

شہید سکندر علیؒ، صفدر علیؒ

صفدر علی ڈھاکہ امن کمیٹی کے جنرل سیکرٹری تھے اور ان کا چھوٹا بھائی سکندر البدر کیڈٹ تھا۔ مکتی باہنی ان دونوں بھائیوں کے تعاقب میں تھی چنانچہ ۱۶ دسمبر کا دن نکلتے ہی ان کی تلاش شروع ہوگئی۔ انہوں نے گذشتہ رات ہی ایک رشتہ دار کے ہاں پناہ لی تھی۔ مکتی باہنی کو اس کی خبر مل گئی اور گھر کا محاصرہ کر لیا۔ دونوں بھائی پکڑ لئے گئے۔ پھر مکتی باہنی کے لوگ انہیں کھینچتے ہوئے اس شاہراہ پر لے آئے جو گورنر ہاؤس کو جاتی ہے پہلے ان دونوں کی داڑھیاں اور سر کے بال مونڈ دیئے گئے۔ پھر ان کے چہروں پر سیاہی مل دی گئی۔ اس کے بعد مخصوص گروہ ان پر ٹوٹ پڑا۔ دو دن تک ان کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا۔ صبح سویرے انہیں سڑک پر لے آتے اور راہ چلتے لوگ ان کے سروں پر جوتیاں برساتے اور گندگی پھینکتے۔ اس پورے عرصہ میں انہیں کھانے کو کچھ نہ دیا گیا۔ نقاہت اور مار پیٹ سے ان کا بُرا حال ہوگیا تھا۔ آنکھیں دھنس گئیں اور چہرے پر ورم آگیا تیسرے روز وہ انہیں فقیرا پور کی مسجد کے سامنے لے گئے۔ ان کے جسم بالکل ٹھنڈے پڑ چکے تھے، مگر غنڈوں کی آتش انتقام ابھی سرد ہونے میں نہ آئی تھی۔ صفدر علی نے مسجد کے سامنے پہنچتے ہی دم توڑ دیا اور ان کے بھائی سکندر کو اسی مقام پر گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ پھر دونوں بھائیوں کی لاشوں کو چاقوؤں سے چھلنی کیا گیا اور انہیں گھسیٹتے ہوئے نورانی ہوٹل کے قریب لے آئے۔ وہاں ایک گڑھا کھودا اور دونوں کو اس میں ڈال کر اسی طرح مٹی میں دبا دیا کہ ان کے ہاتھ اور پاؤں باہر نکلے رہے۔

شہید انور حسینؒ

انور حسین اسلامی جمعیت طلبہ ضلع باری سال کے سیکرٹری، ایم بی بی ایس کے طالب علم اور البدر کے نائب کمانڈر تھے۔ شجاعت اور مقصد میں انہماک ان کی نمایاں ترین صفات تھیں۔ البدر کی کمان کر رہے تھے کہ ۸ اور ۹ دسمبر کی درمیانی رات کو پاک آرمی نے اچانک شہر خالی کر دیا اور ڈھاکے کی جانب روانہ ہوگئی۔ اس اقدام سے البدر تک کو بے خبر رکھا گیا۔ جونہی فوج نے شہر

چھوڑا بھارتی آرمی اور مجیب باہنی نے انڈین ایئر فورس کے طیاروں کی نیچی اڑانوں کے سائے میں شہر پر ہلہ بول دیا۔ محب وطن افراد پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ادھر البدر کیمپ کا گھیرا تنگ ہوتا گیا۔ باقی ساتھیوں کو ایک ایک کر کے مختلف منزلوں پر روانہ کرنے کے بعد انور حسین اپنے ایک رشتہ دار کے گھر چلے گئے۔ رات کے آخری پہر مکتی باہنی نے چھاپہ مارا اور انہیں گرفتار کر لیا۔ یہ لوگ انہیں اپنے کیمپ "دبد بیہ" لے گئے اور البدر کے بارے میں معلومات جمع کرنے کے لئے وحشیانہ تشدد کرتے ہوئے بازو توڑ دیئے، جس سے وہ بیہوش ہو گئے اور جب تشدد کا ہر حربہ ناکام رہا تو اسٹین گن کی ایک باڑھ مار کر اس مجاہد ملت کو شہید کر دیا اور میت کو قریبی ندی میں بہا دیا۔

ضلع باری سال میں انور حسین یہ فریضہ نہایت ذمہ داری اور جرأت کے ساتھ ادا کر رہے تھے وہ کالجوں اور مسجدوں میں جا کر پاکستان کی سالمیت کے موضوع پر پُرجوش تقریریں کرنے ملک میں تخریبی سرگرمیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے وہ بے حد مستعد تھے۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں انہوں نے ایسٹ پاکستان رائفلز کے ایک باغی سپاہی کو دو رائفلوں سمیت تن تنہا گرفتار کیا تھا۔

محمد انور حسین کا تعلق آل کاندا (ضلع باری سال) سے تھا۔ ۵۲ء میں پیدا ہوتے۔ والد گرامی کا نام نذر میاں تھا جو باری سال کے باا ثر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نیک دل اور سادہ طبیعت انسان تھے۔ باری سال میڈیکل کالج کی تعمیر کے وقت حکومت نے بلا معاوضہ ان کی زمین ہتھیا لی۔ جس سے ان کو شدید مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انور حسین نے ابتدائً ناظرہ قرآن کریم پڑھا پھر آل کاندا کے پرائمری سکول میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے انہوں نے ۶۳ء میں وظیفے کا امتحان پاس کیا۔ ۶۸ء میں میٹرک کیا اور وظیفہ حاصل کیا۔ ۷۰ء میں بروز موہن کالج سے انٹر کے امتحان میں بھی وظیفے کے حقدار ٹھہرے، پھر باری سال میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس میں داخلہ لیا۔ وہ ہلکے پھلکے جسم کے مالک تھے۔ چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ اچھے مقرر اور بیڈمنٹن کے بہترین کھلاڑی تھے۔

۱۹۶۹ء میں جب صدر ایوب کی آمریت کے خلاف ملک گیر پر امن تحریک چلی تو قوم پرست اشتراکی طلبہ تنظیموں نے اس تحریک کو تخریب کا رنگ دینا چاہا۔ اس منفی کردار کے سامنے بند باندھنے

کے لئے باری سال میں اسلامی جمعیت طلبہ نے نمایاں کوششیں کیں۔ انور حسین اس تعمیری جدوجہد سے متاثر ہو کر مئی ۱۹۶۹ء میں جمعیت میں شامل ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں جب باری سال میں خوفناک سمندری طوفان نے ہولناک تباہی مچادی تو جمعیت کے امدادی پروگرام میں نمایاں حصہ لیا۔ جمعیت کے امدادی کیمپ شہرلی، عبدالاچرکیش، لال موہن پاچھا اور دھنڈی گنج میں قائم کئے گئے تھے۔ اسی سال جمعیت نے جمعیت طلبہ عربیہ کے اشتراک سے اسلامی نظام پریڈ کے زیر اہتمام جلسے منعقد کئے اور جلوس نکالے اور بیداری ملت کی تحریک چلائی۔ انور حسین اس مشترک وزم کے منتظم تھے۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات سے قبل وہ گاؤں گاؤں گئے اور اسلامی جماعتوں کی حمایت میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے بے پناہ محنت اٹھائی۔ ۱۹۷۱ء کے آغاز میں جب ایک یہودی مصنف کی رسوائے زمانہ تصنیف "فرکشن آرٹ آف لو" جس میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ پر ردعمل ہوا تو احتجاج کو شدید اور موثر بنانے میں انور حسین کا بڑا ہاتھ تھا۔

شہید مصطفیٰ الکمالؒ

مصطفیٰ کمال لشکرہاٹ ہائی اسکول فینی میں جماعت دہم کے طالب علم تھے۔ جمعیت کی دعوت سے نئے نئے متعارف ہوئے تھے۔ سکول کی فٹ بال الیون کے وائس کیپٹن تھے۔ ملنسار اور پرجوش تھے انہوں نے فاضل پور کیمپ میں فوجی تربیت حاصل کی۔ پہلے آپریشن پر جارہے تھے کہ مکتی باہنی کے گھیرے میں آگئے۔ گرفتاری کے دوسرے روز ان کی میت ایک برساتی نالے سے ملی۔ ان کی آنکھیں نکال دی گئی تھیں اور خنجر مار کر سینہ چاک کر دیا گیا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے دو سال بعد تشدد کرنے والے افراد میں سے ایک نے بتایا کہ گولی لگنے سے قبل انہوں نے ایک شعر سنایا: "گزرے ہوئے دن یاد آرہے ہیں، لیکن آخرت میں جنت کی خوشبو کے سامنے وہ کچھ بھی نہیں۔"

شہید محمد نور الاسلامؒ

نواکھالی میں جمعیت کے امیدوار رکنیت تھے۔ ۱۲ دسمبر کو عوامی لیگ کے غنڈوں نے انہیں شہید کر دیا۔

شہید نور الاسلامؒ

راج شاہی انجینئرنگ کالج کے نیک نہاد طالب علم محمد نور الاسلام اسلامی جمعیت طلبہ کے رفیق اور شہر میں رانی نگر رہائشی حلقہ کے انچارج تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہترین انتظامی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اچھے مقرر اور ادیب بھی تھے۔ ہندوستانی جارحیت کے خلاف بڑی پامردی اور جانفشانی سے خدمات انجام دیں۔ اور اس باعث مکتی باہنی کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ۷ ارد سمبر کو مکتی باہنی نے انہیں پکڑ لیا اور اذیتیں دیتے ہوئے دریائے پدما کے کنارے لے آئے جہاں ان کو شہید کر کے دریا کی لہروں میں بہا دیا۔

شہید محمد کمالؒ

میڈیکل کالج میں بطور ڈرائیور ملازم یہ نوجوان سراپا تحریک تھا۔ تحریک اسلامی سے والہانہ لگاؤ، عبادات میں شغف اور جمعیت کے کارکنوں سے محبت ان کے نمایاں اوصاف تھے۔ جلسوں اور جلوسوں کے انعقاد اور تشکیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور ہمیشہ پیش پیش رہے۔ مکتی باہنی نے ۱۶ ارد سمبر کو انہیں ان کے گاؤں سے گرفتار کیا اور دریائے پدما کے کنارے لے جا کر شہید کر دیا میّت کو دریا نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس وقت کمال کی عمر ستائیس برس تھی۔

شہید طاہر الرحمانؒ

۱۲ ارد سمبر ۱۹۷۱ء کو بھارتی طیارے بلا روک ٹوک گدھوں کی طرح چٹاگانگ شہر پر ہجوم کئے ہوئے تھے۔ پاک فضائیہ کے طیاروں کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ نویں جماعت کا طالب علم طاہر الرحمان اینٹی ایئر کرافٹ گن پر ڈیوٹی سنبھالے کھڑا تھا کہ نماز کا وقت آگیا۔ وہ قبلہ رُو ہو کے ابھی زمین بوس ہوا تھا کہ فضائی حملہ ہو گیا۔ اس نے نماز مکمل کئے بغیر فوراً سلام پھیرا اور اینٹی ایئر کرافٹ سے فضا میں آتش و آہن کے دائرے بنانا شروع کر دیئے۔ پاک فوج کے حوالدار ابرار خان نے کہا کہ

"اس قدر شدید شیلنگ میں جوابی کارروائی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں اس لئے کہ "ایئر کور" میسر نہیں، مناسب یہی ہے کہ مورچہ بند ہو کر اپنی جان کی حفاظت کی جائے۔ طاہر نے کہا؟ آپ کا کہنا بجا مگر اب مورچہ بند ہو کر بھی جان بچتی نظر نہیں آتی، کیوں نہ بہادرانہ شہادت قبول کر لی جائے۔"

ابرار خان خاموش ہو گیا۔

عصر کا وقت ہوا تو طاہر نے تیمم کیا اور اپنے رب کے حضور سربسجود ہو گیا۔ دشمن شاید ایسے ہی موقع کی تلاش میں آ رہا تھا کہ پاک افواج کے جیالے اور البدر کے سرفروش جب نماز پڑھنے لگیں تو انہیں جا لیا جائے۔ چنانچہ عین نماز عصر کے وقت بھارتی طیارے پھر نیچی پرواز کرتے ہوئے آئے۔ طاہر نے فضا میں گڑگڑاہٹ سنی تو سجدہ کی حالت ہی سے اپنی ایئر کرافٹ گن کی طرف لپکا اور فضا میں تڑاتڑ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ بھارتی طیاروں نے فوراً اپنا رُخ بدل لیا۔ بھارتی طیاروں کے بھاگ جانے کے بعد البدر کے ایک ساتھی نے طاہر سے کہا، طیارے پھر آئیں گے اور ان کی تعداد زیادہ ہو گی، اس لئے مناسب یہ ہے کہ تم بھی مورچے میں چلے جاؤ؟ طاہر نے جواب دیئے بغیر پھر نماز عصر کی نیت باندھ لی۔ سنتیں ادا کرنے کے بعد اس نے فرائض کی نیت باندھی، وہ چوتھی رکعت کا پہلا سجدہ ادا کر رہا تھا کہ اس مرتبہ بھارتی ہوائی جہاز بیک وقت دو سمتوں سے حملہ آور ہوئے اور طاہر ان کی زد میں تھا۔ وہ حالت نماز ہی میں اس طرح شہید ہو گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ طیارہ شکن توپ کی جانب جسم سے علیحدہ ہوئے پڑے تھے۔ حوالدار ابرار خان نے دیکھا تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے ہونہار شاگرد کے جسم کے ٹکڑوں کو اٹھا اٹھا کر کبھی اپنی آنکھوں سے لگاتا اور کبھی سینے سے۔ سورج غروب ہو چکا تو مسجد کے ساکت و صامت مینار سے کرب اور سوز میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوئی: اللہ اکبر، اللہ اکبر! تب ایک مجاہد نماز عشق سے فارغ ہو چکا تھا۔

شہید سید محمد معین الدینؒ

معین الدین، فرید آباد (ضلع چاٹگام) میں سید فضل کریم کے ہاں پیدا ہوئے جو کتابوں کی دکان کے مالک اور ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے بچپن سے ہی اپنے بیٹے کی اخلاقی تربیت

اور دینی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ معین نے کاٹیرہاٹ کے دینی مدرسے سے فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۸ء میں وہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی انقلابی تحریروں سے متأثر ہوئے اور نتیجتاً شہادت حق کی ادائیگی کے لئے مصروف عمل اسلامی جمعیت طلبہ میں تن من دھن سے شامل ہو گئے۔

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے دین بیزار عناصر اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ اور نااہل قیادت کی حماقتوں کے باعث جب صورت حال خراب ہو گئی تو حکمران ٹولہ کوئی واضح پالیسی نہ ہونے کے سبب اسے سنبھال نہ سکا۔ بھارت تاک میں بیٹھا تھا اس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان عناصر کی کھلم کھلا پیٹھ ٹھونکنا شروع کر دی اور جارحانہ مداخلت کے لئے بہانے تلاش کرنے لگا۔ بھارت کو یہ موقع بھی ہماری نااہل حکومت نے جلد فراہم کر دیا۔ جب ملک کی سلامتی داؤ پر لگتی نظر آئی تو محب وطن عناصر ملک کو بچانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی پس منظر میں اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنان پر مشتمل البدر کی تشکیل ہوئی۔ معین الدین بھی البدر کے ایک جیلٹکیڈٹ تھے۔ پاک بھارت جنگ کے دوران وہ بارہ دسمبر کو ایک محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے کہ بھارتی فضائیہ نے ان کے دستہ کو آن لیا۔ بے پناہ شیلنگ کے دوران معین الدین اپنے ساتھیوں سمیت شہادت کی آغوش میں چلے گئے اس وقت معین الدین اکیس برس کے تھے۔

شہید محمد الیاسؒ

انسان اس خوبصورت دنیا میں کتنی ہی امیدیں لے کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہر کوئی اس دنیا میں اپنی اپنی چاہت کے مطابق کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ کسی کا منتہا اقتدار ہے۔ کوئی مال و دولت کے پیچھے دوڑ رہا ہے اور کوئی زمینداری میں خدائی اختیارات تلاش کرتا ہے کوئی اچھی ملازمت یا تجارت کے لئے سرگرداں ہے، دوسری طرف کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو انسانیت کی خدمت اور خدائے واحد کی عبادت کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ شہید محمد الیاس کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا تھا اور وہ یہی کام سرانجام دیتے ہوئے باطل پرستوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔

محمد الیاس ضلع چاٹگام، تحصیل راجان (Rajan) کے نواپاڑہ (Nuapara) گاؤں کے ایک متوسط خاندان میں ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد صاحب کا نام

محمد اسحاق تھا اور پہلوٹھی کا بچہ ہونے کے سبب والدین کی نگاہوں کا مرکز تھا۔ پرائمری سکول میں ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے اساتذہ کی شفقت کے مستحق بنے۔ پھر نواپاڑا کے ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ یہاں بھی ہر امتحان میں نمایاں کامیابی کی وجہ سے اساتذہ طلبہ اور عوام میں بھی ایک ذہین طالب علم کی حیثیت سے متعارف ہونے لگے۔ دہم کے امتحان میں سائنس گروپ لیا اور اس میں اوّل آئے۔ سکول کے زمانے میں جمعیت کی دعوت سے روشناس ہوئے اور پھر اس دعوت کو عام کرنے میں کوشاں ہو گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے کام کا آغاز نواپاڑا کے ہائی سکول سے کیا اور جلد ہی جمعیت کا یونٹ قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے دائرہ کار میں عوام کو بھی شامل کر لیا اور عوام میں دعوت پہنچانے لگے۔ یہ بات ایسی نہ تھی کہ جسے غنڈے پیٹو ں برداشت کر لیا جاتا۔ چنانچہ دو مرتبہ غنڈوں نے اسکول میں داخل ہو کر انہیں زدوکوب بھی کیا، مگر الیاس مخالفتوں اور مزاحمتوں کو خاطر میں لائے بغیر آگے بڑھتا گیا۔ یہ جرأت اور استقامت دیکھ کر گاؤں کے لوگ تبصرہ کرتے کہ یہ لڑکا کوئی عام قسم کا نوجوان نہیں ہے۔ اب اشتراکیت نواز گروہ کو اپنے ناپاک منصوبوں کے سامنے الیاس ایک عظیم رکاوٹ نظر آنے لگا اور وہ انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

۱۹۷۱ء میں جب بھارت نے مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی تو بھارتی فوج کی سرپرستی میں مکتی باہنی کے غنڈوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ الیاس نے البدر میں شامل ہو کر دفاع وطن کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد دشمن نے ان کی تلاش میں دن رات ایک کر دیا۔ آخر یکم جنوری ۱۹۷۲ء کی شام ہندو اور ہندو نواز مسلمان غنڈوں نے انہیں تلاش کر لیا اور اسی وقت ان کے سینے کو سٹین گن کی گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ گھر کے مغربی پہلو میں واقع قبرستان میں شہید کو دفنا دیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ من قتل فی سبیل اللہ فھو شہید۔

الیاس جس قدر دعوتی سرگرمیوں میں فعال تھے اسی قدر عبادات کی ادائیگی میں بھی باقاعدہ تھے

شہید عبد الاوّلؒ

عبد الاوّل، شفق چھڑی (ضلع چاٹگام) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شاہ احمد بشیر تھا جو خطیب

تھے۔ ان کے پر دادا شاہ معین الدینؒ کو حضرت شاہ ولی اللہ نے خلعت خلافت عطا کر کے چاٹگانگ بھیجا تھا جہاں وہ رشد و ہدایت کا چراغ روشن کرنے کی زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے۔

عبدالاول لمبے قد، گھنگھریالے بالوں گھنی داڑھی اور سفید رنگت کی وجہ سے نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے بڑے بھائی عبدالمنان اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان کی صوبائی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔

عبدالاول نے شفق چھڑی میں ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ کالج چاٹگام سے بی اے کیا اور یہیں پر اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں جمعیت کے رکن بنے۔ لاء کالج میں داخل ہوئے۔ عبدالاول نے اپنے جسم و روح میں جمعیت کی دعوت کو جذب کر لیا تھا۔ زندگی کے گزرتے ہوئے لمحوں کے بارے میں وہ بڑے سنجیدہ تھے اور ہر گھڑی کو بندگی رب میں گزارنے کے لئے فکرمند رہتے۔ فہم دین کے حصول اور تحریکی ساتھیوں کی ذاتی مشکلات دور کرنے میں ان کی دلچسپی نے انہیں محبوب شخصیت بنا دیا تھا۔

لاء کالج ہی میں تھے کہ اسلام کے دفاع اور وطن کی حفاظت کا مرحلہ پیش آیا اور عبدالاوّل البدر میں شامل ہو گئے۔ جب بھارتی افواج نے مشرقی پاکستان پر کھلا حملہ کر دیا تو چاٹگانگ کے انتہائی ساحلی علاقے میں قائم البدر کیمپ بھی ان کی زد میں آ گیا۔ مکتی باہنی کے جو حملہ آور فوجوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ مکتی باہنی نے کیمپ پر ہلہ بول دیا اور عبدالاول کے ساتھ چھ البدر کیڈٹ گرفتار کر لئے۔ ان کو فیاض محلہ میں لایا گیا اور پانچ روز تک بے پناہ تشدد کیا گیا۔ جس کی تاب نہ لا کر ۲۲ نومبر کو اللہ کا سپاہی شہید ہو گیا۔

شہید محمد طفیل احمدؒ

طفیل احمد نواکھالی کالج کی یونین میں نائب صدر اور جمعیت کے سرگرم رفیق تھے۔ البدر میں شامل ہو کر دادِ شجاعت دیتے رہے۔ اسی دوران میں سقوطِ ڈھاکہ سے قبل گرفتار ہوئے اور تخریب کاروں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔

شہید عبد الحق ؒ

عبد الحق اور عبد المتین (رکن ڈھاکہ میڈیکل کالج) ابو محمد جہانگیر کی شہادت کی خبر سن کر صدر گھاٹ کی طرف چلے کہ شہید جہانگیر کی میت آرہی ہے۔ آخری بار اپنے شہید ساتھی کو مل لیں۔ مگر یہ دونوں ابھی کچھ دور گئے تھے کہ سامنے سے اردو بولنے والوں کا ایک جلوس آتا دکھائی دیا جس نے قریب پہنچ کر انہیں محض بنگالی ہونے کے جرم میں پکڑ لیا اور مارتے پیٹتے میرپور گیارہ نمبر (ڈھاکہ) لے گئے۔ وہاں پہنچ کر ان پر سخت تشدد کیا اور پھر دونوں کو ایک کنویں میں پھینک دیا۔ اس طرح ڈھاکہ البدر کی تین کمپنیوں میں سے دو کے کمانڈر ابو محمد جہانگیر (کمانڈر عزیز بھٹی شہید کمپنی) اور عبد الحق (کمانڈر عبد المالک شہید کمپنی) ایک ہی روز (۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء) شہید ہو گئے۔ ایک کو دشمن نے اور دوسرے کو "اپنوں" ہی نے شہید کر ڈالا۔ ان کے ہمراہ عبد المتین بھی شہادت کے مرتبہ پر فائز ہو گئے۔

عبد الحق اور عبد المتین کی شہادت پر "البدر" کے کارکن جذباتی ہو گئے۔ جنہیں جمعیت کی قیادت نے صبر کی تلقین کی اور کہا کہ یہ لوگ بے عقلی میں ایسا کر رہے ہیں انہیں اپنے پرائے میں تمیز نہیں ہے، ہمیں تو بہرحال یہ تمیز قائم رکھنی ہے۔

عبد الحق شہید شادی شدہ تھے اور باریسال سے تعلق تھا۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مشرقی پاکستان کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ گھر سے وقتاً فوقتاً بلاوا آتا رہتا۔ ناظم جمعیت نے کہا کہ آپ گھر سے ہو آئیں۔ کہنے لگے میں نے بہت سوچا ہے اور اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حالات درست ہونے پر ہی گھر جاؤں گا، لیکن حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے اور وہ گھر جانے کے بجائے اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔

عبد الحق شہید ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک ذہین طالب علم اور صابر و متحمل مزاج فرد تھے۔ ہر کام سوچ کر کرتے، لیکن ان کے سوچنے اور فیصلہ کرنے کا عمل اس قدر تیز ہوتا تھا کہ رشک آتا تھا مقصد پر جان نچھاور کرنے اور ساتھیوں پر جان چھڑکنے کا محاورہ ان پر ٹھیک ٹھیک صادق

آتا تھا سخت سے سخت قسم کے کام کی ذمہ داری ان پر ہی عائد کی جاتی تھی۔ جب بھی انہیں پکارا گیا وہ بلا تامل آگے بڑھے اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کٹھن سے کٹھن ذمہ داری ادا کی۔ ان کا توسیع دعوت کا انداز بھی منفرد تھا۔ وہ تین طالب علم منتخب کرتے اور پھر ان تینوں سے اپنے روابط بڑھاتے اور جب تک انہیں رفیق یا امیدوار نہ بنا لیتے کسی دوسرے فرد سے اس انداز کا ربط نہ رکھتے۔ اسی لئے ساتھی ان کو رکن ساز رکن کہا کرتے تھے۔ جب ان کو جمعیت کی ذمہ داریوں سے فرصت ملتی تو تحریک اسلامی کا کام بھی کرتے۔ عیدالاضحیٰ کے روز کھالوں کی وصولی، طوفانوں میں فنڈز کی فراہمی جلسہ ہائے عام کے لیے پوسٹر لگانے وغیرہ جیسی مہمات میں وہ کبھی اپنے آپ کو پیچھے نہ رکھتے کہا کرتے تھے کہ "دستور اور تنظیمیں الگ ہیں، مگر مقصد تو ایک ہے"

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

شہید ابوالحسینؒ

یہ پاکشیا (ضلع تنگائل) کے رہنے والے تھے جمعیت کے رفیق اور سال دوم کے طالب علم تھے۔ ۷ا دسمبر کو انہیں بھارتی فوج نے پکڑ لیا اور گولی ماردی ابھی وہ تڑپ رہے تھے کہ انہیں ایک اجتماعی قبر میں پھینک کر دفن کر دیا گیا۔

شہید نورالاسلامؒ

نور، شاؤنزار (ضلع ہاری سال) میں ایوب علی کے ہاں پیدا ہوئے۔ قاری نور محمد دبار ڈپور، لوا کھالی) سے قرآن مجید کا علم حاصل کیا۔ بعد ازاں عالم کا امتحان دیا، جس میں اوّل پوزیشن لینے پر وظیفہ ملا۔ فاضل کے امتحان میں بھی وظیفہ حاصل کیا۔

نورالاسلام، ایک خستہ حال کسان گھرانے کے نورِ چشم تھے۔ مدرسہ میں تھے کہ اسلامی جمعیت طلبہ کی دعوت قبول کی اور پوری زندگی کے اسی نصب العین کو اپنا نصب العین قرار دیا اور استقامت کے ساتھ اس کٹھن راستے پر قدم بڑھایا۔

۱۹۷۱ء کا المیہ رونما ہوا تو انہیں البدر میں ذمہ داری سونپنے کے بجائے جمعیت

کے تنظیمی امور سونپے گئے۔ ان دنوں نور اکامل کے طالب علم تھے۔ یہ نومبر کی بات ہے کہ انہیں مکتی باہنی نے گرفتار کر لیا اور فاشر ہاٹ لے جا کر لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کی شدید ضربات سے شہید کر دیا۔ ان کی میت تدفین کے لئے نہ مل سکی۔

شہید محمد مقصود علیؒ

مقصود علی ولد محمد ہارون الرشید آگرہ گنڈا تحصیل تمار کھلی (ضلع کشتیا) دسمبر ۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ جے این ہائی اسکول سے ۶۷ء میں میٹرک پاس کیا۔ کالج میں داخل ہوتے ہی جمعیت کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ دیہات میں تعلیم بالغاں کے مراکز کے قیام اور سڑکوں کی تعمیر و مرمت میں ان کا قابل قدر حصہ ہے۔ گورنمنٹ کالج کشتیا میں بی۔ اے کے طالب علم تھے کہ ۱۹۷۱ء میں جمعیت کے ناظم کی ہدایت پر رضا کار فورس میں شامل ہوئے۔ تربیت مکمل کرنے کے بعد تمار کھلی میں ذمہ داری سنبھالی اور ہندوستانی ایجنٹوں کے خلاف مختلف لڑائیوں میں حصہ لیا۔ ۱۳؍دسمبر ۱۹۷۱ء کو کشتیا میں مکتی باہنی کے ہاتھوں پکڑے گئے اور شہید کر دیئے گئے۔

شہید شیخ عبد الغفورؒ

شیخ عبد الغفور نے شیخ سید علی کے گھر ہاٹا ربازی تحصیل تمار کھلی میں آنکھ کھولی۔ جے این ہائی اسکول تمار کھلی سے میٹرک پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج کشتیا سے ۱۹۷۱ء میں انٹر کے امتحان میں شریک ہوئے۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یہ امتحان فوج کی نگرانی میں ہوا تھا۔

میٹرک میں تھے کہ جمعیت سے وابستہ ہوئے۔ جنگ ۷۱ء کے دوران البدر فورس میں تربیت حاصل کی۔ ۱۲؍دسمبر کو گال ہاڑیا گھاٹ کے نزدیک مکتی باہنی نے پاکستان دوستی کے الزام میں الٹا لٹکا کر جسم کو سنگینوں سے چھید دیا انھوں نے شہادت کی زندگی پائی۔

شہید محمد علیؒ

محمد علی، گوگھاٹ (ضلع رنگپور) میں صاحب الدین کے ہاں پیدا ہوئے جسمانی اعتبار سے

مضبوط، دراز قد اور نکھرے ہوئے رنگ کے مالک تھے۔ تحریر و تقریر میں مہارت رکھتے تھے شاعری سے بھی شغف تھا اور تعقیبہ شاعری کرتے تھے۔

۱۹۷۰ء میں راجشاہی یونیورسٹی سے ایم اے کیا کالج کے ابتدائی زمانہ میں عبدالخالق صاحب نے ان کو اسلامی کتب پڑھنے کو دیں۔ دعوتِ حق سے شناسائی ہوئی تو جمعیت کی دعوت پر لبیک کہنے میں تاخیر کو مناسب نہ جانا اور جلد ہی فعال کارکنوں میں شمار ہونے لگے۔ ۱۹۷۱ء میں البدر کے ایک فعال و متحرک کارکن کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔

۷ / دسمبر کو انہیں قل چھاڑی سے گرفتار کیا گیا۔ بھارت نواز سوشلسٹوں نے کندھوں میں رسیاں ڈال کر انہیں درخت سے لٹکا دیا اور گھٹنوں اور ٹخنوں پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ ہر ضرب پر محمد علی اللہ اکبر کہتے اور خاموش ہو جاتے کمینہ دشمن ان کی آنکھوں کی ایمانی چمک کی تاب نہ لا سکا تو ان کی آنکھوں میں نمک بھر دیا۔ ان اذیت ناک لمحوں میں ان کا واحد سہارا خدا کی یاد تھی۔ دشمن نے اس سہارے کو چھیننے کے لئے ان کے سر پر لاٹھیوں سے شدید ضربیں لگائیں حتیٰ کہ وہ اس آزمائش گاہ سے سرخرو ہو کر خدا کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ شہادت کے وقت ان کی عمر ۲۵ سال گیارہ ماہ تھی۔ چند روز بعد ان کی والدہ اور والد کو بھی شہید کر دیا گیا۔ ان کا سایہ اٹھ جانے کے بعد تین بہنوں اور دو چھوٹے بھائیوں کے کنبے نے بڑے تکلیف دہ حالات میں پرورش پائی۔

شہید محمد خورشید عالم

محمد خورشید عالم کے والد ڈاکٹر منصور علی اپنے علاقے کی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ گھر کنڈ دیا پاڑا تحصیل کمار کھلی ضلع کشتیا میں تھا۔ خورشید ابھی ساتویں جماعت میں تھے کہ جمعیت میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۱ء کے پر آشوب ایام میں نویں جماعت کے طالب علم تھے اور کمار کھلی شہر میں جمعیت کے سیکرٹری نشر و اشاعت کے فرائض سنبھالے ہوئے تھے۔ کمزور جسم کا مالک یہ نوعمر لڑکا بے حد دلیر اور جرأت مند تھا۔ تربیت حاصل کرنے کے بعد البدر کیڈٹ بنا۔ سرحدی علاقے میں بھارتی فوج اور مکتی باہنی کے ایک مشترکہ حملے کا مقابلہ کرتے ہوئے ۲۶ / نومبر ۱۹۷۱ء کو شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوا۔ ۱۶ / دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد ان کی والدہ ماجدہ اور تمام بہن بھائی

ظالموں نے شہید کر دیئے اور یہ صدمہ سہنے کے لئے صرف ان کے والد بچے رہے ۔

شہید عبدالستارؒ

شہید عبدالستار کا تعلق ہاٹھور باڑی تحصیل کمارکھلی سے تھا۔ ان کے والد اظہر علی صاحب کا ۱۹۷۰ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ ایم این ہائی سکول کمارکھلی میں دسویں جماعت کے طالب علم تھے کہ ایک ذمہ دار کارکن کی حیثیت سے جمعیت کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ البدر میں شامل ہو کر تربیت حاصل کی۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ گمان غالب ہے کہ مکتی باہنی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ ان کی عمر تقریباً ۱۸، ۱۹ سال تھی۔

شہید عبدالثاقبؒ اور شہید عبدالناقبؒ

ان دونوں بھائیوں کا تعلق درگارہ باڑا تحصیل کمارکھلی سے تھا۔ والد صاحب کا نام محمد مطیع الرحمان تھا جو مقامی سکول میں استاد تھے۔ عبدالثاقب آٹھویں جماعت سے جمعیت سے وابستہ تھے جب کہ چھوٹا بھائی عبدالناقب بھی جمعیت کے اجتماعات میں باقاعدہ شامل ہوا کرتا تھا۔ عبدالثاقب جمعیت کے دیگر کارکنوں کے ساتھ البدر میں شامل ہو گئے اور کمارکھلی میں ذمہ داری ادا کرتے رہے۔ بعد میں شیخ عبدالغفور شہید کے ساتھ تال باڑیا گھاٹ میں پکڑے گئے اور ۲۱ دسمبر کو شہید کر دیئے گئے۔

شہید عبادت علیؒ

عبادت علی، گاؤں شب رام پور تحصیل کمارکھلی میں دسویں جماعت کے طالب علم تھے جمعیت کے کارکن تھے۔ ہنگاموں کے دوران تربیت حاصل کی اور ملک کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ پاک فوج کے سرنڈر کے بعد مکتی باہنی کے ہاتھوں ۲۴ دسمبر کو بیکسی کے عالم میں شہید کر دیئے گئے۔

شہید محمد سہراب علیؒ

محمد سہراب علی کا تعلق آگرہ کنڈہ تحصیل کمار کھلی سے تھا۔ ان کے والد ایمان علی سوت کا کاروبار کرتے تھے۔ نویں جماعت میں تھے کہ جمعیت کے ساتھ منسلک ہوگئے۔ ۱۹۷۱ء میں جے این ہائی اسکول میں دسویں جماعت کے طالب علم اور جمعیت کے فعال کارکن تھے۔ البدر میں شامل ہوئے اور پاک فوج کی شکست کے بعد روپوشی کے عالم میں چوڑہ یا پڑا کے قریب مکتی باہنی کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور ۲۲ر دسمبر کو ناقابل بیان حد تک تشدد اور اذیت کے ساتھ شہید کر دیئے گئے۔

شہید محمد عزیز الرحمانؒ

محمد عزیز الرحمان مانک کے والد کا نام ڈاکٹر امیر الاسلام تھا۔ بیدا مارا ضلع کشتیا سے ان کا

تعلق تھا۔ ۱۹۶۹ء میں وہ جماعت نہم میں سائنس کے طالب علم تھے کہ عبدالخالق ناظم جمعیت ضلع کشتیا کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جمعیت کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ مانک شہید بیدا مارا میں جمعیت کے انتہائی مثالی کارکن تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے اپنی ذمہ داری نبھاتے۔ البدر کے سترہ جوانوں کے وہ جواں حوصلہ کمانڈر تھے۔ گھر سے کشتیا جاتے ہوئے، ار دسمبر ۱۹۷۱ء کو راستے میں بارادی کے مقام پر انہیں اذیتیں دے کر شہید کر دیا گیا۔ پہلے ان کے ناک، کان کاٹ دیئے گئے پھر سارا جسم سنگین سے چھلنی کر دیا گیا اور ان کی لاش کو بغیر کفن کے زمین میں گاڑ دیا گیا۔

شہید محمد مہیر الدینؒ

شہید محمد مہیر الدین ہزارہ ہائی ضلع کشتیا سے تعلق رکھتے تھے۔ شہادت کے وقت شوگر مل ہائی اسکول کشتیا میں دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ آٹھویں جماعت میں جمعیت کے کارکن بنے۔ اسکول یونٹ کے معتمد تھے۔ ۸ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو مکتی باہنی نے شہید کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف چودہ سال کی تھی۔

شہید محمد اسماعیل حسینؒ

شہید محمد اسماعیل حسین کا تعلق تحصیل میرپور ضلع کشتیا سے تھا اور شوگر ملز ہائی اسکول کشتیا میں دسویں جماعت کے طالب علم اور سکول یونٹ کے ناظم تھے۔ پندرہ برس عمر تھی۔ ۱۹۶۸ء میں جمعیت کے کارکن بنے۔ ۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مکتی باہنی نے اذیتیں دے کر شہید کیا۔ البدر کے پرجوش کیڈٹ تھے۔

شہید محمد شاہ جہانؒ

شہید محمد شاہ جہان ہزارہ ہائی (ضلع کشتیا) سے تعلق رکھتے تھے۔ گورنمنٹ کالج کشتیا میں سالِ اوّل کے طالب علم اور جمعیت کے رفیق تھے۔ البدر کی زیرِ کمان بھارتی تخریب کاروں سے نمٹ رہے تھے کہ ۸ دسمبر کو مکتی باہنی نے شہید کر دیا۔

شہید شمس الغازیؒ

شمس الغازی (رنگ پور) زمانۂ طالب علمی میں جمعیت کے پرجوش کارکن تھے۔ ۱۹۷۰ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے اور ملازمت اختیار کرنے کے بجائے عوامی لیگ اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ کو بے نقاب کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کرنے لگے۔

وہ نہایت جوشیلے مقرر تھے۔ بے دھڑک اکیلے ہی دیہات میں نکل جاتے اور پاکستان کی بقا و سالمیت کے بارے میں لوگوں کو بدلائل قائل کرتے۔ آخر ایک روز چھاترو لیگ کے کارندوں نے انہیں گھیر لیا اور دھمکی دی کہ آئندہ اگر تم نے کہیں بھی تقریر کی تو تمہاری تکابوٹی کر دیں گے۔ اسی لب و لہجہ میں غازی نے جواب دیا "میں ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں، تم جبر کر سکتے ہو کر گزرو، پاکستان کی سالمیت میرا عقیدہ ہے۔۔۔"

یہ جواب ابھی ان کے لبوں پر تھا کہ پستول کا فائر ہوا اور ان کے بازو کو زخمی کر گیا۔ غازی نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے نعرہ لگایا "پاکستان زندہ باد" اور دوسرے ہی لمحے ایک دستی بم نے ان کے جسم کے پرخچے اڑا دیئے۔ موقع پر موجود پانچ افراد بھی شدید زخمی ہوئے۔

شہید محمد خلیل الدینؒ

شہید محمد خلیل الدین گورنمنٹ کالج کشتیا میں سال اول کے طالب علم اور جمعیت کے رفیق تھے البدر کیڈٹ کے ساتھ ایک آپریشن پر گئے ہوئے تھے کہ یکم دسمبر ۱۹۷۱ء کو شہید ہو گئے۔

شہید محمد عالمگیر چودھریؒ

عالمگیر نے تھانہ گائی بندھا (ضلع رنگ پور) میں عبدالستار چودھری کے خوش حال گھرانے میں آنکھ کھولی۔ دولت پور میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور گائی بندھا کالج سے بی اے کیا۔ گورے چٹے عالمگیر، مضبوط جسمانی ساخت کے مالک اور والی بال کے اچھے کھلاڑی تھے۔ بے حد خوش خط تھے اور کامیاب مقرر تھے۔

۱۹۶۸ء میں مولانا عبدالغفور کی دعوت پر مولانا مودودیؒ کی کتب پڑھنا شروع کیں اور جمعیت کے کارکن بنے۔ طاغوت کے خلاف جد وجہد کا پرجوش انداز ان کی امتیازی خصوصیت تھا۔ اسلامی تاریخ کی شخصیات کا مطالعہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ سیاسی شعور کی پختگی کے سبب طلبہ مسائل اور طلبہ کی اجتماعی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

۳ر اپریل ۱۹۷۱ء کو ان کے گاؤں پر آرمی ایکشن کیا گیا اور بلا امتیاز گاؤں کے نوجوانوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ ان میں ایک یہ بھی تھے۔ رعب و دہشت کی فضا قائم کرنے کے لیے دہشت کی انتہا کر دی گئی۔ ان تمام نوجوانوں کو گاؤں سے تھوڑی دور باہر لے جا کر گولی کا نشانہ بنا دیا گیا اور میتیں غائب کر دی گئیں۔

شہید سراج الاسلامؒ

نذرالاسلام شہید کے چھوٹے بھائی سراج الاسلام بھی اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن تھے۔ وہ دینی مدرسہ رائے پور میں کامل کی ڈگری کے طالب علم تھے، نذرل سے زیادہ مضبوط جسم کے مالک سراج نے آپریشنز کے دوران نمایاں خدمات انجام دیں۔ نذرل کی شہادت کے بعد سراج الاسلام کو بھی مکتی باہنی نے اذیتیں دے کر شہید کر دیا۔ بازار دیگی کے مغربی کنارہ میں ان کی لحد ہے

خدا ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

شہید علی اکبرؒ

علی اکبر، چھیلونیا، تحصیل فینی، ضلع نواکھالی سے تعلق رکھتے تھے۔ میٹرک اپنے قصبہ کے اسکول سے کیا۔ آخری ایام میں بی کام کی تعلیم فینی میں حاصل کر رہے تھے۔ میٹرک میں وہ جمعیت کے قریب آئے۔ کالج کی اسلامک سوسائٹی کے صدر اور شہر جمعیت کے ناظم تھے۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے عوامی لیگ کی جانب سے ہونے والی ایک ناچ گانے کی محفل کو الٹ دیا تھا گھریلو مالی حالت بہت خراب تھی۔ ابتدا میں رضاکار فورس میں شامل ہوئے اور پھر البدر کالی آندہ کیمپ کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ ۶ دسمبر کو اپنے گاؤں سے آرہے تھے کہ مکتی باہنی نے گرفتار کر لیا اور ایک درخت کے ساتھ الٹا لٹکا کر ان کے سر پہ پاؤں کے ٹھڈے، رائفل کے بٹ اور گھونسے مارتے رہے۔

۱۰ دسمبر کو وہ فینی میں لائے گئے۔ چلنے کی سکت نہیں تھی۔ اس کے باوجود چلنے پر مجبور کئے جاتے رہے۔ آخری روز انہوں نے ہوش میں آتے ہوئے کہا: "جس ملک اور مقصد کے لئے ہم زندہ تھے وہ ملک ہی جب نہیں رہا تو اب زندگی کا کیا فائدہ، مجھے اذیت نہ دو گولی مار دو۔" پھر ان کو مکتی باہنی کے کیمپ میں لٹکایا گیا۔ رات کے وقت شکرہاٹ، وہاں سے کالی داش پہاریا پہنچا کر ان کے بہنوئی احسن اللہ کو کہا کہ ایک گڑھا کھود دیں۔ پھر اسی گڑھے میں ۱۱ دسمبر کو انہیں اکٹھے گولی مار کر شہید کر دیا گیا اور کچھ مٹی بھی ڈال دی۔ اسی وقت ایک مقامی ہندو نے علی اکبر شہید کا سر کاٹ کر بازار میں پھینک دیا۔

شہید عبدالرحیمؒ

۲۰ رمضان المبارک کی رات کو کھلنا کے ایک مضافاتی علاقہ سے البدر کے ایک ننھے مجاہد عبدالرحیم (طالب علم جماعت ہشتم) کو اس کے گھر سے مکتی باہنی کے غنڈوں نے اغوا کیا اور ایک نانبائی کی دکان پر لے جا کر دہکتے ہوئے تنور میں پھینک دیا۔ عبدالرحیم تڑپ کر

باہر نکلا، مگر ظالموں نے اسں بار ہاتھ پاؤں باندھ کر تنور میں پھینک دیا۔ ننھے عبدالرحیم کی چیخیں ظالموں کے قہقہوں میں دب کر رہ گئیں۔ یہ واقعہ اس نانبائی نے سنایا جس کا تنور عبدالرحیم کے لئے مقام شہادت بنا۔

شہید جعفر علیؒ

چٹاگانگ سے تیس میل دور انگوبنا کالج میں سال چہارم کے طالب علم اور جمعیت کے ناظم تھے۔ جمعیت سے ان کا تعلق رفاقت کا تھا۔ شاہ جلال کے ہمراہ چٹاگانگ بندرگاہ پر شہید ہوئے

جعفر احمد شہید

واجدیہ مدرسہ میں کامل کے طالب علم تھے۔ جمعیت کے رفیق تھے۔ نونک سری کے مقام سے تعلق تھا۔ یہ بھی شاہ جلال کے ہمراہ منصب شہادت پر فائز ہوئے۔

شہید نور محمدؒ

ہٹ ہزاری کالج میں انٹر سائنس کے طالب علم اور جمعیت کے رفیق تھے۔ چٹاگانگ بندرگاہ پر شہید ہوئے۔ جھکل نامی گاؤں سے تعلق تھا جو تھانہ بانس کالی کے علاقہ میں ہے۔

شہید محمود الحقؒ

محمود الحق گاؤں غازیہ کاندی (تحصیل فلینی) میں کسان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرشادی ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ ابھی مڈل کلاس میں تھے کہ جمعیت کی دعوتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے جرم میں سکول سے نکال دیئے گئے اور انہوں نے الکشتم ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ بعد ازاں بی کام کرکے چٹاگانگ یونیورسٹی میں ایم کام میں داخل ہوئے۔

محمود الحق شروع ہی سے نہایت نرم دل اور شریف النفس نوجوان تھے۔ پوسٹر نہایت خوشخط لکھتے۔ ان کا پورا گھرانہ جماعت اسلامی سے منسلک تھا۔ اسکول میں اجتماعات کا انتظام

زمانے پر ایوب خان کے زمانے میں انٹیلی جنس والوں نے انہیں بہت تنگ کیا اور اساتذہ بھی بار بار وارننگ دیتے رہے کہ یہ کام نہ کیا کرو، لیکن ان کا ہمیشہ یہ جواب ہوتا "کیا میں صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کے نقش قدم پر نہ چلوں" محمود الحق کو مطالعہ کا بہت شوق تھا اس لئے سلجھے ہوئے انداز میں بحث کرتے۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں جب علیحدگی پسندوں اور اشتراکیت نواز گروہوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر محب وطن پاکستانیوں کے لہو کی ہولی کھیلی تو اپریل میں محمود الحق نے ناظم جمعیت کی ہدایت پر رضاکار فورس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وہ اپنے گاؤں کے نزدیک دھان کے کھیت میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ اگلے روز ایک دوست کے گھر پہنچے۔ دشمن کا گھیرا تنگ تھا۔ مکتی باہنی نے رات کے دو بجے ان کو گرفتار کر لیا اور سرشادی بلڈنگ لے آئے۔ ان کی آنکھیں اور ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ سری داس رام ہندو نے لاٹھی سے پیٹنا شروع کیا۔ غنڈوں نے کرفیو لگایا ہوا تھا۔ محمود بے حال ہو گئے۔ رات کے وقت دیگر ۹ ساتھیوں کے ہمراہ ان کو بلڈنگ کے مشرقی کونے میں لے جایا گیا۔ دشمن کے ہر سوال کے جواب میں وہ صرف ایک مطالبہ کرتے رہے کہ "مجھے صرف ایک بار میری والدہ سے ملوا دو" مگر دشمن کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، بلکہ ان کو رسیوں سے باندھ کر سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیا اور گھسیٹتے ہوئے گراؤنڈ میں لے گئے۔ شدید پیاسے محمود کو پانی سے محروم رکھا گیا اس کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے گئے۔ مکتی باہنی کے ایک غنڈے نے ان پر گولی چلا دی۔ وہ لا الہ الا اللہ پڑھ کر مشرق کی طرف دوڑے، لیکن انہیں پکڑ کر ایک گڑھے میں دھکیل دیا اور مزید فائرنگ کر کے جسم کو چھلنی کر دیا۔ اس محمود الحق کو شہید کر دیا گیا جس نے میٹرک کے زمانہ ہی سے اپنے علاقے کے لوگوں کی خدمت کے لئے جوب تیبا شنگھو (یوتھ سروِنگ سوسائٹی) بنا کر رفاہ عامہ کے کام کئے تھے اور میلاد کی محفلوں میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر منفرد انداز سے تقریریں کرتے تھے۔ شہادت کے وقت وہ سب ڈویژن جمعیت کے سیکرٹری تھے۔

شہید جلال احمدؒ

ضلع ڈھاکہ کا تھانہ کپتیا جمیعت کا ایک فعال حلقہ تھا۔ جلال احمد اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ جمعیت کے ایک سرگرم کارکن تھے۔

تعلیم کے میدان میں وہ ایک روشن مستقبل کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ مکتی باہنی نے گرفتار کرنے کے بعد انہی سے قبر کھدوائی اور پھر اسے کانٹوں سے بھروایا گیا اور تب چند غنڈوں نے اٹھا کر جلال کو قبر میں پٹخ دیا۔ ایک چیخ فضا میں گونجی اور اس کے ساتھ ہی انہیں منوں مٹی کے نیچے دبا دیا۔

یہ المناک حادثہ ۱۵ دسمبر کو پیش آیا۔ اقامتِ دین اور تحفظ پاکستان کی شاہراہ پر جلال احمد کی قربانی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ شہید صرف ۱۹ برس کے تھے۔

شہید محمد علیؒ

۱۱ دسمبر نرسندی کے چوک میں جمعیت کے کارکن محمد علی کو بجلی کے کھمبے کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ مکتی باہنی والے ان کے جسم کا ایک عضو کاٹتے اور مطالبہ کرتے کہ کہو "جے بنگلہ" لیکن محمد علی یہ سن ہی نہیں رہے تھے۔ ان کی زبان پر مسلسل کلمہ شہادت کا ورد جاری رہا اور اسی عالت میں جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ مکتی باہنی کی آتشِ انتقام ابھی نہیں بجھی تھی اس نے ان کی نعش کو سرِ بازار ایک کھمبے کے ساتھ لٹکا دیا لیکن ابن زبیرؓ کی روایت کے امین محمد علی اب اس دکھ سے بے نیاز ہو چکے تھے۔

شہید خورشید احمدؒ

ایک ان پڑھ نوجوان تھے۔ وہ متوسط الحال کسان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے کالا رنگ درمیانہ قد لیکن صحت بہت اچھی تھی۔ خوش اخلاق ایسے کہ سب ان سے محبت کرتے تھے، وہ نہایت سیدھے سادھے تھے۔ لوگوں کے دکھ درد میں شریک رہتے۔ پابند صوم وصلوٰۃ ایسے کہ کیسی بھی پریشانی ہوتی نماز سے غافل نہ ہوتے۔ چنانچہ اپنی اچھائیوں کی وجہ سے وہ

پورے علاقے میں مشہور تھے۔ ڈاکٹر جیبن کی زبان سے تحریک اسلامی کی خوبیاں سنیں تو صدق دل سے جماعت میں شامل ہوگئے۔ انہیں یقین تھا کہ تحریک اسلامی کے ساتھ ان کا تعاون اور تعلق آخرت کی فلاح کے لئے ہے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انتھک محنت کی۔ ہر طرف تحریک اسلامی کی دعوت کو پہنچانے کے لئے وہ ہمہ تن تحریک بن گئے۔

۱۹۷۱ء میں وہ گھر چھوڑ کر فینی چلے گئے رائفل ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد انہوں نے دشمنوں کے ساتھ آمنے سامنے ہو کر مقابلہ کیا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کی ۶ تاریخ کو وہ دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے اور فینی سے نواب پور لائے گئے وہاں ایک ندی کے کنارے لوگوں کو اکٹھا کیا گیا اور خورشید احمد کو مجرم کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اُن پر انٹ شنٹ الزامات لگائے گئے اور پھر خونخوار ظالموں کو ان پر چھوڑ دیا گیا۔ ان ظالموں نے اُن پر اس قدر ظلم کیا کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

۲۴ سال کی عمر میں وہ شہید ہوئے کچھ دن بعد ان کے والد کو بھی شہید کر دیا گیا۔

شہید بدر العالمؒ

ضلع نواکھالی کے گاؤں مہار کاندی میں پیدا ہونے والے اس نوجوان نے میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد معاشی تنگی کے سبب گھڑی سازی کی دکان کھولی۔ جمعیت کے رفیق تھے۔ ۱۹۷۱ء میں جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے۔ اسی برس ملک کے حالات نے ہر محب وطن نوجوان کو میدان عمل میں کودنے کی دعوت دی۔ بدر العالم نے الشمس میں خدمات انجام دیں۔

اکتوبر کی بارش زدہ شام کو مکتی باہنی نے ان کو دکان سے گھر واپس آتے وقت گرفتار کر لیا۔ غنڈوں نے انہیں اور مولانا فرد محمد کو ایک ساتھ ایک جنگل میں شہید کر دیا۔ دو روز بعد ان شہیدوں کی نعشیں ملیں۔

شہید غیاث الدینؒ

ان کا تعلق عنایت پور (ضلع نواکھالی) سے تھا۔ غیاث کے والد سلطان احمد کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ خدا نے ان کو ذہین اور مخلص بیٹا عطا کیا۔ کھلتے ہوئے رنگ کے غیاث الدین درمیانی صحت کے مالک تھے۔ پرائمری کے بعد جمعیت کی دعوت سے متعارف ہوئے۔ خوش خط ہونے کے باعث خوبصورت دیواری پوسٹر لکھتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں میٹرک میں پہنچے تو ملک نازک صورت حال سے دوچار تھا۔ غیاث نے البدر کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد جنوری ۱۹۷۲ء میں وہ لاپتہ ہو گئے۔ چند روز بعد ان کی لاش اس حالت میں ملی کہ ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور گولیوں سے کمر چھلنی تھی۔ شہادت کے وقت غیاث الدین شہید کی عمر ساڑھے سولہ برس تھی۔

شہید نذر الاسلامؒ

نذر الاسلام موضع پور لولاس (تحصیل رائے پور ضلع نواکھالی) کے مشہور دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا امجد حسین علاقے کے نامور عالم دین ایک مقامی مدرسے کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ نذرل کا ایک مجموعہ نعت "محمد عربی مصیبت میں کیوں ہے یہ دنیا" قابل ذکر ہے۔ انہوں نے شائستہ نگر سے میٹرک کیا۔ پھر رائے پور مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیا، وہاں فاضل کا امتحان امتیازی پوزیشن سے پاس کیا۔ مدرسہ میں وہ "نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن" کے مقامی صدر تھے۔ ۱۹۶۹ء میں جونیئر ٹریننگ کالج فینی میں داخل ہوئے تو جمعیت کے کارکنان کی کوششوں سے جمعیت کی دعوت کو قبول کر لیا۔ اسی سال جمعیت کا پورا پینل اسٹوڈنٹس یونین کے انتخاب میں کامیاب ہوا۔ نذرل جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اگلے سال وہ کالج کی مذہبی و سماجی بہبود سوسائٹی کے بلا مقابلہ سیکرٹری منتخب ہوئے۔ شہید نذرل شکل و صورت اور کلام میں بھی مشہور بنگالی شاعر نذر الاسلام سے مشابہت رکھتے تھے۔ درمیانہ قد، صحت مند جسم، بڑی بڑی آنکھوں اور مسکراتے چہرے والا یہ انقلابی شاعر اور عمل و عزم کا

پیکر یہ جوان مشرقی پاکستان کے خلصے لوگوں میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ ان کا لہجہ زوردار اور آہنگ بلند تھا۔ ان کی نظمیں "ظلم کس نے کیا؟" "قانون سے نہیں عمل سے رنگ بدلنا" "غازی صلاح الدین تم کہاں ہو" "بنگالی نہیں مسلم مسلم" "شہید تم نہیں مرو گے" "شہیدوں کا لہو تحریک ہے" "اے مسلم برادر" وغیرہ نے انہیں بہت شہرت عطا کی۔ ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم میں ان سے یہ نظمیں جلسہ ہائے عام میں بار بار سنی گئیں۔ ڈھاکہ، باریسال، کومیلا اور کھلنا کے اجتماعات میں وہ اپنا کلام سناتے رہے۔ ۱۹۷۱ء میں جب لہو دینے کا لمحہ آیا تو نذرل اسلام کیمپ میں تربیت حاصل کر کے تحصیل رائے پور کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ مکتی باہنی نے مدرسہ عالیہ رائے پور پر جب حملہ کیا تو اسے ناکام بنا دیا۔ اپنے علاقے کو دشمن کی ناپاک سرگرمیوں سے پاک کرنے والے یہ عظیم مجاہد ۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو چوموہانی کے مقام پر مکتی باہنی کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ پانچ روز تک عبرتناک اذیتیں دے کر رائے پور کے مدرسہ عالیہ کی مشرقی دیوار کے قریب ایک قبر کھود کر نذرالاسلام زندہ دفن کر دیئے گئے۔ شہید نذرل کی نظمیں اور نغمے آج بھی بنگلہ دیش تحریک اسلامی کے کارکنوں کو یاد ہیں اور ان کے جذبوں اور حوصلوں کو تازہ و توانا رکھے ہوتے ہیں۔

شہید محمد ابراہیمؒ

محمد ابراہیم نواکھالی صدر میں البدر کے پلاٹون کمانڈر تھے۔ کالج میں سال چہارم کے طالب علم تھے۔ ۸ دسمبر کو مکتی باہنی نے انہیں گرفتار کر لیا اور بے پناہ اذیتیں دینے کے بعد گولی مار کر شہید کر دیا۔ شہادت کے وقت ابراہیم کی عمر بیس برس تھی۔

شہید محمد ابوالحسین

مرحوم ادریس میاں ایک باعمل مسلمان تھے جن کے گھرانے میں محمد ابوالحسین نے آنکھ کھولی ان کا گاؤں راجہ پور (تحصیل حاجی گنج ضلع کومیلا) تھا۔ وہیں پر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ نصیر کوٹ ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ پھر جگن ناتھ کالج ڈھاکہ سے بی کام کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۷۱ء میں

سنٹرل کالج ڈھاکہ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۵ء سے وہ اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن چلے آرہے تھے۔ درس قرآن بہت خوبصورت دیتے تھے اور اس حوالہ سے جمعیت کے حلقوں میں بہت محبوب تھے۔

ابوالحسین ۲۴ برس کے تھے۔ ان کی زندگی سراپا تحریک تھی۔ ہمیشہ اس ادھیڑ بن میں رہتے کہ کسی طرح تحریک آگے بڑھے۔ ان کے معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ ٹیوشن کرکے گزر بسر کرتے تھے مگر تحریکی کاموں میں ان کا انہماک اس قدر تھا کہ معلوم نہیں ہوتا تھا کوئی اور کام بھی کرتے ہوں گے۔ جب بھی ان پر کوئی ذمہ داری ڈالی گئی مسکراتے ہوئے قبول کی۔ تحریکی کاموں میں اس قدر انہماک اور مصروفیات کے باوجود امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ ان کا پورا گھر "ہمہ خانہ آفتاب" کا مصداق تھا۔ ایک بڑے بھائی مشرقی پاکستان اسلامی جمعیت طلبہ کے سیکرٹری نشر و اشاعت تھے، دوسرے بڑے بھائی جماعت اسلامی کے رکن تھے اور چھوٹے بھائی جمعیت سے وابستہ تھے۔

شہید ابوالحسین کے بارے میں ڈھاکہ جمعیت کے آخری ناظم صاحب نے بتایا: وہ نہایت سادہ طبیعت کے مالک، بلند اخلاق اور سراپا تقویٰ تھے۔ ان کے تقویٰ کی ایک ادنیٰ سی مثال بیان کرتا ہوں۔ ایک روز جمعیت کی مختلف ٹیموں نے ساری رات پوسٹر لگائے حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔ میں نے ابوالحسین سے کہا آیئے اجتماعی ناشتہ ہوجائے کہنے لگے "میرے بھائی! میں نے یہ کام ناشتے کے لیے تو نہیں خدا کی رضا کے لئے کیا ہے" اور چلے گئے۔ تحریک سے ان کی والہانہ دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ ان کے دوسرے بھائی بھی جمعیت کے رکن تھے۔ گھر کی معاشی حالت بہت کمزور تھی۔ ابوالحسین نے بی کام کیا تو گھر والوں نے کہا: "دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایک تو ملازمت کرلے"۔ یہ بھی کہا "بہتر ہوگا ابوالحسین سروس میں چلا جائے" میں دفتر آیا تو ابوالحسین کو پریشان پایا۔ وہ کہنے لگے "یہ صورتِ حال ہے مجھے مشورہ دیں۔ آپ کا فیصلہ میرے لئے آخری فیصلہ ہوگا"۔ میں نے کہا۔ دشمن نے وطن کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے مختلف مقامات پر پہلے ہی افرادی قوت بہت کم ہے، اس صورتِ حال میں آپ خود ہی فیصلہ کرلیں"۔ میری یہ بات سن کر وہ چپ چاپ گھر چلے گئے۔ دوسرے روز آئے اور کہنے لگے۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس وقت جمعیت کے ساتھ کام کرنا ملازمت کی نسبت زیادہ ضروری ہے" اس کے بعد سقوط مشرقی پاکستان تک انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ وطن کے دفاع کی جنگ لڑی۔

ابوالحسین نے ۱۹۷۱ء میں عسکری تربیت حاصل کی اور مشرقی پاکستان میں قائد تحریک اسلامی پروفیسر غلام اعظم صاحب کے گھر پر پہرہ دینے والے دستے کے کمانڈر مقرر کیئے گئے۔ سقوط کے بعد وہ اِدھر اُدھر ہو گئے، لیکن ۲۶ دسمبر کو بنگلہ دیش کے اخبارات میں گرفتاری کے لئے ان کی تصویر شائع ہوئی۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ داڑھی منڈوا کر کسی محفوظ جگہ چلے جائیں، لیکن انہوں نے یہ مشورہ نہ مانا کہ عزیمت کے خلاف تھا۔ وہ گلشن کالونی میں ایک گھر میں رہتے اور وہیں سے ۲۷ دسمبر کو گرفتار کر لیا گیا۔ مکتی باہنی انہیں ڈھاکہ یونیورسٹی کے اقبال ہال کی قتل گاہ میں لے آئی۔

ابوالحسین کمزور جسم کے مالک تھے۔ مکتی باہنی والوں کا خیال تھا کہ ذرا سختی کریں گے تو سب کچھ اُگل دے گا، مگر وہاں معاملہ دوسرا نکلا۔ کمزور جسم میں ایک مضبوط دل چھپا ہوا تھا۔ غنڈوں نے ابوالحسین کو ہال کے ایک دوسرے کمرے میں قید کر کے طرح طرح کے مظالم ڈھائے ان کے بازو چھریوں سے اس طرح چھیل دیئے گئے جس طرح قصاب جانور کا گوشت ہڈیوں سے جدا کرتا ہے۔

ابوالحسین ایک اہم فرد تھے ان کے سینے میں سینکڑوں راز تھے، لیکن ظلم کا کوئی رنگ ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلوا سکا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک لفظ ان کے سینکڑوں ساتھیوں کو ابتلا سے دوچار کر جائے گا۔ ابوالحسین نے کمال ضبط کا مظاہرہ کر کے بلال حبشیؓ اور صہیبؓ رومی کی سنت کو زندہ کر دکھایا۔

غنڈوں نے جانکنی کے عالم میں انہیں ان کے گھر کے آگے پھینک دیا، لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں یہ سخت جان پھر نہ جی اٹھے۔ ان کی گردن میں سنگین گھونپ دی اور لاشہ کو بوڑھی گنگا میں پھینک دیا۔

شہید ابوالحسین کی آخری آرام گاہ گنگا کا پیٹ ہے۔!

شہید ابوالقاسم شفیق اللہؒ

ابوالقاسم شفیق اللہ سید پور (ضلع نواکھالی) کے بذل الکریم کے صاحبزادے تھے۔ ٹومچر کے مدرسۂ عالیہ سے انہوں نے عالم کی سند حاصل کی اور اسلامیہ مدرسہ نواکھالی سے "کامل" کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد تفسیر گروپ میں داخلہ لے لیا۔ "قائداعظم" کالج ڈھاکہ سے انہوں نے گریجوایشن کی۔

شفیق اللہ، اسلامی جمیعت طلبہ کے رکن اور جمیعت طلبہ عربیہ مشرقی پاکستان کے صدر رہے۔ ۱۶، دسمبر کو مکتی باہنی نے انہیں دیکھتے ہی گولی مار کر شہید کر دیا۔

شہید طیب الرحمنؒ

طیب الرحمان بھیشہ گنج (ضلع نواکھالی) میں پیدا ہوئے۔ دینی مدرسہ میں زیرتعلیم یہ نوجوان جمیعت کے رفیق تھے۔ لکھی دریونٹ میں بیت المال اور لائبریری کے انچارج تھے گزربسر کے لئے شام کے وقت ایک دکان چلاتے تھے۔ البدر ریکروٹ تھے سقوط مشرقی پاکستان کے بعد لاپتہ ہوگئے۔ ان کی والدہ اسی غم میں جنوری ۱۹۷۳ء میں انتقال کر گئیں۔ آج تک خوبصورت صحت کا مالک طیب گھر واپس نہیں آسکا۔

شہید خورشید عالمؒ

خورشید عالم ضلع نواکھالی کے گاؤں "تی تارکاندی" کے عبدالمنان کے بڑے صاحبزادے تھے، زمانۂ طالب علمی میں جمیعت کے رفیق تھے۔ عملی زندگی میں قدم رکھے ابھی ڈیڑھ برس گزرا تھا کہ ملک پر لہو کی بارش برسنا شروع ہوگئی۔ نوجوان خورشید عالم البدر میں شامل ہوگئے۔ جب مکتی باہنی کو غلبہ حاصل ہوا تو خورشید عالم پنجاری کیمپ سے گرفتار ہوئے

پھر وہ اس دنیا میں نہیں دیکھے گئے۔ ظاہر ہے کہ شہید کرنے کے بعد ظالموں نے ان کی لاش بھی گم کر دی۔

محمد مصطفیٰ کمال شہیدؒ

مصطفیٰ کمال امن کمیٹی میں شامل تھے ، انٹر میں دوسرے سال کے طالب علم تھے، پرجوش اور پرعزم! ۱۶، دسمبر کی قیامت صغریٰ کے بعد انہوں نے چند روز اپنے آپ کو چھپائے رکھا۔ پھر تبلیغی جماعت کے ایک وفد کے ساتھ ڈھاکے سے نکل کھڑے ہوئے یہ جماعت ایک مضافاتی بستی کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک سامنے سے ناچتے کودتے نوجوانوں کا ایک مسلح گروہ نمودار ہوا مصطفیٰ کمال نے بھانپ لیا کہ یہ مکتی باہنی کا دستہ ہے ، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا انہوں نے ان کی نظروں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی ، مگر پاس گزرتے ہوئے اُن کے کالج کے لڑکوں نے انہیں پہچان لیا اور خوشی سے چیخ اٹھے ، وہ رہا مصطفیٰ کمال! مکتی باہنی والے خونخوار درندوں کی طرح جھپٹے اور بھیڑوں کے گلہ میں سے اسے اچک کر لے گئے: تبلیغی وفد وظائف پڑھتا ہوا آگے بڑھ گیا !

ظالموں نے وہیں سرِ راہ مصطفیٰ کمال کی انگلیاں کاٹ ڈالیں اور بہنے والے خون کو اپنے چہروں پر لتھیڑ کر قہقہے لگانے لگے۔ ایک نے کہا چہرے اچھی طرح سرخ نہیں ہو سکے۔ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں اور اس کے ساتھ ہی مصطفیٰ کمال کے دونوں بازو قلم کر دیئے گئے۔ اب خون ان کے چہروں کو رنگین کرنے کے لئے کافی تھا مصطفیٰ کمال ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا کہ ایک بدمعاش لڑکا اس کی آنکھیں نکالنے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن مکتی باہنی میں شامل ایک فرد کو رحم آیا اور اس نے مصطفیٰ کمال کے سینے پر رائفل کی نالی رکھ کر لبلبی دبا دی۔

مصطفیٰ کمال قید حیات سے آزاد ہو گیا اور حیاتِ ابدی کا سزاوار ٹھہرا۔

شہید ابوالبشرؒ

ٹکی پور تھانہ رنوا کھالی ، کے پارلیا گاؤں کے منیف الحق کے گھر ابوالبشر پیدا ہوئے منیف الحق بہت دیندار آدمی تھے۔ ان کے پورے خاندان کی اسلام سے گہری وابستگی تھی۔ چنانچہ اسی مبارک رجحان کے باعث ابوالبشر کو اسلامی مدرسے میں داخل کیا گیا۔ وہ ایک ذہین خوش اخلاق اور خوش گفتار طالب علم تھے۔ ساتھ ساتھ وہ نہایت

جرأت مند بھی تھے۔

۱۹۷۱ء کی حق و باطل کشمکش کے دور میں مکھی پور آکر البدر میں شامل ہو گئے۔ فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ کیمپ میں بھیج دیئے گئے۔ وہ اپنے فرائض ایسے انہماک سے انجام دیتے تھے کہ کسی اور بات کا خیال ہی نہ رہتا تھا۔ ایک بار ان کی والدہ ان سے ملاقات کرنے آئیں اور گھر چلنے کے لئے کہا۔ انہوں نے والدہ سے کہا: "اماں قرآن اور سنت کی حکمرانی کے قیام کے لئے اور مسلمانوں کو اسلام دشمن عناصر سے محفوظ رکھنے کے لئے میں البدر میں شامل ہوا ہوں، جب تک یہ کام مکمل نہ ہو جائے کہیں نہ جاؤں گا۔ دعا کیجئے اللہ ہمیں صحیح راستے پر قائم رکھے۔"

دسمبر میں بھارتی فوج کے حمایتی اسلام دشمن عناصر کا ایک گروپ ان کے کیمپ پر حملہ آور ہوا۔ وہ جدید اسلحہ سے لیس تھا۔ جدید اور خودکار ہتھیاروں کے سامنے البدر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ یہ کیمپ دشمن کے قبضے میں چلا گیا، لیکن ابوالبشر وہاں سے بحفاظت نکل جانے میں کامیاب ہو گئے اور اپنی خالہ کے پاس جا پہنچے۔

دشمنوں نے ان کی خالہ کا مکان گھیرے میں لے لیا۔ اس گھر میں ناریل کا ایک درخت تھا۔ ابوالبشر درخت پر چڑھ گئے مگر تقدیر نے اور کچھ فیصلہ کر رکھا تھا۔ دشمن نے انہیں دیکھ لیا اور ان کو درخت سے اترنے پر مجبور کیا۔ پھر ان پر سخت مظالم ڈھائے گئے۔ . . . ۱۹ دسمبر کو انہیں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ اس وقت وہ لا الٰہ الا اللہ کا ورد کر رہے تھے۔

شہادت سے تھوڑی دیر پہلے ان کے ایک پھوپھی زاد بھائی ان سے ملاقات کرنے آئے تو انہوں نے کہا: "اماں ابا سے میرے لئے دعا کی درخواست کرنا۔"

شہادت کے وقت ان کی عمر صرف سترہ برس تھی۔

شہید خادم الاسلام

خادم الاسلام کا تعلق ضلع راجشاہی سے تھا۔ وہ جنید اکالج جیسور میں زیر تعلیم تھے اور جمعیت کے ایک فعال کارکن سمجھے جاتے تھے۔

وطن کی حفاظت اور مظلوم عوام کو ظلم و وحشت کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے

"البدر" کی صدا پر انہوں نے لبیک کہا اور یہ مقدس فریضہ انجام دینے کے جرم میں انہیں بھی سزا دی گئی۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد ظالموں نے ان کو سفاکی سے شہید کر دیا۔

شہید عبدالوہابؒ

عبدالوہاب، نواب سراج الدولہ کالج میں بی اے کے طالب علم تھے، وہ اپنی ذہانت شرافت اور بے باکی میں پورے ناٹور شہر میں مشہور تھے۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے جمعیت کے ناظم مقرر ہوئے۔ جمعیت کا کام کرنے سے گھر والوں کی طرف سے کئی بار منع کیا گیا، مگر وہ اس کی پروا کئے بغیر اپنے فرائض بڑے انہماک اور یکسوئی سے انجام دیتے رہے۔

عبدالوہاب بڑے دلیر اور جذباتی تھے۔ جمعیت کے کاموں کے لئے انہوں نے خود کو وقف کر دیا تھا۔

سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے اگست میں رائے پوری تھانہ سے عبدالوہاب اور جمعیت کے کارکنان معین الدین عبدالباطن اور حافظ محمد یونس کو مکتی باہنی نے پکڑ لیا۔ یہ تمام لوگ غیر مسلح تھے۔ انہیں ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک ندی میں ڈبو دیا گیا اور یہ ساتھی شہید ہو گئے۔

شہید عبدالمتینؒ

شولا چارا، بیگم گنج تھانہ کا ایک گاؤں ہے جس میں عبدالمتین پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام نور محمد تھا اور یہ اپنے والد کے بڑے بیٹے تھے۔

عبدالمتین اوائل عمر سے ہی ایک سنجیدہ اور متین ہونہار بچے تھے۔ مقامی پرائمری اسکول سے فارغ ہونے کے بعد گلاب پور ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ برسات کے دنوں میں گلاب پور جانے کے لئے کشتی کا سفر کرنا پڑتا تھا، مگر آندھی ہو یا طوفان، وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ سکول پہنچتے۔ ہائی اسکول سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے چومونی کالج سے ایف ایس سی کیا اور یہیں جمعیت سے متعارف ہوئے اس سے قبل وہ این۔ ایس۔ ایف سے متعلق تھے جمعیت سے وابستگی کے بعد

دعوتی کام میں ان کا انہماک دیدنی تھا۔ وہ اگرچہ دبلے پتلے جسم کے مالک تھے، مگر لمبے قد اور پرکشش نقوش نے ان کی شخصیت کو سحر انگیز بنا دیا تھا۔ اس پر مستزاد ان کا دعوتی انداز تھا جو از دل خیزد بر دل ریزد کا صحیح مصداق تھا۔ ۱۹۶۷ء میں عبدالمتین نے ڈھاکہ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں بھی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ تحریک کا کام پوری تندہی سے انجام دیتے رہے۔

۱۹۶۹ء میں عوامی تحریک کے دوران میں وہ اسلام پسند طاقتوں کے ہراول دستوں میں شامل رہے۔ اسی زمانہ میں "عبدالمالک" کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا۔ اس واقعہ پر ان کا ردعمل "بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق" کا سا تھا اب وہ اور زیادہ بے باکی اور جرأت کے ساتھ میدان عمل میں نکل آتے۔ والد کو علم ہوا تو بیٹے کو نشیب و فراز سمجھانے لگے۔ سعادت مند بیٹے نے جواب دیا "اباجی موت برحق ہے، لیکن اگر یہ اللہ کی راہ میں آئے تو خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ"۔ باپ نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیٹے کو بہت سمجھایا، مگر بیٹا فرض کے ہاتھوں مجبور تھا۔

عبدالمتین نے اب اپنے کام کا دائرہ کار بڑھا لیا تھا۔ وہ گاؤں آتے تو لوگوں کا مفت علاج کرتے۔ کوئی میڈیکل کالج چلا آتا تو وہاں بھی تعاون کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھتے۔ انہوں نے رفاہ عامہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لئے ایک "فلاح عام کلب" قائم کیا۔ اس کے سیکرٹری بنے۔ کلب کے فرائض میں عوام الناس کی خدمت سرفہرست تھی۔ اس کلب نے متعدد رفاہی کام انجام دیئے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں عبدالمتین نے پروفیسر غلام اعظم کے حلقہ انتخاب میں جمعیتی ساتھیوں کے ہمراہ زبردست کام کیا۔

عبدالمتین کی یہ تمام سرگرمیاں "دشمن" کی نگاہ میں بری طرح کھٹک رہی تھیں۔

۱۹۷۱ء میں وہ ڈھاکہ میں تھے کہ گاؤں میں مکتی باہنی نے سراج اور خورشید نامی دو لیڈروں کی قیادت میں ان کے گھر پر حملہ کیا اور تمام مال اسباب لوٹ کر لے گئے۔ زیورات اور نقد رقم ہی نہیں، لٹیروں نے اناج اور چاول تک ڈھو لیا۔ ان کے والد سمجھ گئے کہ میرے بیٹے کے "اعمال" کی سزا ہے، چنانچہ انہوں نے عبدالمتین کو اس راہ سے "بھٹکانے کے لئے" ان کی شادی کر دینے کی تجویز سوچی ان کا خیال تھا کہ یہ زنجیر عبدالمتین کے قدم آگے بڑھنے سے روک دے گی، مگر بیٹے نے یہ کہہ کر زنجیر کو پہننے سے انکار کر دیا کہ اباجی میرے وطن کو زنجیریں پہنانے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ میں

پہلے ان سے نمٹ لوں، پھر آپ کی خواہش کا احترام بھی انشاء اللہ ضرور کروں گا۔

ان کے والد نے خواب میں دیکھا کہ عبدالمتین سامنے بیٹھا مسکرا رہا ہے، لیکن کان میں لوگوں کی آوازیں آرہی ہیں کہ عبدالمتین کہاں چلا گیا۔ وہ تو ہمارے گاؤں کی آبرو ہے۔ اسے ڈھونڈو، وہ تو ایک ہیرا ہے جو نجانے کہاں چھپ گیا ہے۔" ان کے والد خواب سے بیدار ہوئے تو سخت حیران تھے۔ اس کی تعبیر ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

عبدالمتین نے ڈھاکہ سے اپنے والد کو جو خط لکھا تھا۔ وہ ڈاکیے نے دشمن کے کیمپ کے کمانڈر لطف الرحمٰن کو دے دیا۔ اس خط میں انہوں نے اسلام دشمن عناصر کے عزائم اور اپنے ارادوں کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کر رکھا تھا۔ اس خط نے دشمن کے نزدیک عبدالمتین کو اور خطرناک بنا دیا۔ چنانچہ دشمن نے فوراً پروگرام بنایا اور ایک گھات لگا کر عبدالمتین کو شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۵ نومبر ۱۹۷۱ء کو رونما ہوا۔

شہادت سے چند روز قبل ان کے علاقے کے ایک شخص مخلص الرحمان نے عبدالمتین کو فوراً ڈھاکہ سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ عبدالمتین نے کہا کہ جس اخلاص کے ساتھ آپ نے مجھے مشورہ دیا ہے اس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں، لیکن بھائی موت سے فرار بھی کبھی ممکن ہوا؟ اگر میری موت آچکی ہے تو مجھے کوئی نہیں بچا سکتا، کہیں بھی نہیں بچا سکتا اور اگر ابھی وقت مقرر نہیں آیا۔ تو پھر میں یہاں بھی محفوظ ہوں!"

عبدالمتین کی عمر ۲۲ سال تھی اور جمعیت کے رکن تھے۔

شہید ابراہیمؒ

اسلامی جمعیت طلبہ کے امیدوار رکنیت تھے اور گورنمنٹ کالج نواکھالی اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر تھے۔ ان کو ابوناصر نے جمعیت سے متعارف کرایا اور وہ بھی چلتے چلتے، ہوا یوں کہ ابوناصر بازار سے گزر رہے تھے، ابراہیم اسکول کے طالب تھے، کہنے لگے "آپ لوگ ہر وقت یہ کیا کام کرتے ہیں" ابوناصر نے بتایا کہ ہم دین کا یہ کام کرتے ہیں اس پر ابراہیم بولے "میں بھی یہ کام کروں گا" اور بعد میں وہ اسی صراطِ مستقیم پر چلتے چلتے اپنی جان نچھاور کر گئے۔ یہ واقعہ دسمبر ۱۹۷۱ء کے آخری ہفتہ نواکھلی میں ہوا۔

شہید محمد دلاور حسینؒ

پانچ کھولا گاؤں (ضلع فرید پور) کے آسودہ حال محمد عبدالمالک منشی کے ہاں آنکھ کھولی۔ نظام الدین کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد زرعی کالج میں ایم ایس سی کے طالب علم تھے کہ بڑے بھائی کی دعوت پر جمعیت میں آئے اور تمام تر صلاحیتیں دعوت حق کی ترویج و اشاعت کے لئے مخصوص کر دیں۔ وہ سوچ بچار سے زیادہ عملی جدوجہد کو پسند کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خوش الحانی سے نوازا تھا۔ ورزش کے شوقین اور بیڈمنٹن کے اچھے کھلاڑی تھے۔ جب ملک میں خلفشار پیدا ہوا تو وہ البدر میں شامل ہو گئے۔ انہیں پلاٹون کمانڈر مقرر کیا گیا ۱۰ دسمبر کو ایک مہم سر کرنے کے بعد شہداد پور سے فرید پور جا رہے تھے کہ راستے میں کالا بارہ کے مقام پر دشمن سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ گھیرے میں آچکے تھے۔ دو دن تک مقابلہ ہوتا رہا۔ اس معرکہ میں دلاور شہید کے تین ساتھی محمد سہراب حسین، عبدالعزیز اور ستار حسین شہید ہو گئے اسلحہ ختم ہو گیا تو دلاور حسین گرفتار کر لئے گئے۔ بے پناہ تشدد کیا گیا۔ مکتی باہنی کے غنڈے اُن کو جئے بنگلہ کا نعرہ لگانے اور جمعیت کے ساتھیوں اور البدر میں اشتراک کیڈٹوں کے نام پوچھنے پر اصرار کرتے رہے۔ مگر دلاور حسین نے جیسے ہونٹ سی لئے ہوں۔ غنڈوں نے پیٹ پیٹ کر ادھ موا کر دیا اور جب انہیں ٹانگ سے گھسیٹ کر ایک گہری کھائی میں پھینکنے لگے تو دلاور نے پہلی بار اپنی زبان کھولی اور غنڈوں سے پہلی اور آخری درخواست کی "میرے والدین کو پیغام دینا کہ وہ صبر سے کام لیں۔" ان کے انتقال کی خبر سن کر والدہ دماغی توازن کھو بیٹھیں اور چار سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ شہادت کے وقت دلاور حسین کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

شہید محمد مجیب الرحمانؒ

محمد مجیب الرحمان کے والد کا نام ماجد علی سردار تھا اور ان کا تعلق داری چرلا کی پور (ضلع فرید پور) کے ایک پڑھے لکھے خاندان سے تھا جو پیشہ تجارت سے منسلک تھا۔ کھلتے ہوئے رنگ اور لوٹا سے قد کے حامل شہید بھائی، بہت اچھے مقرر اور کبڈی اور والی بال کے کھلاڑی تھے ——

مزاج دھیما، مگر دل منصوبہ پایا تھا۔ نظام الدین کالج سے فراغت کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ فزکس میں داخلہ لیا اور یہیں جمعیت سے متعارف ہوئے۔ توسیع دعوت کے ضمن میں بہت اچھے تعارفی پروگرام پیش کرنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ منصوبہ بندی اور حکمت عملی کے شعور کے سبب جنگی ایام میں ان کو البدر کا پلاٹون کمانڈر مقرر کیا گیا اور وہ اپنے عمل سے اللہ کے ایک نڈر اور بے باک سپاہی ثابت ہوئے۔

۱۷ دسمبر کو جب پاک فوج شاداد پور سے پسپا ہوئی تو مکتی باہنی نے اچانک چھاپہ مار کر البدر کیمپ سے ان کو گرفتار کر لیا۔ عینی شاہدوں کے مطابق دشمن نے ان کے ساتھ بڑا ہولناک سلوک کیا۔ ان کے کان اور ناک کاٹ دیئے گئے اور گلے میں رسی ڈال کر پورے شہر میں پیدل گھمایا؟ پھر انہیں کالج لایا گیا اور ایک ہجوم کے سامنے ان کو کہا گیا کہ جے بنگلہ کا نعرہ لگاؤ" مگر وہ خاموش رہے۔ اس عزیمت کی پاداش میں ان کے دونوں بازو کاٹ دیئے اور اسی لمحہ عروس شہادت نے انہیں چوم لیا۔

"وہ مومن ہی کیا جو نصب العین اور پروگرام میں خستیں تلاش کرتا پھرے۔" یہ فقرہ انہوں نے ۵، دسمبر کی صبح درس قرآن دیتے ہوئے کہا تھا اور اپنے عمل سے اس قول کو سچ کر دکھایا۔ ان کی شہادت کے بعد سوشلسٹ غنڈوں نے ان کے والد کا چاول کا گودام لوٹ لیا اور چاول صاف کرنے والی مل کو آگ لگا دی۔

شہید عبدالحق بیوپاریؒ

مولانا حسین محمد بیوپاری کے فرزند عبدالحق بیوپاری لوکیک پور یو کیرا (ضلع فرید پور) میں پیدا ہوئے۔ کسان گھرانے سے تعلق تھا اور گھریلو فضا دینی ماحول سے رچی بسی تھی۔

عبدالحق شہید نے میٹرک کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ بعد میں نظام الدین کالج میں داخلہ لیا۔ شہادت کے وقت بی۔ ایس سی کے طالب علم تھے۔ سرخ و سفید، مروقہ کے وجیہہ عبدالحق نے جمعیت کی دعوت اسکول ہی میں قبول کر لی تھی اور اس وقت سے لے کر دم واپسیں تک احساس ذمہ داری کے ساتھ دعوت دین کا کام کرتے رہے۔ ہر قسم کی ذمہ داریاں

ان پر پڑتی رہیں جنہیں ہمیشہ بطریق احسن نبھایا۔ وہ ربط و ضبط رکھنے اور دعوت سے متعارف کرانے کے معاملہ میں قابل رشک ذوق رکھتے تھے۔

عبدالحق کی شہادت کے بعد ان کے گھر سے ذاتی ڈائری ملی جس میں ان کی زندگی کے تین سالہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء تک کے شب و روز کی روداد رقم ہے۔ جگہ جگہ انہوں نے اجتماعی زندگی کی برکتوں کو کس طرح نعمتِ خداوندی کے طور پر دیکھا۔ اس کا اظہار ہے اور جمعیت پر لوگوں کے اعتراضات اور نکات کی صورت میں ان کے جوابات درج ہیں

۱۹۷۱ء میں جب پاک فوج نے مداری پور خالی کر دیا تو البدر کے ان مجاہدوں کا پرسان حال کوئی نہ تھا۔ مکتی باہنی کو گذشتہ چار ماہ سے شکستیں دینے والا عبدالحق اب قومی شکست کے سبب چاروں طرف سے گھیرے میں تھا۔ کچھ معزز شہریوں نے ان کو پناہ دی، لیکن جلد ہی مکتی باہنی نے گرفتار کر لیا اور وہیں پر ان کے بازوؤں اور گلے کو رسی کے ساتھ اس قدر سخت جکڑا کہ آنکھوں میں خون جم گیا اور ناک سے لہو بہنے لگا اور پھر کر بیں سنگین گھونپ کر حیات جاوداں بخش دی۔ بعد میں ان کا گھر لوٹ لیا گیا۔ گاؤں کی مسجد کے قریب ہی ان کی قبر ہے۔

شہید حق نورالاسلامؒ

صاحب حیثیت اور باوقار خاندان کے ایک فرد مولانا عبدالعزیز کے صاحبزادہ تھے کوار پور (ضلع فرید پور) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر مڈل اسکول میں داخلہ لیا۔ لکھنے پڑھنے اور تقریر کرنے میں عمدہ توازن اور حسن بیان کے مالک تھے۔ باریش چہرہ سانولے رنگ، درمیانے قد اور ہلکے پھلکے بدن کے حق نورالاسلام ۱۹۶۸ء میں فرید پور جمعیت کے ناظم مقرر ہوئے۔

۱۹۶۵ء میں جمعیت سے وابستگی اختیار کی فرید پور کے انچارج دفتر اور انچارج نشرو اشاعت رہے۔ مگر گھر کے معاشی حالات کی خرابی کے سبب کچھ عرصہ کے لئے سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ لیکن اس دوران میں بھی وہ متحرک رہے اور پیہم جدوجہد سے اپنی سب ڈویژن

میں کسانوں کی ایک تنظیم قائم کی اور جماعت اسلامی کے مختلف شعبوں کی ذمہ داریاں بھی ادا کرتے رہے۔ حق نور نے انتھک محنت کرکے اپنے علاقے "ڈورا د" کی امن کمیٹی کو بڑی کامیابی سے چلایا اور فسادات کی آگ کو بھڑکنے نہ دیا۔

جون ۱۹۷۱ء میں جب وہ امن کمیٹی کی ایک نشست میں پاکستان دشمن پراپیگنڈہ کے توڑ کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے کے بعد وہیں دفتر میں بیٹھے چند شہریوں کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے مکتی باہنی کے غنڈوں نے اچانک اس دفتر پر حملہ کر دیا۔ وہاں موجود پانچ شہری موقع پر ہی شہید ہو گئے جب کہ حق نورالاسلام کے پاؤں میں گولی لگی اور انہوں نے جان بچانے کے لئے کھڑکی سے پچھلی جانب چھلانگ لگا دی۔ مگر تخریب کاروں نے کھڑکی سے ہی ان پر فائر کھول دیا۔ وہ مجروح ہو کر گر پڑے۔ دشمن ان کو گھسیٹ کر ندی کی جانب لے جا رہا تھا۔ اس دوران میں انہوں نے شہادت کی ابدی زندگی پالی۔

شہید عبدالسلام شیخؒ

ضلع فریدپور میں ناڑار ٹیک کے مقام پر عبدالسلام شیخ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم گرامی محمد عبدالرشید شیخ تھا۔ مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عبدالسلام جاکا گنج کے مدرسہ میں داخل ہوتے۔ وہاں سے تعلیمی فراغت پر یاسین کالج میں داخلہ لیا۔

ادب لطیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے اور ادب تخلیق بھی کرتے تھے۔ ان کے کئی افسانے رسالوں میں چھپے۔ سانولے رنگ اور درمیانے قد کے عبدالسلام کبڈی کے شاندار کھلاڑی تھے۔ اپنے دوست ابوالقاسم خان کی دعوت پر جمعیت کے پروگرام کو سمجھا اور یاسین کالج کے ناظم مقرر ہوتے۔ ۱۹۷۱ء کے آغاز میں جمعیت کے رکن بنے اور ضلع فریدپور کے ناظم منتخب ہوتے وہ برادر تنظیم جمعیت طلبہ عربیہ کے بھی مرکزی رہنما تھے۔

۱۹۷۱ء میں جب ملکی حالات خراب ہوئے اور اشتراکی قوم پرستوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر ملک کو تباہی کے غاروں میں دھکیلنا شروع کیا تو عبدالسلام نے اپنے ضلع میں

نفرتوں کی آگ پھیلنے سے روکنے کے لئے جان توڑ کوششیں کیں۔ اپریل میں وہ جمعیت کی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لئے خصوصی دعوت پر ڈھاکہ گئے۔ اجلاس ختم ہونے پر رات کے وقت جمعیت کے صوبائی دفتر سے باہر نکلے۔ اس کے بعد آج تک ان کی اطلاع نہ مل سکی۔ ان دنوں ڈھاکہ کا مکمل کنٹرول پاک فوج کے پاس تھا کچھ عرصہ بعد مشرقی پاکستان جمعیت کے قائدین کو اطلاع ملی کہ وہ پاک فوج کی کارروائی کا شکار ہو گئے۔ کالج کے ابتدائی زمانہ میں ان کی شادی ہو گئی تھی۔ وہ ایک بچی اور ایک بچے کے والد تھے جن کے لئے سوائے اس کے اور کوئی اطمینان کی بات نہیں کہ وہ ایک شہید باپ کے بچے ہیں۔ یاد رہے کہ انہی کے ہمراہ شاہ جمال چودھری بھی شہید ہوتے تھے۔

شہید محمد عبدالحق

محمد عبدالحق مداری پور (فرید پور) کے ۱۴ سالہ البدر کیڈٹ تھے۔ وہ جمعیت کے ایک سرگرم رفیق رہے۔ جب گڑبڑ شروع ہوئی تو پکڑے گئے۔ مکتی باہنی نے "جے بنگلہ" کا نعرہ لگانے پر چھوڑ دینے کا وعدہ کیا، مگر اس نوعمر مجاہد اسلام نے یہ نعرہ لگانے سے صاف انکار کر دیا اور صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ میں اسلام کے لئے لڑ رہا تھا اور راہ حق پر تھا میرا کام ختم ہو چکا۔ اب تمہارا جو جی چاہے کرو۔ شہادت مومن کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ لہٰذا موت سے ہم نہیں ڈرتا۔

یہ جواب سن کر ان ظالموں نے اس مجاہد کو فوراً شہید کر دیا۔ آخری وقت بھی اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی اپنے گھر جا رہا ہو۔

شہید کمال الرحمٰن

مداری پور (ضلع فرید پور) میں سترہ سالہ کمال الرحمٰن اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن تھا۔ گڑبڑ شروع ہوئی تو اسے مکتی باہنی نے پکڑ لیا اور مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ مار کھا کر کمال نعرہ تکبیر بلند کرتا اور بہت بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھتا۔

یہ صورت حال دیکھی تو مکتی باہنی والے بہت گھبرائے۔ ان کے اوسان خطا ہو گئے۔

انہوں نے کمال سے کہا،

"اگر تم اعلان کر دو کہ میں نے جو کچھ کیا، غلط کیا اور میرا پاکستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، تو ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔"

کمال نے کراہتے ہوئے جواب دیا،

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا اپنا فرض ادا کیا، پاکستان میری روح اور میری جان ہے۔"

یہ جواب سن کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور آخری فقرہ ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ چار گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں اور وہ کلمہ پڑھتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا۔

شہید عطاء الرحمٰنؒ

احمد عمر (دیناج پور کے رفیق جمعیت) نے بتایا، مشرقی پاکستان کی آزادی برقرار رکھنے کے لئے لڑنے والے حق پرستوں میں عطاء الرحمٰن کا نام بھی آتا ہے۔

سترہ سال کا یہ نوجوان مجاہد دیناج پور ہیرال کا رہنے والا تھا۔ وہ گورنمنٹ عالیہ مدرسہ کا طالب علم تھا۔ نہایت غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد صاحب معذور تھے، ضعیفی اور کمزوری کی وجہ سے کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔

کئی بار یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ عطاء الرحمٰن تعلیم کو خیرباد کہہ کر کچھ کمانے کی فکر کرے، مگر ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ اس کی لگن کو پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیتا اور اس کی تعلیم جاری رہی۔

عطاء الرحمٰن میرا پھوپھی زاد بھائی تھا اس لئے مجھے اس کے حالات بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔

اللہ پاک نے عطاء الرحمٰن کو قابلِ رشک صحت کے ساتھ حسن سیرت اور حسن صورت بھی عطا کیا تھا۔ با اخلاق، خوش اطوار، بلند کردار، سچائی اور حق کے لئے ہمہ تن وقف، دلیر نڈر اور مستقل مزاج۔

عطاء الرحمٰن جمعیت کا فعال کارکن تھا۔ وہ ہمارے لئے ایک مثالی حیثیت رکھتا تھا۔

فوجی آپریشن سے پہلے ہی مکتی باہنی پورے مشرقی پاکستان پر چھا گئی تھی۔ اس نے جگہ جگہ مہاجرین، محب وطن بنگالیوں اور اسلامی کیمپ سے تعلق رکھنے والوں کے خون سے ہولی کھیلنا شروع کر دی تھی۔ اس دور میں مکتی باہنی کی بہیمیت کی ایسی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئیں کہ جن پر خود درندگی بھی شرما جاتے۔

جب مکتی باہنی نے شہروں اور دیہات میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو عام لوگوں میں زبردست خوف وہراس پیدا ہو گیا؛ چنانچہ جو لوگ سرحد کے قریب بستے تھے مکتی باہنی کے ظلم وغارت گری سے بچنے کے لئے بھارت میں داخل ہونے لگے، اگرچہ وہاں پہنچ کر مزید ظلم و ستم سہتے رہے۔

حکومت نے یہ حالت دیکھی تو فوجی آپریشن کا فیصلہ کیا اور فوج کی آمد سے وقتی طور پر امن وامان قائم ہو گیا۔

عطاء الرحمٰن کی خالہ بھی بھارت چلی گئی تھیں۔ فوجی آپریشن سے حالات قدرے بہتر ہوتے تو عطاء الرحمٰن انہیں لانے کے لئے سرحد پار گیا، لیکن وہاں شہادت کا جام لئے موت کا فرشتہ اس کے استقبال کو موجود تھا۔

مجھے اس واقعہ کی تفصیلات ایک شخص نصرت اللہ کی زبانی معلوم ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ جب عطاء الرحمٰن وہاں پہنچا تو ایک ہندو لڑکے نے جو اس کو جانتا تھا مکتی باہنی والوں کو اطلاع دے دی اور ان خون کے پیاسوں کو جب یہ نوعمر لڑکا ملا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی انہوں نے اس کو مختلف اذیتیں پہنچا کر قتل کر دیا۔ سب سے پہلے ان درندوں نے ہتھوڑے سے اس کی ایک ایک انگلی توڑی۔ وہ یہ ظلم کرتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ کہہ رہے تھے:
"بول جئے بنگلہ، ہم تجھے بخش دیتے ہیں!"

مگر حق کے ساتھی کی غیرت اس کے لئے تیار نہ ہوئی کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے باطل کے سامنے سر جھکا دے۔ ایسے موقع پر اسے یقیناً حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کی استقامت یاد آتی ہوگی۔

مکتی باہنی کے درندوں نے عطاء بھائی کو اپنے موقف سے ہٹانے کی پوری کوشش کی۔

لیکن آزمائش کی اس گھڑی میں یہ لڑکا ایک ایسی چٹان ثابت ہوا جس کو اپنی جگہ سے ان میں سے کوئی بھی نہ ہلا سکا۔

اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں کہا: "میں نے حق کا ساتھ دیا ہے میں اس سے انکار کیوں کروں"۔

انہوں نے ایک ایک کرکے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے پھر اس کے چہرے کو نوچ ڈالا اور آخر میں گولیوں سے اس کے جسم کو چھلنی کر دیا۔

شہید عبد الصمدؒ

عبد الصمد سراج گنج (ضلع پبنہ) کے رہنے والے تھے۔ وہ انٹرمیڈیٹ سال دوم کے طالب علم تھے۔ کالج کی تعلیم کے ساتھ انہوں نے درس نظامی کا کورس بھی مکمل کر لیا تھا۔ وہ جمعیت کے مقامی ناظم تھے، مقرر اس غضب کے کہ تقریر شروع کرتے ہی مجمع پر چھا جاتے تھے، لوگ دور دور سے ان کی تقریر سننے کے لئے آتے تھے۔

بڑے نرم خو اور خوش خلق تھے۔ . . . . خودداری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کبھی اپنے ذاتی اخراجات کے لئے کسی پر بوجھ نہ ڈالا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ایک مدرسے میں مدرسی کرتے تھے۔ تنخواہ معمولی تھی، لیکن وہ ہنسی خوشی گزارا کرتے تھے۔

جب لڑائی شروع ہوئی وہ البدر کے یونٹ کمانڈر تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد دوسرے محبِ وطن لوگوں کی طرح انہیں بھی ظالموں نے طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر شہید کر دیا۔

شہید میاں دھونوؒ

لکھی پور (ضلع نواکھالی) سے ان کا تعلق تھا۔ تعلیمی زندگی میں اسلامی جمعیت طلبہ کے پرجوش کارکن تھے۔ معاشی کمزوری کے سبب سال اول ہی میں تعلیم کا رشتہ منقطع کرنا پڑا اور بیارہ پور میں چائے کی دکان کھول لی۔ سقوط کے بعد انہیں عوامی لیگی جیسور بن عبدالستار کی ہدایت پر درخت کے ساتھ الٹا لٹکا دیا گیا۔ چوبیس گھنٹے تک اسی حالت میں رہنے کے باعث

وہ شہید ہوگئے۔ وہ چوبیس سال کے تھے۔

شہید شاہ جلالؒ

شہید شاہ جلال جمعیت کے رکن، چٹاگانگ البدر پلاٹون کمانڈر تھے۔ ان کی شہادت کے بارے میں محمد حمید صاحب نے قریبی شاہد کی حیثیت سے بتایا کہ:

"بھارت کی جانب سے کھلے حملے کے بعد ۱۲ دسمبر کو جمعیت نے چٹاگانگ میں "بھارت کو کچل دو" کے نعروں کے سائے میں ایک زبردست جلوس نکالا جس میں شہریوں کی بھی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ یہ جلوس لال ڈگی میدان میں پہنچا، جہاں تقاریر کے بعد جلوس منتشر ہوگیا، یہاں سے ہم لوگ جونہی جمعیت کے دفتر میں پہنچے۔ ڈپٹی کمشنر اور سول ڈیفنس دفتر سے فون آیا کہ "بھارتی فضائیہ نے چٹاگانگ بندرگاہ پر حملہ کردیا ہے۔ جہاں پٹرول کے جنوبی ذخیرے میں آگ بھڑک اٹھی ہے، اسے کنٹرول کرنے اور شمالی ذخیرے میں پٹرول کے ڈرموں کو بچانے کے لئے فوری طور پر البدر کے مجاہدین درکار ہیں۔ اس فون سے یہ تاثر بھی ملا کہ آرمی اور سول ڈیفنس دونوں اس کام کو انجام دینے سے ہچکچا رہے ہیں۔ المیہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں دفاعی افواج کے پاس پہلے ہی پٹرول کی کمی تھی۔ اب رہی سہی کسر اس حملے نے پوری کردی تھی۔ شاہ جلال نے ساتھیوں کو صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کیا اور ان کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس وقت دفتر میں ۲۵ البدر کیڈٹ موجود تھے، وہ سب یکبارگی پکار اٹھے کہ ہم اس مہم پر جانے کے لئے تیار ہیں۔ بھارتی فضائیہ کے چمکتے ہوتے روسی مگ لڑاکا طیارے چٹاگانگ شہر کی فضا میں غوطے لگا رہے تھے کہ بھائی شاہ جلال نے اس صورت حال کو نظر انداز کرتے ہوئے انتہائی بے نیازی کے عالم میں جیپ اسٹارٹ کی اور ۲۵ جیالوں کی ٹیم لے کر بندرگاہ کی جانب تیزی سے روانہ ہوگئے۔ مجھے دفتر میں ہی رہنے کا حکم ملا تاکہ رابطہ کا تسلسل قائم رہ سکے۔

بندرگاہ پہنچتے ہی شاہ جلال اور ان کے ساتھی جیپ سے کودے اور شمالی ذخیرہ میں

پیٹرول کے ڈرموں کو لپکتی ہوئی آگ کی دستبرد سے بچانے کے لئے لڑھکا کر دور لے جانے لگے۔ اس مشن میں ان کے ساتھی ابوالحسین نے بتایا کہ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور فضا میں سخت تپش تھی، لیکن ہمارے ساتھی انتہائی برق رفتاری کے ساتھ اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دشمن نے ایک بار پھر حملہ کیا۔ کچھ ساتھی سڑک کے ایک طرف دکانوں کی آڑ میں ہو گئے۔ جب کہ شاہ جلال چودھری اور کچھ ساتھیوں نے ایک عمارت میں پناہ لی۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ بدقسمتی سے دشمن نے عمارت کو بھی نشانہ بنا لیا اور ہمارے دس البدر ساتھی جو انٹر اور ڈگری کلاسز کے سٹوڈنٹ تھے۔ عمارت کے ملبے تلے دب کر شہید ہو گئے۔ اگرچہ شاہ جلال اور چار دوسرے کیڈٹ زندہ بچ رہے، مگر شدید زخمی تھے۔ ہم چند جو محفوظ رہے۔ زخمی ساتھیوں کو ہسپتال لے جانے کے لئے کمر پر لاد کر شہر کی جانب بھاگے۔ دشمن شاید تاک میں تھا کہ ایک بار پھر فضا سے تڑ تڑ گولیاں برسنے لگیں۔ بھارتی ہوائی جہاز بہت نیچی پرواز کر رہے تھے۔ حسین بھائی نے جو زخموں سے نڈھال میری کمر پر تھے۔ اس عالم میں مجھے اپنی پوری قوت سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "ابوالحسین! مجھے یہیں چھوڑ دو۔ اپنی جان بچاؤ" میں انہیں سڑک پر لٹانے لگا تو زخمی شاہ جلال کی آواز آئی: "ابوالحسین حسین کو بچاؤ، حسین کو بچاؤ" قبل اس کے کہ میں جلال کی آواز پر لبیک کہتا، وہ لڑکھڑاتے ہوئے خود حسین کو بچانے کے لئے اٹھے ..... میں نے صرف اتنا دیکھا تھا کہ ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔"

اس المناک داستان کا اگلا حصہ محمد حمید سناتے ہیں کہ "اس بمباری اور شیلنگ کے دوران میں، میں شاہ جلال کی ہدایت کے مطابق جمعیت کے دفتر بیٹھا ہوا تھا کہ شام ساڑھے چار بجے فون کی گھنٹی بجی، دوسری جانب پاک آرمی کا ایک جوان بول رہا تھا جس کی آواز ٹوٹ ٹوٹ کر سسکیوں کے ساتھ میرے کان میں ٹکرائی: "شاہ جلال اور اس کے ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔" فون بند ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے آسمان اور زمین چکی کے دو پاٹ ہیں اور میں ان کے درمیان کرچی کرچی ہو گیا ہوں۔

میں نے ساتھیوں کے جسدِ خاکی کا پتہ کرنے کے لئے پہلے سی ایم ایچ فون کیا۔ کچھ پتہ نہ چلا پھر میں اٹھا اور پولیس لائن پہنچا۔ وہاں دو لاشیں آئی ہوئی تھیں۔ آگ سے جھلس جانے کے سبب

ان کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اندازہ ہوا کہ ان میں سے ایک جعفر شہید ہیں۔ جو ارانگو نیا کالج جمعیت کے ناظم تھے اور دوسرے عبدالمعبود تھے۔ ان کی تدفین کا انتظام کرانے کے فوراً بعد میں چٹاگانگ پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ گھپ اندھیرے میں آگ کے شعلوں میں محصور بندرگاہ کا منظر بڑا وحشت ناک تھا۔ بریگیڈیئر عطا محمد صاحب دفاعی صورتحال کی ایک میٹنگ میں مصروف تھے۔ ان سے رابطہ نہ ہوسکا اور ناکام لوٹ آیا۔ یہ رات ہم سب ساتھیوں نے تڑپ تڑپ کر گزاری ۱۳ر دسمبر کی صبح میں دو ساتھیوں کے ہمراہ جیپ میں بیٹھ کر پھر بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا۔ کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ اچانک بھارتی طیارے گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے ہمارے سروں پر سے گزرے۔ ہم نے کود کر ایک کھائی میں پناہ لی۔ میں نے مشورہ دیا کہ ہمیں اب اکٹھے نہیں جانا چاہیئے۔ اس طرح دشمن کا نشانہ بننے کے زیادہ امکانات ہیں، لیکن دوسرے دو ساتھی نہ مانے اور کہا: "ہم اکٹھے جئیں گے اور اکٹھے مریں گے"۔ اس جذباتی فضا میں میں نے اپنا مشورہ واپس لیا اور کہا، "ٹھیک ہے تینوں جاتے ہیں"۔ جب بندرگاہ پر پہنچے تو وہاں معلوم ہوا کہ شاہ جلال اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں اس بڑی عمارت کے ڈھیر کے نیچے ملنے کے امکانات ہیں جو بندرگاہ سے تھوڑے سے فاصلے پر کبھی سر بفلک کھڑی تھی، لیکن اس روز ملبے کو ہٹانے کے لئے کرین کا بندوبست نہ ہو سکا۔ ۱۴ر دسمبر کو کرین کے ذریعہ ملبہ ہٹایا گیا تو دوسری لاشوں کے ہمراہ شاہ جلال کی لاش بھی ملی۔ تین دن گزر جانے کے باوجود کسی لاش سے بو نہیں آ رہی تھی۔ شاہ جلال کا ایک بازو ٹوٹا ہوا تھا۔ ہم شہید ساتھیوں کو لے کر سٹیڈیم میں آئے۔ جنازہ پڑھتے اور دفن کرتے وقت بھارتی طیارے فضا میں کرگسوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ کارکنوں کی سسکیاں چیخوں میں بدلتی جا رہی تھیں۔ ایسے عالم میں فوجی جوان بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔

شاہ جلال کا تعلق نواکھالی کے تھانہ شودرام سے تھا۔ اسکول کے زمانہ میں جمعیت سے متعارف ہوئے اور کارکن بنے۔ انہوں نے مختلف ذمہ داریاں بہ احسن نبھائیں۔ وہ اسکول کمیٹی کے انچارج رہے۔ پھر صدر کے ناظم بنائے گئے، اس کے بعد چٹاگانگ جمعیت کے

آرگنائزنگ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ لیکن یہ سرگرمیاں ان کی تعلیم میں کبھی حارج نہ ہو سکیں۔ انہوں نے میٹرک انٹر سائنس میں فرسٹ ڈویژن اور وظیفہ حاصل کیا اور فزکس میں آنرز کرنے کے بعد شہادت کے وقت وہ ایم ایس سی فزکس فائنل کے طالب علم تھے۔

شاہ جلال سادہ منش مگر صاحب ہمت و عزم و جلال شخصیت تھے۔ ذاتی زندگی میں متقی اور محتاط تھے۔ دیہات میں انہوں نے بڑی محنت سے کام کو پھیلایا تھا۔ سخت سے سخت ذمہ داریوں کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتے۔ ایوب خان کا آخری زمانہ تھا۔ اس دوران میں مشرقی پاکستان کے ثانوی تعلیمی بورڈوں نے فیصلہ کیا کہ "پاکستان کلچر" کے نام سے میٹرک کے طلبہ کو ایک کتاب پڑھنا ہوگی۔ اس فیصلہ پر ہندو، نام نہاد ترقی پسند اور قوم پرست بھڑک اٹھے اور ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور سیکنڈری اسکولز سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کے نام سے تحریک چلا دی گئی۔ ۔ ۔ ۔ جمعیت نے اس نئے مضمون کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ شاہ جلال کی نگرانی میں ڈیموکریٹک اسکولز اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی (DSSAC) بنادی گئی۔ شاہ جلال نے ایک ایک اسکول میں جا کر مدلل تقاریر کیں۔ "پاکستان کلچر" اور "ہندو کلچر" کی آویزش کا پس منظر بتایا۔ شاہ جلال کی اس کوشش اور کاوش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ہفتہ بعد ہی چاٹگانگ کے آدھے سے زیادہ ہائی سکولز جمعیت کی تحریک کے زیر قیادت سڑکوں پر آکر یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ "ہمیں پاکستان کلچر پڑھایا جائے"۔ اس صورت حال میں جب کہ خود جمعیت ایوب حکومت کی مخالف تھی اور پورا مشرقی پاکستان صدر ایوب کے کسی اقدام کو بھی درست ماننے کے لئے تیار نہ تھا، حکومت کے کسی فیصلہ کی حمایت کرنا بڑا مشکل اور کٹھن کام تھا۔ لیکن شاہ جلال نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ جمعیت کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنایا۔

شاہ جلال شہید پیدل بہت چلا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ پیدل چلنے سے صحت اچھی رہتی ہے ان کے تمام گھر والے ماسوائے والد ماجد کے جمعیت کے سخت مخالف تھے۔ جلال کے والد صاحب نے بتایا کہ مجھے یقین تھا کہ جس راہ پر میرے بیٹے نے قدم اٹھایا ہے۔ یہ راہ پھولوں کی سیج کبھی بھی نہیں رہی اور اس راہ کے راہی کے لئے ہی نہیں اس کے عزیز و اقارب تک کو ابتلاء آزمائش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے میں ذہنا ہر قسم کے خطرات انگیز کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس لئے جلال کی شہادت پر مجھے صدمہ تو ضرور ہوا مگر ملال ہرگز نہیں!

شہید شاہ جہانؒ

شاہ جہان چرچاندیا (نواکھالی) کے ایک متوسط کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالحق تھا۔ وہ اپنے والدین کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

سوداگر پاٹ پرائمری اسکول سے فارغ ہونے کے بعد منگل کاندھی ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور میٹرک میں درجۂ دوم حاصل کر کے کامیاب ہوئے۔

وہ سانولے رنگ اور پست قد کے تھے اور اللہ نے انہیں بہت قابلیت بخشی تھی خصوصاً ان کی تحریر تو بہت ہی خوشنما تھی۔

شاہ جہان نے جمعیت کے ایک کارکن کی حیثیت سے اپنے علاقے میں بہت محنت سے کام کیا۔ ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں میں وہ باطل کے خلاف صف آراء ہونے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے۔

وہ سوناغازی کیمپ میں متعین تھے کہ دشمن غالب آ گیا۔ وہ وہاں سے نکلے اور ایک دوست کے گھر میں پناہ لی، لیکن چند دن بعد ہی ایک سپاہی کے ساتھ گرفتار ہو گئے اور پھر ان پر اس قدر ظلم کئے گئے کہ جنہیں احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ ان کے منہ میں کیچڑ اور گندے جوتے ٹھونسے گئے۔ وہ بیہوش ہو جاتے۔ جب ہوش میں آتے تو دوبارہ ظلم شروع کر دیا جاتا۔ اس تشدد سے انہیں اس وقت نجات ملی جب وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

ان کے گھر کے نزدیک ان کا مرقد ہے۔ جواں سال شہید کی عمر صرف ۲۶ سال تھی۔

شہید فضل الکریمؒ

فضل کریم مجبنہ گنج (نواکھالی) میں مولانا محمد اسحاق کے ہاں پیدا ہوئے۔ میٹرک میں تھے کہ اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہو گئے۔ انگریزی اور اچھی اردو پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ سیاسی ذوق رکھتے تھے۔ معاشی حالات زیادہ اچھے نہیں تھے۔ مگر اس کا اظہار کسی سے نہ کرتے تھے۔ اگر کوئی ساتھی ان کی مدد کرنا چاہتا تو خوبصورتی سے ٹال جاتے۔

۱۹۷۰ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی، لیکن تحریکی دلچسپیوں میں کمی نہ آنے دی۔ نسلی فسادات کے دوران میں انہیں ایک جگہ سے لاکھوں روپے کی رقم ملی۔ جسے انہوں نے سول انتظامیہ تک بحفاظت پہنچا دیا۔ اس کے نتیجے میں حکومت نے انہیں سول ایوارڈ دینا چاہا، مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "یہ میری دینی اور اخلاقی ذمہ داری تھی"۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو نمازِ عشاء کے بعد مسجد میں لیٹے ہوئے تھے کہ مکتی باہنی کے دو غنڈوں نے مسجد میں داخل ہو کر ان کو گولی مار کر شہید کر دیا۔

شہید انعام الحق ؒ

کورپھوٹا (ضلع کومیلا) کے رہنے والے تھے۔ قد لمبا اور رنگ سانولا تھا۔ مدرسہ عالیہ میں عالم کلاس کے ہر دلعزیز زندہ دل طالب علم تھے اور اسلامی جمعیت طلبہ کے رفیق تھے۔ البدر میں شامل ہوئے تو کئی آپریشنوں میں حیرت انگیز صلاحیتوں کے ساتھ خدمات انجام دیں۔

۱۳ دسمبر کو گھر سے کیمپ کی جانب آ رہے تھے کہ بھارتی فضائیہ نے حملہ کر دیا۔ وہ اس بے پناہ شیلنگ کی زد میں آ گئے اور اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر کے امر ہو گئے۔ اس روز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور گھر میں اللہ کے نام کے سوا کچھ موجود نہ تھا، غریب والدین نے انعام کو کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر مالکِ حقیقی کے سپرد کر دیا۔ ۱۷ برس کی عمر میں شہادت پائی۔

شہید افضل حسین ؒ

ان کا تعلق بینا پور (ضلع بوگرہ) سے تھا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے پرجوش رفیق تھے۔ ۱۹۷۰ء میں عملی زندگی میں قدم رکھا۔ وہ ایک با اخلاق، باکردار انسان تھے۔

۲۷ اپریل ۱۹۷۱ء کو وہ سودا سلف لینے بازار گئے۔ دشمن گھات لگائے بیٹھا تھا جو مقامی عوامی لیگی غنڈوں پر مشتمل تھا۔ افضل حسین کو اغوا کر لیا گیا۔ چھ روز بعد چھ میل دور ان کی بے گور و کفن میت ملی۔

شہید ابو طاہرؒ

ابو طاہر ضلع نواکھالی کے پہاڑی علاقے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد حسین پہاڑیوں پر کھیتی باڑی کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ ابو طاہر بچپن ہی سے نرم طبیعت کے مالک اور پکے نمازی تھے۔ ابتدائی تعلیم قریبی اسکولوں سے حاصل کرنے کے بعد سٹی کالج چٹاگام سے بی کام کیا۔ سال اول میں اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن بنے۔

جب صورت حال خراب ہوئی تو قوم کو صحیح راستہ دکھانے کے لئے تحریک اسلامی آگے بڑھی۔ البدر قائم ہوتے ہی ابو طاہر اس میں شرکت کے لئے کیمپ میں جانے لگے تو ان کے والد نے طاہر کو بہت سمجھایا کہ "تم مجیب کے گروپ میں شامل ہو کر پاکستان کی تخریب کرو"۔ لیکن طاہر نے جواب دیا: "میں کسی قیمت پر میر صادق بننے کو تیار نہیں"۔ چند ماہ قبل ان کی شادی ہوئی تھی۔ اس لئے چند روز کے لئے سسرال چلے گئے اور وہاں سے کیمپ روانہ ہو گئے۔ جب سقوط ہوا تو غداروں نے انہیں پکڑ لیا اور نو دن تک لبور پاٹ تھانہ میں تشدد کا نشانہ بنایا۔ ایک بڑی قبر کھودی گئی تھی جس میں پاکستان کے نیر و حامیوں کو شہید کرنے کے بعد پھینک دیا گیا تھا۔ خنجر مار کر تڑپتے ہوئے ابو طاہر کو بھی اسی مشترکہ قبر میں ڈال دیا۔ اس وقت ان کی عمر پچیس سال تھی۔ پسماندگان میں ابو طاہر کا ایک بیٹا ابو الکلام اور بیوہ ہے۔

شہید حافظ نور اخترؒ

حافظ نور اختر، ضلع نواکھالی کے گاؤں ٹومچر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دینی مدرسہ میں حاصل کی اور قرآن مجید حفظ کیا۔ نہایت خوش الحانی سے قرآن کی تلاوت کرتے۔ رمضان المبارک میں فرید پور کی مسجد میں نماز تراویح بھی پڑھایا کرتے تھے۔ اچھی صحت کے مالک تھے۔ اچھی کتب کا مطالعہ ان کا مشغلہ تھا۔

میٹرک میں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب خطبات پڑھ کر تحریک اسلامی سے متاثر ہوئے اور اس سال جمعیت کے کارکن بن گئے۔ ۱۹۷۱ء میں رضاکار لکھی پور کیمپ میں

تربیت حاصل کی۔ بعد ازاں دلال بازار کیمپ میں اور کچھ عرصہ بعد لکھی پور کیمپ البدر میں واپس آ گئے۔ جب دسمبر میں ہندوستان کی افواج آگے بڑھیں تو تو نوبحر کیمپ بھی قبضے میں چلا گیا۔

حافظ نور اختر وہاں سے نکلے۔ ان کے دوست نے انہیں کھیت میں جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس نے دوستی کے حوالے سے دلاسہ دیا اور اپنے گھر لے آیا۔ وہی لڑکا دس منٹ کے بعد مکتی باہنی کو لے کر گھر آیا اور حافظ نور اختر کو بدبخت دشمن کے حوالے کر دیا۔ ۵ ر دسمبر کی صبح انہیں آسوندھی باڑی میں ایک گڑھے میں گرا کر زندہ دفن کر دیا۔ اس وقت حافظ صاحب کی عمر چوبیس برس تھی۔

شہید محمد امیر حسینؒ

امیر حسین نے اودھ مارا دنو اکمالی اے کے دیہاتی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور برسات کی رم جھم اور دھوپ کی سنہری کرنوں میں پرورش پائی۔ ہائی اسکول میں وہ دوران تعلیم جمعیت سے متعارف ہوئے۔ وہ شعور کی اس منزل کو پہنچ چکے تھے کہ اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے بغیر ہماری زندگی ایک حیوان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ دبلا پتلا اور خوبصورت امیر حسین جب دسویں جماعت میں پہنچا تو ملک دشمنوں کی مذموم مسلح کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں غداروں کے عزائم خاک میں ملانے کے لئے امیر حسین نے پہلے چوموہانی رضاکار کیمپ میں دفاعی تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد البدر سے وابستہ ہو گئے۔ انہیں چھاگل نائیہ سرحد پر متعین کیا گیا۔ سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ رونما ہوا تو ان کا کیمپ ختم ہو گیا۔ یہ جنگلوں اور کھیتوں کے راستے اپنے نانا کے گھر پہنچے وہاں مکتی باہنی نے ان کو پکڑ لیا اور مقامی اسکول میں لے جا کر گولی مار دی اور لاش کو قریبی ندی میں ڈال دیا۔ خدا کی راہ میں خون کا نذرانہ پیش کرنے والے شہید امیر حسین کی عمر اس وقت سترہ سال تھی۔

شہید مصطفےٰ اشوکت عمران

توفیق الحق نے شوکت عمران کے بارے میں اپنی یادداشتوں کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ:

" شوکت عمران کی شہادت سے دو روز قبل جمعیت کے دفتر میں ایک فون آیا جس کو سن کر انہوں نے قہقہہ لگایا اور کہا "جناب! ہم موت سے نہیں ڈرتے، اور اسے سامنے دیکھ کر بھی اسی طرح ہنستے ہیں جس طرح اب آپ سے فون پر بات کرتے ہوئے ہنس رہا ہوں"۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگے میرے ایک عوامی لیگی رشتہ دار نے فون کیا تھا اور کہا کہ تمہاری موت کا وقت قریب ہے۔ پھر ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کی ناقابل فراموش رات آئی جب ۱۰ بجے کے قریب خرم جاہ مراد صاحب کا فون آیا کہ "فوراً صدیق بازار دفتر میں آجاؤ" شوکت عمران نے مجھے جیپ میں بٹھایا اور خرم جاہ مراد صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ خرم صاحب نے کہا "فوج والے اگرچہ اعتراف نہیں کر رہے لیکن میرا قیاس ہے یہ لوگ ضرور ہتھیار ڈالیں گے"۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں کچھ ہدایات دیں۔ ہم سب سے پہلے اپنے ایک سابق ناظم صوبہ کے گھر گئے وہاں سے ان کے بچوں کو محفوظ جگہ پہنچانے کے لئے نکالا اور گلشن کے علاقے میں پہنچایا۔ رات تین بجے گھر لوٹے۔ میں نے کہا عمران بھائی آپ بہت تھک چکے ہیں تھوڑا آرام کر لیں۔ اس پر دو لیٹے اور سو گئے۔ اسی کمرے میں البدر کے کچھ ساتھی بھی سو رہے تھے۔ فجر کی اذانیں سوگوار فضا میں بلند ہوئیں۔ نماز پڑھتے ہی عمران بھائی اور میں کرنل حجازی صاحب کے پاس پہنچے وہ سول کپڑوں میں مصلّی بچھائے تسبیح پڑھ رہے تھے ہم نے ان سے ہتھیار ڈالنے کی افواہ کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے "بیٹا! بریگیڈیر بشیر آپ کو بتائیں گے"۔ ہم نے بشیر صاحب سے پوچھا تو وہ کہنے لگے۔ ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے آپ چاہیں تو ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں، جو حشر ہمارا ہوگا وہ آپ بھی بھگت لینا۔ باقی فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے"۔ یہ سن کر ہم دونوں واپس دھان منڈی البدر کیمپ میں اپنے ساتھیوں کے پاس آگئے۔ وہاں پر میں نے اور عمران بھائی نے ساتھیوں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اسی اثناء میں یہ سن گُن ملی کہ محمد پور تھانہ سے ایک گروپ مجھے گرفتار کرنے کے لئے آ رہا ہے۔ عمران بھائی نے مجھے کہا: "آپ فوراً اس جیپ میں بیٹھ کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں" میں نے کہا،

اس وقت ڈھاکہ میں ہمارے ۱۱ کیمپ ہیں جن میں ایک ہزار سے زائد البدر کیڈٹ ہیں ان کو منتشر کئے بغیر میں کیسے کہیں جا سکتا ہوں۔ میری بات سنی اَن سنی کر کے انہوں نے زبردستی مجھے بازو سے گھسیٹ کر جیپ میں دھکیل دیا اور ڈرائیور سے کہا: اسے فوراً لے جاؤ۔" میرے آنے کے بعد اب وہاں ذمہ دار فرد صرف عمران بھائی رہ گئے تھے۔ اسی اثنا میں سرنڈر ہو گیا۔ عمران نے تمام ساتھیوں کو پوری ذمہ داری سے مختلف سمتوں میں ہجرت کر جانے کے لئے ہدایات دیں۔ مصطفےٰ شوکت عمران سب ساتھیوں کو بھیجنے کے بعد جیپ میں ایک دوسرے کیمپ کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں حادثہ پیش آ گیا۔ ان کے ماتھے پر شدید چوٹ آئی تھی یہاں سے قریب ترین جگہ ان کی بہن کا گھر تھا۔ ان کے بہنوئی روس نواز نیشنل عوامی پارٹی کے کارکن تھے۔ جب کہ دوسرے سبھی رشتے دار کٹر عوامی لیگی تھے۔ انہوں نے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ ہولی فیملی ہسپتال چلے گئے۔ اگرچہ ہسپتال محفوظ مقام نہ تھا۔ کیونکہ وہ میڈیکل کے طالب علم تھے۔ اس حوالے سے ہسپتال کا عملہ ان کو پہچانتا تھا۔ چنانچہ فوراً ہی دشمن کو خبر ہو گئی۔ مکتی باہنی نے ان کو ہسپتال سے مشہور غنڈے سیف الدین مانک چھاترو یونین کے لیڈر اور نیشنل عوامی پارٹی کے کارکن کی زیر قیادت اغوا کیا اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے اقبال ہال لے آئے جہاں ان کی آمد سے قبل مولوی فرید احمد اور جمعیت کے کارکن عزیز الاسلام پر تشدد ہو رہا تھا دو روز تک اس ہال میں ان کو رکھا گیا۔ اس دوران میں مولوی فرید احمد کو شہید کر دیا گیا فرید احمد صاحب کے بدن پر صرف ایک بنیان اور لنگی تھی انہوں نے نماز کے لئے جب بھی پانی مانگا تو مکتی باہنی نے ان کو پیشاب بھرا گلاس تھما دیا — یہاں سے کچھ دیر بعد دشمن عمران کو ٹیچرز اسٹوڈنٹس سنٹر ڈھاکہ یونیورسٹی لے گیا۔

ٹی ایس سی میں آدھ گھنٹہ رکھنے کے بعد شوکت عمران کو ایک جیپ میں ڈال کر ہاتھی پل پہ لے جایا گیا۔ یہاں مکتی باہنی کے بہت سے افراد جمع تھے۔ عمران کے زخمی سر پر رومال بندھا ہوا تھا جو لہو رنگ ہو چکا تھا۔ یہاں عمران کو جیپ سے اتارتے ہی نشانہ ستم بنایا جانے لگا۔ عمران کے پاس سے جنرل راؤ فرمان علی خان کا جاری کردہ خصوصی شناختی کارڈ برآمد ہوا تھا۔ بہ حوالہ دشمن کو مزید آتش زیر پا کر گیا اور ظلم کی بدترین قسمیں آزمائی جانے لگیں۔ ہر ضرب شدید

پر عمران اسی شدت سے پکارتے۔ "پاکستان زندہ باد" جب تشدد کا یہ انداز کچھ نہ اگلوا سکا۔ تو ان کے جسم کو بلیڈ مار کر چھلنی کر دیا گیا اور زخموں پر نمک چھڑک دیا گیا۔ البدر کے بارے میں معلومات کے حصول کی ہر ناپاک سعی عمران کے قدموں پر دم توڑ رہی تھی اور ادھر زیادہ لہو بہہ جانے کے باعث سانس کی ڈوری ٹوٹتی جا رہی تھی۔ ان کا گلا سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ انہوں نے دور سے پکارا "پانی" —— اسی کرب ناک آواز کو سن کر شیطنت پر سکون رہی۔ ایک سنگدل نے گلاس میں پیشاب کیا اور عمران کے منہ کے قریب لے گیا۔ نیم غنودگی کے عالم میں عمران نے آنکھیں کھولیں اور گلاس والے ہاتھ کو جھٹک دیا اور پھر معصومانہ احتجاج سے لبریز آنکھوں کے ساتھ اس غنڈے کو ایک نظر دیکھا اور نحیف آواز سے کہا "پانی" —— جواب میں شیطانی قہقہہ بلند ہوا۔ عمران بھائی نے پیاس بجھانے کے لئے اپنے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا چبا لیا اور خون چوسنے لگے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے تھوک دیا۔ عمران کی آنکھیں اب بند ہونے لگیں تھیں اور زبان کسی رفیق سفر کا پتہ دیئے بغیر خاموش ہو رہی تھی۔ ان کا سینہ اسلام و پاکستان کے مجاہدوں کے رازوں کا مدفن ثابت ہو چکا تھا کہ ایک غنڈے نے لپک کر ان کے سینے پر چاقو سے "جئے بنگلہ" کھودنا چاہا۔ عین اسی لمحے ہونٹ پھڑپھڑاتے اشہد ان لا الہ الا اللہ ......
ڈوبی ہوئی آواز میں ابھرتا ہوا یہ کلمہ بھی دشمن کو گوارا نہ ہو سکا اور ان کے کالج ہی سے ایک عوامی لیگی طالب علم ساتھی نے ان کے سینے میں سنگین گھونپ دی اور سینے کو دونوں ہاتھوں سے چاک کر کے دل وشت نے دل کو باہر نکال پھینکا اور حقارت سے قدموں تلے روند ڈالا۔ عمران نے جان کی بازی ہارنا گوارا کر لی مگر عزیمت کا راستہ ترک کرنا گوارا نہ کیا۔ یہ کردار اسلام کا کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ہے جو تاریخ اسلام کے صفحات پر جابجا روشن نظر آتی ہے اور جو اپنا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے ۱۸ دسمبر کی شام کو ایک بار پھر روشن ہوئی۔

مشعل بدست ہیں مرے رستے کے سنگ میل
اک روشنی کے ہاتھ میں ہے دوسری کا ہاتھ

اس روح فرسا منظر کی تفصیلات ہمیں عظیم پورہ (ڈھاکہ) کے ڈاکٹر جمیل الزمان نے بتائیں جو اس وقت مکتی باہنی میں شامل اور عمران پر تشدد کرنے والوں میں خود شریک تھے، لیکن

عمران کی استقامت ان میں شہادت حق دینے کا جذبہ بیدار کر گئی اور انہوں نے اسی شاہراہ پر گامزن ہونے کا مصمم فیصلہ کر لیا جسے عمران شہید نے اپنے لئے چن لیا تھا۔

یہ جوان لہو، نام نہاد سونار بنگلہ کے لالہ و گل میں پیغام انقلاب اسلامی کے طور پر نمایاں ہو گیا۔ شہید کی نعش وہاں سے اٹھا کر کسی نامعلوم جگہ پر ڈال دی گئی۔ آج عمران کے فکری ساتھی اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتے ہیں تو آنکھیں مرقد شہید کو ڈھونڈتے میں ناکام رہتی ہیں، مگر دل گواہی دیتا ہے کہ اس سرزمین میں اسلامی انقلاب کے لئے اٹھنے والا ہر قدم اسی قافلے کا قدم ہوتا ہے۔

شوکت عمران، فینی شہر (ضلع نواکھالی) میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ ناز و نعم میں پلے بڑھے لیکن بچپن ہی سے سادگی پسند اور طبعاً شریف واقع ہوئے تھے۔ والد صاحب عوامی لیگ کے سرگرم رہنما تھے۔ گھریلو سیاسی فضا نے ان کو لڑکپن ہی میں جرأت مند بنا دیا تھا اور اسی حیثیت سے اپنے سکول میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ تقریری مقابلوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے۔ میٹرک کا امتحان دیا تو اچھی پوزیشن سے کامیاب ہوئے۔ سکول لائف ہی میں ان تک جمعیت کے کارکنوں نے فریضہ اقامت دین کی دعوت پہنچائی جسے اس سلیم الفطرت نوجوان نے جلد ہی قبول کر لیا۔ انٹر سائنس کے دوران میں وہ اسلامی لٹریچر کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اپنے علاقے میں غیر قانونی کمیونسٹ پارٹی کی خفیہ نکسل باڑی تحریک کی سرگرمیوں کا بنظر غور جائزہ لیتے رہے۔ ان کے یہ مشاہدات اور دل کی کیفیات ان کی ڈائری میں جگہ جگہ مرقوم ہیں۔ اس غیر نصابی مطالعہ و مشاہدہ میں انہماک کے باوجود شوکت عمران نے ضلع بھر کے کالجوں میں دوسری پوزیشن حاصل کرتے ہوئے پری میڈیکل کا امتحان پاس کیا۔

انٹر سائنس کرنے کے بعد ڈھاکہ میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے لئے داخلہ لیا۔ یہاں پر آتے ہی انہوں نے اسلامی جمعیت طلبہ کی انقلابی دعوت کو عملی طور پر قبول اور اختیار کیا۔ پھر حق و باطل کی یہ تمیز ان کا امتیاز بن گئی۔ قدرت نے انہیں تقریری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ تحریری صلاحیت سے بھی نوازا تھا اور جلد ہی یہ دونوں حیثیتیں بھی اس مجاہد کی پہچان بن گئیں۔ یہاں انہوں نے ۳۰ راپریل ۱۹۶۸ء کو جمعیت کی رکنیت کے لئے درخواست دی۔ چھ ماہ امیدوار رکنیت رہنے کے بعد ۳۰ رنومبر ۱۹۶۸ء کو انہیں جمعیت کا رکن بنا لیا گیا۔ رکنیت کی منظوری کے بعد وہ

اپنی زندگی میں نیا پن محسوس کرتے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنے والدین کے نام خطوط میں عجب سرور وکیف کے جذبات کے ساتھ کیا ہے۔

رکن بننے کے بعد عمران کی صلاحیتوں نے بڑی تیزی کے ساتھ نشوونما پائی اور اسی رفتار سے ان کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوا۔ ذہانت اور عمل کا پیکر عمران ایک گوہر تابدار تھا اور اپنی اس حیثیت میں وہ اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان کی صف میں صاف پہچانے جاتے تھے۔

۱۹۶۹ء میں عمران کو ڈھاکہ میڈیکل کالج میں جمعیت کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ واضح رہے کہ ڈھاکہ میڈیکل کالج علیحدگی پسندوں کی فکری قیادت اور غنڈہ گردی کا گڑھ سمجھا جاتا تھا اور اسی سال وہ پہلے صوبائی مجلس شوریٰ کے رکن بنے، اور اگلے برس انہیں مرکزی مجلس شوریٰ کے لئے چن لیا گیا۔ یہ دور ملکی حالات، اور طلبہ سیاسیات کے حوالے سے دورِ رستاخیز تھا مگر عمران نے تنظیمی واجتماعی ذمہ داریوں کی بجاآوری اور اپنی تعلیم میں توازن برقرار رکھا اور ہر پروفیشنل پہلی مرتبہ پاس کیا۔ ۱۹۷۱ء میں انہیں البدر کی تینوں کمپنیوں کی کمان سونپی گئی اور اس ذمہ داری کو بھی مرتے دم تک انہوں نے بہ طریق احسن نبھایا۔

مصطفیٰ شوکت عمران شہید نے بچپن میں دینی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اسکول کے زمانہ میں تحریک اسلامی سے متعارف ہوتے اور بھرپور مسلمانہ جوش وجذبے کے ساتھ دینی روح کو اپنی روح میں جذب کر لیا۔ نماز اس قدر خشوع وخضوع سے پڑھتے گویا وہ واقعی خدا کے حضور کھڑے ہیں اور ان کی نماز کو شرف قبولیت حاصل ہو رہا ہے۔ تحریکی لٹریچر کا مطالعہ ان کی روحانی غذا تھی۔ عبدالمالک شہید اور شاہ جمال چودھری شہید کی طرح مطالعہ میں مسابقت کا رویہ ان کی خوبی تھی۔ وہ لٹریچر خود خریدتے۔ اہم مقامات کو نشان زد کرتے، حواشی تحریر کرتے اور اپنی نوٹ بک میں حاصل مطالعہ کے طور پر نوٹس لیتے۔ مطالعہ میں ان کی ترجیح کیمونسٹ پارٹی کی حکمتِ عملی، تاریخ اقوام عالم، تاریخ اسلام اور برصغیر جنوبی ایشیا میں تحریک اسلامی کی حکمتِ عملی تھی مشرقی پاکستان کی تاریخ کے وہ ماہر جانے جاتے تھے۔ تاریخ کے اس گہرے شغف کے باعث وہ ماہرانہ رائے دینے اور نپے تلے تجزیے کرنے میں نمایاں ترین تھے۔ تربیتی کیمپ میں ان کا پسندیدہ موضوع تاریخ اسلام میں دعوت وعزیمت کا باب تھا۔ درسِ قرآن دیتے وقت بھی وہ اسی پہلو سے آیات

کا انتخاب کرتے تھے۔ میڈیکل کے طالب علم ہونے کے باوجود خطابت کے میدان کے شہسوار تھے ڈھاکہ یونیورسٹی کے میدان میں تقریر کرتے تو اس میں جذبہ کی آمیزش بھی ہوتی اور دلائل کی کاٹ بھی۔ ان کی تقریریں روح کی بالیدگی اور تازہ ترین معلومات کا سامان لئے ہوتی تھیں۔

توفیق الحق صاحب نے بتایا کہ:

ان کے والدین بڑے مالدار تھے اور تحریک اسلامی کے سخت مخالف۔ ان کی خواہش تھی کہ عمران چھاترو لیگ (اسٹوڈنٹس لیگ) میں چلے جائیں خصوصاً ان کے والد گرامی تو تواتر کے ساتھ اپنے خطوط میں یہی تقاضا کیا کرتے تھے۔ جن کو اکثر عمران بھائی پڑھے بغیر ایک طرف رکھ ... ایک روز میں نے کہا: "یہ کیا حرکت ہے" کہنے لگے "یہ خطوط مجھے تحریک اسلامی سے تعلق توڑنے کا درس دیتے ہیں اور ایسی بات پڑھنے سننے کے لئے میں تیار نہیں ہوں"۔ میں نے پوچھا والدین کے خطوط سے آپ کا یہ رویہ کب سے ہے؟ کہنے لگے "کئی ماہ ہو گئے ہیں" میں نے ان کے اس رویے سے ناراضی کا اظہار کیا۔ ایک روز میرا ان کے کمرے میں جانا ہوا تو میں نے ان کی الماری میں بند خطوط کا ایک انبار دیکھا۔ اس وقت میں نے بات کرنا مناسب نہ جانا اور کسی بہتر موقع کی تلاش میں رہا۔ چند روز بعد دفتر جمعیت میں صرف ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے کہ ڈاکیہ آیا اور اس نے جو ڈاک دی اس میں مصطفیٰ شوکت عمران کے نام بھی ایک خط تھا۔ میں ایڈریس کی لکھائی سے پہچان گیا کہ یہ ان کے گھر ہی سے آنے والا خط ہے۔ میں نے عمران سے کہا کہ یہ آپ کے گھر سے آیا ہوا خط لگتا ہے، وہ بولے "ہاں"۔ یہ کہہ کر وہ اس خط کو ایک طرف رکھنے لگے تو میں نے انہیں سخت سست کہا اور اصرار کیا کہ اسے ضرور پڑھیں۔ میں ایک کام سے باہر چلا گیا، تقریباً آدھ گھنٹہ بعد واپس لوٹا تو دیکھا کہ عمران میز پر سر رکھے ہچکیاں لے رہے ہیں میں نے ان کا سر اٹھایا اور پوچھا کیا بات ہے؟ انہوں نے مجھے جواب دینے کے بجائے جیب سے والد صاحب کا خط نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا جس میں صرف تین سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

"مصطفیٰ بیٹے!

تم کو مولانا مودودیؒ نے کتنے روپے میں خریدا ہے۔ تم اگر مودودی اور غلام اعظم کے زر خرید غلام ہو تو ہم تمہیں ہر حال میں اس غلامی سے چھڑانے کو تیار ہیں۔ چاہے ہمیں اپنی تمام جائیداد

فروخت کرنی پڑے۔ حتیٰ کہ ہم اپنے بدن کے چمڑے سے جوتے بنا کر انہیں بیچ کر تمہیں ان کی غلامی سے واپس لانا چاہتے ہیں۔ ——— تمہارا ابو"

شوکت عمران کہنے لگے آپ اصرار کرتے تھے کہ میں والدین کا خط ضرور پڑھوں۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیوں نہیں پڑھتا تھا۔ یہ تو ایک نمونہ ہے ورنہ ہر خط اس قدر خوفناک ہوتا ہے کہ اگر ساتھیوں کی دعائیں اور خدا کی مدد شامل حال نہ ہو تو میں پاگل ہو جاؤں میں والدین کی بے ادبی نہیں کرنا چاہتا اس لئے خطوط نہیں کھولتا۔ صبر کرتا ہوں کیونکہ سوچتا ہوں کہ یہ خطوط مجھے والدین کی نافرمانی پر اکسائیں گے یا پھر تحریک اسلامی کے راستہ سے ہٹائیں گے۔ توفیق نے بتایا یہی وجہ ہے کہ وہ گھر بہت کم جاتے تھے۔

مصطفیٰ شوکت عمران کے والد جو ان کی زندگی میں ان کے سخت دشمن تھے شہادت کے بعد دیوانے ہو گئے۔ ان کے والد صاحب بار بار مجھے ملتے اور کہتے: میں تمہاری شکل میں اپنے بیٹے عمران کو تلاش کرتا ہوں۔ ہمارے بیٹے نے خدا کو پا لیا لیکن ہم اپنے بیٹے کو بھی نہ سمجھ سکے۔ اب عمران شہید کا پورا گھرانہ تحریک اسلامی سے وابستہ ہے۔ ان کا چھوٹا بھائی تحریک اسلامی سے وابستہ ہے اور والد صاحب جماعت اسلامی کے کارکن۔

مطیع الرحمان نظامی رسابق ناظم اعلیٰ نے کہا کہ:

شوکت عمران بھائی جمعیت کے ساتھیوں کے لئے سراپا اخلاص تھے ان کا ایک واقعہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ دوسری دفعہ جب جنوری ۱۹۷۱ء میں مجھے نظامت اعلیٰ کی ذمہ داری سونپی گئی تو انہیں میری پریشانی کا کچھ اندازہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ رات بارہ بجے میرے کمرہ میں دوائی لے کر پہنچ گئے۔ چونکہ ڈاکٹر تھے، ان کو معلوم تھا کہ اگر میں ذہنی طور پر پریشان ہو جاتا ہوں تو نیند وغیرہ کم آتی تھی۔ اجتماع گاہ کے انچارج تھے اور اجتماع کی ذمہ داری پوری کرنے کے بعد انہوں نے آرام کرنا پسند نہیں کیا، بلکہ وہ میرے بارے میں اطمینان کئے بغیر اپنے آپ کو سونے کے لئے تیار نہ کر سکے۔

مختلف اجتماعات یا تربیت گاہ وغیرہ کے انتظامات ان لوگوں کے ذمے ہوتے تھے عبدالمالک شہید، شاہ جمال شہید اور شوکت عمران شہید کو ہم نے دیکھا کہ انتظامات کو سنبھالنے کے لئے

دن رات ڈیوٹی دیتے تھے۔ اس کے باوجود مزاج میں پوری استقامت تھی اور ہر کام خود آگے بڑھ کر کرتے تھے۔ شاہ جمال میز پر بیٹھے بیٹھے بھی کام لے سکتے تھے، لیکن عبدالمالک اور شوکت عمران ۔۔۔ ناظم اجتماع ہونے کے باوجود چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔

مشرقی پاکستان جمعیت کے آخری ناظم صوبہ نے مصطفیٰ عمران کے بارے میں کہا کہ:

وہ عام ذمہ داریوں میں ہی نہیں ہنگامی ذمہ داریوں میں بھی اپنے آپ کو جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مشکلات سے ٹھنڈے ذہن کے ساتھ نبٹنا اور معاملہ فہمی ان کا ناقابلِ فراموش انقلابی ردِ عمل ہے۔ عمران تنظیمی مسائل پر فوری قدم (ایکشن) اٹھانے کے قائل تھے۔ اجتماعی زندگی میں گہری سوچ کے ساتھ ہر آن ہر پہلو مشورے دینا، اور ہر مفید بات متعلقہ فرد کو لاگ لپیٹ کے بغیر بیان کر دینا یہ کام ہر کسی کے بس کا نہیں۔ سوائے ان افراد کے جو اپنے دلوں کی دھڑکنیں اور اپنے سانسوں کی آمد و شد بھی تحریک کے حوالے کر دیں۔ اس حوالے کی مجسم مثال شوکت عمران تھے۔ وہ اپنی انتہائی مصروفیات میں بھی میرے پاس آتے اور اپنی تجاویز تحریری طور پر پیش کرنے کے بعد ان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے اور ساتھ یہ بھی کہہ دیتے اگر آپ اسے جمعیت کے مفاد میں مفید جانیں تو شوریٰ سے رائے لے لیں ورنہ بس اپنے تک رکھیں۔

اس اعتبار سے عمران ایک فراخ حوصلہ اور وسعتِ نظر رکھنے والے مشیر تھے۔ ان کے کردار کے اس پہلو سے دل خوش بھی ہوتا، رشک کے جذبات بھی پیدا ہوتے اور اکثر و بیشتر میں دعاؤں کے وقت اپنی ہتھیلیوں پر عمران کے نام کی دھندلاہٹیں ابھرتی ہوئی محسوس کرتا۔ شاید اسی کیفیت کو اہلِ سخن محبت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس میرے محبوب کا نام شوکت عمران تھا۔ دعا اور جہاد کا ساتھی مصطفیٰ شوکت رہا۔

شہید محمد الیاسؒ

شہید محمد الیاس ضلع نواکھالی کی تحصیل فینی کے ایک موضع رام پور میں ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئے ابھی بچے تھے کہ والد ماجد حاجی نواز علی پٹواری کا انتقال ہو گیا۔ ان کی والدہ آسیہ خاتون نے بڑی محبتوں کے ساتھ اپنے اس سب سے چھوٹے بیٹے کی پرورش کی۔ والدین کا تعلق نہایت آسودہ

گھرانوں سے تھا اس لئے معاشی بحران کے سائے ان کی ابتدائی زندگی پر نہ پڑے۔

قرآن حکیم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خصوصی لیاقت کا امتحان دیا اور مڈل سکول میں داخلہ لیا۔ میٹرک کرنے کے بعد فینی کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں اچھے نمبروں کے ساتھ انٹرپاس کیا۔ پھر یہیں پر بی اے کلاس میں داخل ہوئے۔ انٹر کے زمانہ میں جمعیت کے کارکنوں سے ربط و تعلق بڑھا جس نے ان کی زندگی کا دھارا اسلام کی عملی جدوجہد کی جانب موڑ دیا۔

ان کے بڑے بھائی مجیب الرحمان جو سٹوڈنٹس لیگ (چھاترو لیگ) کے مقامی رہنما تھے وہ یہ دیکھ کر سٹپٹائے اور الیاس کو جمعیت کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے سختی سے منع کرنے لگے لیکن الیاس شہید جس راہ پر سوچ سمجھ کر گامزن ہو چکے تھے اس سے پلٹ کر واپس آنے سے انہوں نے اسی سختی سے انکار کر دیا۔ اس پر بڑے بھائی نے ان کو گھر سے خالی ہاتھ نکال دیا۔ لیکن یہ نشہ وہ نہیں تھا جسے حالات کی ترشی اتار دیتی۔ یہ انتہائی اقدام بھی الیاس کے بڑھتے ہوئے قدم نہ روک سکے۔ چونکہ فارغ البال گھرانے سے تعلق تھا اس لئے اپنے والد مرحوم کے ایک دوست سے چودہ سو روپے ادھار لے کر اگلی زندگی کی معاشی منصوبہ بندی کی۔ خوش لباس الیاس اب سادہ کپڑوں میں پہلے سے زیادہ جذبے کے ساتھ سوئے منزل رواں ہوئے اور اسی بحران کے دنوں میں وہ فینی شہر اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم منتخب ہوئے۔

فینی کی سیاست کو انقلاب کا پیغام دینے والے الیاس شہید کا تذکرہ کئے بغیر مشرقی پاکستان جمعیت کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ شمس الحق صاحب نے بتایا جب عبدالمالک شہید ہوئے تو الیاس فوراً ڈھاکہ پہنچے۔ معلوم ہوا کہ میت شہید کے گاؤں روانہ ہو چکی ہے ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں رک رک کر بولے "یہاں ملاقات نہیں ہوئی۔ چلئے ان سے گھر پر ہی مل لیں گے" شہید کے گاؤں پہنچے۔ تجہیز و تکفین میں انتہائی صبر و ضبط سے حصہ لیا، لیکن جب قبر پر مٹی ڈالنے لگے تو ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ اب ان کو صبر کی تلقین کرنے کے لئے کسی میں حوصلہ نہ تھا ——!

عبدالمالک کی شہادت نے ان میں بجلی کی سی تڑپ پیدا کر دی۔ اب وہ ہر کام میں پیش پیش رہنے لگے اور ہر وقت مصروف کار رہنا انہوں نے اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ زندگی کا کوئی لمحہ وہ بے مصرف صرف کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ شمس الحق صاحب بیان

کرتے ہیں" جنوری ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان اسلامی جمعیت طلبہ کی صوبائی کانفرنس منعقد ہوئی تقریباً ۳ ہزار مندوبین کے کھانے کا بندوبست میرے ذمے تھا، لیکن انتظام اچھا نہ ہوسکا۔ الیاس شہید آگئے اور کہنے لگے "کھانے کا انتظام کیوں نہیں ہورہا؟" میں نے بتایا کہ اندازے سے زیادہ ساتھی آگئے ہیں۔ وہ بڑی اچھی صحت اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک تھے۔ کہنے لگے "میں انتظام کرتا ہوں۔" میں نے کہا اس کام کے لئے جسمانی صحت کی نہیں مہارت کی ضرورت ہے۔ مسکرا دیئے کہنے لگے: "جب دس ساتھیوں کا کام اکیلا کروں گا، تو بہتر انتظام کیوں نہ ہوگا" اس کے بعد وہ کام میں جُت گئے۔ دوسرے روز پلٹن میدان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو خطاب کرنا تھا عوامی لیگی غنڈوں نے جلسہ الٹ دیا، ہمارے کئی ساتھی زخمی اور شہید ہوئے۔ ان زخمیوں میں الیاس شہید بھی شامل تھے۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کی آمد آمد ہوئی تو وہ دیوانہ وار قریہ قریہ پہنچے تاکہ یہ انتخابات اسلامی قوتوں کے لئے کامیابی کی نوید بن کر آئیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے دن رات ایک کردیا۔ انتخابات کے نتائج اگرچہ حوصلہ شکن تھے، مگر ان کی پیشانی پر فکر کی ایک شکن بھی نہ اُبھر سکی۔ گویا ان کا اس بات پر یقین تھا

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

دوسری جانب باطل قوت الیاس شہید کی ان سرگرمیوں پر مضطرب تھی۔ طاغوت ہمیشہ ایسے لوگوں کی تاک میں رہا ہے کہ جب موقع ملے وار کیا جائے، چنانچہ دشمن نے اسلامی فکر کے نمائندہ بیدار مغز مردِ آزاد محمد الیاس کو پھانسنے کے لئے جال بچھانا شروع کر دیئے لیکن دیدہ بینا رکھنے والے الیاس ہر بار جال سے بچ نکلے اور دشمن کا سینہ بغض کی آگ سے مزید بھڑک اٹھا۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں جب عوامی لیگ غنڈوں نے برملا محبِ وطن مسلمانوں کے لہو سے ہولی کھیلنا شروع کی تو دشمن زیادہ دیدہ دلیری کے ساتھ ان کے درپے آزار ہوگیا۔ چنانچہ جمعیت کے کارکنوں کے پیہم اصرار پر وہ چند روز کے لئے کومیلا چلے گئے۔ وسط اپریل ۱۹۷۱ء میں وہ واپس فینی آرہے تھے کہ راستے میں پاک فوج کے کیپٹن نعیم سے ملاقات ہوگئی۔ وہ انہیں

اپنے ہمراہ کومیلا چھاؤنی لے گئے۔ وہاں پر فینی کے ایس ڈی ایم بھی موجود تھے۔ ہر دو افسران نے علاقے میں مکتی باہنی کی گوریلا جنگ اور اس کی حکمت عملی کے بارے میں الیاس شہید سے تبادلہ خیال کیا اور جمعیت سے تعاون کی درخواست کی۔ الیاس وہیں سے ڈھاکہ چلے گئے تاکہ جمعیت کی قیادت سے اس سلسلہ پر بات چیت کر سکیں۔ فینی کے حالات خاصے خراب تھے۔ واضح رہے یہ جگہ ان علاقوں میں سے ایک ہے۔ جہاں بھارتی فوجوں نے ابتداء میں قبضہ کیا تھا۔

محمد الیاس کو ضروری تربیت کے بعد فینی میں البدر کا کمانڈر مقرر کیا گیا اور اس حیثیت میں انہوں نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کی قیادت میں البدر رضاکار بھارت کی صفوں پر گوریلا کارروائی کرتے اور دشمن کو شدید نقصان پہنچا کر پلٹ آتے۔

ان سرگرمیوں کی وجہ سے مکتی باہنی اس فرزند اسلام کے خون کی پیاسی بن گئی تھی۔ ۷دسمبر کی شام کو جب بھارتی فوجیں فینی میں داخل ہونے لگیں تو البدر کی مقامی تنظیم نے فیصلہ کیا کہ الیاس فوراً چر مکھی گنج چلے جائیں، لیکن الیاس مسلسل انکار کرتے رہے اور کہتے رہے "مجھ پر آپ کی ذمہ داری ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ ایک ساتھ جئیں گے، ایک ساتھ مریں گے"، مگر ساتھیوں کا اصرار تھا کہ آپ کی زندگی ہم سے زیادہ قیمتی ہے۔ چنانچہ وہ چر مکھی گنج جانے کے بجائے اپنے ایک رفیق عبدالرحمان کے ساتھ ایک قریبی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ عام راستے چھوڑ کر پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے جائے پناہ کی تلاش میں مسافتیں طے کرتے عشاء کے وقت جب یہ دونوں ایک ڈاک بنگلے کے قریب سے گزرے تو اچانک کچھ مسلح لوگوں نے گھیرے میں لے لیا۔ دونوں کے پاس ایک ایک سو روپیہ تھا وہ اور الیاس کی قیمتی گھڑی چھین لی۔ اس کے بعد وہ پوچھ گچھ کرنے لگے تو الیاس نے کہا ہم ذرا عشاء کی نماز پڑھ لیں۔ عبدالرحمان جو زندہ بچ گئے بتاتے ہیں کہ ہماری نماز کے دوران میں وہ باتیں کر رہے تھے کہ فینی کا الیاس نہیں مل رہا وہ ہاتھ آجاتے تو پھر ہم سمجھیں گے کہ فینی پر ہمارا قبضہ قائم ہو گیا ہے۔ نماز کے اختتام پر ہم نے اپنے ہاتھوں کے کٹورے سائل کے کشکول کی

طرح اس کی قیوم کے سامنے پھیلا دیتے جو مارنے اور کاٹنے والا ہے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو سوال و جواب شروع ہو گئے اور عین انہی ساعتوں میں مکتی باہنی کے چند اور غنڈے آدھمکے۔ ان میں سے ایک نے فوراً الیاس کو پہچان لیا۔ اس پر مارے خوشی کے سب کی باچھیں کھل گئیں۔ اب ہم دونوں ان کی خوفناک آنکھوں کے نرغے میں تھے۔"

مکتی باہنی نے عبدالرحمان کو نو عمر لڑکوں کے حوالے کر دیا جنہوں نے انہیں برہنہ کر کے انتہائی وحشیانہ انداز میں مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور اپنے ذوقِ ستم کی تسکین کی خاطر الیاس کے لئے ستم کی یہ طرزِ نو ایجاد کی کہ انہیں ٹرک کے پیچھے باندھ دیا گیا اور پوری رفتار سے ٹرک چلا دیا گیا۔ الیاس کئی میل تک گھسٹتے چلے گئے۔ ان کا جسم لہولہان ہو گیا اور جگہ جگہ سے گوشت ادھڑ گیا۔ ٹرک کے منزل پہنچنے تک الیاس شہید رخصتِ فردوس ہو چکے تھے۔ اس عالم میں بھی ظالموں کو رحم نہ آیا اور ان کی پشت پر جلتے سگریٹوں سے "جے بنگلہ" کا نعرہ لکھا گیا۔ اور اس دردناک ماحول میں جادۂ حق کے اس عظیم سالار کی جان جانِ آفریں کے سپرد ہو چکی تھی۔ لیکن کمینے دشمن کے سینے کی آگ ابھی ٹھنڈی ہوئی تھی۔ ایک وحشی آگے بڑھا اور اس نے شہید الیاس کی دونوں آنکھیں نکال لیں اور پھر اس بے جان لاشہ کو بجلی کے کھمبے سے لٹکا دیا گیا۔ لاش چار دن تک لٹکی رہی۔ خوف و ہراس کا ایک ناقابل بیان منظر تھا جو بالآخر چند بزرگوں کی جانب سے منت سماجت سے لاش اتارنے کی اجازت حاصل کرنے کے بعد ختم ہوا۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

خرم جاہ مراد
ڈائرکٹر جنرل
اسلامک فاؤنڈیشن انگلینڈ

یہ مضمون البدر کتاب کی تعارفی تقریب، ۱۶ ر دسمبر ۱۹۸۵ء لاہور میں پڑھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچّا کر دکھایا۔ اِن میں سے کوئی اپنی نذر گزار چکا اور کوئی وقت کا منتظر ہے۔"

(احزاب، ۲۳)

مبارک ہے یہ محفل کہ آج ذکر اُن کا ہے جو زندہ ہیں!

شمار تو ہم سب اپنا زندوں میں کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم نے سانس کے آنے اور جانے، دُنیا کمانے اور کھانے پینے کا نام ہی زندگی رکھ لیا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ہم میں سے کتنے زندہ ہیں۔ ہم ہوشمند ہوں تو اُن کا شمار زندوں میں کیسے کریں جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں نہ سوچتے ہیں بھلے سے اُن کے پاس آنکھ، کان اور دماغ سب ہی کچھ ہوں، اس لیے کہ دماغ کی موت (Brain death) کے بعد تو کوئی مسیحا بھی زندگی کا حکم نہیں لگا سکتا۔ یا، ان کو زندہ کیسے سمجھ لیں جو خالق کو چھوڑ کر مخلوق کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں، کہ یہ مُردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ یا، ان کو زندہ کیوں کر کہیں کہ جن کی جان ہر دم نکلے، کبھی غیر یقینی اور فانی دنیا بے حقیقت محبوبوں کی طلب و شوق کی خاطر اور کبھی یقینی اور لازوال زندگی کی آمد کے خوف سے ——— جب انسان کی حالت یہ ہو جائے کہ وہ دانائی سے محروم ہو جائے، نہ دیکھے، نہ سوچے اور اپنے وجود ہی سے غافل ہو جائے تو اُسے زندہ نہیں کہا جا سکتا، خواہ وہ اپنے اوپر زندگی کی تہمت کا بار اُٹھائے پھرتا ہو۔

لیکن آج تو ذکر اُن کا ہے جو یقیناً زندہ ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم اپنے آپ کو زندہ تصوّر کرتے ہیں اس لیے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ ان کو مُردہ کہیں۔ ان کو زندہ کہیں تو مشکل یہ ہو جاتا ہے کہ پھر اپنے آپ کو کس منطق سے زندہ کہیں۔ ان کے بدن خاک میں مل چکے ہیں اور ہمارے بدن رزق حاصل کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہوئے حوادث و تغیّرات پُکار پکار کر بتا رہے ہیں کہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

اور وہ زندہ ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کے یقین کا پودا اس ربّانی بارش سے پھوٹتا

ہے جو قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، اور ان کے زندہ ہونے پر خود خالقِ موت و حیات نے گواہی دی ہے۔ فرمایا:

"جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مُردہ نہ کہو (ایسے لوگ تو حقیقت میں) زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔" (البقرہ: ۱۵۴)

مزید فرمایا:

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوگئے انہیں مُردہ نہ کہو وہ (تو حقیقت میں زندہ ہیں اور) اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں فرحاں و شاداں ہیں۔" (آلِ عمران: ۱۶۹)

موت! انسانی زندگی کی سب سے زیادہ اٹل، سنگین اور بھیانک حقیقت ہے۔ ایسی بھیانک کہ ازل سے ہی انسان زیادہ تر اسی کے خوف کا شکار رہا ہے اور خدا سے آزاد و بے نیاز ہو کر موت کے پنجۂ خوف میں اس طرح گرفتار ہوا ہے کہ نہ معلوم کتنے فلسفے اس نے اسی کے گرد گھڑ لیے۔ لیکن جو جاننا چاہتا ہے وہ جانتا ہے کہ خوف و حزن سے آزادی کی منادی تو صرف اس کے لیے ہے جو اپنے خالق کی طرف چل پڑا، اس کے پیغامبروں کا ہاتھ پکڑ لیا، اس کے لیے جیا، اور اسی کے لیے مر گیا۔ "جو لوگ میری ہدایت کے پیچھے پیچھے چلیں گے نہ ان کے لیے خوف کا موقع ہوگا، نہ وہ غم میں مبتلا ہوں گے۔" (البقرہ: ۳۸) خُلد یعنی ابدی زندگی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ زندگی خالق کی نذر کر دی جائے، نہ کہ اس کی نافرمانی کی جائے کہ ہدایت کی صراطِ مستقیم کا یہ ازلی و سرمدی ٹکڑا ہے:

"کہو، میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں۔" (الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳)

خوف و حزن اس کا مقدر کیوں کر ہو کہ جس کے لیے زندگی اور موت کی سرحد مٹ گئی، جسے موت اور ماورائے موت کی فکر نہ رہی بلکہ اس سے پہلے کہ موت حقیقت کو آشکار کر دے، ہر چیز روزِ روشن کی طرح اس پر عیاں اور واضح ہوگئی جس کے لیے موت دیدارِ الٰہی کے شوق کی تعبیر بن گئی، جس نے خود اپنی رضا سے اپنی جان کی نذر پیش کر کے اپنے شوق و ایمان پر اور اپنے رب پر شہادت دی ــــ اور پھر ایسے سعید گواہ پر خود رب اس کے زندہ رہنے پر شہادت کیوں نہ دیتا،

"کہو کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کہو اللہ کی۔" (الانعام: ۱۹)

کتنی مبارک ہے وہ زندگی جس میں عزمِ وفا، آرزوئے رضا، اور شوقِ لقا کے چراغ جھلمل کر کر رہے ہوں۔ اور کتنی مبارک ہے وہ موت جس میں کامرانِ زندگی کی بہار رقصاں ہو۔ کتنا مبارک ہے وہ خون جس میں وفورِ تمنا کے چشمے موجزن ہوں، اور کتنا مبارک ہے وہ سر جو قدمِ یار پہ نثار ہو جائے۔ کتنی مبارک ہے وہ خاک جس میں گلہائے بیتاب کے بیج بوئے گئے ہوں، اور کتنی مبارک ہے وہ زمین جس کا نصیب خونِ شہادت کی جلن سے سُرخ رُو ہونا لکھا گیا ہو ___ اور ___ کتنا مبارک ہے وہ بدن جو راہِ خدا میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ اور کتنا مقدس ہے وہ حُسن جو اس پاکیزہ بدن کے انگ انگ سے پھوٹ رہا ہو اور پور پور سے جھلک رہا ہو۔

دیکھا جائے تو انسانی زندگی میں اللہ کی راہ میں جان دینے سے زیادہ جان بخش و جاں افزا عمل اور اس کی خاطر جان دینے سے زیادہ جاں آفرین و فرحت انگیز چیز کوئی دُوسری اور کیا ہو سکتی ہے کہ جان دے کر ہی آدمی جان پاتا ہے۔ ایسے جاں دار اور مبارک بندوں کی یاد اور تذکرہ سے زیادہ نشاط انگیز تذکرہ اور کس کا ہو سکتا ہے کہ اس میں دلوں کے لیے کیف و سرور اور فرحت و آسودگی کا سامان ہے۔ یہ وہ مبارک بندے ہیں جن کے لیے ان کے مالک نے اپنی محبت ظاہر کر دی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں:

"جو اللہ کو محبوب ہیں اور اللہ اُن کا محبوب ہے۔ یہ مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہیں، یہ اللہ کی راہ میں جدّ و جہد کے لیے جان لگا دیتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔" (المائدہ، ۵۴)

اللہ کے چند ایسے ہی محبوبوں کی یاد آج کی اس محفل کا عنوان ہے اور اُن کے تذکرے کا سامان فراہم کیا ہے ہمارے عزیز و محبوب بھائی سلیم منصور خالد کی کتاب "البدر" نے۔ کہ یہ کتاب مسلم بنگال کے اُن اَمر نوجوانوں کی داستان ہے، جن کو اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان (پاکستان اسلامی چھاترو شنگھو) نے البدر کی صورت میں ان کے اپنے رب پر نثار کر دیا۔ یہ داستان جو ہماری حیاتِ ملی کا ایک درخشاں باب ہے تاریخ کے صفحات سے گم ہو جاتا، اگر سلیم منصور اتنی جانفشانی اور کاوش، محنت اور عرق ریزی، محبت اور خلوص کے ساتھ اس کو محفوظ کر دینے کا انتظام نہ کر دیتے۔ وہ ہم سب کی طرف سے پوری ملت کی طرف سے تشکر و امتنان کے مستحق ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ دراصل

ہمارے اعتراف و تحسین سے بالاتر ہیں اور البدر کے جن نوجوان شہدا کے ساتھ رشتہ کے ناطے اور ان کی محبت میں اپنے سارے لمحات بسر کرکے اور ان کے اخلاص و سوزِ دروں کو جذب کرکے ان کی نگاہیں اجر اور داد و تحسین کے لیے اس لازوال ہستی پر مرکوز ہیں کہ جس نے خود کو غفور و شکور کہا ہے۔ "اللہ سے سچی بات اور کس کی ہوسکتی ہے۔" (القرآن) میں تو ان کو بس اتنا ہی یقین دلاتا ہوں کہ ان کا یہ حسنِ عمل اس کے سامنے ہے جس سے زیادہ سخی اور کوئی نہیں اور وہی ان کی پوری قدر دانی کرے گا کہ اس کی استطاعت ہمارے بس میں نہیں۔ وہی ان کی فروگذاشتوں سے درگزر کرے گا کہ ہم جیسے بندے اتنا ظرف نہیں رکھتے۔

کتاب کا تذکرہ بہت دن سے سن رہا تھا۔ کچھ لکھنے کا تقاضا بھی تھا۔ کچھ شبہ بھی تھا کہ شاید نہ لکھوں کہ مسلم بنگال میں فوجی اقدام کے بارے میں میری رائے معلوم و ظاہر ہے۔ لیکن جن شہدا کے خون کا ہر ایک قطرہ ہی میری ساری متاعِ حیات سے زیادہ قیمتی اور وزنی ہے، جن کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ بیش بہا لمحات گزارے ہیں، جن کی زندگیوں کے ساتھ میری زندگی پیوست ہے۔ اور جن کی یادیں میرے دل کے صفحات پر ایسے روشن اور انمٹ الفاظ میں کھدی ہوئی ہیں کہ انہیں شام و سحر کی گردشیں محو نہیں کرسکتیں، ان کے بارے میں کچھ کہنے اور لکھنے کی عظیم سعادت سے محرومی کا خسران بھلا میں کیسے اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ کتاب آئی، تقاضا آیا، محفل کی خبر آئی، اور میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، اگرچہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر اور: ؎

سر خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

ترجمہ: (میں اس سرفروش کی تربت (قبر) پر گلِ لالہ کی پتیاں بکھیر رہا ہوں جس کا لہو ہماری ملت کے شجر (کی سربلندی) کے لیے مفید ثابت ہوا)

کتاب ہاتھ میں آئی، دلِ بے تاب نے انتظار کی مہلت نہ دی، فوراً ورق پہ ورق الٹنا شروع کر دیا۔ شروع کے ایک تہائی حصے میں جگہ جگہ نگہ ٹھٹکی اور قدم رکے کہ وہ تاریخ و تجزیہ پر مشتمل ہے، کیونکر ایسا ہوا کہ پاکستان دولخت ہوگیا؟ ـــــ اور یہ وادی پُرخار ہے۔ کہ اس وادی میں خود میں نے بھی آبلہ پائی کی ہے اور میرے قلب و نظر نے جو راہیں پائی ہیں اور جو تصویریں دیکھی ہیں وہ ان اُلٹی راہوں اور مسخ تصویروں سے بہت مختلف ہیں جن کا چلن بازار میں عام ہے۔ اب یہ الگ بات ہے

کہ ان کی نشاندہی اور نقاب کشائی کے لیے ماحول سازگار نہ ہو۔ لیکن کتاب کا پہلا حصّہ گزرا تھا کہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک سطر، ایسا لگا کہ اپنے ہی دل کے ساز کا آہنگ ہے۔

ع — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ماضی کے دریچے کھلتے چلے گئے، یادوں کے خزانے اُبلتے گئے۔ نگاہ نے پہلے تلاش کر کر کے ان کا تذکرہ پڑھا کہ جن کی ادائیں دل پر نقش ہیں۔ اور جن سے وہاں شناسائی تھی لیکن اس راہ میں ناشناسی کا کیا سوال اس لیے کہ صادق و مصدوق کے قول کے مطابق تو اللہ کی راہ میں محبت کرنے والوں کی رُوحیں بھی ایک دُوسرے کو خُوب پہچانتی ہیں۔ اور جلد ہی کتاب ختم ہوگئی۔ کاش یہ دراز تر ہوتی یہ مل جاتی کہ ایسی لذیذ حکایت سے لُطف اندوزی کم ہی نصیب ہوتی ہے۔

میں سلیم منصور خالد کا شکر گزار ہُوں کہ اُنھوں نے ہمارے سافر کے لیے وہ مے فراہم کر دی ہے کہ جس کی لذت بیان سے باہر ہے اور جو لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ کی مصداق ہے۔ اور میں تو اس لیے بھی اپنے آپ کو احسان مند محسوس کرتا ہُوں کہ اگرچہ اس داستان کا ایک حصّہ اُس وقت لکھا گیا جب میں وہاں موجود تھا لیکن غیر حاضر تھا۔ اور اُنھوں نے یہ باب میرے سامنے کھول دیا اور دُوسرا حصّہ بھی اُنھوں نے میری نگاہوں کے سامنے لا کر رکھ دیا جو اس وقت لکھا گیا جب میں جنگی قیدی تھا۔

اپنی ناواقفیت اور کوتاہی کا اعتراف ضروری ہے اور مجھے اس میں کوئی تامّل نہیں اس لیے کہ جنگی قید سے واپسی کے بعد بہت سی محفلوں میں مجھے البدر کے حوالے سے وہ کریڈٹ دیا جاتا رہا ہے کہ جس کا میں مستحق نہ تھا لیکن جس کی فوری تصحیح سے بوجوہ قاصر تھا۔ اوّل تو میرا دائرہ کار ہی ایسا تھا کہ اگرچہ میرا اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ ربط تھا، ان کے اہم پروگراموں میں شرکت کرتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں کارکنوں کی اکثریت سے ذاتی شناسائی سے محروم تھا۔ اس لیے البدر کے قیام اور اس کی جدوجہد سے میرا ربط، کسی شہید کے جنازہ میں حضوری کی سعادت اور دو آنسو بہانے سے زیادہ نہ تھا۔ لہٰذا اس احسان کا اعتراف ضروری ہے کہ سلیم منصور خالد نے مجھے وہاں حاضر کر دیا جہاں میں موجود ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر تھا۔ کہ اس سے میری عقل مجھے مستقبل کی راہیں سُجھا رہی تھی اور میں اس عشق کے غلبہ سے محروم تھا جس کا غلبہ میرے جمعیت کے ساتھیوں پر تھا۔ ورنہ

اس کا کوئی جواز نہ تھا کہ میں بھی ان کے ساتھ بے خطر آتشِ نمرود میں کود نہ پڑتا۔ ورنہ آج آپ سے یہ گفتگو کر رہا ہوتا۔

لیکن البدر سے میرا تعلق کتنا ہی کم اور ناقص کیوں نہ ہو، اس جمعیت سے میرا زندگی بھر کا ساتھ ہے، اس کا گوشت میرا گوشت اور اس کا لہو میرا لہو ہے جس جمعیت نے "البدر" کو جنم دیا، میرا وجود جو گوشت پوست کے علاوہ ہے اُس کی ساری تعمیر جمعیت کی آغوش ہی میں ہوئی ہے۔ اس لیے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں البدر سے اچھی طرح واقف ہوں، اس ایمان اور شوقِ جہاد و شہادت سے آگاہ ہوں جو اس کی رگ رگ میں جاری و ساری تھا۔ ان ولولوں اور عزائم سے شناسا ہوں جو اس کا اصل سرمایہ تھے۔

البدر کی تشکیل جمعیت کے جن نوجوانوں سے ہوئی تھی یہ وہ نوجوان تھے جنہوں نے اپنے ربّ کو پہچانا اور اسی کا بن جانے کی آرزو کا شرار ان کے وجود میں جل اٹھا۔ جب مٹی کے پتلے میں یہ شرارِ آرزو فروزاں ہو جائے تو تعجب اس پر کیوں ہو کہ وہ بلا جھجک اپنے ربّ کی راہ میں خاکستر ہونے پہ آمادہ ہو گیا بلکہ لپک لپک کر آگے بڑھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تعجب کا مقام ہوتا۔ اس لیے مجھے نہ حیرت ہے نہ تعجب، صرف رشک ہے۔ وہ رشک جس کی اجازت خود نبی اکرمؐ نے دی ہے۔

۲

آئیے! اب چند لمحوں کے لیے رُک کر پہلے ان چند شہدا کا ذکر کر لیں کہ جو میرے جانے پہچانے تھے۔

— محمد عبدالمالکؒ جو البدر کے بننے اور آرمی ایکشن سے پہلے راہِ حق میں جمعیت کی پہلی نذر تھے۔ نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو، رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز۔ جب وہ جامِ شہادت نوش کر کے اپنے رب کے حضور پہنچ گئے تو ہم "کوثر ہاؤس" (دفتر ڈھاکہ جماعتِ اسلامی) میں جمع ہوئے تاکہ اپنا غم ہلکا کر سکیں اور ایک دوسرے کو پُرسا دیں۔ میں نے اس وقت جو کچھ کہا وہ اب بھی یاد ہے:

"آپ سب غمگین ہیں۔ میں بھی ہوں۔ لیکن میں اس پر کیا کروں کہ غم کے ساتھ ساتھ میرے دل میں مسرت کا ایک چشمہ بھی موجزن ہے۔ بیشک میں سوگوار ہوں، بیشک میری آنکھیں نمناک ہیں، بیشک میرا دل بھی اپنے اس ساتھی کے فراق میں رو رہا ہے جو راہِ خدا میں ہمارا بہت ہی قیمتی سرمایہ تھا۔ لیکن میں مسرور ہوں کہ اُس نے اپنی مراد پالی، اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ آخر اس سے بڑھ کر اور کونسی

سعادت اور معراج ہے جس کا تصور ہم اس کے لیے کر سکتے تھے ۔ اور خوش اس لیے بھی ہوں کہ آج ایک لمبی مدت کے بعد مشرقی پاکستان کی خاک میں ایک نوجوان کا ایسا لہو جذب ہوا ہے جو صرف اللہ کی راہ میں بہایا گیا ہے ۔ عرصہ سے یہ خاک اس خون کے بوجھ سے غم ناک رہی ہے جو زبان اور نسل اور قوم کے لیے بہایا گیا ہے ۔ اور مجھے یقین ہے یقین سحر کی طرح کساب اس سرزمین میں دعوت وجہاد کا وہ بیج پڑ گیا ہے جو پھلتا پھولتا ہی رہے گا ۔ برگ بار ہی لاتا رہے گا ۔

عبدالمالک شہید کے لیے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کی تبلیغ اور حق کے لیے پیاسی سرزمین پر بارانِ رحمت کا پہلا قطرہ تھے ۔

—— شاہ جمال چوہدری، دُبلے پتلے، قد میں پست، لیکن عزم و ایمان میں بلند، ڈھاکہ جمعیت کے ناظم ہونے کے حوالہ سے اکثر ملتے اور ساتھ بیٹھتے ۔ راہِ خدا میں یہ جمعیت کی دُوسری بڑی نذر تھے ۔ ان کو نہ مکتی باہنی نے مارا، نہ ہندوستانی فوج نے ۔ یہ اپنوں ہی کا شکار ہو گئے ۔ جمعیت کے دفتر سے نکلے تھے کہ دھر لیے گئے ۔ پھر پتہ نہ چلا مگر مدت کے بعد کچھ ہمدرد افسروں نے تصدیق کر دی کہ شہید کر دیے گئے، ان کو پاک فوج کے ہی کسی افسر اور جوان نے شہید کیا ۔ اس سے پوری پاک فوج ذمہ دار نہیں ہو جاتی ۔ لیکن اس کے لیے کون تیار تھا کہ مجرموں کی نشاندہی کی جائے اور انہیں سزا دی جائے کہ یہ پوری فوج کی ناک اور وقار کا مسئلہ تھا ۔

—— اور یہ کون سرخرو کھڑا ہے ۔ ۔ ۔ مصطفٰی شوکت عمرانؒ !

ع ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

ان سے میڈیکل کے اُبھرتے ہوئے ہونہار طالب علم، فعّال کارکن کی حیثیت سے تعارف ہوا ۔ جلد ہی وہ اپنے رب کی راہ پر تیزی سے آگے بڑھتے گئے ۔ اتنی تیزی اور عجلت سے کہ یہ اندازہ تو سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ہوا کہ وہ کتنی عجلت میں تھے ۔ جتنی تیزی سے آگے بڑھے اتنی ہی تیزی سے دل میں گھر کرتے چلے گئے ۔ ہنستا مسکراتا سانولا چہرہ، چمکتی ہوئی آنکھیں، نگاہوں میں ٹھہر جانے والی روشنی ۔ اور ان سب کے پیچھے سے حسین و رعنا اور جوان و شاداب ایمان کا ایک پیکر جھانکتا ہوا ۔ ۱۵ر اور ۱۶ر دسمبر کی شب کو آخری دفعہ دیکھا ۔ میں تو معلوم نہیں کب سے بیتاب تھا کہ جمعیت کے یہ نوجوان سب کے سب اپنے آپ کو مستقبل کے لیے محفوظ رکھیں ۔ لیکن ۱۵ر دسمبر کو جب دیکھا کہ اب

بھی کسی کو احساس نہیں کہ کل کی سحر اپنے دامن میں کیا طوفان لا رہی ہے اور ہر شخص وہیں جا رہا ہے
جہاں وہ ہے کو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ شوکت عمران کو تقریباً تحکیمہ انداز میں بلایا' اپنی جیب دی گلشن
میں اپنے خالی مکان کی نشاندہی کی جو کیپٹن کی طرف سے مجھے ملا ہوا تھا اور معروف نہ تھا اور التجا کی
کہ خدا کے لیے کوثر ہاؤس' ۵۔ براہ بلیٹن (جمعیت کا دفتر) اور آدمی کے کیمپ چھوڑ دو۔ کل ان میں سے کچھ باقی رہتا
نظر نہیں آتا۔ اسی التجا کے جواب میں شوکت عمران میرے گھر آ گئے' اور ان سے اس آخری ملاقات کا
نقش دل میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ اللہ کو ان کے مدارج بلند کرنا مقصود تھے کہ جیپ کا حادثہ پیش
آیا۔ وہ زخمی ہو کر ہولی فیملی ہسپتال پہنچے اور وہاں سے پکڑ کر لے گئے اور انتہائی شقاوت اور
بے دردی سے شہید کر دیے گئے۔ مجھے تو ڈھائی سال بعد پتہ چلا کہ کیا کچھ گزری۔ جو تھوڑا سا سنا تو
آگے کچھ مزید پوچھنے کی تاب نہ پائی۔

مصطفےٰ شوکت عمران کی قسمت بلند پر کو میرے جیسا کم مایہ کم ہمت انسان رشک کرنے کی
جرأت بھی نہیں کر سکتا کہ طائرِ ہمت کے پر جلنے لگتے ہیں۔ وہ خاک کتنی خوش قسمت تھی کہ جس کے
نصیب میں سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے ایک ادنیٰ پیرو کا مسلا ہوا دل لکھا ہوا تھا۔ یقیناً اس نے لپک
کر اس امانت کو سینہ میں رکھ لیا ہوگا اور دل رکھنے والوں کو اب بھی وہاں سے مشک کی خوشبو آتی ہوگی۔
کیا کوئی اُس مقام کی نشاندہی کرے گا کہ میں اس کو چوم سکوں اور مشامِ جاں کو معطر کر سکوں۔ ؎

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

اور ایسا خوش قسمت کون ہوگا کہ وہ اپنی جان سپردِ جاناں کر رہا تھا اور سفاک اسے پانی کے بجائے
پیشاب پیش کر رہے تھے۔ کیا روح کے قفسِ عنصری سے پرواز کرتے ہی اس کے لیے حوضِ کوثر سے
ساقی نے حوروں کو جام بدست نہ روانہ کیا ہوگا! مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسا نہ ہوا ہو۔ اسی کا وعدہ تو ہم
سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے کیا تھا۔ کتنے سچے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ۔

سلیم منصور نے بہت مشکل کام اپنے سر لیا کہ ان کے تذکار کا بیڑا اٹھایا جن کا حال یہ ہے کہ،
داستانِ خود بخونِ خود نوشت۔ جو داستان نوکِ شمشیر سے اور خون کی روشنائی سے لکھی گئی ہو اُس کا احاطہ
بھلا نوکِ قلم سے کیسے ہو۔ ان پری وشوں کے لیے اپنا بیان کیسے کافی ہو۔ لیکن جو لذت بھی اہلوں نے
سننے اور سنانے اور پڑھنے والوں کو فراہم کر دی ہے اس پر ان کے احسان کا اعتراف ضروری ہے۔

شوکت عمرانؒ کا ذکر تو میں نے اس لیے تفصیل سے کیا کہ وہ میرا شناسا تھا، اس کے مقام اور اس کی قربانی کی آب و تاب سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جمعیت نے کوئی ایک شوکت عمران تو نہیں پیدا کیا۔ پھر اُن عام کارکنوں کی تعداد کوئی کم نہیں اور ان کا مقام اور اجر اس سے کسی طرح کم نہ ہوگا جنہوں نے عزیمت اور قربانی کی ایسی ہی روشن شمعیں جلائیں جیسی اس نے کہ :

؎ خیلِ تشنہ بہ داز اں قطار اندر قطار آمد

____ محمد الیاسؒ کہ جس کو ٹرک کے پیچھے باندھا گیا اور پھر ٹرک کو پوری رفتار سے چلا دیا گیا یہاں تک کہ رُوح پرواز کر گئی۔ عطاء الرحمٰنؒ جس کی ایک ایک انگلی ہتھوڑے سے توڑی گئی۔ ہاتھ پاؤں کاٹے گئے پھر کو نوچا گیا۔ عبدالحقؒ بیوپاری جس کے بازوؤں اور گلے کو رسّی سے جکڑا گیا یہاں تک کہ آنکھوں میں خون جم گیا۔ محمد حبیب الرحمٰنؒ جس کے ناک اور کان کاٹے گئے، پھر گلے میں رسّی ڈال کر شہر میں گھمایا گیا، پھر دونوں بازو کاٹ دیے گئے۔ عبدالوہابؒ، معین الدینؒ، عبدالباطنؒ اور محمد یونسؒ جن کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ندی میں ڈبو دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال جس کی انگلیاں کاٹی گئیں دونوں ہاتھ کاٹے گئے۔ ظالموں نے اس کا لہو اپنے چہروں پر ملا، قہقہے لگائے اور پھر سینہ پر تالا رکھ کر بسلی دبا دی گئی۔ ابو الحسینؒ جس کا گوشت ہڈیوں سے چھیل کر اس طرح الگ کر دیا گیا جس طرح قصاب جانوروں کا کرتا ہے۔ محمد علیؒ جس کو بجلی کے کھمبے کے ساتھ باندھ کر ایک ایک عضو کاٹا گیا۔ پھر نعش کو سر بازار کھمبے کے ساتھ لٹکا دیا گیا،

؎ جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ تو چند نام ہیں، ورنہ ہر فرد ایسی ہی دشوار گھاٹی سے گزارا گیا۔ نہ معلوم کتنے اور ایسے تھے جن کے اعضا کاٹے گئے، گوشت نوچا گیا، درختوں سے لٹکایا گیا، پانی میں ڈبویا گیا، زندہ گڑھوں میں دفن کیا گیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(خاک و خون میں لوٹنے کی کیسی اچھی رسم انھوں نے ڈالی، خدا ان نیک سرشت عاشقوں پر رحمت کرے)

اور ان میں ہر ایک عزیمت و عظمت کی ایسی تصویر کہ دیکھنے والے اپنی انگلیاں کاٹ لیں، محو

حیرت ہو جائیں۔ ہر ظلم و ستم کے باوجود اپنی جگہ پہاڑ کی طرح قائم و ثابت۔

ع ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

اور تسلیم جاں کا انداز بھی نرالا۔ موت کے گھاٹ اتارے گئے تو مسرور و شادماں تھے۔ چہرے ایسے چمک رہے تھے کہ جیسے دُولہا کا چہرہ۔ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (عبس: ۳۹)

عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا مت پُوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا!

۳

اس قوت و استقامت کا راز کیا ہے ؟ اس شوق و وارفتگی کا سرچشمہ کہاں سے پھوٹتا ہے ہستی کے پُتلے میں پہاڑوں سے بڑھ کر ثبات اور سمندر کی لہروں سے بڑھ کر وفورِ شوق کہاں سے بھر جاتا ہے !

یہ راز عیاں ہے کہ یہ چشمہ سب کی دسترس میں ہے۔ یہ ساری قوت قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا کے خزانہ میں موجود ہے۔ جنہوں نے حق کو دیکھا، پہچانا اور اس کے پیچھے ہو لیے، اُن پر خوف کا سایہ بھی نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ فرشتے اُن کی رگ رگ میں اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (نہ ڈرو اور نہ غم کرو) کی رُوح پھونک دیتے ہیں، نس نس میں نشۂ شوق بھر دیتے ہیں۔ اور ان کو فوز و فلاح کا مژدہ سناتے ہیں کہ "اس جنت کی خوشیاں مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ؛ اور وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہو گی، یہ ہے سامانِ ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔" (حٰم السجدہ: ۲۱،۲۲)

ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر .... یہ کیا اس کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ قوت و استقامت اور شوق و آرزو کا خزانہ کہاں سے آگیا ؟ جمعیت کے یہ نوجوان اسی لیے تو موت سے بے خوف تھے، وہ اس حقیقت پر ایمان لا چکے تھے کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، اس سے کوئی مفر نہیں، اور اس پر کہ کوئی اللہ کے حکم اور فیصلہ کے بغیر جان لینے پر قادر نہیں، اور اس پر کہ جہاں جس طرح، جس وقت ان کی موت لکھ دی گئی وہ کشاں کشاں اسی جگہ، اسی طرح اسی وقت مرنے کے لیے پہنچ جائیں گے۔

وہ جہاد پر کمربستہ ہو گئے تھے کہ اُن کا ایمان تھا، جو ایمان راہِ جہاد پر نہ لے جائے وہ نفاق سے

زیادہ قریب تر ہے" اور اس پر کہ ایمان لانے کے بعد وہ اپنا جان و مال اللہ کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں" (التوبہ : ۱۱۱) اور اس پر کہ مردانِ کار کے لیے عہدِ وفا کو وفا کرنے کے علاوہ کوئی راہ نہیں کہ دُنیا و آخرت میں عزّت و سربلندی، سرخروئی و کامرانی، فوز و فلاح اور اجرِ عظیم کی راہ بس یہی ہے اور" وہی اپنے دعوئ ایمان میں سچے ہیں کہ جو اپنے رب اور اس کے رسولؐ کی کسی بات، کسی حکم، اور کسی دعوی پر ذرہ برابر شک نہ کریں اور مال و نفس سب اس کی راہ میں لگا دیں" اور اس پر کہ یہی وہ تجارت ہے جو عذابِ الیم سے نجات اور جنّت کی ضامن ہے۔ پھر وہ کونوا انصار اللہ (اللہ کی مدد کے لیے کھڑے ہو جاؤ) کی پکار پر کیوں نہ لبیک کہتے، وہ اس پر ایمان لا چکے تھے کہ اگر وہ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے تو اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ پھر ان کے دل موت کا دروازہ کھلنے پر بھلا کیوں ڈرتے؟ دروازہ کھلنے سے ڈرنا اگر اس کے پیچھے جو کچھ ہے، اس کے لیے دعائیں اور تمنا کرنا، یہ دو رُخا پن اُن جوانوں کے ایمان میں جمع نہ ہوا تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ یہ دروازہ کھلے گا تو خدا کا ہر وعدہ پورا ہوگا ــــ تو وہ شوق و تمنا سے کیوں نہ لبریز ہوتے! اور یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ انہوں نے حق کو پہچانا اور اس کے پیچھے ہو لیے، نہ بھٹکے، نہ جھجکے، نہ رکے، نہ پلٹے، اور بس آگے ہی بڑھتے چلے گئے:

"مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا، اور کہتا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ پس اے ہمارے رب! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں اُن سے درگذر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دُور کر دے۔ ہمیں اپنے وفادار بندوں (نیک لوگوں) کے ساتھ موت دے۔ خداوندا، جو وعدے تُو نے اپنے رسولوں کے ذریعے کیے ہیں اُن کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رُسوا نہ کیجیو، بے شک تُو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔ (آلِ عمران : ۱۹۳، ۱۹۴)

اور اس سے بڑھ کر انہوں نے اس ایمان کے معنی سمجھ لیے تھے کہ جس کے ساتھ اللہ نے اپنے وعدوں کی تکمیل کو مشروط کیا ہے" جن لوگوں نے میری خاطر ہجرت کی اور جو (میری راہ میں) اپنے گھروں سے نکالے گئے اور (میری راہ میں) ستائے گئے اور

میرے لیے لڑے اور مارے گئے، ان کے سب قصور میں معاف کر دوں گا،
اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔

(آل عمران : ۱۹۵)

ایک بات کہی جاتی رہی ہے تحریکِ اسلامی اپنے کارکنوں کو جہاد و شہادت کے نشہ سے سرشار نہیں کرتی، فوجی تربیت کا کوئی انتظام نہیں، جسمانی تربیت کا بھی اہتمام نہیں۔ جب وقت آئے گا تو یہ لوگ کیا کریں گے۔ تحریکِ اسلامی سے وابستگان پر طویل مدت گزر چکی ہے یا نو واردان ہیں، ان میں سے کسی کے لیے میں البدر کے حقیقی مجاہدین و شہدا کی مانند استقامت اور شوقِ شہادت کی پیشگوئی کی جسارت تو نہیں کر سکتا، نہ کرنا چاہیے کہ اس سے منع کیا گیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ان میں سے کتنے اپنے عہدِ وفا کو وفا کریں گے، جاں سپردِ جاناں کر دیں گے۔ گوشت کے نوچے جانے، زندہ اعضا کے کاٹے جانے اور زندہ دفن کیے جانے کے لیے تیار ہوں گے ــ اپنا حال تو بہت پتلا ہے اور "مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تم نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے، پروردگار جس بار کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں وہ ہم پر نہ رکھ" (البقرہ ۲۸۶) کا وظیفہ ہی دن رات ہے۔ لیکن البدر اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ اس پہلو سے تحریکِ اسلامی خام نہ ثابت ہوئی۔ بات یہ ہے کہ اگر ایمان کے صحیح معنی قلب میں بیٹھ جائیں اور منزل روشن اور واضح ہو تو ہر خوف کرامن جدو جہد اور کفوا ایدیکم کی تعمیل کے باوجود وقت آنے پر ایسا ایمان، خدا کے اذن سے، پیچھے نہ رہے گا۔ اور ایمان کے معنی محدود رہیں یا منزل کا شعور نہ ہو تو لاکھوں کا مجمع بھی کلمہ کے ورد کے باوجود، جہاد و شہادت کے فضائل سننے اور پڑھنے کے باوجود، ان مراحل سے شناسا نہ ہو گا۔ جب وقت آئے گا تو چھوٹ جائے گا۔ مگر البدر کو دیکھ کر تحریکِ اسلامی کہہ سکتی ہے:

به مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آمد ۔۔۔ تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نمناک گردید ۔۔۔ به بازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد

(غزواتِ بدر و حنین کے آقا (رسولِ اکرمؐ) کی بات عشاق تک پہنچی۔ حضورؐ کے باطنی کمالات نظر میں صاف ظاہر ہو گئے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے نخل، کی شاخ کی پھر ہمارے لہو سے آبیاری ہوئی (اس طرح بازارِ عشق میں ہماری پونجی کھری ثابت ہوئی۔)

۴

پاکستان دولخت ہوگیا، لیکن کیا البدر کی قربانیاں رائیگاں گئیں۔ کیا ساری جدوجہد بے سود رہی؟ ایسا وہی سوچ سکتا ہے کہ جو کم فہم ہو اور جس کی نگاہ اس دُنیا سے ماورا دیکھنے سے قاصر ہو۔ جو جہاد و شہادت کی رُوح اور مقصد سے ناآشنا ہو۔ فرد کے سود و زیاں کا اجتماعی فتح و شکست سے کیا تعلق۔ دونوں کو خلط ملط کرنے سے ہی فکر و نظر یاس یا ترکِ راہ کے فتنے کا شکار ہوتے ہیں۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

فرد کا مقصود اور مطلوب تو وہ دلِ بیدار اور وہ قلبِ سلیم ہے، اور جہاد و شہادت کا حاصل یہی متاعِ دل ہے کہ ہاتھ آجائے تو بیڑا پار ہے۔ یہی خدا سے محبت کا حاصل ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اِک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں!

کیا کھویا؟ کیا پایا؟ نشۂ شہادت سے سرشار مجاہد اور ہم کنارِ شہادت مومن کو بحیثیت فرد کے ان سوالوں سے کیا بحث۔ جس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا بس وہی کامیاب ہوگیا۔ ایک جواں سال صحابیؓ کی پشت پر دشمن نے آکر نیزہ مارا تو وہ ... "ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا" کہتے ہوئے شہید ہوگئے۔ مارنے والے کا دل اسی ادا پر مرمٹا اور وہ آکر رسولِ خدا کے قدموں پر گر گیا۔

کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرف بہاراں ہوئے۔ البدر تو ہوا کے جھونکے کی مانند بہار کا پیغام لائی۔ اس سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ مسلم بنگال میں تحریکِ اسلامی کی بہار ایک بڑے درجے میں نوجوان شہدا کے خون کے قطروں کی مرہونِ منت ہے۔ اتنے بڑے حادثے کے بعد، اتنا لٹنے پٹنے کے بعد، اتنے عظیم نقصان کے بعد وہاں تجدید و احیا کا چراغ جلا ہے تو انہی کے خون سے جلا ہے۔ کیا اس کو معجزہ نہ کہا جائے کہ ہزاروں افراد کی قربانی دینے کے بعد، اور دشمن کی جانب سے اپنی دانست میں بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے بعد، چند سال کی مختصر سی مدت میں اسلامی جمعیت طلبہ کے سالانہ اجتماع (۱۹۸۱ء) میں بنگلہ دیش کے گوشے گوشے سے پانچ ہزار سے زیادہ متوالے جمع ہوگئے؟ مسلم بنگال کے بارے میں کہا جا سکتا ہے، ذرا تھی منتظرِ حنا کی عروسِ زمینِ شام۔

اور یہ حنا جمعیت کے ان نوجوانوں کے خون نے لگادی کہ جو اپنے رب کے راستہ پر قربان ہو گئے اور یہ خیال جو دلوں میں آتا ہے کہ "اگر ایسا اور ایسا ہوتا تو یہ قیمتی جانیں تو بچ جاتیں تو یہ ایک سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ پھر یہ ایک خاص کافرانہ خیال ہے۔ دیکھیے قرآن نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو کافروں کی سی باتیں نہ کرو کہ جن کے عزیز و اقارب کہیں سفر پہ جاتے ہیں یا جہاد میں نکلتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دل میں حسرت واندوہ کا سبب بنا دیتا ہے۔ ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہے اور تمہاری تمام حرکات پر وہی نگران ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصہ میں آئے گی، وہ ان ساری چیزوں سے بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔"

(آل عمران ۱۵۶، ۱۵۷)

اور کتنے تیکھے انداز میں منافقین سے کہا گیا "ان سے کہہ دو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمہاری موت جب آئے اسے ٹال کر دکھا دینا۔" (آل عمران: ۱۶۸)

۵

پاکستان دولخت کیوں ہوا؟ مسلم بنگال مغربی پاکستان سے کیوں کٹ گیا؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس کا جواب تحریک اسلامی کے ذمہ قرض ہے۔ جس قرض کو ادا کیے بغیر مستقبل کی راہیں نہ محفوظ ہوں گی نہ کھلیں گی۔ اور سب سے بڑھ کر ہمارے اوپر یہ قرض ان نوجوانوں کی قربانیوں اور ان کے خون کا ہے جو البدر کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ یہ محفل اس سوال کا جواب دینے کی نہیں لیکن دل یہ کہنا ضرور چاہتا ہے کہ ہم عام ڈگر سے ہٹ کر سوچیں۔ ہم اپنی ہر تشنہ کامی، ہر حرماں نصیبی، ہر خرابی، ہر تباہی کے لیے بیرونی دشمنوں اور ان کی سازشوں کو ذمہ دار ٹھہرا لیتے ہیں۔ یہ اپنی ذمہ داریوں سے فرار ہے۔ ہم اپنے کو سلوانا چاہیں تو کوئی ہم کو بگاڑ نہیں سکتا، ہم خود اپنی تباہی چاہیں تو کوئی ہم کو بچا نہیں سکتا۔ تاریخی تجربات و مشاہدات کو ایک طرف رکھ دیجیے کہ وہ بہت ہیں، یہ فکر اور روش تو قرآن مجید کی صریح تعلیمات کے خلاف محسوس ہوتی ہے جو ہمیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر بتاتی ہیں کہ جو خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ وہی ہلاک ہوتا ہے۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، نہ کوئی کسی اور کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ نہ انسان کی قسمت میں اپنے عمل کے علاوہ کسی دوسرے کی کھیتی کا پھل ہے۔ یہ

تعلیم تو اتنی ازلی ہے کہ صحف ابراہیم و موسیٰ تک میں اس کی موجودگی کی شہادت قرآن دے رہا ہے، جو قوم خود اپنے حالات بدلتی ہے، اسی کے حالات میں تغیر آتا ہے (الرعد: ۱۱) جنگلی جانوروں کو کیا الزام دیں جب باڑھ خود ہی کھیت کو کھا گئی ہو۔

میں مشرقی پاکستان میں، اب اس کو مسلم بنگال کہیں یا بنگلہ دیش، اس وقت موجود تھا جب پاکستان کی اس پاکستان کی جس کو برصغیر کے مسلمانوں نے لا الٰہ الا اللہ کی تعبیر کے لیے بنایا تھا، آخری صبح سانس لے رہی تھی۔ میرا اس دیس سے تعلق بہت پرانا ہے اور وہاں کے باسیوں سے میرے رشتے بہت گہرے ہیں میں نے اپنی زندگی کے بہترین بندرہ سال وہاں گزارے ہیں۔ جب میں وہاں گیا تو ۲۰ سال کا تھا، جب رخصت ہوا تو ۲۹ سال کا تھا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتائج کے بعد مجھے اس میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ اب اس ملک کا ایک رہنا تقریباً ناممکن ہے لیکن میں شدت سے اس کا قائل بھی تھا کہ اس ملک کو بچانے اور اس کی سالمیت کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ ہمارا فرض تھا اور ادائیگی فرض کا انحصار نتائج پر نہیں ہوتا۔ نتائج کے بارے میں ظن و تخمین کی بنیاد پر فرائض اور ملک کے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگایا جا سکتا اور اس لیے بھی کہ بچانے کی کوشش کے علاوہ اور کوئی بہتر اور ممکن راستہ سامنے نہ تھا۔ پاکستان کو توڑ کر بنگلہ دیش بنانے کی مہم میں شامل ہو جانے اور دھارے کے ساتھ بہنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ یہ ایمان و ضمیر کے خلاف ہوتا اور تدبیری طور پر بھی اس کا کوئی نفع نہ تھا۔ خاموش اور بے تعلق ہو کر گھر بیٹھ جانے کا سوال بھی تحریک اسلامی کے وابستگان کے لیے پیدا نہ ہوتا تھا، اور اس صورت میں بھی جو نقصان ہوتا وہ شاید بچانے کی کوشش میں ناکام ہو جانے کی صورت سے کچھ بہت زیادہ کم نہ ہوتا۔

اگرچہ میرا یہ خیال تھا کہ حالات کو جس نہج پر لے جایا جا رہا ہے اس کے نتیجہ میں بنگلہ دیش ضرور بن کر رہے گا لیکن مجھے اس بات سے اتفاق نہ تھا کہ بنگلہ دیش ہندوستان کی کالونی اور ہندو کی باج گزار ریاست بن کر رہے گا۔ فوجی تربیت کی حد تک بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ فوجی ایکشن کے بعد مارشل لا کے ایک انتہائی ذمہ دار فرد سے پہلی ملاقات میں ہی میں نے یہ کہا تھا کہ آپ ان بنگالیوں کو فوجی تربیت دیں جو اسلام اور خدا کی خاطر پاکستان کی سالمیت کی جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔

دوسری بات میں نے ان سے یہ کہی تھی جو اپنے رفقا سے بھی کیا کرتا تھا کہ آپ سیاسی لیڈروں کو

مجبور نہ کریں کہ وہ پبلک میں آپ کے فرستادہ بن کر نمودار ہوں، اس میں نہ آپ کا فائدہ ہے نہ ان کا۔ ان کو آپ اپنے راستوں سے کام کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں اور جو رضاکار تربیت پائیں ان کو بھی آپ اپنے طور پر تخریب کاروں سے نپٹنے دیں، فوج کا ایک جزو نہ بنا کر رکھ دیں۔ ان دونوں باتوں پر بھی عمل نہ ہو سکا۔

البدر نے بالآخر پاکستانی فوج کا ایک جزو بن کر اور اس کے تحت کام کیا۔ کچھ لوگ پوچھتے ہیں کیا یہ ٹھیک تھا؟ میرا خیال ہے کہ زیادہ صحیح سوال یہ ہے کہ کیا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ تھا؟ فوج کو (بلکہ شاید پورے مغربی پاکستان کو) بنگالیوں پر جو عدم اعتماد تھا۔ اس کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اگر البدر کو یہ پوزیشن قبول نہ ہوتی تو اس کو دفاع پاکستان میں حصہ لینے کا موقع نہ دیا جاتا۔

فوج کے کردار کا ذکر کیے بغیر البدر کے تذکرہ سے گزرنا ممکن نہیں۔ چند بنیادی باتیں کہ دینے میں کیا حرج ہے۔ اول یہ کہ فوج ہماری ہے، ہماری قوم کا ایک حصہ، ایک اہم ادارہ۔ اس کی غلطیاں ہماری اپنی غلطیاں ہیں، جن پر ہم کو شرمسار ہونا چاہیے اور اس کی خوبیاں ہمارے لیے باعث فخر ہیں جن پر ہم کو خوش ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ 'ہم' اور 'وہ' کا معاملہ کوئی محبِ وطن نہیں کر سکتا۔

دوم، وہ اتنی ہی خراب یا اچھی ہے جتنی کہ بحیثیت مجموعی پوری قوم ہے۔ وہ قوم سے زیادہ اچھی نہیں ہو سکتی الّا یہ کہ اس کو اچھا بنانے کا اہتمام کیا گیا ہو، اور نہ خراب ہو سکتی ہے الّا یہ کہ خراب کرنے کا اہتمام کیا گیا ہو۔

اس اہم حقیقت کو بدقسمتی سے اکثر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ ناقدین، فوج کو ساری قوم سے بدتر سمجھتے ہیں اور اس کی غلطیوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ گویا باقی قوم ان سے بری ہے۔ دوسری جانب فوج خود کو ساری قوم سے بہتر اور ارفع تصور کرتی ہے کہ گویا حُبُ الوطنی، دانائی اور کردار پر اس کا اجارہ ہے۔

سوم، البعض باتیں ضرور ایسی ہیں جو پوری فوج کے مزاج اور کردار میں داخل ہیں، اچھی بھی اور بری بھی۔ لیکن فوج کوئی ایسی یک جنس دیک رنگ (homogeneous) چیز نہیں کہ سب یکساں ہوں۔ فوج کی بھاری اکثریت اسی طرح اچھے افراد پر مشتمل ہے جس طرح پوری قوم یا قوم کا کوئی دوسرا طبقہ۔ چند افراد کے کردار کو پوری فوج کے کھاتہ میں ڈالنا منصفانہ طرزِ عمل نہیں۔ فوج اپنے ڈسپلن کی وجہ سے

ہر غلط اور صحیح میں اپنے افسروں کی اطاعت کرتی ہے۔ اس لیے جب افسر کوئی روش اختیار کرتے ہیں تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ استعارہ کے طور پر کہا جائے کہ فوج کی روش یہ تھی، مگر اس سے کبھی ساری فوج مقصود نہیں ہوتی، اور جب افعال اتنے خراب ہوں کہ ان کا صدور بہت تھوڑی تعداد سے بھی ہو تو کل تعداد کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جاتا ہے۔ خصوصاً جب معاملہ فوج جیسے منظم اور تربیت یافتہ گروہ کا ہو۔

چہارم، مشرقی پاکستان میں اپنے قیام اور بعد میں دو سال جنگی قیدی کیمپ میں فوجیوں کے ساتھ بسر کرنے کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری فوج کے بڑے حصہ نے پوری جاں نثاری اور سرفروشی سے پاکستان کے دفاع کے لیے جنگ لڑی، بڑی قربانیاں دیں، بہت سے شہید ہوئے۔ اکثر اچھے کردار کے مالک تھے الا یہ کہ چند رجحانات و میلانات ان کو گھونٹ کر پلائے گئے تھے اور ان کے اظہار کے لیے انہیں معذور سمجھا جاتا چاہیے۔

اس لمبی تمہید کے بعد اتنی بات مختصراً کہہ لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ مشرقی پاکستان میں جو غلطیاں ہوئیں وہ معمولی نہ تھیں اور نہ ان کو اکا دکا واقعہ کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ نہ ان سب کو کلیتہً مغربی ذرائع ابلاغ اور ہندو پروپیگنڈے کی اختراع قرار دے کر ان پر پردہ ڈالنا صحیح ہے۔ بہت سے واقعات ایسے عینی گواہوں سے سُنے ہیں جو خود فوج میں تھے۔ اپنا مشاہدہ اور عام و غیر جانبدار بنگالیوں کی رپورٹیں اور تاثرات الگ ہیں۔ مثلاً ایک کے بدلے میں سو بے گناہ شہریوں کو لائن میں کھڑا کر کے شوٹ کر دینا یا عورتوں کی بے حرمتی کرنا، یا بلا دریغ مال و اسباب اُٹھا لے جانا، ایسے واقعات دو چار بھی ہوں بلکہ ایک بھی ہو تو ایک منظم تربیت یافتہ فوج کے لیے جس کو عام شہریوں کی نسبت اپنے کردار کی بلندی کا زعم بھی ہے، مجموعی طور پر باعث شرم اور انفرادی سطح پر ناقابل معافی ہے۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رجمنٹ کے جو افسر اور جوان انتہائی گھناؤنے مظالم کے مرتکب ہوئے اور جو عام انسانی اخلاق سے بھی محروم ثابت ہوئے، وہ بھی پاک فوج کے نظام تربیت سے ہی نکلے ہوئے افراد تھے۔ اس سب سے اُس بڑی تعداد کے دامن پر کوئی حرف نہیں آتا جس نے دیانت و اخلاق اور سرفروشی کی بہترین مثالیں پیش کیں لیکن فوج کو بحیثیت مجموعی اپنا دامن پاک کرنے کی ضرورت جب بھی تھی اور اب بھی ہے۔ اور اصل ستم یہ ہے کہ ہماری اسلامی فوج کی روایات میں کافر امریکن فوج کی طرح ایک "مائی لائی"

(شامل) بھی نہ ہو سکا۔ شاہ جمال چودھریؒ کی شہادت کا واقعہ تو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے لے کر نیچے تک سب کے لیے معروف تھا لیکن کوئی کارروائی کرنے سے معذوری کا اظہار کیا گیا۔ اس لیے کہ یہ فوج کی 'ناک' اور 'مورل' کے خلاف ہوتا۔

اس قسم کی غلطیوں کے لیے تعمیل حکم کا عذر بھی قبول نہیں۔ قرآن تو ۱۴۰۰ سال پہلے ہی معاملہ صاف کر چکا ہے کہ کوئی مستضعف کسی مستکبر اور کوئی تابع کسی متبوع کے سر الزام رکھ کر بچ نہیں سکے گا۔ بس یہ ہے کہ جو کچھ ہوا اس کے لیے بہت سے بے چاروں کا گناہ شاید اس لیے ہلکا سمجھا جائے کہ ان کو یہی سمجھایا گیا تھا۔ میرے کان میں مغربی پاکستان سے نو آمدہ سپاہیوں کا یہ جملہ اکثر گونجتا رہا ہے کہ وہاں سب غیر مسلم ہیں ——— اور بعض کے لیے یہ بات ایک باعث حیرت وانکشاف تھی کہ یہاں 'کافر' نماز اور قرآن پڑھتے ہیں۔

جمعیت کے نوجوانوں کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ ایک الگ داستان ہے۔ کم اسلحہ دینا یا چند مقامات پر پُر خطر مہمات میں آگے کر دینا جیسے واقعات اس وقت بھی سُنتے تھے۔ ۱۶ تاریخ کو سرینڈر کے بعد یہ کہنا کہ اب جو چاہو کرو' یہ تیاس اس وقت بھی تھا اور اب یہ معلوم کر کے کوئی حیرت نہ ہوئی کہ خود البدر کے کورس نے عالم تذبذب میں مشرقی کمانڈ کی نماز کو زیادہ اہم سمجھا اور ایک پستول اور سورۃ یاسین کے نسخہ کے ساتھ ۹ افراد کو بھارتی رنگروٹ کے خلاف مہم پر روانہ کر دیا۔ اگر یہ جانیں ضائع ہو جاتیں تو کیا مشرقی کمانڈ یا احساس جرم خدا کے ہاں کافی عذر ہو سکتا تھا۔ یہ مثال میں نے اس لیے پیش کی کہ یہ رویہ تنقید کرنے پر وہ بھی اپنے کو مجبور پاتے تھے جو شاید ان کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے۔

۶

المیہ مشرقی پاکستان کے اسباب کیا تھے اور کس سبب کا کیا مقام تھا، فوج کا کردار کیا تھا اس کے ساتھ کتنا تعاون مناسب تھا۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب میں دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن جمعیت کے نوجوانوں کے لیے تو اسباب سے قطع نظر سب سے بڑی حقیقت یہ تھی کہ پاکستان ٹوٹ رہا ہے جو اسلام کا گھر ہے۔ نشۂ شہادت سے سرشار وجود کو تحقیق اسباب سے کیا بحث[1] چنانچہ انھوں نے سر کی بازی لگا دی اور وہ اس بازی میں کامران و بامراد ہو گئے ——— یہ نوجوان اسؒ کے پیرو تھے جو آج تک پاکستان کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔

---

[1] مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

"جو اللہ کی راہ میں نکلے، ستائے گئے، لڑے اور مارے گئے۔ ان کے بارے میں کسی شک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، وہ یقیناً اپنے رب کے پاس سے رزق پا رہے ہیں جو کچھ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں۔ ان کے جو ساتھی پیچھے رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے، ان کے بارے میں بھی خوش اور مطمئن ہیں کہ ان کے ساتھ اللہ کا وعدہ پورا ہو رہا ہے اور وہ خوف و حزن سے پاک ہیں۔ وہ شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

(آل عمران، ۱۶۹۔۱۷۱)

یقیناً وہ اللہ کے پاس بڑا درجہ پا چکے ہیں، کامیاب ہیں، اپنے رب کی طرف سے رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتیں پا چکے ہیں کہ جہاں ان کے لیے پائیدار عیش کا سامان ہے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ (التوبہ، ۲۰۔۲۲)

اب رہ گئے ہم۔ تو اس سے بڑھ کر اور ہم کس چیز کی آرزو کر سکتے ہیں کہ ہم اس خبر پر یقین کریں کہ جو اللہ تعالیٰ نے ہم تک پہنچائی ہے، اس زندگی کو پہچانیں کہ جس کے حصول کے لیے ہاتھ کی کھجوریں پھینک دیں، نیزوں پر کھڑے ہو ہو کر بڑے بنیں۔ وقت، جان اور مال اس کی راہ میں لٹا کر کہ جس نے یہ بخشا ہے، نفع حاصل کرنے کی لذت سے آشنا ہوں اور ہم اللہ کی راہ میں اپنی جان کھپا دیں کہ ہماری نجات و کامیابی کا راستہ یہی ہے اور باقی ماندہ پاکستان کی سلامتی کا مدار بھی اسی پر ہے۔

ع باقی ہے ابھی رنگ میرے خون جگر میں

إِنَّهُ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف، ۸۷)

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔

تشکر

ہم ربِّ کریم کے شکرگزار ہیں کہ اس نے ہماری تمام تر کمزوریوں کے باوجود اس موضوع پر یہ کاوش پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ درود و سلام محسنِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور رحمتیں بخششیں ان کے بہترین اُمتیوں پر جن میں سے ایک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ ہیں — کہ جن کے فیضانِ نظر سے یہ قابلِ رشک قافلۂ سخت جاں تیار ہوا۔

— اس مرحلہ پر وہ بزرگ اور احباب یاد آ رہے ہیں جنہوں نے اس ضمن میں خصوصی دعاؤں کا سہارا — پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم، مولانا معین الدین خٹک مرحوم، پروفیسر فروغ احمد صاحب، خرم جاہ مراد صاحب، پروفیسر خورشید احمد صاحب، استاذ خلیل احمد حامدی صاحب، سید منور حسن صاحب، آباد شاہ پوری صاحب، شیخ محبوب علی صاحب، تسنیم عالم منظر مرحوم، پروفیسر سلیم سجاد صاحب، ڈاکٹر [illegible] صاحب، مستری چوہدری صاحب اور والد محترم محمد زبیر صاحب کی دعائیں اس تمہید کار میں خورشید امید بنی رہیں۔

— علاوہ ازیں ظفر جمال بلوچ صاحب، عبدالملک مجاہد صاحب، لیاقت بلوچ صاحب، شبیر احمد خان، اعجاز چوہدری صاحب، راشد نسیم صاحب اور جناب سید حسین تجمل، ان تیغِ جفا سے کٹنے والے شہیدوں کی حیات افروز روداد مرتب کرنے کی برابر یاد دہانی کراتے رہے۔

— جبکہ تحقیق و جستجو کے لیے محمد اسلم سلیمی صاحب، سید زاہد حسین بخاری صاحب، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب اور ظفر بیگ صاحب سے مشاورت کام آئی۔۔۔ جبکہ دستاویزات کی اردو میں منتقلی کے لیے نظام الدین صاحب (انجینئر) اور شمس الرحمان صاحب کی اردو فہمی سے استفادہ کیا۔

دوسرے ایڈیشن میں پروف کی درستی کے ضمن میں عبدالوحید سلیمانی صاحب، نجیب طارق ریزنی، برادر خورشید عمر برلاس نے جس محنت اور افتخار مسعود نے جتنی محبت کے ساتھ تعاون کیا، اس پر ان کا ممنون ہوں۔

— اور کتاب کی طباعت و پیش کش کا حتمی مرحلہ احسن اختر ناز، کلیم منصور، ڈاکٹر نذیر اکرام اور افضل جاوید کے کسی نہ کسی درجے میں تعاون سے طے ہوا۔

مصنف ان تمام بزرگوں اور دوستوں کی محبت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب پیرایۂ بیان نہیں پاتا، اللہ تعالیٰ انہیں فوز و فلاح سے نوازے (آمین)

"تو پھر وفادار کون ہے؟"

میجر ریاض حسین ملک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

البدر کے بارے میں کچھ کہنے سے پیشتر میں مختصراً اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں ۔ تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ یہ جو میرے Views (خیالات) ہیں ، یہ کسی خاص تنظیم سے متعلق نہ ہونے کے باوجود ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ ایک Impartial رائے ہی زیادہ معتبر گواہی ہوتی ہے ۔

میرا بچپن ایسے تعلیمی اداروں میں گزرا جن میں دینی تعلیم کی طرف کوئی زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی ۔ اس کے بعد کچھ ایسے اداروں میں رہا ، جہاں غالب تربیت فوجی انداز میں دی جاتی تھی ۔ اور اُن دنوں مولانا مودودی کی تصانیف پر ہمارے ان اداروں میں خاص طور سے پابندی تھی ۔ اس حوالے سے پاکستان بھر میں ایک عجیب قسم کا پروپیگنڈا تھا کہ ''مولانا اور ان کے ساتھی ملک کے وفادار نہیں ہیں''۔ انھی خیالات کے ساتھ میں مختلف درس گاہوں میں پروان چڑھا ، جوان ہوا ، اور پھر پاک فوج میں آگیا ۔

خاصا عرصہ گزر گیا ۔ پیشہ ورانہ ذمہ داریوں اور کلب کی رنگینیوں میں وقت گزرتا چلا گیا ۔ نہ کبھی مولانا کی تصانیف کو پڑھنے کی فرصت ملی اور نہ اپنے اس یک طرفہ قائم شدہ نظریئے کو پرکھنے کا موقع ملا ۔ کہ کیا واقعی ان میں کوئی ایسی بات ہے جو ملک کے لیے نقصان دہ ہے ؟۔

مگر میں مولانا کی معروف معنوں میں اصطلاحی تصانیف کو تو نہ پڑھ سکا ، لیکن پھر خدا نے مجھے ایک موقع عطا فرمایا ، تب میں نے مولانا مودودی کی حقیقی تصانیف کو نہ صرف دیکھا بلکہ عملاً پڑھا ۔ یعنی ان عظیم لوگوں کو دیکھا کہ جن کے دلوں میں مولانا مودودی کے اسلامی انقلابی لٹریچر نے ایک ایسا جذبہ بھر دیا تھا ، جس کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے اپنی ساری گذشتہ زندگی گنوادی ہے ۔

---

* کتاب کی تعارفی تقریب میں میجر ریاض حسین ملک کا خطاب ۔

مجھے مولانا کی ان تصانیف کو دیکھنے کا موقع مشرقی پاکستان میں ملا ۔ میں آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ بتاتا ہوں جو مشرقی پاکستان ۱۹۷۱ء میں انہی جنگی مہمات (Operations) کے دوران میں میرے سامنے وقوع پذیر ہوا ۔ وہاں کچھ عجیب سے دشمنوں سے پالا پڑا تھا ۔ جب اپنے ہی کچھ لوگ دشمن بن کر دشمن کے ہاتھوں میں کھیلنا شروع ہو جائیں ، تو پھر ان کے بارے میں ٹھیک طرح سے اطلاع کا ملنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے ۔ میں ان حالات میں ایک دریا کے کنارے پاک فوج کی Vanguard Company کے کمانڈر کی حیثیت سے پہنچا اور ابھی اس خیال میں تھا کہ کہیں سے کشتیاں اکٹھی کر کے دریا کے پار پہنچنے کی کوشش کی جائے ۔ یہ صبح کا وقت تھا ——— دیکھا کہ ایک آدمی دوسری جانب سے دریا میں تیرتا ہوا ہماری جانب آرہا ہے ۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت دریا میں طغیانی تھی ، اچھا خاصا پانی تھا ۔ جب وہ صاحب ہمارے قریب تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ وہ خاصے عمر رسیدہ ہیں اور بنگالی بولنے والے ہیں ۔ پہلے تو میں بڑا حیران ہوا کہ اس عمر میں ان میں اتنی قوت کہاں سے آگئی کہ وہ اس دریا کی شوریدہ سر لہروں کو چیرتے ہوئے اس کنارے پہنچ گئے ۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ کوئی جسمانی قوت نہ تھی بلکہ یہ تو قوتِ ایمانی تھی ۔ خیر! وہ صاحب آئے اور کہا:

"آپ اس دریا کے پار جانا چاہتے ہیں ۔ مگر ذہن میں رکھیئے ! اس سامنے والے کنارے پر جو جنگل ہے ، اس میں ایسٹ بنگال رائفلز کے باغیوں اور بھارتی فوج کے تعاون سے ملک دشمن عناصر نے مورچے قائم کیے ہوئے ہیں ۔ میں کل رات سے اس طرف آنے کی کوشش میں تھا ، لیکن ان کی طرف سے خاصی ناکہ بندی تھی ، جس کے باعث میں آنے میں کامیاب نہ ہو سکا ۔ یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اُس جانب سے اُن کی یا اس جانب سے آپ کی گولی کا نشانہ بھی بن سکتا ہوں ۔ مگر پھر ایمان نے اکسایا اور ارادہ کیا کہ شاید پار پہنچ جاؤں ، وطن کی کچھ خدمت کر جاؤں اور بڑی جدوجہد کے بعد الحمدللہ اس کنارے آ پہنچا ہوں ۔ مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ آپ اُس طرف جائیں تو بڑی احتیاط سے جائیں اور اس جنگل میں تخریب کاروں کی کمین گاہ کو بھی نگاہ میں رکھیں" ۔

یہ کہہ کر وہ صاحب چلے گئے ۔ ہمارے لیے فوجی نقطۂ نگاہ سے یہ خبر بہت اہم تھی ۔

اس کے بعد جو مناسب کارروائی تھی وہ ہم نے کی ، اور دشمن اس جنگل سے بُری طرح نقصان اٹھا کر بھاگ نکلا ——— بعد میں مجھے اپنے اُس محسن کے بارے میں ایک دوسرے ذریعے سے معلوم ہوا کہ وہ صاحب جماعتِ اسلامی کے رکن تھے ۔

۔۔۔۔۔۔ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے احساس ہوا ، اگر یہ وہ ہستیاں ہیں ، جن کے خلاف میں بچپن سے لے کر اب تک پراپیگنڈہ سنتا رہا ہوں اور ایسے گروہ کا ایک شخص پاکستان کی بقا کے لیے ، ایسی طغیانی کے عالم میں دریا میں کود پڑتا ہے اور اپنے ملک سے عہدِ وفا نبھانے کے لیے موت کے خوف سے بے نیاز ہو جاتا ہے ، اگر یہ فرد اس گروہ میں سے ہے جسے "غدار" کہا جاتا ہے :

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے ، یہاں وفادار کون ہے ؟۔
گویا یہ پہلی چنگاری تھی جو اس روز میرے سینے میں روشن ہوئی ۔

آگے چلیے ——————

مشرقی پاکستان کا ایک چھوٹا سا سرحدی گاؤں غالباً باوت کلاں ہے ، ہم وہاں پہنچے ۔ گاؤں میں بہت سے لوگ اکٹھے ہوئے اور محبت سے ملے ۔ ان میں ایک عورت اپنے معصوم بچے کو لے کر میری طرف بڑھی ۔ اور اپنے اس بچے کو میری بانہوں میں ڈال کر کہنے لگی ! "صاحب 'وعدہ کریں کہ جب یہ بڑا ہو گا تو آپ اس کو فوج میں لے لیں گے" ۔

میں حیران تھا کہ اس بات کا کیا جواب دوں ۔ ایک بزرگ نے وہ بچہ مجھ سے لیا اور واپس ان خاتون کو دیتے ہوئے احترام سے کہا : 'بیٹی ! آپ گھر جائیں' ——— مجھے بتایا گیا "کہ اس خاتون کے والدِ محترم جماعت اسلامی کے رکن تھے ۔ اس کا خاوند بھی جماعت اسلامی سے متعلق تھا اور بھائی اسلامی چھاترو شنگھو (اسلامی جمعیتِ طلبہ) کا کارکن تھا ۔ یہ سب مکتی باہنی کے ہاتھوں شہید ہو چکے ہیں ۔ اب اس کی کل کائنات یہ بچہ ہے ۔"

میں یہ سن کر کانپ اٹھا ۔ میں نے اس وقت بھی یہی سوچا اور آج بھی یہ سوچتا ہوں کہ کاش ! اس ملک کی ساری مائیں ایسی ہو جائیں ۔ سب مائیں اپنے بچوں کو اس لیے

پروان چڑھائیں کہ وہ اپنے دین اور ملتِ اسلامیہ اور ملکِ عزیز کی بقا و سلامتی پر نثار ہونے کے لیے بڑھے ہوں ۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے ۔ اس اثنا میں میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سالمیتِ پاکستان کی اس کٹھن جد وجہد کا یہ کام صرف اور صرف پاک فوج کے بس میں نہیں ہے ۔ ان دنوں ہمیں آرمی ہیڈ کوارٹر سے ہدایات ملی تھیں کہ کسی بنگالی کے پاس ہتھیار نہ چھوڑیں ، کیونکہ موجودہ صورتِ حال میں کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔ جب کہ انہی دنوں اسلامی جمعیتِ طلبہ مشرقی پاکستان کے بنگالی بولنے والے طالب علم میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ "وہ پاکستان کے دفاع کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں"۔

اس سے چند روز پہلے ایک اور واقعہ مجھے پیش آچکا تھا :۔
ایک لڑکا آیا اور کہنے لگا: "آپ میرے بڑے بھائی کو گرفتار کر لیں"۔
میں نے کہا: "کیوں؟"
کہا "وہ بھارت جاتا ہے اور پاک فوج کی نقل و حرکت کی خبر دشمن کو دیتا ہے"۔
میں نے کہا "آپ کو علم ہے کہ یہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس پر آپ کے بھائی کو کیا سزا ہو سکتی ہے" ؟
کہنے لگا "جی ہاں! مجھے معلوم ہے"
میں نے کہا: "یہ سب جانتے ہوئے بھی یہ کچھ کہہ رہے ہو" ۔
کہنے لگا "جی ہاں! ایک ایسے بھائی کا مر جانا ہی بہتر ہے جو کروڑوں ہم وطن بھائیوں کے ساتھ غداری کرے"۔
پڑھنے سننے والو! یہ لڑکا بھی اسلامی جمعیتِ طلبہ کا کارکن تھا ۔

میں نے سوچا کہ جب اکیلے یہ فوج کے بس میں نہیں کہ ملک کا دفاع کرے ، تو کیوں نہ ایسے عظیم نوجوانوں کو منظم کیا جائے تاکہ یہ ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھیں ۔ لیکن میری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کو ہتھیار دینے کی ممانعت کا آرڈر تھا ۔ میرے پاس دشمن کے چھوڑے ہوئے اتنے ہتھیار اکٹھے ہو چکے تھے کہ ایک دو بٹالین آسانی سے کھڑی کر سکتا تھا ۔ لیکن مسئلہ اجازت کا تھا ——— میں نے سوچا کہ اس نیکی کے کام کے لیے موجودہ غیر معمولی صورتِ حال میں کیا کروں ؟ پھر خیال آیا کوئی بھی کام

جو اس ملک کی بہتری اور حفاظت کے لیے ضروری ہے ۔ اور آج حالات ایسے ہیں ، جو کسی رسمی اجازت کے محتاج نہیں رہتے ۔ آخر کیوں نہ تھوڑا سا اجتہاد کر ہی لوں ۔ پھر جب میں نے اپنے کرنل صاحب کے سامنے ان خیالات کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگے : "بھائی کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبو" ۔

میں نے کہا: "ان شاء اللہ آپ پر حرف نہیں آئے گا کیونکہ جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کا اگر کچھ بھی بُرا اثر ہوا تو کھلے دل کے ساتھ میں اس کی ذمہ داری قبول کر لوں گا"۔

اس طرح "البدر" کا قیام عمل میں آیا ۔

شیرپور (ضلع مومن شاہی) میں سب سے پہلی "البدر" بٹالین قائم ہوئی ۔ وہاں جب میں نے اسلامی جمعیتِ طلبہ کے لڑکوں کو اکٹھا کیا، تو ان میں ایک لڑکا خاصا کمزور ، دبلا پتلا اور مختصر سے قد کاٹھ کا تھا ۔ وہ بھی اس صف میں کھڑا تھا ۔ میں معائنہ کر رہا تھا ۔ اور جو لڑکے بہ ظاہر زیادہ کمزور نظر آتے میں ان کو صف میں سے پیچھے ہٹنے کے لیے کہتا ۔ اس لڑکے نے دیکھ لیا کہ یہ کمزور کمزور لڑکوں کو پیچھے نکال رہا ہے ـــــ جب اس کی باری آئی تو میں نے اسے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا ، لیکن وہ جم کے کھڑا ہو گیا ۔

میں نے کہا: "بیٹا! آپ چھوٹے ہیں" ۔

مگر وہ ایڑیاں اٹھا کر کھڑا ہو گیا اور جواب میں کہنے لگا: "ہُن تو بڑا ہونے کا چھے" (یعنی اب تو بڑا ہو گیا ہوں) ۔

یہ بات مجھے تاریخ میں بہت پیچھے لے گئی ۔ میں آبدیدہ ہو گیا اور اسے گلے سے لگا کر کہا: "بیٹے ! میں نے غلط کہا ہے ۔ تم کبھی چھوٹے نہیں تھے ۔ کبھی کمزور نہیں تھے ـــــ ہمیشہ سے مضبوط ہو اور ہمیشہ مضبوط رہو گے ۔ کیونکہ تم ایسی قوت رکھتے ہو جو چٹانوں میں بھی نہ ہوگی" ۔

گذارش یہ ہے کہ اپنے تعارف کے ضمن میں ، میں نے یہ واقعات اس لیے بیان کیے ہیں تاکہ آپ کو بتا سکوں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ صرف اور صرف اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ: "البدر" ایک ایسی مالا ہے جس کا ہر موتی اس قدر چمکدار ہے کہ انہوں نے میری زندگی

سنوار دی ۔ مجھے اپنی بقیہ زندگی کے لیے ایک لائحہ عمل دیا ۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے تین بیٹوں کو سب سے پہلے چکھنے کو جو چیز دی ہے وہ آبِ زم زم ہے ، سب سے پہلی چیز جو ان کے دائیں ہاتھ میں تھمائی ہے وہ قرآن مجید ہے ، اور سب سے پہلی چیز جو ان کے بائیں ہاتھ میں دی ہے وہ خنجر ہے ۔ اور سب سے پہلی دعا جو ان کے لیے کی ہے ، وہ یہ ہے کہ یا رب العالمین! میری کوشش یہی ہو کہ ان کو بطور مسلمان پروان چڑھاؤں ۔ یا رب العالمین ، تو ان کو توفیق عطا کر کہ یہ قرآن سے رہنمائی حاصل کر سکیں ۔ اور اس خنجر سے ملتِ اسلامیہ اور مظلوموں کے لیے جدوجہد کر سکیں ۔ مالک ! میں ان کو مومن دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ اگر کسی وقت یہ تجھے اور تیرے دین کو درکار ہوں تو میں تیرے ساتھ یہ عہد کرتا ہوں کہ مسکرا کر یہ تینوں اسی وقت تجھے لوٹا دوں گا۔

"البدر" کی تشکیل ، ان کی استقامت اور قربانیوں نے میری آنکھیں کھول دی تھیں ۔ اور مشرقی پاکستان کے میدان جنگ میں شہادت کے علاوہ میری زندگی کی اب بڑی خواہش یہ تھی کہ جب بھی مغربی پاکستان واپس لوٹوں تو سب سے پہلے اس ہستی کو دیکھوں کہ جس نے مادہ پرستی اور نفرتوں اور مذہبی و سیاسی عصبیتوں اور فتنوں کے ماحول میں کمزور ، بوڑھے اور نوخیز جسموں میں ایسی روح پھونک دی ہے کہ وہ قابلِ رشک مسلمان اور مثالی پاکستانی بن گئے ۔۔

اللہ تعالیٰ نے میری یہ خواہش پوری کر دی ۔

میں شہادت کی موت سے تو محروم رہا البتہ جب میں زخمی ہو کر نومبر ۱۹۷۱ء کے آخر میں مشرقی پاکستان سے واپس آیا ۔ ملٹری کے مختلف ہسپتالوں میں زیر علاج رہا ۔ اور پھر جونہی مجھے ہسپتال سے چھٹی ملی ، تو گھر جانے کے بجائے ـــــ میرا سب سے پہلا پڑاؤ اچھرہ (لاہور) میں تھا ، سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ہاں ۔

حضرات !

آج اس کتاب "البدر" کے بارے میں مختصراً میں یہی عرض کروں گا کہ میرے ذہن میں اکثر یہ سوال اٹھتا تھا ، لازوال قربانیوں کی یہ عظیم داستان کہ جس نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یادیں تازہ کر دی ہیں ، کیا یہ سب کی سب وقت کے ساتھ ساتھ دھندلی ہو جائیں گی ؟ کیا ہماری آئندہ آنے والی نسلیں ان کے بارے میں نہیں جان سکیں گے ؟

تو مجھے یہ جان کر اتنی خوشی کہ اس کا شائبہ اظہار بھی نہ کر سکوں ۔ جب یہ معلوم ہوا کہ سلیم منصور خالد ایک کتاب میں تاریخ کے اس عظیم پہلو کو قلم بند کر رہے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہو سکیں ۔ اب سے دس سال پہلے سلیم منصور میرے پاس کوہاٹ چھاؤنی تشریف لائے ۔ خاصی طویل بات چیت ہوئی ۔ پھر انہوں نے ان حقائق کو اکٹھا کرنے کے لیے جتنی محنت کی ، اللہ ان کو اس کا اجر دے ۔ یہ کام بے شک و شبہ عام آدمی کے بس میں نہیں تھا ۔ پھر جس خوبصورتی سے ان حقائق کو پیش کیا ہے وہ کسی تعریف کے محتاج نہیں ۔ ایک ایک موتی کے بارے میں انہوں نے اس خوبصورت انداز میں لکھا ہے کہ پڑھنے والے کو نہ صرف رشک آتا ہے بلکہ ایمان تازہ ہو جاتا ہے ۔ مختصراً میں یہی کہوں گا کہ یہ ایک ایسی پیاری کتاب ہے اور ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جو پاکستان کے ہر نوجوان کے لیے پڑھنا ضروری ہے ۔

وما علینا الا البلاغ

سیاسی تقسیم در تقسیم

توضیحات

صفحہ ۰۰ جمعیت طلبہ عربیہ کے ضمن میں مشرقی پاکستان میں دینی مدارس عالیہ کے تعلیمی درجات اور اسناد کی تقسیم اس طرح تھی (داخل - عالم - فاضل - کامل)

(۱) "داخل" کی سند کے حصول کے لیے آٹھ سال تک تعلیم حاصل کی جاتی۔
(۲) "داخل" کے چار سال بعد مزید پڑھنے پر "عالم" کی سند ملتی۔
(۳) "عالم" کا کورس مکمل ہونے کے بعد دو سال مزید پڑھنے پر فاضل کی ڈگری ملتی۔
(۴) جبکہ "کامل" کی اعلیٰ ڈگری "فاضل" کے بعد مزید دو سال تعلیم حاصل کرنے پر ملتی۔

وہاں کے دینی مدارس کا نظام تعلیم مغربی پاکستان کے دینی مدارس سے اس حوالے سے منفرد تھا کہ وہاں انگریزی کی تعلیم بھی ساتھ دی جاتی اور مدارس میں یہ اہتمام بھی تھا کہ طلبہ میٹرک، ایف اے، بی اے کے امتحان پاس کر سکیں۔

صفحہ ۰۰ پر مندرج البدر کا تنظیمی ڈھانچہ ڈھاکہ کے لیے تھا، جبکہ دوسرے مقامات اور خصوصاً اضلاع میں خصوصی صورت حال کے پیش نظر تنظیمی تقسیم کار اس طرح تھی:

جبکہ تقسیم کار اس طرح تھی:

- بٹالین (بٹالین کمانڈر، بٹالین سیکنڈ ان کمانڈ، بٹالین سارجنٹ، کلرک)
- کمپنی (کمپنی کمانڈر، کمپنی سیکنڈ ان کمانڈ، کمپنی سارجنٹ، کلرک)
- پلاٹون (پلاٹون کمانڈر، پلاٹون سیکنڈ ان کمانڈ، سارجنٹ)

گروپ (۱۰ - البدر کیڈٹ)

ڈھاکہ : سات گنبدوں والی مسجد (نیچے) مسجد بیت المکرم
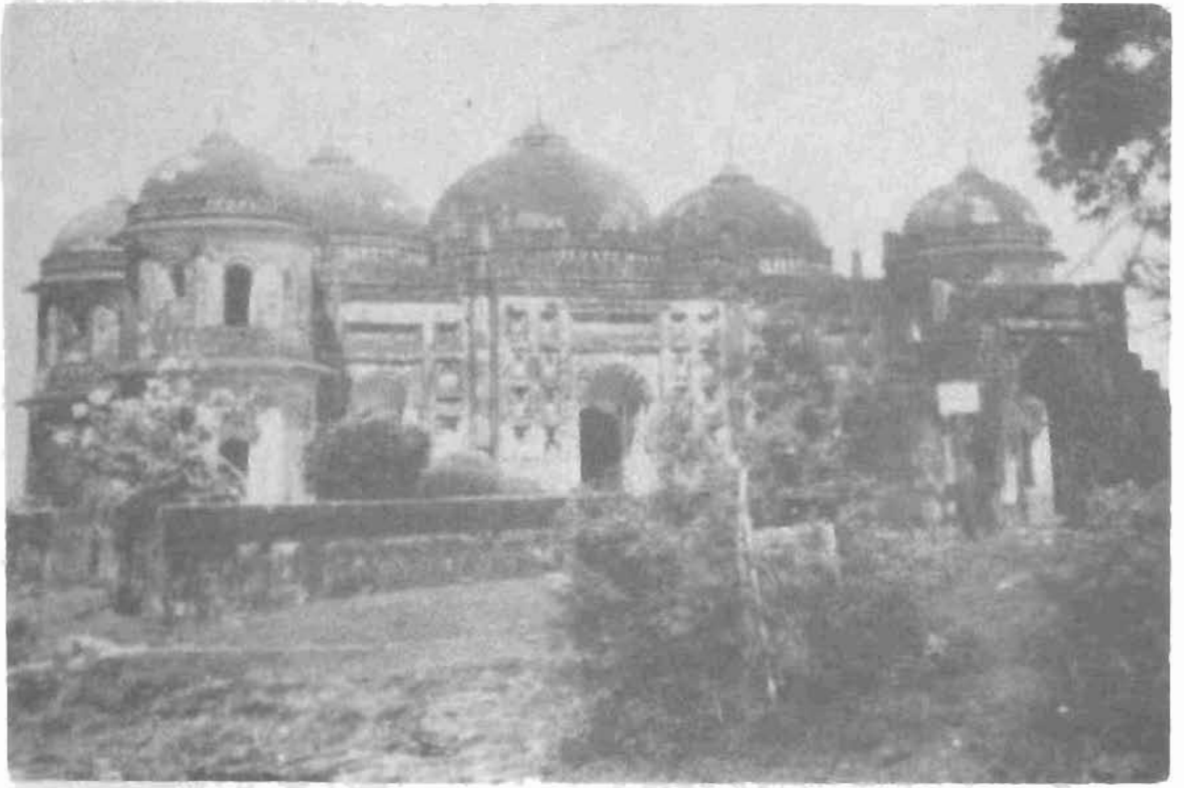
اسلامی جمعیت طلبہ ڈھاکہ: (اوپر) ایک مظاہرہ۔ (نیچے) بھارتی مداخلت کے خلاف جمعیت کا ایک جلوس (اپریل ۱۹۷۱)

عبدالمالک زخمی ہو کر گرے پڑے ہیں اور قاتل صاف نظر آ رہے ہیں۔

7.92 MMG
JESSORE
GUN MACHINE

شہید محمد عبدالمالک

شہید مصطفےٰ شوکت عمران

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء: غروبِ آفتاب کا منظر، ایک اداس شام
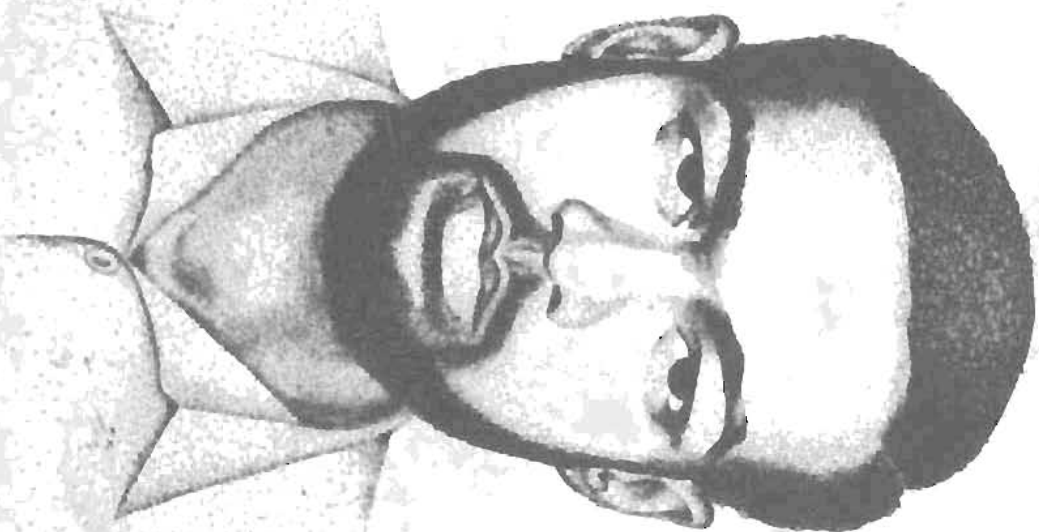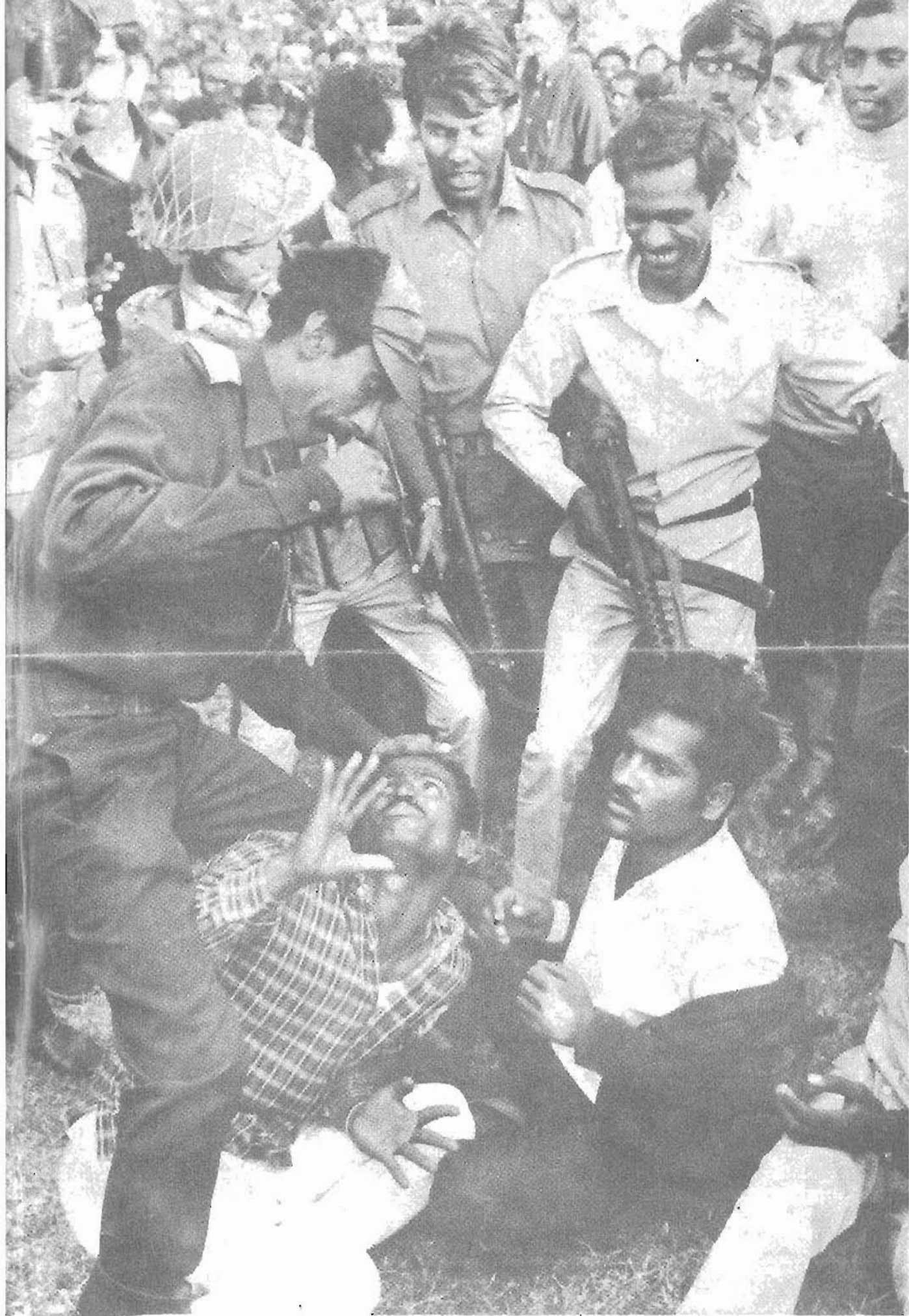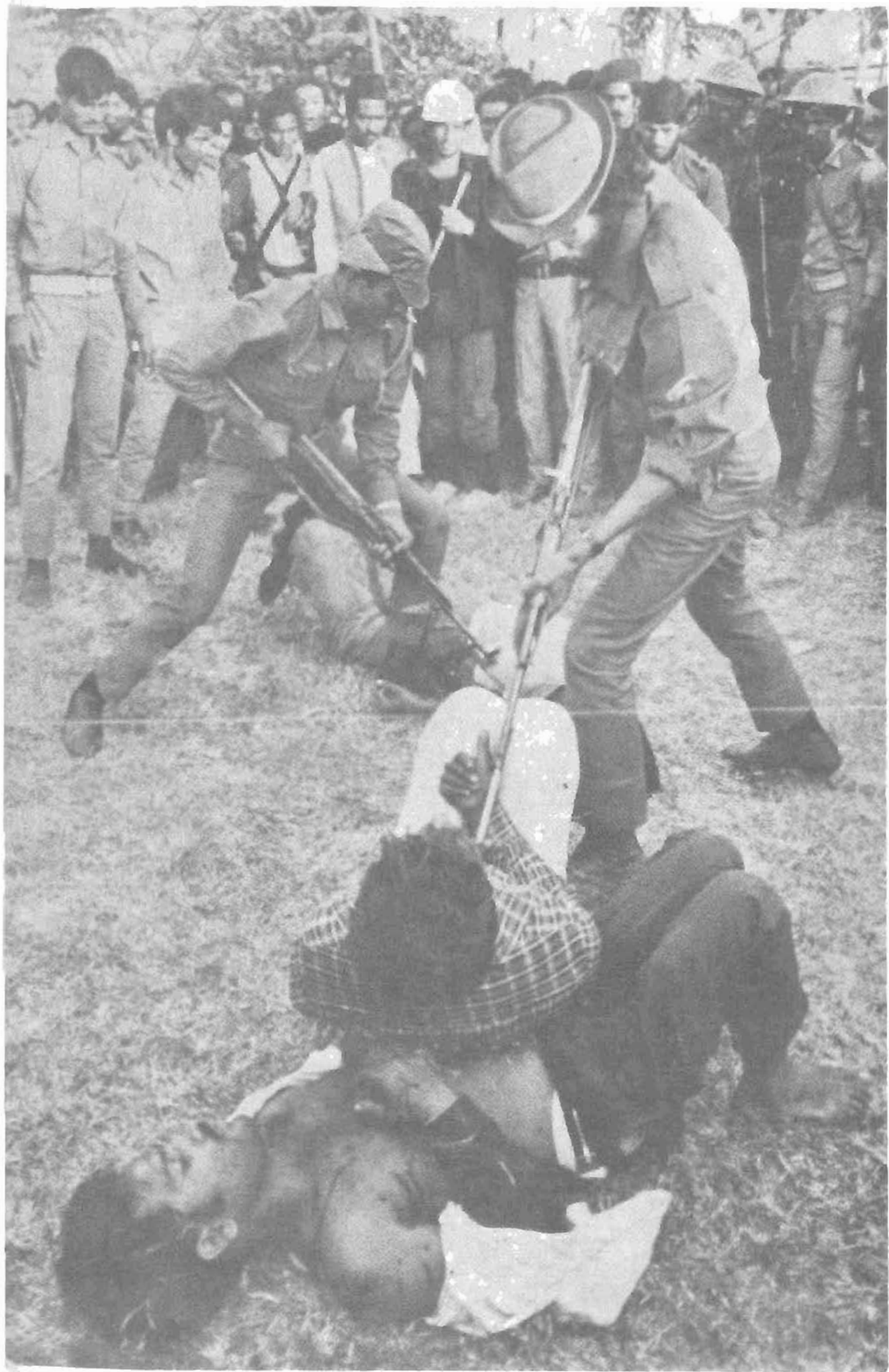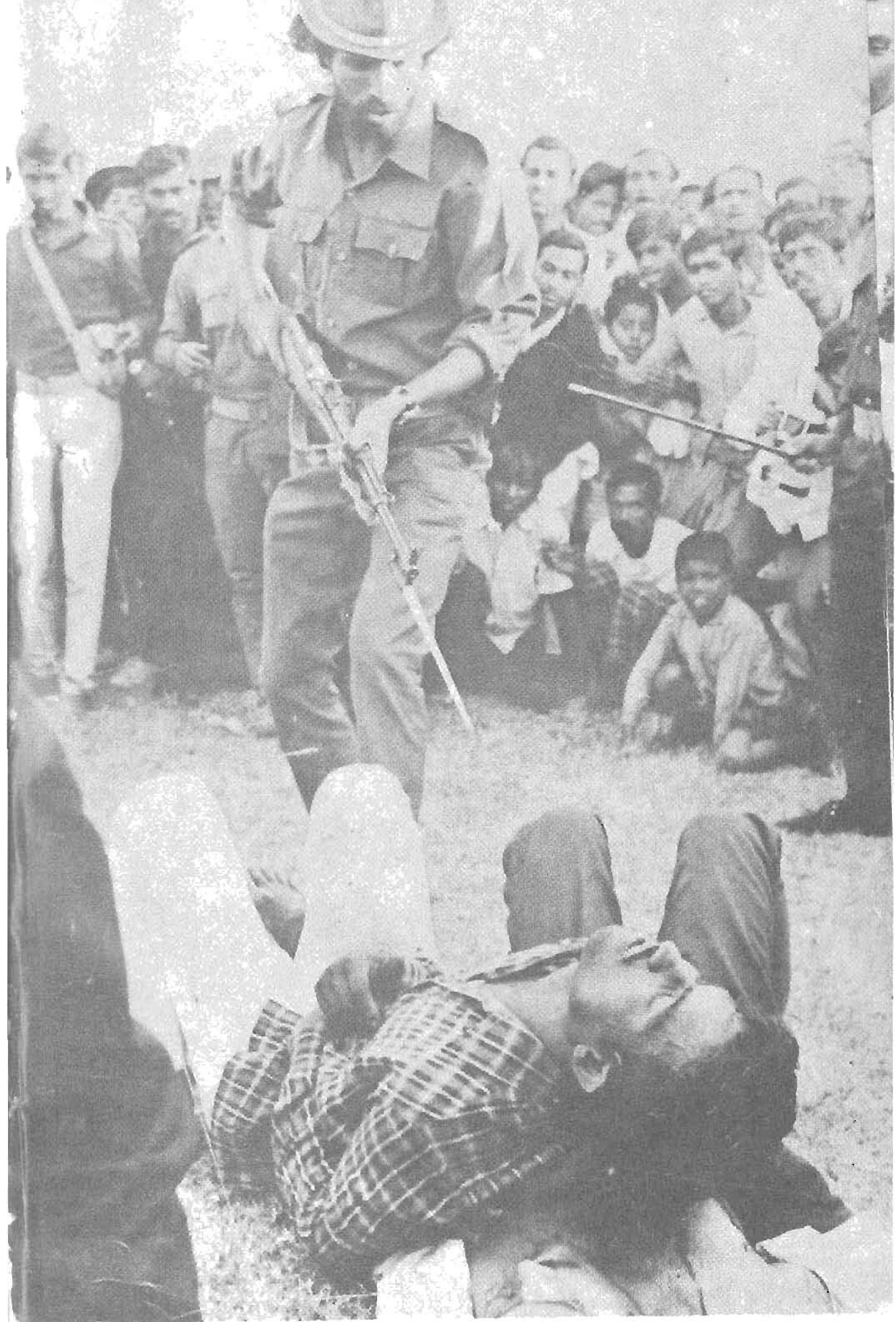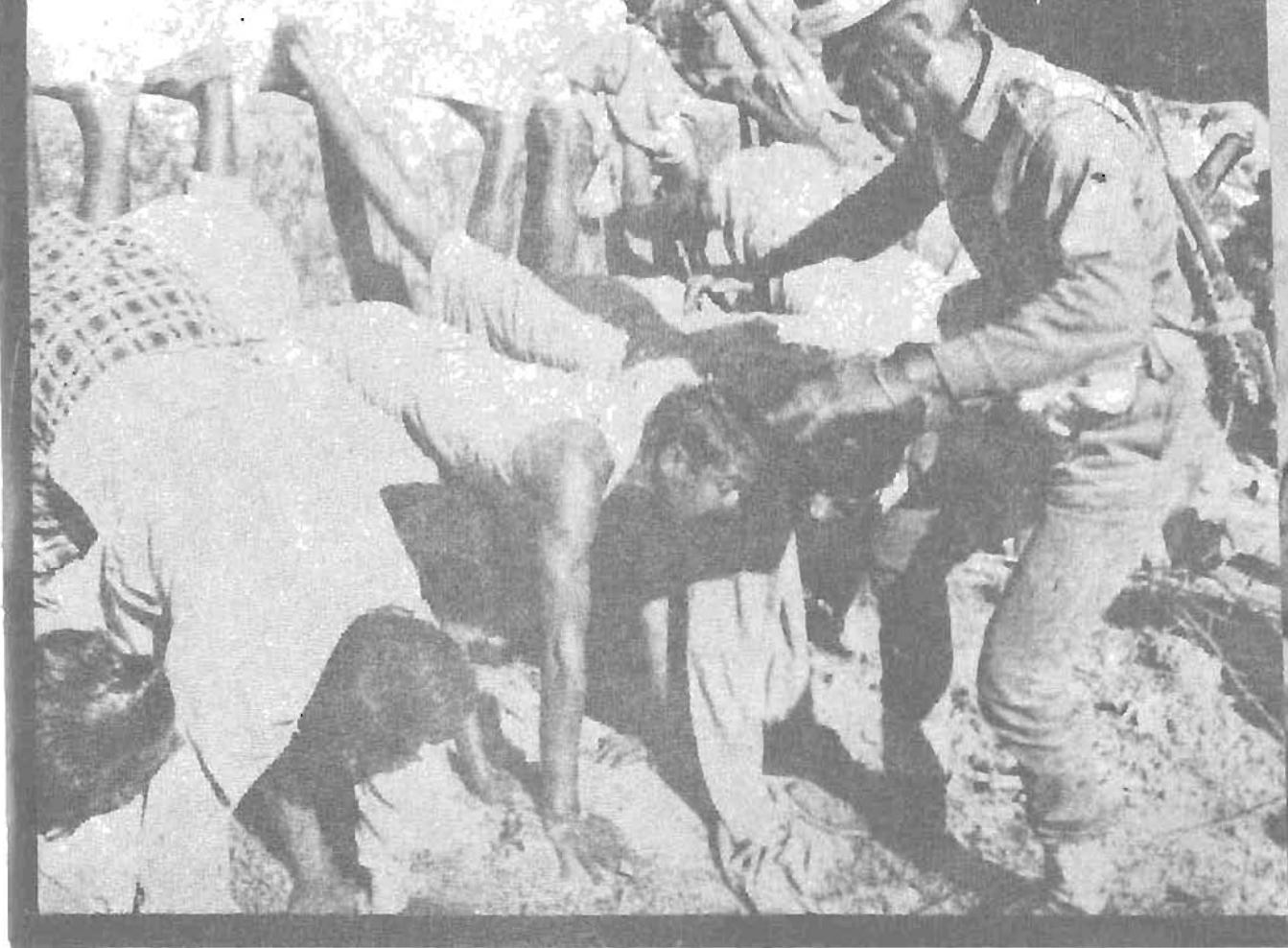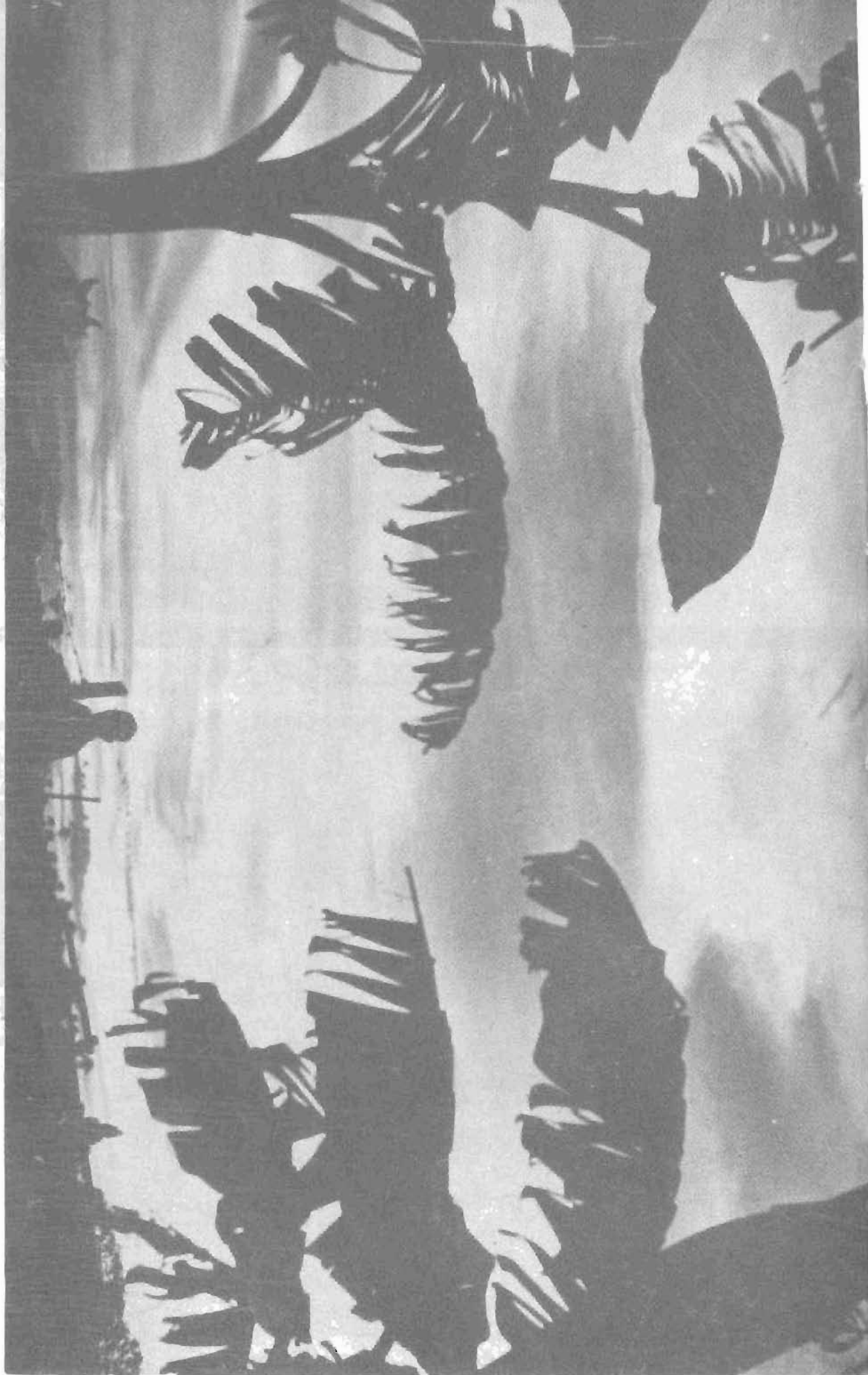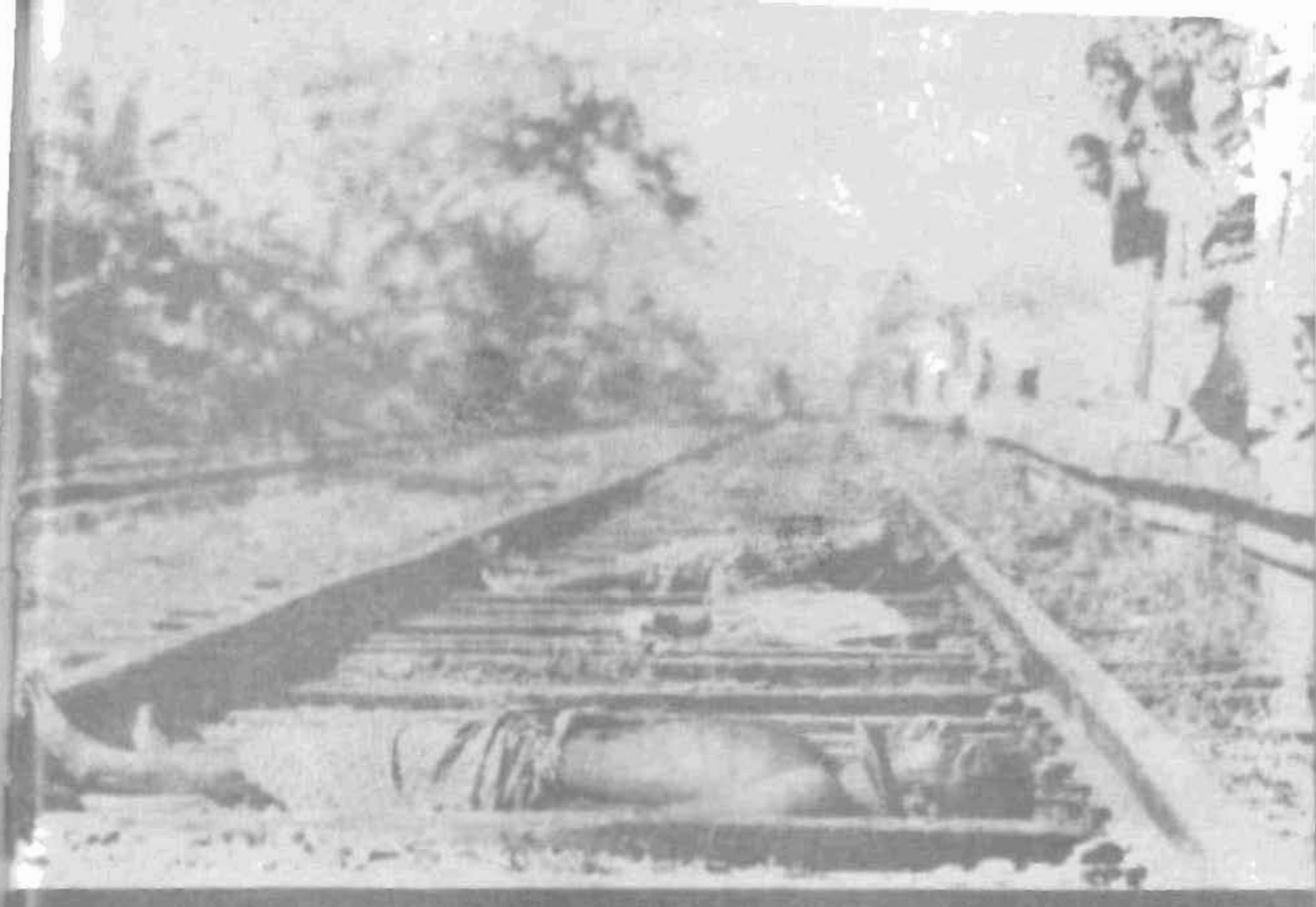
سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بے گور و کفن لاشیں
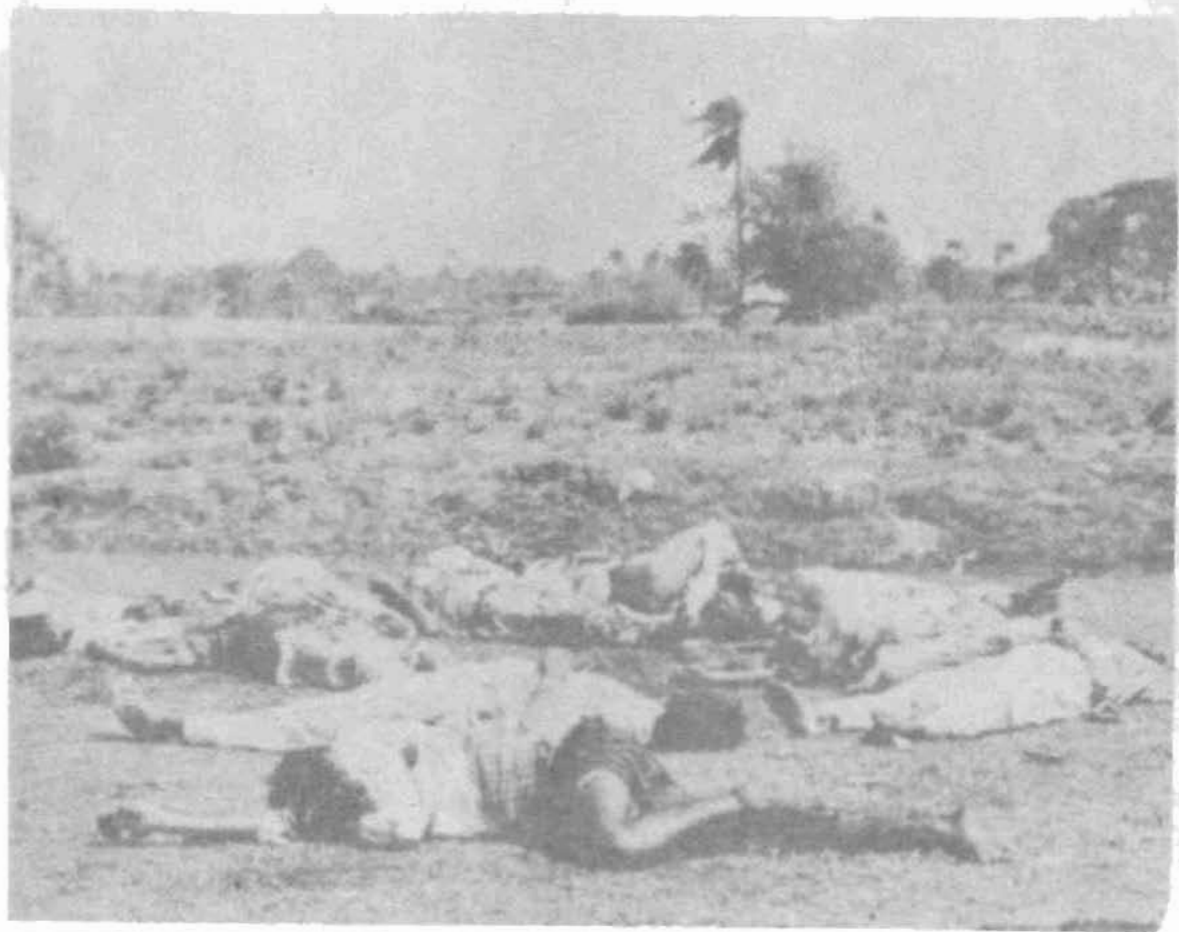
آخری خطاب

(شہادت سے چند روز قبل نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن ڈھاکہ کے تحت منعقدہ مذاکرے میں عبدالمالک شہید کی یہ تقریر بنگلہ میں ہوئی جس کا ٹیپ سے اردو میں ترجمہ درج ذیل ہے۔)

صدر محترم و دانشور دوستو!

اس وقت یہاں نئی قومی تعلیمی پالیسی کی تجاویز زیر بحث ہیں اور گفتگو کا محور اس پالیسی کی نظریاتی بنیاد ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب تک جن حضرات نے اس مذاکرے میں تقریریں کی ہیں، ان میں سے اکثر دوستوں نے زیر بحث موضوع پر ہٹتے ہوئے بہت سی غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں کو چھیڑ دیا ہے اس لئے میں اپنی تقریر کے مختصر وقت سے کچھ حصہ ان غیر متعلقہ باتوں کی وضاحت میں خرچ کرنے پر مجبور ہوں۔

کچھ "دانشوروں" نے ثقافت کے مسئلے کو اٹھایا ہے اور فرمایا ہے کہ ان کی مطلوبہ ثقافت درحقیقت "Single Cultural Pattern" جس کے فکری سوتے مارکس ازم سے پھوٹتے ہوں اور عملی لحاظ سے وہ ہندو بنگلہ ثقافت اور مسلم بنگلہ ثقافت کا یکساں آمیزہ ہو۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ دعویٰ سرے سے غلط ہے، کیونکہ پاکستان اسلامی فکر کے تابع مشترک ثقافتی اقدار کے لئے بنا ہے اور مشترک ثقافت کے معنی کبھی بھی واحد یکساں یا یک رنگ ثقافت کے نہیں ہوتے۔ ایک زندہ معاشرے میں ایک سے زیادہ وحدتوں کے مابین مشترک ثقافتی اقدار تو ہو سکتی ہیں، لیکن اسے غلط انداز میں یکساں ثقافتی وحدت میں تبدیل کرنے کی کوشش غیر فطری ہوگی اور اس ضمن میں معاشرے پر یکساں ثقافت ٹھونسنے کی غیر فطری مثال سوویٹ روس ہے۔ جہاں جدلیاتی مادی نظریے کے تابع سیاست میں تمام ثقافتی اقدار کو مسمار کر کے بزور "یکساں ثقافت" تشکیل دیا۔ ہم اصولی طور پر اس طرز فکر اور طرز عمل پر یقین نہیں رکھتے، بلکہ ہمارا مطمح نظر پاکستان میں مشترک ثقافتی اقدار کا فروغ ہے۔

اور جہاں تک مجلس مذاکرہ کے موضوع "تعلیم کا حقیقی مقصد کیا ہے؟" کا تعلق ہے، تو اس

سلسلے میں عظیم شاعر ملٹن (Milton) کی ایک بات کی طرف اشارہ کروں گا۔ اس نے کہا تھا Education is the harmonious development of body, mind and soul

دوستو! یہ جسم، یہ دماغ اور یہ روح کی "Harmonious development" (متوازن ترقی) کسی نظریہ، اور کسی فکر و آدرش کے بغیر ممکن ہو نہیں سکتی۔ انسانی تاریخ و تجربے کی یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ روحانی عقیدہ یعنی تصورِ کون و مکان ہی وہ بنیاد ہے جس سے نوع انسانی کی تمام اخلاقی اقدار، معاشرتی تصورات اور تاریخی نظریات کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اس لئے ان افراد سے یہ بنیادی سوال پوچھنا چاہوں گا کہ جو نظام تعلیم اخلاقی و نظریاتی بنیادوں سے عاری ہوگا وہ کس طرح انسانیت کی متوازن ترقی اور فلاح کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ ؟

مزید یہ کہ ایک زندہ قوم کے پیش نظر تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ فرد میں صحیح متوازن اور نسلی و لسانی نفرتوں سے پاک تشخص کا شعور پیدا کرے۔ اس کے لئے نظام تعلیم کی سہل الحصول اور سائنٹیفک اسلامی تشکیل ہی واحد موثر ذریعہ ہو سکتا ہے جس کے ذریعے اسلامی ملی اور پاکستانی فکر و ثقافت کا احیاء ممکن ہے۔ اس طرح طلبہ کی ذہنی، اخلاقی، روحانی اور جسمانی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کے لئے ایک مضبوط اور مربوط مشترک ثقافتی ورثہ فراہم کر سکیں۔ جس کی نظریاتی بنیادیں مستحکم ہوں تاکہ وہ ہر دم رواں زندگی کو فکری مغالطہ انگیزیوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کے آکاس بیل سے بچا سکیں۔

پھر جو لوگ لادینی یا سیکولر نظام تعلیم کے خواہاں ہیں، انہیں چاہیئے کہ وہ عقل و خرد کی آنکھوں سے اپنے معاصر مغربی سماج یا اس اس تہذیب سے متاثر معاشروں کو دیکھیں جہاں سیکولر نظام تعلیم رائج کیا گیا ہے۔ اسی کا ایک معروف مغربی فلاسفر اور ماہر تعلیم پکار اٹھتا ہے:

> "تین قسم کی ترقی اہم ہے علم اور تکنیک میں ترقی، انسان کی سماجی حیثیت میں ترقی اور روحانیات و اخلاقیات میں ترقی ـــــ اور امر واقع یہ ہے کہ ان میں آخری ترقی سب سے اہم، بنیادی اور ضروری ہے"۔

اسی طرح مغرب کا ایک دوسرا فلسفی البرٹ شویزر (Albert Schwazer) اپنی تصنیف "Teaching of Reverence for Life" میں اس نے دین و بے مقصد نظام تعلیم

پر تنقید کی ہے ـــــ وہ اسے روحانی و اخلاقی نظریہ کے تابع تشکیل دینے پر زور دیتا ہے :۔

" ہمارے اس عہد کو روحانی اقدار کے احیاء کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک نئی "Renaissance Movement" (نشاۃ ثانیہ) کی ضرورت ہے ایسی نشاۃ ثانیہ جس میں حضرات انسان تمام ٹھوکروں سے سبق لیتے ہوئے بغیر کسی ہٹ دھرمی اور بغیر کسی ضد کے تسلیم کرے کہ ـــــ اخلاقی عمل اور روحانی اقدار ہی نوع انسانی کی سب سے عظیم اور بالاتر صداقتیں ہیں اور انہی کے ذریعے کرب و ابتلا۔ میں تڑپتی ہوئی انسانیت کی نجات ممکن ہے ۔"

اس اخلاقی شاہراہ کے علاوہ انسانیت کی نجات کا کوئی اور راستہ ممکن نہیں۔ یہ بات مسٹر البرٹ نے جس قدر بے لاگ اور صاف صاف پیرائے میں بیان کی ہے۔ اس پر میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اب اس سلسلے میں مزید بحث کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ "جدت" کی عینک لگا کر معذرت خواہانہ انداز میں دلائل کی تلاش میں نکلنے والے مستغربین یا متجددین کے سامنے اسی نام نہاد جدیدیت بے دین، مادہ پرست اور بے قید نظام تعلیم کے پروردہ عالم نے اعتراف حقیقت کیا اور مروجہ نظام تعلیم کی قلعی کھول کے رکھ دی ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک یہاں ایک بے دین، بے روح حتیٰ کہ خالص قومی بنیادوں سے بھی عاری نظام تعلیم رائج ہے اور اسی نظام تعلیم کا یہ اثر ہے کہ اس نے آج ہمارے ہاں لارڈ میکالے کے Brain children اور بڑی تعداد میں Brown Englishmen پیدا کر دیئے ہیں جو سیکولر نظام تعلیم کی مالا جپتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اپنے پاکستانی وجود کو تسلیم کرنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔

بہرحال ہمیں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیئے کہ ہمارے ہاں اس وقت جو نظام تعلیم رائج ہے، اس نظام تعلیم کو آج سے ڈیڑھ سو سال قبل یہاں پر نافذ کیا گیا تھا اور جب ابتدا میں یہ نظام تعلیم راسخ العقیدہ مسلمانوں کو برطانوی سامراج کی خواہش کے مطابق پوری طرح "مطلوبہ سانچے" میں نہ ڈھال سکا، تو تاج برطانیہ نے اس "خامی" کا جائزہ لینے کے لئے سر ولیم ولسن ہنٹر W.W. Hunter کو مقرر کیا، موصوف نے اپنی رپورٹ میں لکھا :۔

"The truth is that our system of public instruction is opposed to the tradition unsuited to the requirement and hatefull to the Religion of Mussalmaans".

ایک دوست سوال کرتے ہیں کہ "اسلامی آئیڈیالوجی کیا ہے"؟ میں انہیں نہایت ادب سے صرف یہ کہوں گا کہ آپ بیگانوں کی سی بات کرنے کے بجائے ذرا سی زحمت فرمائیں اور اسلامی تاریخ و ثقافت کا مطالعہ کریں، تنقیدی جائزہ لیں، پھر بڑے شوق سے سوال کریں کہ "بتاؤ اسلامی نظریہ کیا ہے؟" چند رٹے رٹائے اعتراضات کو جڑ دینے کا عمل غیر سائنسی اور عامی قسم کا ہے جو کسی پڑھے لکھے اور بزعم خود "روشن خیال" فرد کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔ جناب! اسلامی آئیڈیالوجی پر جس سماج کی ثقافتی اقدار کو تعمیر و پروان چڑھایا گیا تھا۔ وہاں پر سرخ جنت روس کی مانند جبراً یکساں ثقافت مسلط نہیں کی گئی تھی بلکہ معاشرے میں مشترکہ سماجی اقدار کا نفاذ اور عملی ارتقاء عقیدے کی گرمی اور محبت کے رشتوں جیسے مثبت رویوں کے ذریعے ہی معرض وجود میں آیا تھا۔ اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ بھائی! تعلیم و ثقافت کے معاملہ میں غیروں اور پرائیوں کی جانب دیکھ کر فکر و عمل کی قلابازیاں لگانے کے بجائے اپنے نظریے، اپنی تاریخ اور اپنے درخشاں ماضی اور روشن ورثے کو پہچانیے۔ تسلیم کرنے میں ہچکچائیے نہیں اور عصری تقاضوں کے مطابق اسے نافذ کرنے میں شرمائیے نہیں ـــــ البتہ غلط نظریوں سے مرعوب ہو کر سراب کی جانب لپکیں گے تو سوائے بربادیوں اور عبرتوں کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ تب مستقبل کا مورخ اور آپ کی آئندہ نسلیں یک زبان آپ کو مجرم گردانیں گے۔

اگلی گزارش یہ ہے کہ پاکستان جس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا ہے، اس مقصد کا شعور رکھتے ہوئے شیر بنگال اے۔ کے فضل الحق نے مسلم لیگ پٹنہ کے اجلاس ۱۹۳۸ء میں فرمایا تھا:

"ہم (پاکستان میں) ایک اسلامی نظام تعلیم رائج کریں گے"۔

یہی وہ . . . .

(وقت ختم ہونے کے باعث تقریر ادھوری چھوڑنا پڑی)۔

شہدائے البدر

البدر کے ان شہیدوں کا تذکرہ، جو اس کتاب میں شامل ہیں

اشاریہ ضمنی موضوعات

مسلم بنگال

مشرقی پاکستان؟

البدر : تعارف

جنگی مہمیں

جاوداں

سقوط

اسیری

هجرت

اشخاص

(الف)

ماخذ و مراجع (اردو)

آباد شاہ پوری "روس میں مسلمان قومیں" 112

— "ترکستان میں مسلم مزاحمت" 112

ابو الاعلیٰ مودودی ، "اسلام کا سر چشمہ قوت" 1

— "تحریک آزادی ھند اور مسلمان" ، 14

— "مشرقی پاکستان : حالات و مسائل کا جائزہ اور اصلاح کی تدابیر" 92،83،81،47،46،34،32،28،24

— "ترجمان القرآن" 144،113،71،69،38،

— "تبصرہ تحقیقاتی عدالت" 44

— "انتخابی تقریر 1964ء" 119

— "تحریک جمہوریت : اسباب اور مقاصد" 118،44

— "مخلوط انتخابات : کیوں اور کیسے ؟" 66

— "خطاب بہ مرکزی مجلس شوریٰ" 112،56

— "تصریحات" 64

اختر حسن "سازش یہود" 103

اعجاز الحق قدوسی "تذکرہ صوفیائے بنگال" 1

الطاف حسن قریشی : "اردو ڈائجسٹ" 242،150،105،100،16

الطاف گوہر "مشرقی پاکستان" (اردو ڈائجسٹ) 69،40

باری علیگ "کمپنی کی حکومت" : 2

پنجاب یونیورسٹی لاہور "اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد چہارم" 1

— "تاریخ ادبیات" 55،29

— "محور صد سالہ عمر" 59،28

جماعت اسلامی پاکستان "انتخابی منشور 1951" 33،32

— "انتخابی منشور 1970" 91

جمیل احمد رانا "مارشل لاء کے تین سال" 142،136،134،132

حسن ریاض ، سید "پاکستان ناگزیر تھا" 18،14،13،12

حفیظ الرحمان حسن "مشرقی پاکستان اور جماعت اسلامی" : 57

حفیظ الرحمان صدیقی (ڈاکٹر) "قرار داد مقاصد سے اسلامی قانون تک" 118،35

حنیف رامے "پنجاب کا مقدمہ" 121

روز نامے

مجلے و ماہنامے ہفت روزے

- 'Dawn' Daily, 103
- "From East Pakistan to Bangladesh", 143,180
- G.W. Chaudhry, "India, Pakistan, Bangladesh and Major Powers", 110.
  "Last Days of United Pakistan", 101.
- Hasan Askari "Military and Politics in Pakistan", 47.
- Hasan Gardezi (ed) "Pakistan : The Unstable State", 104.
- Henery Kissinger, "White House Years", 108.
- Herbert Feldman "From Crisis to Crisis" 49.
  "The End and the Beginning", 128.
- Humara Momen "Muslim Politics in Bengal of 1937", 11,12.
- Indira Gandhi "India and Bangladesh", 97.
- Josef Korbel "Danger in Kashmir", 94.
- Jotisen Gupta "Eclipse of East Pakistan", 53,60,81
- Khalid B. Sayeed "Politics in Pakistan", 32,75.
- Kuldip Nayar "Report on Afghanistan", 108,112.
- Lachman Singh (Maj. Gen) "Indian Sword Strikes in East Pakistan", 187.
- Lawrence Lifschultz "Bangladesh : The Unfinished Revolution", 187.
- Lawrence Ziring, "Pakistan : The Enigma of Political Development", 107,153.
- Mohammad Ali Jinnah "Some Recent Speeches and Writings", 65.
- Maniruzzaman Talukdar (Dr) "Radical Politics and The Emergence of Bangladesh" 46,50 59 61,80,85,87,88,141,188.
- Matiur Rahman (Dr), "Iron Bars of Freedom", 194.
- News Week", 179.
- "Pakistan Observer" (daily) 185.
- "Pakistan Times", (daily) 6,98,103,104,112,118.
- Pran Chopra, "India's Second Liberation", 147.
- Rafiq-ul-Islam, "The Tale of Millions", 147,149,151,158.
- Robert Payne, "Massacre" 186.
- Rounaq Jahan (Dr), "Pakistan : Failure in National Integeration", 33,40,48,50,75, 76,81,117.
- Rushbrook William, "The East Pakistan Tragedy" 28.
- Safdar Mahmud (Dr) "Pakistan Divided", 40,47,52,97,98,104,106,107,109,110,128, 156.
- Sarfraz Mirza, "All India Muslim Students Federation", 28.
- S.M. Ikram (Dr), "Modern Muslim India and Birth of Pakistan", 62.
- S.M. Zafar, "Through the Crisis", 51.
- Stelnley A. Kochanek, "Business and Politics in Pakistan", 33.
- Sukrangan Das Gupta, "Midnight Massacre in Dacca", 109,187.
- "The Tale That Was Never Told", 179,193,194.
- Vemtsry Vovsky, "The Development on the Indian Subcontinent and Soviet Union" 112.
- Y.V. Gankovsky, "A History of Pakistan," 84.
- Zulfiqar Ali Bhutto, "The Great Tragedy", 40.

نسیم حجازی

"جب قوموں کا حافظہ جواب دے جائے تو ان کا مستقبل مخدوش ہو جاتا ہے۔ البدر کے مصنف نے اسلامی تاریخ کے اس درخشاں باب کو اجاگر کر کے ملی سطح پر ہمارے حافظے کو بحال کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔۔۔۔ البدر کے حوالے سے ان واقعات کا مطالعہ نئی نسل کے لیے اشد ضروری ہے۔"

نعیم صدیقی

"البدر ایک ایسی زندہ دستاویز ہے، جس کا ہر باب دردناک بھی ہے اور سرچشمۂ اُمید بھی۔۔۔ پھر یہ ایک زندہ انسانی تجربے کا حسین و قابلِ قدر مرقع بھی ہے۔ اس کتاب کا ہر لفظ قومی سطح پر اُٹھنے والے طوفانوں سے پیشتر سنبھلنے کا پیغام ہے۔۔۔۔ تحریکِ اسلامی کی فکر کے ساتھ ساتھ عمل کی یہ پوری داستانِ عزیمت درحقیقت "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا چوتھا حصہ ہے۔"

سراج منیر

"البدر کو پڑھنا اپنی کتابِ ضمیر کو پڑھنے کے مترادف ہے جس میں بیان واقعہ اور واقعہ بن کر سامنے آتا ہے اور دورانِ مطالعہ یوں لگتا ہے کہ البدر کے لڑکے اس طرح ایڑیاں اٹھا اٹھا کر میدانِ جہاد میں آتے تھے کہ ان کی اٹھتی ہوئی ایڑیاں البدر سے میدانِ بدر تک لے جاتی تھیں۔ یہ کتاب معروضیت کے مغربی پیمانوں سے بالاتر ہے۔۔۔۔۔۔ کتاب میں عدل و صداقت شعاری بھی ہے اور ایمان و خلوص کی داخلی جہت بھی۔۔۔۔ اور تحقیق کے مروجہ و مطلوبہ اصولوں اور معیارات کو نہ صرف پیشِ نظر رکھا گیا ہے بلکہ ان معیارات سے بہت آگے ہے۔۔۔۔ اس لیے یہ کتاب بہت عرصے تک داد و تحسین سے مستغنی اور شاید ہمیشہ اس سے ماورا رہے گی۔"

میجر ریاض حسین ملک

"البدر پاکستان کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ اس کتاب میں تمام تر حقائق و واقعات محنت اور لگن سے جمع کیے گئے ہیں اور یہ کام جواں عزم انسان ہی انجام دے سکتا تھا۔ اتنی خوبصورت تصنیف کی تعریف رسمی الفاظ میں ممکن نہیں۔ حیرت ہے کہ فوجی آپریشن سے عملاً ناآشنا ہونے کے باوجود مصنف نے ان کارروائیوں کی عکاسی اتنی ماہرانہ انداز میں کی ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔"

ارشد میر

"مصنف کے اسلوب کے سحر، تجزیاتی انداز کے بانکپن اور حقائق کی صداقت نے کتاب البدر کو ادبی و فکری سطح پر تاریخی دستاویز بنا دیا ہے۔"

ڈاکٹر وحید قریشی

"البدر اپنے موضوع پر پہلی لیکن بہت اہم کتاب ہے۔ جس میں اُن سیاسی حالات کو پہلی دفعہ صحیح تناظر اور حقیقی اعداد و شمار میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے ...... اور ان دُور رس عوامل کی نشان دہی کی گئی ہے جو سانحۂ مشرقی پاکستان پر منتج ہوئے ..... موجودہ قومی صورتِ حال میں ہم البدر کے بیانات سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں کہ آئندہ کے لائحۂ عمل میں یہ کتاب ہمیں بہتر شعور عطا کرتی ہے۔"

پروفیسر پریشان خٹک

"اسلامی، ملی اور پاکستانی جذبوں پر کسی قسم کی سودے بازی نہ کرنے کی زندہ دلیل البدر کی یہ حیات افروز داستان، پاکستان کے لاکھوں طالب علموں کے زیرِ مطالعہ آنی چاہیے۔"

پروفیسر محمد منور مرزا

"البدر کے مطالعہ کے دوران، غداری کے سانحے پر جہاں میرے سینے میں نیزے اور دماغ میں سوئیاں چبھتی محسوس ہوئیں، وہاں ملتِ اسلامیہ کے ان نوجوانوں پر فخر محسوس ہوا کہ انھوں نے اسلام اور پاکستان کے لیے ایثار و قربانی کی بے مثال داستانیں چھوڑیں ..... البدر کے جیالوں اور شہیدوں نے اپنے خون سے جو چراغ روشن کیے ہیں ان سے مستقبل میں شاہراہِ ملت منور ہوتی رہے گی ..... سچی بات یہ ہے کہ ہم جغرافیے کے نہیں بلکہ تاریخ کے لوگ ہیں اور یہ ہماری اسلامی تاریخ کا قابلِ فخر باب ہے۔"

مسعود مفتی

"البدر کے مطالعہ کے دوران میں دو باتوں سے بہت متاثر ہوا ہوں:
اوّل تو کھری باتیں، کہ مصنف نے جو چاہا وہ برملا کہا، مصلحت کا غلاف چڑھائے بغیر ... اور دوسرے جو کہا مناسب ریسرچ کے بعد کہا، محض جذباتی بیان نہیں لیے ..... ضرورت ہے کہ مشرقی پاکستان کے متعلق ایسی ہی کتابیں تحقیق کے بعد شائع ہوں ..... یہ کتاب مشرقی پاکستان کے متعلق تحریروں میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔"

میاں طفیل محمد

"البدر کے مطالعہ سے یہ احساس اور گہرا ہو جاتا ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی ایمان پختہ ہو تو اسی کردار کو جنم دیا جا سکتا ہے جس کا مشاہدہ دورِ اوّل میں چشمِ فلک نے کیا تھا ... محترم مصنف، پاکستان کے ایک نہایت نازک اور اہم دور کے وہ بے شمار ایمان افروز واقعات ریکارڈ پر لے آئے ہیں، جو آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے اور یہ خطرہ تھا کہ وہ مرورِ زمانہ کے گرد و غبار میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائیں گے ... میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک احسانِ عظیم ہے جو اس نوجوان مصنف نے پاکستان، اہلِ پاکستان اور نظریۂ پاکستان پر کیا ہے۔"

الطاف حسن قریشی

"مصنف نے البدر مرتب کر کے ہماری تاریخ کا ایک نہایت اہم باب قلم بند کر دیا ہے، جس میں امر نالیاں بھی ہیں، عبرتیں بھی اور بے پناہ جراتیں بھی۔ مشرقی پاکستان کے نوجوان جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کا سچا شعور عطا کیا تھا اور جو اپنا تاریخی کردار ٹھیک طور پر سمجھتے تھے، ان قوتوں کے سامنے ڈٹ گئے جو پاکستان کی آزادی کے درپے تھیں۔ اس جہادِ عظیم میں سینکڑوں نوجوان شہید ہوئے اور ہزاروں اپنے زخموں سے وطن کے مستقبل کی آبیاری کرتے رہے۔ البدر کے حریت پسندوں اور شہیدوں نے اسلام کی عظمت کے لیے جو تابدار قربانیاں دیں، آج وہ بنگلہ دیش میں ایک نئی تحریک اور ایک نئی قوت تخلیق کر رہی ہیں۔"

خرم جاہ مراد

"البدر مسلم بنگال کے ان امر نوجوانوں کی داستان ہے، جو اپنے رب پر نثار ہو گئے۔ یہ ہماری حیاتِ ملی کا درخشاں باب ہے جو تاریخ کے صفحات سے گم ہو جاتا اگر مصنف اتنی محنت اور عرق ریزی، جاں فشانی اور کاوش، محبت اور خلوص کے ساتھ اس کو محفوظ کر دینے کا انتظام نہ کر دیتے۔ اس کاوش پر وہ بجا طور پر پوری ملتِ اسلامیہ کی طرف سے شکر و امتنان کے مستحق ہیں۔ انھوں نے ہمارے ساغر کے لیے وہ مے فراہم کر دی ہے جس کی لذت بیان سے باہر ہے۔"